ماہنامہ سرگزشت کراچی

دسمبر 2016

نگران اعلیٰ
معراج رسول

DECEMBER 2016

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کبھی کبھی ایسی کہانیاں بھی نظر آجاتی ہیں جو چند جملوں میں بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔''پی ٹی وی کے گیٹ پر ایک بڑے میاں بیٹھے دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ہائے اردو' میری پیاری اردو کہہ کہہ کر وہ سر پیٹ رہے تھے۔ میں نے پوچھا ہوا کیا ہے؟ انہوں نے ایک اسکرین شاٹ سامنے کر دیا۔ اسکرین شاٹ' پی ٹی وی کے خبرنامے کا تھا، جس میں موٹے موٹے حرف میں خبر لکھی ہوئی تھی''کشمیری اور پاکستانی ایک جان دو کلب ہیں'' اسکرین شاٹ دیکھ کر میں نے پوچھا' آپ ہیں کون؟ تو وہ سر پیٹ کر بولے' اپنے آپ سے شرمندہ زیڈ اے بخاری ہوں۔'' کہانی مجھے اس لیے بھی پسند آئی کہ چند جملوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس وقت تقریباً تمام چینلز پر جو اردو استعمال ہو رہی ہے اسے سن اور دیکھ کر یقیناً زیڈ اے بخاری کی روح شرمندہ ہو رہی ہو گی۔ بھلے ہی زیڈ اے بخاری اردو کے بہت بڑے مصلح نہیں تھے لیکن انہوں نے نشریاتی اداروں میں اردو کی جس طرح خدمت کی۔ اردو کے تلفظ پر نظر رکھی اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن آج جس طرح تمام نشریاتی ادارے اردو کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب اردو نامی زبان کی تمام شیرینی ختم ہو کر بازاری زبان باقی رہ جائے گی۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

معراج رسول

جلد 26 ❖ شمارہ 11 ❖ دسمبر 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی نازش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

میکش

سرگزشت

1906ء میں اس نے آگرے کے ایک زمین دار گھرانے میں جنم لیا۔ نام اس کا محمد علی شاہ رکھا گیا۔ گھر میں عزت وتوقیر، محبت وعقیدت کے انبار تھے جو اس کے مصرف کے نہ تھے بلکہ معیشت اور اقتصادیات پر بھی بار تھے۔ دوسری طرف خاندانی دشمن بندوق تانے کھڑے تھے اور سر پر باپ کا سایہ نہ تھا۔ ماں کا بھرپور پیار حاصل تھا لیکن باپ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ جب وہ ڈیڑھ یا دو سال کا تھا تبھی سر سے شفقت پدری کی ردا چھن گئی تھی۔ اس نے باپ کے مطلق جو کچھ سنا وہ دوسروں سے سنا۔ ہر شخص اس کے باپ کی خوش اخلاقی، بذلہ سنجی کے قصے سناتا لیکن ماں ہر وقت آنسو بہاتی نظر آتی عید تہوار پر ماں اسے نئے کپڑے پہنا کر روتی باہر آتا تو عزیز رشتے دار اسے گلے لگا کر روتے اور وہ سہم جاتا۔ اسی لیے اسے رونے سے چڑ ہو گئی تھی اور اس نے ماں کو ٹوکنا شروع کر دیا بیٹے کی ضد دیکھ کر ماں بھی رونے سے اجتناب برتنے لگی۔ پڑھنے کی عمر آئی تو رسم بسم اللہ مسجد کے پیش امام نے کرائی لیکن ابجد کا علم ماں نے دینا شروع کیا۔ وہ ابتدائی قاعدے کے ساتھ سبق آموز قصے کہانیاں سناتی۔ خدا اور رسول کی باتیں بتاتی۔ قصص الانبیاء کا بہت سا حصہ یاد کرایا پھر دادی کی سوتیلی بہن نے تعلیم دینا شروع کر دی ان کے بعد مولوی عبدالمجید ٹونکی کو ٹیوشن کے لیے مقرر کیا۔ انگریزی تعلیم کے لیے بھی اساتذہ مقرر ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے تفسیر جلالین ...... مشکوٰۃ اور منطق کی ابتدائی کتاب مرقاۃ پڑھا دیا۔ بہنوئی سید شہزاد علی اس زمانے میں علی گڑھ میں جیلر تھے۔ ان کے بلاوے پر میلہ دیکھنے دیگر عزیزوں کے ساتھ وہ بھی چلا جاتا۔ اس وقت تک علی گڑھ کالج، کالج ہی تھا، یونیورسٹی میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ ایک بار جب وہ علی گڑھ گیا تو بہنوئی اسے علی گڑھ کالج لے گئے اور مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات کی خدمت میں پیش کر دیا کہ آپ "جانچ" کر دیکھیں یہ بچہ پڑھ بھی رہا ہے یا صرف وقت برباد کر رہا ہے۔ امتحان لیا گیا تو کم عمری کے باوجود اسے بہت زیادہ نمبر ملے۔ اس بات نے سب کو مسرور کر دیا۔ پھر اسے مدرسہ عالیہ میں داخل کرا دیا گیا جہاں مفتی سعادت اللہ مدرس تھے۔ اس مدرسہ سے ایک کے بعد ایک امتحان پاس کرتے ہوئے خود مدرس کے عہدے پر آ گئے۔ ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن سے بھی دلچسپی بڑھتی رہی۔ والد سید اصغر علی شاہ اصغر، چچا سید عبدالعلی شاہ بیدل، جد محترم سید مظفر علی شاہ بھی فارسی و اردو میں شاعری کرتے تھے اس لیے یہ شوق انہیں بھی گھیرے رہا۔ شاعری نو عمری سے شروع ہوئی تھی جس میں اب پختگی آ چکی تھی۔ بچپن میں جب شاعری گھٹنیوں چل رہی تھی۔ تمام رشتے داروں کے کم عمر لڑکوں نے ایک انجمن بنالی تھی جس کے زیر اہتمام بزرگوں سے چھپ کر ہر پندرہ دن بعد ایک مشاعرہ منعقد کر لیتے تھے پھر اس مشاعرے میں باہر کے نو عمر لڑکے بھی شامل ہونے لگے اور اس مشاعرے کی شہرت شہر بھر میں پھیلنے لگی۔ ان کے اچھے اشعار ایک سے دوسرے تک پہنچنے لگے پھر انہوں نے غزلیں رسائل کو بھیجنی شروع کیں تو وہ چھپنے بھی لگیں اور وہ اردو شعراء میں ایک اہم نام کی حیثیت سے سامنے آنے لگے۔ جگر مراد آبادی، فانی، جوش جیسے شعرا سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ شاعری میں نت نئے تجربے کیے جانے لگے۔ اس دور کا شاید ہی کوئی ایک ایسا معروف نام ہو جو آگرہ آئے اور ان سے ملاقات کرنے نہ پہنچے۔ جب کہ یہ خود مشاعروں سے دور بھاگتے تھے۔ ان کی قابل تذکرہ تصانیف میں نغمہ اور اسلام، میکدہ، حرف تمنا، نقد اقبال، متفرق مضامین کافی مقبول ہیں۔ دنیائے ادب انہیں میکش اکبر آبادی کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

شہرِ خیال
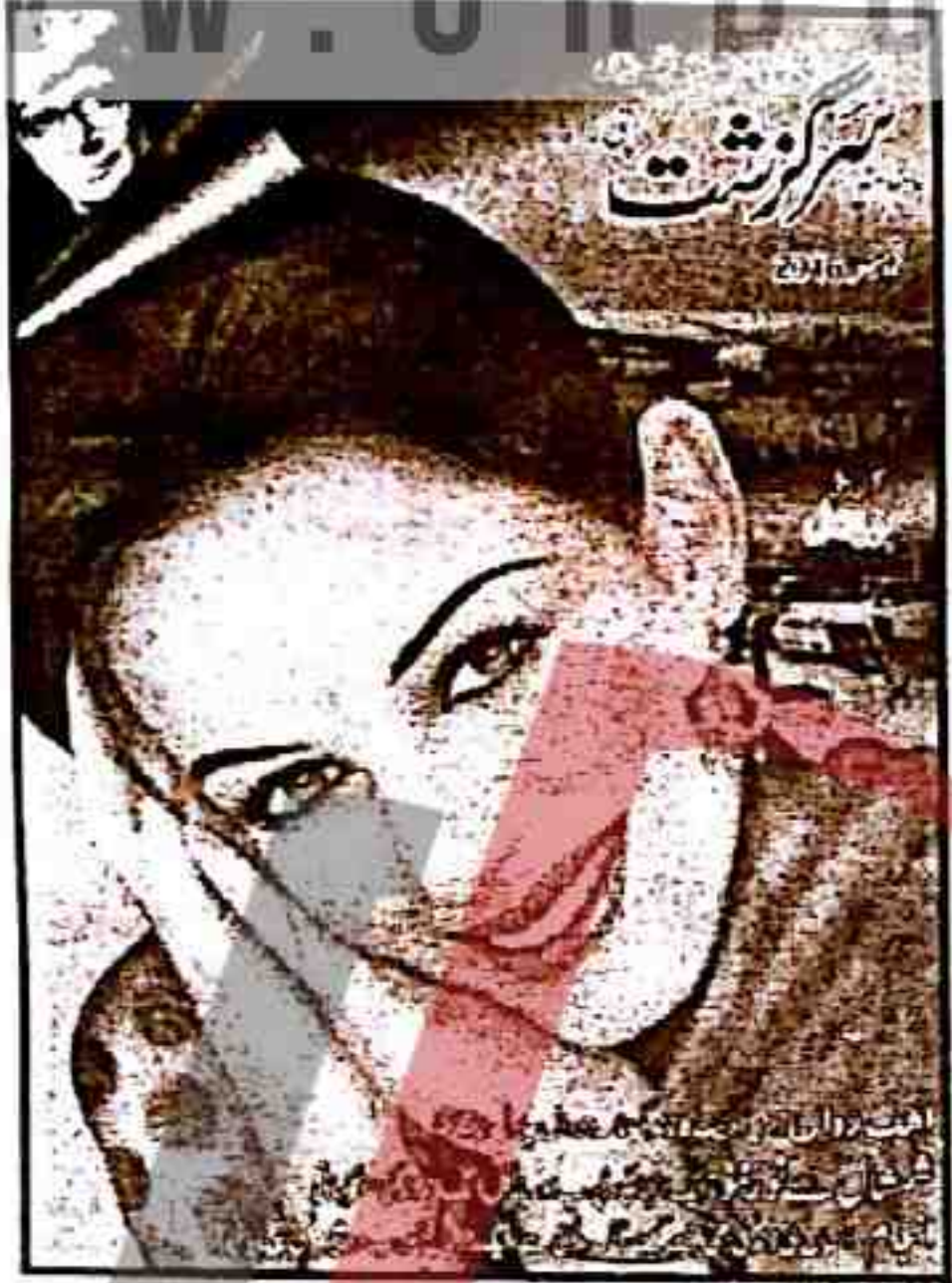
☆ اعجاز حسین ستھار کا تجزیہ نور پور تھل سے۔ ”جب سرگزشت ہاتھ میں آتا ہے تو آپ ہماری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ بار بار دیکھتے اور صفحات الٹتے ہیں۔ بڑی احتیاط اور پیار کا سلوک کرتے ہیں۔ سرورق صحیح چپکا نہ ہو تو گوند لگا کر جوڑتے ہیں۔ ہر کہانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ خطوط اور ناموں پر غور کرتے ہیں۔ آسانی کے لیے یوں جانیے جیسے بچے کے ہاتھ نیا کھلونا آئے تو کیسا تجسس ہوتا ہے۔ میں کئی رسائل کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن سرگزشت کا اپنا معیار اور اسٹائل ہے پھر پورے چھبیس سال سے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ ابتداء سے آج تک ہماری مستقل مزاجی دیکھ لیں۔ آپ مسند انصاف پر بیٹھے ہیں۔ سزا جزا کے مالک ہیں۔ قارئین کی یہ محبتیں ذہن میں تازہ رکھیں ہم اتنا ہی مخلصانہ چاہتے ہیں۔ انور عباس شاہ مسند صدارت پر فائز ہیں اس اعزاز کے لیے میری نیک خواہشات قبول کر کے سادات فیملی سے ہونے کے ناطے صحت وتندرستی کے لیے دعا فرما دیں۔ بھکر کے تمام دوستوں کو سلام۔ ”نومبر کی شخصیات“ میں وقار یونس، جون ایلیا، مشتاق محمد، فواد خان۔ شیخ رشید اور غلام مصطفیٰ جتوئی سے متعلق معلومات مزہ دے گئیں۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ دلچسپ ہے۔ ندیم اقبال کا اپنا مزاج اور انداز ہے۔ ”سراب“ سے متعلق حیران ہوں کہ کاشف زبیر انتہائی محنت سے لکھ رہے تھے، ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہے تھے لیکن پڑھنے والوں میں کچھ یہ رائے دینے لگے تھے کہ یہ سلسلہ یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے اس لیے یہ کہانی سمیٹ کر نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اب یہ ابتداء کی طرح دوبارہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ سب کو اب احساس ہوا ہے جس کا سارا کریڈٹ اپنی راہیں خود بنانے والے عظیم اور پہاڑوں جیسا حوصلہ رکھنے والے کاشف زبیر کو جاتا ہے۔ ان کی اس طبع زاد کہانی میں صلاحیتیں عروج پر نظر آتی ہیں۔ اللہ ان کی لغزشیں معاف فرما کر جنت کے باغ مسکن بنائے۔ (آمین)۔ اب سچ بیانیوں کی طرف آتے ہیں۔ اس بار زیادہ تر کہانیاں بھاری جسامت میں نظر آ رہی ہیں۔ اس رعایت سے کہنا چاہتا ہوں کہ پر تجسس اور دلچسپ ہوں گی۔ ”انجام“ میں دین محمد اپنی تربیت، ماحول اور پیشے کے ہاتھوں مجبور تھا۔ دوست، گاہک اور شاگرد ولڑکے بھی ایسی ذہنیت اور مزاج کے ملے کہ اخلاق سنوارنے، کردار سازی اور شرفاء سے گفتگو اور برتنے کا سلیقہ سکھانے کی بجائے محض دولت کمانے اور اکٹھا کرنے کے راستے پر لگا دیا۔ ملک کے حالات، سیاسی اتار چڑھاؤ اور مذہبی لگاؤ سے کوئی سدھ بدھ نہ تھی۔ اس کی حرکتیں، شک کرنا اور گھٹیا سوچ اسی ماحول کی مرہون منت ہے۔ مجھے ثمینہ کے باغیانہ لہجے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اگر وہ کمزوری دکھاتی تو آج پاگل ہو چکی ہوتی یا کسی پاگل خانے میں زندگی گزار رہی ہوتی۔ اصغر اس کے لیے مخلص تھا اور عملی قدم اٹھایا جس نیک نیتی کا صلہ اللہ نے یوں دیا کہ وہ آج کامیاب اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ ماضی دفن ہو چکا ہے اور خوشیاں چار دیواری کے اندر ہر گوشے میں لوٹ پوٹ ہو رہی ہیں۔ ”بازگشت“ پڑھنے کے بعد دو سوال میرے ذہن میں آئے ہیں۔ کسی کی عزت سے کھیلنے کی سزا اپنی عزت کی پامالی ہے اگر یہ اصول نسل در نسل چلتا رہا تو یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ایسا فعل کرنے والا پہلے جرم سے پہلے معصوم ہوتا ہے، وہ کیوں اور کس گناہ کی پاداش میں گندگی میں اترتا ہے۔ ثمرہ اور اس جیسی لڑکیاں کس لغزش کی وجہ سے ظلم و بربریت کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ یہاں بھی مردوں کے کرتوت عورتوں کو بھگتانے پڑے۔ اس ناانصافی کی کیا توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ”اونچی ناک“ جیسے ڈرامے بار بار دیہاتوں میں کھیلے جاتے ہیں لیکن ان واقعات نے رلا دیا ہے۔ اسے ضد، انا اور بدبختی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ رضیہ معمولی غلطی کے باوجود معصوم لڑکی تھی، کچی عمر تھی، سیدھی راہ دکھانے اور اونچ نیچ سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ کسے کیا خبر تھی کہ معمولی رقعہ کی ابتداء سے جنم لینے والا قصہ اتنی تباہی پھیلائے گا کہ اثرات اگلی نسلوں تک منتقل ہو جائیں گے۔ غصے کو قابو رکھ کر متبادل حل بھی نکالا جا سکتا ہے۔ جب دیکھنے والی آنکھ بند ہو جائے تو کس نے دیکھنا ہوتا ہے کہ غیرت کے نام پر کتنے ایوارڈ مل رہے ہیں جو سزا خاندان کے دوسرے لوگوں نے بھگتی وہ کس کے کھاتے میں ڈالی جائے گی؟ ”ملمع“ میں صفدر کو اتنی رعایت دی جا سکتی ہے کہ وہ نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا اس کے والدین قصوروار ہیں جو اس کے جرائم پر پردہ ڈالتے اور دوسروں کو قربانی کا بکرا بناتے رہے۔ پھر اس پر نظر نہ رکھی، اسے اکیلا چھوڑ دیا۔ سوچنا چاہیے تھا کہ مرض دوبارہ حملہ آور ہو سکتا ہے۔

شمسہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی بدقسمت رہی کہ ساری سزائیں اکیلی جان کو بھگتنی پڑیں۔ یہ راز قدرت جانتی ہے کہ کوئی کیوں اور کیسے بے ضرر کردار رکھنے کے باوجود جلنے کڑھنے کے لیے چن لیا جاتا ہے اور کبھی قاتل بھی بڑھکیں لگاتے بظاہر مطمئن اور طویل زندگی جیتے ہیں یہاں انسانی ذہن کی سوچ بانجھ ہوجاتی ہے۔ ''مانوس اجنبی'' میں ماں نے کمال حکمت عملی سے بیٹی کو زمانے کے سرد گرد سے آگاہی دی ہے لیکن ایک عمر ایسی آتی ہے کہ نصیحت کرنے والے خوشیوں کے قاتل لگتے ہیں۔ ذہن میں ایسے باغیانہ خیالات جنم لے کر اودھم مچاتے ہیں کہ بندہ خود کو عقل کل سمجھتا ہے۔ جب ہوش آتا ہے تو دل کے سارے خوش نما موسم دستک دے کر اور خزاں کو ڈیوٹی سونپ کر لوٹ جاتے ہیں۔ تب ناپسندیدہ ماحول بھی سرپرائز کی صورت قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ جیت کے سارے پتے ہاتھ سے نکل چکے ہوتے ہیں۔''

☆ طاہرہ گلزار کا خط پشاور سے شامل ''ایک صفحہ'' یک ہستی پر چودھری خلیق الزماں کے بارے میں پڑھا جو میری پسندیدہ شخصیات میں سے ہیں۔ بہت مختصر لیکن جامع تحریر تھی۔ یہ سرگزشت کا احسان ہے کہ ہمیں اردو میں اتنے اچھے طریقے سے ایسے لوگوں کے بارے میں معلومات دیتا ہے میری ایک تجویز ہے۔ شاید کہ ادارے والے بھی متفق ہوجائیں کہ ''سراب'' کے ساتھ ساتھ ایک اور طویل سلسلہ بھی ہو یعنی دو، دو سلسلہ وار کہانیاں ہوں، بے شک سچ بیانیاں کم کرکے چار یا پانچ کرلیں۔ اب چلتی ہوں اپنے دوستوں کی محفل 'عشیر خیال' میں۔ پہلے نمبر پر انور عباس شاہ مبارکاں مبارکاں، بہت اچھا اور جامع تبصرہ آپ کے ایف آئی آر والی بات پر بہت ہنسی آئی ورنہ اس سے پہلے اپنے خط پر ادارے والوں کا تبصرہ پڑھ کر بہت غصہ آیا تھا۔ (خط لکھنا قلم کار کی پہلی سیڑھی ہے۔ خط میں الفاظ کا صحیح استعمال، کہانیاں لکھنے کا فن سکھاتا ہے) آپ نے ڈاکٹر روبینہ کو جو کہا میں اس سے متفق ہوں۔ نزابت افشاں! آپ کا تبصرہ مختصر لیکن بہت پیارا ہے۔ عبدالحکیم کا تبصرہ بھی مختصر لیکن اچھا ہے۔ حسب سابق عبدالجبار رومی اپنے جامع اور شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے لیکن اگر تو حیدی بھائی نے اپنے اصل اور سچے راز کھول دیے تو پھر گھر میں ان کی خیر نہیں ہوگی۔ رومی صاحب کچھ عرصہ پہلے دو تین صلاح الدین ایوبی پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہم سب نے مل کر پھانسی دی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حق آئے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ بھائی اب تو قیامت کی نشانیاں ہیں۔ نہ جانے کب زندگی کی شام ہوجائے۔ سیف اللہ بھی بہت جذباتی اور پُراثر تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ سدرہ ڈیئر! میں سلامت ہوں، اتنی جلدی آپ لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑنا۔ آپ کا شاندار اور جامع تبصرہ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ تمام عورتوں کو شیطان اور خاص کر ان گندے مردوں سے بچائے، آمین۔ محمد احمد رضا انصاری ویلکم بھائی۔ سرگزشت سے آپ کی محبت و پیار دیکھ کے اپنی دیوانگی پر بھی ہنسی آئی میں بھی دو تین بار رکشے میں جاکر پتا کرتی ہوں۔ قیصر خان بھی تبصرہ کے ساتھ شادی کا پیغام دینے بھی حاضر۔ بھائی آپ کو شادی سے کس نے روکا ہے یہ تو سنتِ رسولؐ ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ عزت و احترام سے رہو۔ تبصرہ اچھا لکھتے ہو۔ سید مسرت جبیں بھی فل سائز تفصیلی، جامع لیکن شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ کافی معلومات بھی دے گیا۔ بہت اچھے ویلڈن......! اویس شیخ کا پُرسوز تبصرہ مجھے یاد کرنے کا شکریہ۔ بہت اچھا لکھتے ہو۔ نجمی رحمٰن بھی اس بار پھر مختصر تبصرہ لے کر امریکا سے حاضر تھی۔ اعجاز بھائی ان ڈاک والوں کا کچھ علاج نہیں ہوسکتا۔ اس ملک کا کوئی بھی بندہ سدھرنا نہیں چاہتا لیکن دوسروں کو سدھرنے کی تلقین اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں آپ کا تبصرہ ہمیشہ سے سرگزشت کی شان ہے۔ آپ نے صرف سوال کیا آپ ہم سب دوستوں سے ناراض ہیں کہ تبصرے میں کسی دوست کا ذکر نہیں ہوتا؟ م۔ انور آف مردان آپ کی اتنی محبت کا شکریہ۔ بھائی میرا ابھی علاقہ چارسدہ ہے۔ ویلکم بخیر راغلے۔ سعید احمد چاند بھائی سب دوستوں کو ہائے اور مجھے بائے بائے۔ تبصرہ اچھا ہے۔ انور اعجاز خان بھائی میرے پاس کم از کم 20 یا 25 سرگزشت کی کاپیاں ہیں۔ آپ آکر مجھ سے لے جائیں۔ روبینہ نفیس سسٹر بھی حاضر تھی جاندار تبصرہ لے کر۔ ڈیئر ویلکم السلام علیکم! اب غائب مت ہوجانا اگر میں نے اپنی تکالیف اور اذیتیں بیان کیں تو آپ دوستوں اور ادارے والوں کے آنسو نہیں رکیں گے لیکن یہ زندگی ہے ہر حالت میں گزر ہی جاتی ہے۔ اب ہم کیا کرسکتے ہیں۔ مجبور جو ہیں۔ آخر میں ندیم اقبال صاحب کا محبت نامہ۔ ندیم اقبال صاحب آپ کا انداز مجھے آفاقی انکل اور مستنصر حسین تارڑ کے بعد بہت پسند ہے۔ آپ کی شکل بالکل میرے والد صاحب کی طرح ہے۔ بس وہ عمر میں آپ سے بڑے ہیں۔ اس بار آپ کی تحریر میں نے ''سراب'' سے پہلے پڑھی مجھے سرجی اور شہباز کی تو تو میں میں بہت پسند ہے۔ بلکہ سیدھے سادے سرجی تو بہت ہی پسند ہیں۔ اکثر باتوں میں ایسی سوئی لگا جاتے ہیں کہ بندہ تلملا جاتا ہے۔ صائمہ اقبال کے ''نومبر کی شخصیات'' میں وقار یونس، مشتاق محمد اور جون ایلیا میری پسندیدہ شخصیات ہیں۔ ساتھ میں اس بار موٹر سائیکل والے وزیر شیخ رشید بھی حاضر تھے۔ فلمی دنیا کی شخصیات میں سے شباب کیرانوی، شفیع محمد اور نیرہ نور بہت پسند ہیں۔ اس بار ''سراب'' شروع کی تو اتنی جلدی ختم ہوگئی کہ پتا ہی نہیں چلا۔ شہباز کی وہی ایکشن پہ ایکشن، اغوا پر اغوا، آخر شہباز بھی انسان ہے وہ بھی جذباتی ہوکر آخر ایک بڑا فیصلہ کر بیٹھا ہے۔ مرشد کا خاتمہ یا شہباز کی موت۔ یہ کہانی بس اب ایک یا دو قسطوں میں ہوگی کیونکہ اگلی کہانی کے اشتہار اور رائٹر کا یہ جملہ کہ ''اب اس کہانی کا خاتمہ کرنا ہی بہتر ہے لیکن کیسے کیا جائے اسی پر ہم غور کررہے تھے۔'' خاتمہ تو ہر چیز کا ہے لیکن ''سراب'' نے بتا دیا زندگی بھی کتنی بڑی ''سراب'' ہے۔ پہلی سچ بیانی ''انجام'' ایسوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ثمینہ ڈیئر! تم خوش قسمت ہو جو تمہیں اصغر جیسا شوہر ملا جو اس معاشرے میں ایک فیصد ہیں۔ دین محمد جیسے مردوں کی مثال کتے کے دم کی ہے۔ ان مردوں پر بھروسا اور اعتبار کرنا سانپ پر اعتبار کرنا ہے۔ دوسری سچ بیانی ''بازگشت'' زویا اعجاز کی تصویر کیا ہوا یہ تو مردوں کا حق ہے۔ دوسروں کی بہن بیٹیوں کی عزت سے کھیلنا اس وقت تو نومی کو اپنے مرد ہونے کا نشہ تھا کہ میں افضل ہوں عورت سے۔ بالے نے بہت اچھا کیا اس کی بیٹی سے انتقام لے کر کیونکہ اس کی بیٹی کوئی آسمان سے اتری نہیں تھی۔ تیسری سچ بیانی ہے ''اونچی ناک'' واہ

کیا مرد کی اونچی ناک ہے۔ ناک صرف ان مردوں کی ہے۔ یہ وہ گھٹیا معاشرہ ہے مردوں کا کہ یہاں ہر لمحہ ایک رضیہ غیرت کے نام پر مرتی ہے۔ لعنت ہے اس عورت پر جو ماں ہے اور اللہ سے بیٹے مانگتی ہے۔ یہ مائیں بیٹے نہیں بیٹیوں کے لیے درندے پیدا کر رہی ہیں۔ چوتھی کہانی ''ملمع'' ڈیئر شمسہ شکر کرو کہ اپنی جاب کر رہی ہوں۔ یہ دنیا ساری صفدر اور جاوید جیسے خود غرضوں سے بھری ہے۔ یہ گھٹیا مرد عزتوں کو لوٹنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ پانچویں سچ بیانی ''مانوس اجنبی'' وہی شوبز کی کہانی، ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ چندا ہو یا پری ہو یا چاندنی۔ عزت عورت کی ہی پامال ہوتی ہے مرد کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چھٹی سچ بیانی ''خطا'' اکثر لوگ نہ سمجھے۔ قلم نگری میں انور فرہاد کی تحریر ''غلط فہمی'' بہت زبردست تحریر ہے۔ میری انور فرہاد صاحب سے التجا ہے کہ وہ گوندا اور ان کے والدین پر کچھ تحریر کریں۔ شاہد لطیف کی تحریر ''بولتے مجسمے'' پڑھتے پڑھتے ایسا لگا کہ میں ان افریقیوں پر بنی کوئی انگلش مووی دیکھ رہی ہوں۔ اچھی تحریر ہے۔ مجھے ایسی تحریریں بہت پسند ہیں۔ یہ براعظم افریقا اب بھی بہت اسرار رکھتا ہے۔ سلمیٰ اعوان کی تحریر ''شہزادی گل'' بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر ہے، ویلڈن۔ سلمیٰ اعوان زور قلم تیز تر ہو۔ ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر ساجد امجد لے آئے ایک زبردست اور معلوماتی تحریر ''اشکِ رواں''۔ پڑھ کے بہت معلومات حاصل کیں۔ اب آخر میں پھر ایک بار اپنے پرانے تبصرہ نگاروں سے آنے کی درخواست پلیز واپس آجائیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بھائی جاوید سرکانی، رضا حکیم نقوی، بھائی رانا سجاد، رانا محمد شاہد، تفسیر عباس بابر وغیرہ۔''

☆انور عباس شاہ کا اشاریہ دریا خان بھکر سے۔ ''مشہرِ خیال'' میں نظر دوڑائی تو خود کو کرسی صدارت پر براجمان پایا، بے حد خوشی ہوئی۔ عبدالجبار رومی انصاری، طاہرہ گلزار اور اویس شیخ کے تبصرے دل موہ لینے والے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ! لگتا ہے اب پابندی سے حاضری دیا کریں گی۔ قیصر خان حاضر تھے اور محکمہ پولیس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ خان صاحب Police کا جو لفظ ہے یہ مخفف ہے یعنی یہ مکمل لفظ نہیں ہے اس کا مکمل لفظ ہے P سے Polite یعنی نرم خو، O سے Obedient یعنی اطاعت گزار ہونا، L سے Loyal یعنی وفادار ہونا، i سے Inteligent یعنی ذہین ہونا، C سے Courteous یعنی خلیق وخوش اخلاق ہونا اور E سے Efficitent یعنی مستعد ہونا۔ اب آپ خود ہی بتائیں کیا یہ سب خوبیاں ہماری پولیس میں ہیں، ہاں اس کے برعکس ضرور ہیں۔ خانہ بدوشوں کے بارے میں سینہ زوری ایک دلچسپ تحریر تھی۔ خانہ بدوشوں کی کمائی کا یہ انداز کہ کسی سفید پوش آدمی کو پھنسا کر لے جانا پھر اس پر دھاوا بول کر سب کچھ اس سے ہتھیا لینا، بہت ہی بھیانک تھا۔ خداوند کریم ایسے لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، (آمین)۔ سرگزشت کا خاص تحفہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہر ماہ ہمارا دل موہ لیتی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ جب یہ مکمل ہو جائے تو مع تصاویر اسے کتابی شکل میں ضرور شائع کیا جائے۔ ہاتھوں ہاتھ بکے گی، انشاء اللہ۔ ندیم اقبال صاحب کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ اور نیک خواہشات۔ مشہور شخصیات کے حالات و زندگی کے بارے میں معلوماتی مضمون ''نومبر کی شخصیات'' حسبِ معمول بے حد دلچسپی سموئے ہوئے تھا۔ اس بار اس میں کچھ زیادہ شخصیات شامل تھیں۔ البتہ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد اس بار اس میں شامل ہونے سے رہ گئے کیونکہ ان کا انتقال 23 نومبر 1983ء کو ہوا تھا ویسے پچھلے سال ہم ان کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ''سراب'' نے تو اچانک کروٹ بدلی ہے اور بالکل نیا رخ اختیار کرلیا ہے۔ اب یہ دن بدن نکھرتی جا رہی ہے۔ نامعلوم مصنف جو بھی ہیں تہہ دل سے بہت بہت شکریہ اور نیک خواہشات۔ پچھلے دنوں ایک بک اسٹال پر مختلف رسالوں کے اوراق پلٹتے ہوئے جب ان کی قیمت پر ہماری نظر پڑی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ اکثر رسائل نوّے روپے اور ایک سو بیس روپے سے کم کے نہ تھے اور ان رسائل کا معیار بھی ہمارے سرگزشت سے بلند ہرگز نہ تھا۔ آپ نے تو اپنے رسائل کی قیمت ان کے مقابلے میں بہت ہی کم رکھ کے ہم سے کافی رعایت کی ہوئی ہے۔ خداوند کریم آپ کو جزائے خیر دے۔ ہم سرگزشت کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہیں۔''

☆سید مسرت حسین رضوی کا مکتوب کراچی سے۔ ''ابھی چند دن قبل 28 محرم بروز اتوار 30 اکتوبر کو دہشت گردوں نے ناظم آباد نمبر 4 کے ایک گھر کے اندر گھس کر فائرنگ کی جس میں پانچ افراد شہید ہو گئے۔ کوئی روکنے والا نہیں، یہ ظلم کب رکے گا کچھ پتا نہیں۔ جو شہید ہوئے ان کے گھر میں کہرام ہے۔ کس کے اشارے پر یہ سب ہو رہا ہے، یہ تباہی کیوں کی جا رہی ہے؟ اللہ رحم کرے۔ وطن دشمن اسلام کے دشمن اور انسانیت کے دشمن پاکستان کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھ سکتے۔ معراج رسول صاحب کی کہانی پڑھی، کچھ عجب نہیں کہ بھکاری اپنے پیٹ کی آگ کو سرد کرنے کے لیے تھپڑ کھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ ملنے والی روٹی پر گندگی نہیں ہوتی۔ دوسرے تھپڑ کی صورت میں شاید سالن کے ساتھ دیگر لوازمات بھی مل جائیں۔ رات گئے شادی ہال کے باہر بھی دیکھا گیا کہ شادی کی تقریب سے جو کھانا جس میں روٹی، بریانی، قورمہ، مچھلی، کھیر......! غرض طرح طرح کی خوراک کک حضرات پھینک دیتے ہیں، وہ سب کتے بلی کھاتے ہیں، ان کے پیٹ سے بھی جو بچ جاتا ہے وہ سڑتا رہتا ہے اگر یہی کھانا صفائی کے ساتھ جس میں ہڈی گندگی نہ ہو علیحدہ کرکے فقیروں کو جو نہ جانے کس کس طرح پیٹ کی آگ کو سرد کرتے ہیں، دے دیا جائے تو کیا یہ ثواب کا کام نہیں ہوگا؟ مگر کون سمجھے گا اور کون سمجھائے گا۔ معراج رسول صاحب کا درد سمجھ میں آ رہا ہے مگر ایک یا دس دردمند دل رکھنے والے کیا کرسکتے ہیں، نہ کرپشن رک سکتی ہے اور نہ کوئی آواز اٹھا سکتا ہے اور جس نے آواز اٹھائی وہ اکیلا ہی مارا جائے گا۔ بزم شہرِ خیال کے پروانوں میں اس دفعہ اضافہ ہوا ہے جس سے سرگزشت کی رونق بڑھ گئی ہے۔ ہر پروانے نے اپنی اپنی بساط کے مطابق تبصرے تحریر کیے ہیں جو

بہت پسند آئے۔ انور عباس، طاہر الدین، نزاہت افشاں، عبدالحکیم، عبدالجبار رومی، سیف اللہ، سدرہ بانو، طاہرہ گلزار، محمد احمد رضا، قیصر خان، اویس شیخ، نجمی رحمٰن، اعجاز حسین، ہم۔انور، انور اعجاز، محمد عامر، فقیر غلام حسین، روبینہ نفیس اور ندیم اقبال۔ ان سب پر داتوں کو پڑھا، بہت اچھا لگا۔ ''شہرِ خیال'' کی محفل میں اسی طرح خلوص اور آمد ہونی چاہیے۔ دیگر کہانیوں میں ''انجام'' بڑے دھیمے انداز و رفتار میں لکھی گئی مگر قابل توجہ تھی۔ ''بازگشت'' زویا اعجاز کی روداد نے بہت متاثر کیا۔ ماسٹر شکیل جیسے کردار کے لوگ اس لائق ہیں کہ سرِعام سنگسار کردیا جائے، ایسے دوستوں کو بھی نصیحت مل جائے۔ یہ دعا کرنا چاہیے بدکردار اور ذلیل ذہنیت کے لوگوں کو سرِعام سزا ملنی چاہیے۔ قدرت کا انصاف اپنی جگہ اٹل ہوتا ہے لیکن برائی میں بکھرے لوگوں کا احتساب بھی ضروری ہے۔ زویا اعجاز کی تحریر نصیحت آموز بھی ہے۔ ''اونچی ناک'' ارشد علی کی تحریر پڑھنے کے بعد شدید غم و افسوس ہوا۔ کچھ لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہورہی ہے۔ آج کے دور میں بھی ایسی شقی القلب ہستیاں موجود ہیں، یقین نہیں ہوتا اللہ ہم سب پر اور خصوصاً گاؤں دیہات میں رہنے والے اور اونچی ناک اور شملہ رکھنے والوں کو راہِ ہدایت دے، (آمین)۔ ''طمع'' شمسہ عالم کی کہانی دلچسپ تھی۔ اس سلسلے میں کیا کہا جائے شمسہ عالم کی فاش غلطی یہ تھی کہ وہ ہر دفعہ صفدر کے بلانے پر اکیلی جاتی رہی اور نقصان اٹھایا۔ شاید دوسری لڑکیاں اس غلطی سے عبرت حاصل کریں اور کسی کے بھی بلانے پر اکیلی کہیں نہ جائیں۔ ''مانوس اجنبی'' محمد فیاض ماہی کی تحریر وہ گھسی پٹی پرانی کہانی ہے جو آج بھی کہیں نہ کہیں لڑکیوں کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر تباہ کردی جاتی ہے۔ ''خطا'' آصفہ ضیاء احمد کی تحریر عبرت ناک رہی۔ شرافت جیسے کردار کے لوگ اسی طرح سے گھروں میں آگ لگا کر سب کچھ بھسم کردیتے ہیں۔ کہانی پُراثر تھی آنکھوں کو نم ناک کرگئی۔ ''تصویر'' سلیم خورشید کی تحریر اچھوتی تحریر تھی۔ تاثرات اور خوف پر مبنی پسند آئی۔ ''سینہ زوری'' ناظم بخاری کی روداد۔ ''بنجارے'' ہر شہر میں ملیں گے اور طرح طرح کے قصے ان کے نام سے مشہور ہیں۔ مطالعہ کے لیے پڑھیں۔ سلسلہ وار شائع ہوئی تھی۔ ''مداری'' اس میں ان بھکاریوں کی پوری روداد ہے۔ ''بھول'' نواز خان کی تحریر دلچسپ تھی مگر شروع سے آخر تک یاسر کے کردار پر جھنجلاہٹ اور غصہ آتا رہا لیکن آخر میں بات بن گئی، یہ بھی اچھی بات ہوئی ورنہ تو بچی صومی کی زندگی خطرے میں تھی۔ ''سراب'' نئی سلسلہ وار کہانی جنگ آزما کا اشتہار دیکھ کر خوشی ہوئی اور جب ''سراب'' پڑھی تو بہت جلدی قسط ختم ہوگئی جس سے اندازہ ہوا کہ اب شاید بہت جلد آخری قسط آجائے گی۔ ''فلم نگری'' اچھی چل رہی ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی شخصیات اچھا اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' یہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنے وطن کی خوشبو کہیں اور نہیں مل سکتی باہر جانے کے شوقین صرف پیسا دیکھتے ہیں لیکن وہاں جو تکالیف ہیں ان کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ دوسری طرف ملک کے اندرونی حالات بھی دن بدن بگڑتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے تقریباً ہر محبِ وطن شخص پریشان ہے۔ آئے دن کے ہنگامے، دھرنے، جلاؤ گھیراؤ......! اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ دشمن ملک تو انتظار میں ہے کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ پاکستان کو تنہا کردے مگر انشاء اللہ وطن عزیز پر ملک کا بچہ بچہ قربان ہو جائے گا پر ملک پاکستان پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا کیونکہ پاکستان کی سلامتی عزت وقار پر کوئی آنچ آئی تو پھر اسلام پر حرف آئے گا جو کوئی بھی پاکستانی نہیں چاہتا۔ اس پاکستان کو بنانے میں کیا کیا مشکلیں و مصائب جھیلیں اور قربانیاں دی گئیں۔ سب پر عیاں ہے یہی وجہ ہے کہ اتنا سب گنوا کر ہجرت کی، بھرا گھر لٹانے کے بعد اپنے پیاروں کو بھی کھویا تو اب کیسے اس پر حرف آنے دیا جائے گا، دشمن کا منہ کالا۔ یہ دشمن کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا جو وہ چاہتا ہے کہ پاکستان پر حملہ کرکے فتح کرلے یہ ناممکن ہے۔ وطن کا بچہ بچہ سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوگا اور دشمن منہ کی کھائے گا، (آمین)۔''

☆ رانا محمد شاہ نے بورے والا سے لکھا ہے۔ ''نومبر کے اداریے میں آپ نے صحیح لکھا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے مفادات میں جکڑے لوگ ہیں جب ایک کا مفاد پورا ہوجائے تو وہ اجتماعی مسئلے کا کیونکر سوچے گا۔ حمیت کا سونا اور کرپشن ہمارے اجتماعی مسائل ہیں مگر جب تک ہم اپنے انفرادی مسائل سے باہر نہیں آتے، ہم روٹی کے ساتھ سالن لینے کے لیے تھپڑ کھاتے رہیں گے۔ چوہدری خلیق الزماں کی جدوجہد پر مبنی مختصر سرگزشت دلچسپ رہی۔ گزشتہ ماہ خط نہیں پہنچا تھا۔ سدرہ بانو نا گوری کا بیٹی کی سالگرہ کے لیے مبارک باد اور دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں اور شوکت رحمان خٹک کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ گزشتہ دنوں ایک ہفت روزہ میں ان کی تصویر بھی نظروں سے گزری تھی۔ اس دفعہ ''شہرِ خیال'' میں انور عباس شاہ کرسی صدارت پر تھے۔ نزاہت افشاں کو نئے شمارے کے ساتھ پرانے بھی مل گئے، وہ کیسے؟ عبدالجبار رومی آپ نے کہا اور ہم نے ایک معلوماتی تحریر لکھ لی ہے بلکہ بھجوا بھی رہے ہیں۔ ''شہروں کے نام کیسے پڑے؟'' امید ہے پسند آئے گی۔ طاہرہ گلزار 10 فل اسکیپ صفحات کا تبصرہ لکھ لیتی ہیں۔ ہمت ہے آپ کی۔ ویسے ''شہرِ خیال'' کے 8 صفحات ہوتے ہیں۔ کوشش کریں کہ مختصر مگر جامع ہو تا کہ زیادہ سے زیادہ لکھنے والوں کو شرکت کا موقع ملے۔ قیصر خان بھائی! ''شہرِ خیال'' میں عامر سہیل اور سعید انور پر توجہ ہی مبذول کرائی جاسکتی تھی اور صائمہ اقبال بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اویس شیخ! آپ نے صحیح لکھا مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی وجہ سے زیادہ نقصان اٹھا رہا ہے۔ بھارتی فوجی ایک معصوم کشمیری بچے کے جنازے پر شیلنگ کرتی ہے اور دوسری طرف سعودی عرب یمن میں جنازے پر بمباری کرکے 100 سے زیادہ مسلمانوں کو شہید کردیتا ہے۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟ اعجاز حسین سٹھار! محکمہ ڈاک کا کیا کہیں کوریئر سروسز آنے کے باوجود اس محکمے میں بہتری نہ آسکی۔ حالانکہ مقابلہ بازی میں بہتری کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ''الفِ رواں'' پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اردو کے اتنے بڑے ادیب دال چاول بیچتے تھے۔ ان کا زندگی نامہ دلچسپ رہا۔ انور فرہاد فلمی شخصیات پر اچھا لکھ رہے ہیں۔ صائمہ اقبال نے نومبر کی اہم شخصیات کا ذکر کیا۔

شیخ رشید کی سالگرہ تو ہم نے ٹی وی پر دیکھ لی تھی۔ اپنے شہر سے تعلق رکھنے والے بورے والا ایکسپریس وقار یونس کے بارے میں کچھ معلومات درکار تھیں، شکریہ صائمہ۔ البتہ پاکستان کے دو عظیم کرکٹرز کی پیدائش بھی نومبر کی ہے، جس کا تذکرہ نہ تھا۔ ایک عمران خان اور دوسرا یونس خان۔ ندیم اقبال کے سفرنامے میں عید کے دن کے حوالے سے ان کا خصوصی تذکرہ پڑھا۔ کچھ یادیں بہت اداس کر دیتی ہیں۔ عید کے دن ماں کا یاد آنا۔ اس سے زیادہ کربناک لمحات کیا ہو سکتے ہیں۔ ندیم بھائی! جب میری والدہ حیات تھیں تو عید کی نماز کے بعد جب ہم گھر آتے تو اپنے سب بیٹوں کو گلے لگاتیں، ان کا ماتھا چومتیں بلکہ جب تک امی جان زندہ تھیں تو ساری اولاد کے اکٹھے عید کرنے کی وجہ بھی وہی تھیں۔ دو سال پہلے دسمبر کی 24 تاریخ کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ گویائی خدا دیتا ہے مگر بولنے کا طریقہ تو ماں ہی سکھاتی ہے۔ اپنے پڑھنے والے سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

☆ رضوانہ قریشی کی آمد راولپنڈی سے۔ ''علمی خزانہ سرگزشت عرصہ 20 سال سے پڑھ رہی ہوں۔ آپ کے تمام رسالے ہمارے بڑے بھی شروع سے پڑھتے آئے ہیں۔ ''جاسوسی'' سے ہم نے بہت سی الجھنوں کو حل کرنا سیکھا۔ ''سسپنس'' ہمیں آگے بڑھنے کا شوق دیتا ہے۔ ''پاکیزہ'' اچھی تربیت کا ذریعہ ہے اور ''سرگزشت'' کی خوبی یہ ہے کہ ہر مہینے ساری دنیا کی معلومات اکٹھا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ''اشکِ رواں'' شاعر کے دکھ، درد اور جدوجہد کی جو کہانی ہے اس کا ہر لفظ اشک میں ڈوبا ہے۔ آپ کی تاریخی، اسلامی یا کسی شاعر و ادیب یا موجدوں کی کہانیاں، آپ کی ہر کہانی شاہکار ہوتی ہے۔ انور فرہاد فلمی نگر سے انڈین جوڑے کی کہانی لے کر آئے۔ سمیتا پاٹل کو فوت ہوئے بہت سال گزر گئے ہیں لیکن ہمارے مصنف نے ان کے دکھ اور غم کو یاد رکھا۔ ''غلط فہمی'' لفظ ہی ایسا ہے جو ساری زندگی دکھ اور پچھتاوا دیتا ہے۔ ہمیں کوئی ایسا جملہ نہیں بولنا چاہیے جو کسی کے دل کو زخمی کر دے۔ جس طرح سمیتا پاٹل نے ایک ادھورے جملے پر اپنی جان دے دی۔ ''بازگشت'' زویا اعجاز نے اپنی کہانی میں ایک ہی بات پر زور دیا ہے جو بہت ہی اہم ہے کہ والدین کو بچوں کی طرف سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ ''ملمع'' شمسہ نے ایک دفعہ اس کے گھر جا کر خود ہی صفدر کو ڈھیل دی۔ دوبارہ بلانے سے اکیلی چلی گئی پھر تو یہ انجام ہونا ہی تھا۔ ''خطا'' آصف ضیاء کی کہانی میں ارمغان کی ایک خطا نے بہت سی خطاؤں سے دور کر دیا۔ ''اونچی ناک'' ارشد علی ارشد۔ ''تصویر'' سلیم خورشید۔ ''سینہ زوری'' ناظم بخاری۔ ان تینوں مصنفین نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ ارشد علی ارشد نے عورتوں پر ہونے والے ظلم کی دردناک تصویر بتائی ہے جو مرد اپنی جھوٹی عزت کی خاطر عورتوں کو مار دیتے ہیں، انہیں غیرت سے مر جانا چاہیے تاکہ راہ چلتے لوگ ان پر انگلیاں نہ اٹھائیں کہ فلاں کا باپ، بھائی یا شوہر جا رہا ہے۔ صرف عورت ہی کو اس جرم میں کیوں مارتے ہیں جو اس نے کیا ہی نہیں ہوتا۔ سلیم خورشید نے ایک نئے عنوان پر کہانی لکھی ہے کہ فیصل حیات نے رخشندہ کو ظالم باس سے چھٹکارا لانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور کامیاب ہو گیا۔ ناظم بخاری کی ''سینہ زوری'' میں عقیل نے کیا کیا جتن نہیں کیے کہ مجبور عورتوں کے بارے میں کچھ لکھے لیکن وہ ایک عورت سے دھوکا کھا گیا۔ اکثر کہانیاں مردوں کی برائی میں لکھی جاتی ہیں لیکن اس دنیا میں اچھے مرد بھی موجود ہیں جنہوں نے عورتوں کے ظلم کے خلاف اور ان کی آزادی کے لیے آواز اٹھائی ورنہ آج جو عورتیں انہیں برا کہتی ہیں۔ وہ ان کی برائی کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتیں۔''

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل نے ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھا ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں انور عباس شاہ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ طاہرہ گلزار پشاور آپ کا بہت شکریہ حوصلہ افزائی کے لیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہم سب کی اپنی محفل ہے اور رہے گی۔ جناب قیصر خان آف بھکر بھائی ہم ناراض بالکل نہیں تھے۔ ندیم اقبال صاحب سمیت تمام دوستوں کے تبصرے بے حد پسند آئے، شکریہ۔ اس دفعہ ''نومبر کی شخصیات'' میں وقار یونس، فواد، شیخ رشید، شفیع محمد شاہ وغیرہ کے بارے میں جان کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنٹو'' تو اس دفعہ کی قسط پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ اور کمال کی تھی۔ اس سفرنامے کو ہم سب بہت انجوائے کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کینیڈا کی گھر بیٹھے سیر بھی ممکن ہوئی۔ آپ بیتیوں میں ''انجام'' بہت سبق آموز آپ بیتی تھی۔ ''ملمع'' بہت زیادہ سبق آموز کہانی ہے۔ خاص کر عورت کے لیے۔ کبھی بھی کسی رشتے پر اس طرح اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ''مانوس اجنبی'' اچھی تحریر تھی اور خطا بھی۔ ''تصویر'' بہت منفرد کہانی تھی چونکہ میں خود ایک آرٹسٹ ہوں تو اس طرح کے عجیب و غریب آرٹسٹ کی انوکھی داستان سن کر اچھا بھی لگا اور حیرت بھی ہوئی۔ سینہ زوری بہت ہی زیادہ دلچسپ لاجواب کہانی ثابت ہوئی کیونکہ اس سے ملتا جلتا واقعہ ہمارے قصبے میں ہو چکا ہے۔ ''بھول'' میں یاسر کی ایک چھوٹی سی غلطی نے کیا کیا گل کھلا دیئے۔ یہ ہم سب کے لیے سبق آموز ہے۔ اللہ پاک سرگزشت کو صدا کامیابیاں عطا فرمائے، (آمین)۔''

☆ نزابت افشاں کی گہرافشانی مہورہ فتح جنگ سے۔ ''اداریہ حسب سابق سبق آموز تھا۔ ''اشکِ رواں'' بہت ہی آئیڈیل داستانِ حیات تھی۔ سچ ہے کہ محنت میں عظمت ہے۔ اردو ادب کی کئی معروف ہستیاں ایسے ہی گزر اوقات کرتی رہی ہیں۔ احسان دانش اس کی زندہ مثال ہیں۔ شہزادی گل، شمشال سے ٹورنٹو، سراب، بازگشت، ملمع، مانوس اجنبی، خطا، بھول بہترین کہانیاں تھیں۔ اس ماہ کی ٹاپ آف لسٹ کہانی انجام تھی اور دوسرے نمبر پر اونچی ناک واقعی آدمی اپنی جھوٹی عزت کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔ ''شہرِ خیال'' میں انور عباس شاہ کو صدارت مبارک ہو۔ عبدالجبار رومی، محمد احمد رضا انصاری، اعجاز حسین سٹھار بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ ندیم اقبال آف مشی گن! یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ۔

ڈاکٹر روبینہ نفیس ہماری پکار پر حاضر ہونے کا تہہ دل سے شکریہ۔ سعید احمد چاند، سید مسرت حسین رضوی، اویس شیخ آپ سے گزارش ہے کہ کہانی بھی لکھیں۔ طاہرہ گلزار آپی یاد کرنے کا شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری نے جس شعر کی صحیح کی ان کی صحیح بھی غلط ہے۔ اصل شعر یوں ہے۔ ’خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ☆ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے‘ یہ شعر معروف شاعر جناب امیر مینائی (1900۔ 1828) کا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ”کلیاتِ امیر“ آخر پر کہوں گا کہ سرگزشت کا موجود معیار بہت اچھا ہے۔ سرگزشت کی خوبی یہ ہے کہ اسے ہم سب گھر والے پڑھ سکتے ہیں۔ ایسا رسالہ اس وقت مارکیٹ میں صرف یہی ایک ہے۔

☆ سیف اللہ کا تبصرہ ملک وال سے۔ ”معاشرتی مسائل اجاگر کرنے کے لیے معراج رسول صاحب کا کہانی کی صورت میں لکھنا اچھوتا انداز ہے، جو کہ بہت اچھا لگتا ہے۔ چوہدری خلیق الزماں صاحب کی زندگی ایک صفحے کے مضمون میں پڑھی جو صرف سرگزشت کا خاصا ہے کہ جو کہانی 20 صفحے میں آتی اسے ایک صفحے میں بیان کر دیا۔ ”اشکِ رواں“ میں ساجد صاحب نے بتایا کہ اوپندر ناتھ اشک نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ ڈرامے، افسانے، تنقیدی مضامین، ناول خاکے لکھے۔ ڈھیروں ترجمے کیے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں اشک صاحب میں۔ محترمہ طاہرہ گلزار کے تبصرے بھرپور ہوتے ہیں۔ میں طاہرہ صاحبہ پر تنقید تو نہیں کر سکتا لیکن اگر طاہرہ صاحبہ یہ لکھیں کہ فلاں فلاں لوگ اپنے تبصروں کے ساتھ موجود تھے تو لفظ حاضر کی بجائے موجود پڑھتے وقت بھلا لگے گا (حاضر صحیح ہے، موجود غلط العام لفظ ہے)۔ سلمیٰ اعوان کے مضامین پُراثر اور گہرائی والے ہوتے ہیں۔ میرے جیسے اکثر سرگزشت پڑھنے والے اتنی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مضمون صرف سلیس اردو تک محدود رہے۔ وہاں کی مقامی زبان کے ڈھیروں الفاظ شامل نہ ہوں تاکہ قاری ان الفاظ میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ ”بولتے مجسمے“ افریقا تو ہے ہی پُراسرار اور سراسر پُراسرار۔ افریقا کے پس منظر میں لکھی گئی کوئی بھی تحریر ایسی ہی حیرت زدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ یہ تحریر واقعی حیرت زدہ کر گئی۔ انور فرہاد کی تحریر سابقہ تحریروں سے ہٹ کر تھی جو کہ اچھی لگی۔ ایسی تبدیلیاں قاری کو اچھی لگتی ہیں۔ انور فرہاد صاحب کو ایسے تجربے کرتے رہنا چاہیے۔ صائمہ اقبال ٹھیک جا رہی ہیں۔ ہر ماہ چند مشہور ہستیوں کے متعلق بتا کر پڑھنے والے کے علم میں اضافہ کر رہی ہیں کیونکہ ان ہستیوں میں مختلف شعبوں کے مشہور لوگ ہوتے ہیں۔ اب چلتے ہیں ندیم اقبال کی تحریر ”شمشال سے ٹورنٹو“ کی طرف۔ تمام پڑھنے والے اس سفرنامے کی تعریفیں ہی کر رہے ہیں سمجھ نہیں آ رہا ندیم اقبال صاحب کی اس طرزِ تحریر کی، کیا اور کن الفاظ میں تعریف کی جائے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ یہ سفرنامہ پڑھ کر جذبات میں ہلچل پیدا ہوتی ہے اور بقول شاعر ’عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ☆ یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا‘۔ اگر صحت اور عمر اجازت دے تو کب کے ندیم اقبال صاحب کے پاس بسلسلہ سیر پہنچ چکے ہوتے۔ اللہ ندیم اقبال صاحب کو صحت والی عمر دے اور ایسی تحریریں لکھنے کی توفیق دے، (آمین)۔“

☆ فقیر غلام حسین ضیاء نے بھکر سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت کے ’شہرِ خیال‘ میں حاضری قبول فرمائیے۔ اس شمارہ میں ناظم بخاری لودھراں نے ’سینہ زوری‘ کے عنوان سے خانہ بدوش بھکاریوں پر جو کیچڑ اچھالا ہے بلکہ ان کو بدنام کیا ہے اور نوجوان نسل کو بدکاری کا رستہ دکھایا ہے۔ بلاشبہ بخاری صاحب انعام کے مستحق ہیں۔ ماہنامہ سرگزشت ایک ادبی رسالہ ہے۔ بچے، بچیاں، چھوٹے بڑے سب اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ فحش نگاری سے گریز بہتر ہے۔ (دوبارہ سے ’سینہ زوری‘ پڑھی لیکن فحاشی نظر نہیں آئی۔ عام سا واقعہ ہے۔ جملے بھی درست نظر آئے)۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی آمد لاہور سے۔ ”معراج انکل نے ٹھیک آئینہ دکھایا ہے۔ کراچی میں ایک بار پھر ٹارگٹ کلنگ شروع ہوگئی ہے اور کرپشن بھی جوں کی توں ہی ہے۔ تحفظ فراہم کرنے والے ادارے تو جیسے اونگھ رہے ہیں۔ پتا نہیں ان میں کب کون بجلی بھرے گا۔ جانی مانی شخصیت چودھری خلیق الزماں کی زندگی کا احوال عمدہ رہا۔ انور عباس شاہ گلے شکوؤں کے ساتھ صدرِ محفل کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ تبصرہ اچھا لگا۔ مرزا طاہر الدین نے تو یہی شکایت درج کروائی اور تبصرہ؟ نزاہت افشاں اور عبدالحکیم کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ سیف اللہ، سدرہ بانو کی آمد بھی بینسٹ رہی۔ اوہ سویٹ بیسٹ فرینڈ طاہرہ جی دس فل اسکیپ لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ احمد رضا انصاری کو سرگزشت نہ ملا۔ اُف انتظار کے بعد تو صدمہ ہی ہوتا ہے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں آپ۔ ارے قیصر شادی نہیں ہوئی تو کر لیں ناں۔ مسرت حسین رضوی، اویس شیخ، اعجاز ستھار، نجمی رحمٰن، ام انور، سعید احمد چاند، افغانستان و کشمیر کا جغرافیائی تعین کرتے انور اعجاز خان محمد عامر ساحل، شعبدہ باز فقیروں کو عیاں کرتے فقیر غلام حسین، ہمت و حوصلہ لیے روبینہ نفیس انصاری موجود تھیں۔ ندیم اقبال مشی گن سے جو اپنے حوصلہ افزا ولولے کے ساتھ ’شہرِ خیال‘ کی محفل میں بھی اپنے قارئین کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ اوپندر ناتھ اشک اپنی زندگی میں مایہ ناز کارکردگی کا حامل رہا۔ ان کی سرگزشت ”اشکِ رواں“ کی صورت بہت عمدہ رہی۔ نومبر کی ڈھیر ساری شخصیات میں سے محمد حسن عسکری، وقار یونس بطور بورے والا ایکسپریس، جون ایلیا، پاکستان کے جیمز بونڈ شیخ رشید، شباب کیرانوی، نیرہ نور الغرض سب کی مختصر سرگزشت اچھی رہی۔ محبت کسی ایک علاقے کی میراث نہیں، یہ وہ پھول ہے جو کہیں بھی کسی کی بھی چاہت کی سیرابی سے سر اٹھا لیتا ہے اور یہی محبت ہمیں شمشال سے لے کر ٹورنٹو تک نظر آتی ہے جو پردیس میں ہو کر پھر اسی محبت سے گنگناتا ہے ’کاش آج میں پردیس میں نہ ہوتا‘ بہت عمدہ اور زبردست سفرنامہ ہے۔ جو بویا تھا وہی کاٹا زندگی میں پھر سکھ کا سانس نصیب نہ ہوا۔ جب نمرہ کی آواز گونجی تو نعمان عرف نومی کو اپنی ہی بازگشت سنائی دی لیکن اب کیا فائدہ جب کچھ بھی نہ بچا۔ دوسری سچ بیانی

بے راہ روی کا انجام لیے کچھ ایسی ہی بازگشت سنا رہی ہے۔ لمحے خطا کرتے ہیں اور صدیاں سزا پاتی ہیں۔ شرافت نے ایک خاندان تباہ کر دیا مگر ربیعہ کی سمجھداری نے شرافت کو کٹہرے میں لاکھڑا کیا اور جو خطا کی تھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ خاندانی رنجشوں پر مشتمل ''خطا'' عبرت انگیز اسٹوری تھی۔ پروردگار میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے بازوؤں میں سونا چاہتی ہوں۔ پہاڑوں کی شہزادی گل کی خواہش بھی پوری ہوئی اور پھر وہ اپنے شہزادے کی بانہوں میں ہمیشہ کے لیے سوگئی۔ شہزادی گل کی کہانی بہت دلچسپ اور خوبصورت لگی۔ دوسری عورت کتنی ہی خوبصورت ہو لیکن اپنی بیوی اپنی ہی ہوتی ہے۔ یہ سب سمجھنے کے لیے یاسر کو اچھے خاصے پاپڑ بیلنا پڑے تھے اور تبھی صوفی کا آپریشن بھی کروا سکا اور پیو اور زینی بھی اپنے انجام کو پہنچے۔ سچی بیانی ''بھول'' بھی ڈرامائی انداز لیے بہترین رہی۔ فلم نگری میں بہت حساس لوگ ہوتے ہیں جن کی اندرونی کہانیاں جانے کیسے کیسے موڑ لیتی ہیں۔ کہیں غلطی ہو جاتی ہے تو زندگی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے جیسے سمیتا پاٹل کی سرگزشت پڑھ کے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ''بیت بازی'' کے زبردست مقابلہ بازی میں نسرین مشتاق، مہناز فتح، رعنا حیات محمد اور فہد علی حمید عمدہ جواب کے ساتھ حاضر تھے۔''

☆ شاکر لطیف لکھتے ہیں۔ ''اس سے پہلے لاہور کے ڈائجسٹ میں میری کہانیاں تواتر کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ آپ کو پہلی بار کہانی پوسٹ کر رہا ہوں جواب ضرور دیجیے گا۔ حصہ دار کے نام سے ایک کہانی پوسٹ کی ہے۔ علیحدہ سے خط لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ضرور شائع کریں۔''

☆ سعید احمد چاند نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''نومبر کا پرچہ ملا۔ سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس سحر طراز حسینہ کی مسکراہٹ دل پر اثر کر گئی۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا۔ بھکاری بچے اور روٹی سالن کی حکایت سمجھ داروں کے لیے ایک پیغام تھا۔ اس کے بعد یک قلمی داستان میں چودھری خلیق الزماں کا احوال پڑھا۔ ان کے نام سے تو سبھی واقف تھے مگر اتنی تفصیل سے آگاہی نہ تھی۔ اس دفعہ کرسی صدارت پر انور عباس شاہ بھکر والے براجمان تھے۔ لگتا ہے ڈاکٹر روبی بھکر والی کی ازدواجی زندگی میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں جنھیں بے چاری صفحہ قرطاس پر لاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہی ہیں کیونکہ انہیں اپنی نجی زندگی بھی سنبھال کر رکھنی ہوتی ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ گاہے بگاہے ''معبر خیال'' میں نظر آجاتی ہیں۔ اس کشمکش میں وہ ہمیں نظر انداز کر گئیں۔ خیر کوئی بات نہیں جب دل ہی غموں سے چھلنی ہو تو کیا پرانے کیا نئے کہاں نظر میں رہتے ہیں۔ بہرحال میری طرف حوصلہ مندی پر مبارک باد قبول کریں یہ غموں بھری رات بھی سپیدہ سحر میں ڈھل جائے گی۔ شوکت رحمٰن خٹک کے پیروں کا درد تو اب اکثر پاکستانیوں کا مزاج بن چکا ہے۔ طاہرہ گلزار ڈاکٹر ''معبر خیال'' میں اکثر نظر آتی ہیں۔ شمیم آراء کے انتقال پر افسوس ہوا وہ بھی ایک زمانے میں سپر اسٹار تھیں۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ''سراب'' اچھی جا رہی ہے۔ مرزا طاہر الدین بیگ کا تبصرہ بہت مختصر تھا۔ نزاہت افشاں مہورہ فتح جنگ کا بھی تبصرہ مختصر تھا مگر کیا خوب تھا۔ عبدالحکیم کراچی شیمم آراء کے لیے ہم بھی اتنا ہی افسردہ ہیں جتنے آپ ہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری، شمیم کا بیٹا لائق تحسین ہے جس نے اپنی ماں کو آخری وقت سہارا دیا۔ سیف اللہ ملک وال، رشوت ستانی کے میں بھی خلاف ہوں۔ محمد احمد رضا انصاری ''شمشال سے ٹورنٹو'' دلچسپ تحریر ہے۔ قیصر خان بھکر! آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ سید مسرت حسین رضوی، کراچی! شمیم آراء پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ اویس شیخ ٹوبہ ٹیک سنگھ، آپا کا طویل تبصرہ پسند آیا۔ بجی رحمٰن، امریکا! قائداعظم کی کیا بات ہے۔ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل! روبینہ نفیس انصاری کا محکمہ ڈاک سے شکوہ بے جا ہے۔ م انور، باڑی چم ہوتی مردان۔ تبصرے قریباً سب ہی اچھے ہیں۔ ثمینہ اصغر کا ''انجام''، زویا اعجاز کی ''بازگشت''، ارشد علی ارشد کی ''اونچی ناک''، شمسہ عالم کا ''طمع''۔ محمد فیاض ساہی کا ''مانوس اجنبی'' آصفہ ضیاء احمد کی ''خطا''، سلیم خورشید کی ''تصویر'' ناظم بخاری کی ''سینہ زوری'' نواز خان کی ''بھول'' کہانیاں قریباً سب ہی اچھی ہیں۔ سرگزشت واقعی مبارک باد کے قابل ہے کہ اس میں چھپنے والا مواد معیاری رہتا ہے۔ ڈاکٹر روبی کے چٹ پٹے خط کا منتظر ہوں۔''

☆ رضا احمد اعوان کی دریا خان بھکر سے خیال آفرینی۔ ''کافی عرصہ بعد ''معبر خیال'' میں حاضر ہوں۔ امی کے انتقال کے بعد بھری دنیا میں، میں تنہا رہ گیا ہوں۔ پچھلے دنوں شدید پریشانی اور ڈپریشن کی وجہ سے خواب آور گولیاں مقدار سے زیادہ کھالیں جس کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔ ایک مخلص دوست نے بروقت اسپتال پہنچایا۔ نومبر کا سرگزشت میرے سامنے ہے۔ یک قلمی سرگزشت میں ''مجاہد سیاست'' چودھری خلیق الزماں کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ فلم نگری میں ''غلط فہمی'' کے عنوان سے دو معروف فلمی ہستیوں کے اہم گوشے بے نقاب ہوئے۔ سمیتا پاٹل میری پسندیدہ اداکارہ تھیں۔ ان کے متعلق تھوڑا بہت اخبارات میں پڑھا تھا لیکن بہت زیادہ انور فرہاد صاحب نے آگاہ کیا ہے۔ وحید مراد کے متعلق بھی جلد تفصیلی حالات سے آگاہ فرمائیں۔ سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' واقعی منفرد انداز کا سفرنامہ ہے جسے قاری پڑھتے ہوئے خود کو رائٹر کے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس وقت چونکتا ہے جب بقیہ آئندہ لکھا ہوا آتا ہے اور پھر سارا مہینا اگلا رسالہ آنے تک بے چین رہتا ہے۔ ندیم اقبال کی گرفت شروع سے آخر تک رہتی ہے۔ بلاشبہ وہ تعریف کے حق دار ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''اشکِ رواں'' او چندر ناتھ اشک پر خاصے کی چیز تھی۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''دیپ جلے گا'' اور ''کھویا ہوا پربھا منڈل'' پڑھ چکا ہوں۔ ''نومبر کی شخصیات'' میں فلمی و سیاسی ستارے چھائے ہوئے تھے۔ محمد حسن عسکری، جون ایلیا، شباب کیرانوی، شفیع محمد شاہ پرویز ملک، نیرہ نور، غلام مصطفیٰ جتوئی اور شیخ رشید کے بارے میں معلومات پسند آئیں۔ صائمہ اقبال بڑی محنت کر رہی ہیں جس کی وجہ سے اس سلسلے کو پسند کیا جا رہا ہے۔ ''بیت بازی'' اچھا جا رہا ہے۔ ذہنی آزمائش پر انعام دینے کی بجائے ''بیت بازی'' پر انعام دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ نزاہت افشاں،

ثنایت تبسم اور اصغر علی کے اشعار خوب تھے۔ زویا اعجاز کی ”بازگشت“ بہت اچھی کہانی تھی۔ ”ملمع“ اور ”مایوس اجنبی“ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ بلبتہ ”تصویر“ درمیانے درجے کی کہانی رہی۔ قسط وار نئی کہانی ”جنگ آزما“ کا شدت سے انتظار ہے۔ ”مشہر خیال“ میں آپا طاہرہ گلزار، سید سرت حسین رضوی، قیصر خان کے تبصرے خوب تھے۔ انور شاہ کی کمی محسوس ہوئی۔ نفیس بھائی کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔“

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری نے کوٹ ادو سے لکھا ہے۔ ”معراج رسول کی چند لائنوں کی تحریر نے دکھی کر دیا۔ یہی تو ہو رہا ہے ہر طرف۔ ہم لوگ غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ پاک نے امیر غریب امتحان کے لیے بنائے ہیں۔ امیروں کے مال پر غریبوں کا بھی حق ہے مگر ہم لوگ خوشی خوشی اس حق کو بھی اپنا حق سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔ بوجھل دل لیے ”مشہر خیال“ میں پہنچے تو یقین کریں مجھے بہت خوشی ہوئی کہ سب نے مجھے یاد رکھا اور میرے آنے پر سب نے خوش آمدید کہا۔ انور عباس مجھ سے گلہ کرتے نظر آئے۔ آپ کا گلہ بجا ہے مگر حالات ایسے رہے کہ چاہتے ہوئے بھی میں ”مشہر خیال“ میں شامل نہ ہو سکی۔ ثاقب کی طبیعت تو بہت پہلے سے ٹھیک ہو گئی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ انور صاحب میرے شوہر کا نام نفیس نہیں ہے محمد ثاقب ہے۔ دوسرا یہ کہ میرا کوئی کلینک یا جاب نہیں ہے۔ میں نے صرف ہومیو ڈاکٹر کی تعلیم حاصل کی ہے بی اے کے بعد۔ میری ڈاکٹری کی سند الماری میں پڑی ہے۔ بس ڈاکٹر بننے کا شوق تھا سو پورا ہو گیا۔ میں آپ سے بہت معذرت کرتی ہوں انشاء اللہ اب اس محفل میں آتی رہا کروں گی۔ عبدالجبار رومی آپ نے پکارا ہم چلے آئے۔ اس بار تبصرہ مختصر نہیں ہے خوش ہو جائیے۔ سدرہ بانو میرے آنے پر اتنی خوش ہیں کہ مجھے شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں کیوں غائب رہی۔ طاہرہ گلزار نے میری آمد پر اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔ او میرے پیاروں اتنا پیار، ہائے میں مر جاواں گڑ کھا کے۔ شکر ہے کوٹ ادو سے احمد رضا کا تبصرہ شائع ہوا تو بہت خوشی ہوئی کہ میرے کوٹ ادو سے بھی کوئی لکھ رہا ہے مگر جناب اس بار میں بھی کوٹ ادو آئی ہوئی ہوں اور یقین جانیے بہت خوشی ہو رہی کہ بہت عرصے بعد کوٹ ادو سے تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ قیصر خان صاحب اتنی عزت دینے کا شکریہ کہ میری وجہ سے ”مشہر خیال“ میں آئے اور ہاں میں اب آتی رہا کروں گی تو اب ہر ماہ خوش ہوا کریں۔ اعجاز حسین صاحب کیا کریں کہ بہت سی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں، کیا کریں تبصرہ بھیجنا محکمہ ڈاک کی ذمہ داری ہے جو یہ لوگ پوری نہیں کرتے۔ میرے اختیار میں ہو تو خود اڑ کر ادارے میں تھما آؤں خط۔ پر ہائے یہ مجبوری۔ یہ موسم اور یہ دوری ا ندیم اقبال پر میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ جیسے بڑے رائٹر کی حوصلہ افزائی پسند آئی۔ آپ خوب لکھ رہے ہیں۔ تبرک کے طور پر آپ کا سفر نامہ پڑھ رہی ہوں۔ اور سناؤ مسلمانو! کیسے ہیں سب لوگ خوش خوش رہا کریں سب...... کہ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ کہانیوں میں ثمینہ اصغر کی ”انجام“ نے متاثر کیا۔ شک کا جن تو سب کی گردن پر سوار رہتا ہے۔ اس شک نے نہ جانے کتنے گھر برباد کیے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والوں کا مقصد بھی یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سے دوسرے سبق حاصل کریں۔ ”اونچی ناک“ ارشد علی ارشد کی تحریر نے دل و دماغ ہلا کر رکھ دیئے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں بند کر لیا ہو۔ محبت کرنے والوں کے گن بھی گاتے ہیں اور محبت کرنے والوں کو ذلیل کر کے اذیت بھری موت بھی دیتے ہیں۔ میں مانتی ہوں بے حیائی ٹھیک نہیں مگر سچی محبت کرنا تو کوئی عیب نہیں۔ محبت ہی تو ہے جو انسان کو انسان کی اہمیت اور رشتوں کی صحیح پہچان کرواتی ہے سچی محبت کرنے والے کبھی بھی غلط قدم نہیں اٹھاتے۔ تو یہ اتنا ظلم ......! رہی سہی کسر ”ملمع“ نے پوری کر دی۔ انسان اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ اسے اپنے پرائے کی پہچان بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو عقلِ عظیم عطا فرما کر خوشیوں بھری زندگی عطا فرمائے، آمین۔ باقی کہانیاں زیرِ غور ہیں۔“

☆ سید محمود حسن نے جعفر طیار، کراچی سے لکھا ہے۔ ”امید ہے کہ آپ سب ایڈیٹر و اسٹاف خیریت سے ہوں گے۔ میں ماہنامہ سرگزشت کا پرانا قاری ہوں اور اس کا اعلیٰ معیار اور بہترین تحریریں ہمیشہ ہی متاثر کرتی ہیں اور معلومات میں اضافے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ایک سچ بیتی ”پچھتاوا“ بھیجنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ہے تو مختصر سی لیکن ہمارے معاشرے کی سچی کہانی ہے اور سبق آموز بھی ہے اگر قابلِ اشاعت ہو تو شائع فرما دیں، نہایت خلوص کے ساتھ ماہنامہ سرگزشت ڈائجسٹ کی ترقی و کامرانی کے لیے دعا گو ہوں۔“

☆ خالد قریشی نے کوئٹہ سے لکھا ہے۔ ”اپنی تحریر ”این گونگ کا آدم خور“ کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ کچھ عرصہ مصروفیات کی بنا پر تحریر و تحقیق کا سلسلہ منقطع رہا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ شکاریات کے موضوع سے تعلق رکھنے والی اس تحریر کا تانا بانا کینیا کے ایک ٹاؤن سے ہے۔ ٹاؤن کا نام این گونگ ہے اور علاقہ چائے کی وسیع کاشت پر مشتمل ہے۔ میرے محدود مطالعے کے مطابق سرگزشت وہ واحد ماہنامہ ہے جو اس موضوع کی مختصر سہی لیکن کبھی کبھار اشاعت پر توجہ دے رہا ہے۔ میں آپ کی اس ادبی خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تجویز دوں گا کہ اس سلسلے کو مستقل کر دیجیے تاکہ مجھے بھی ہر ماہ لکھنے کا موقع میسر آ سکے۔ امید کرتا ہوں میری تجویز آپ کو پسند آئے گی۔ (آپ فون کریں تاکہ صحیح رہنمائی کی جا سکے)۔“

تاخیر سے موصول خطوط: راشد ایاز، نوشین ملک، فہیم الدین شیخ، کلیم احمد (کراچی)، نگار سلطانہ (لاہور)، عنایت علی انجم (مانسہرہ)، وسیم الدین (حیدر آباد)، عباس علی (سکھر)، کاوش عباسی (ہالا نیو) بادشاہ خان (ڈی آئی خان)، محمد کلیم (پشاور)، حسین چنگیزی (کوئٹہ)۔

سکندرِ ثانی

ڈاکٹر ساجد امجد

ماہ و سال کے محور پر گردش کرتے کرتے 100 قبل مسیح کی صدی تھک چکی تھی۔ انقلابات و انکشافات، محاربات سے دنیا کی تاریخ بدل رہی تھی مگر اس پیرزال دفتر نظم و نسق ہنوز سرگرم تھا۔ تعمیر و تخریب میں اضافے ہورہے تھے۔ نئی نئی قدریں ابھر رہی تھیں۔ اتنی ہی ڈوب رہی تھیں۔ سینکڑوں مر رہے تھے تو ہزاروں پیدا ہورہے تھے۔ وجود عدم سے ہستی میں آیا اس وقت شاید ہی کسی کو احساس ہو کہ اس گندی سی بستی میں جنم لینے والا یہ بچہ اقوام عالم کی نئی تاریخ مرتب کرے گا۔ آدھی دنیا پر اپنا پرچم لہرائے گا اور اس کا خاتمہ ایسا دردناک ہوگا کہ رہتی دنیا تک لوگ اس کو بطور استعارہ استعمال کریں گے۔

ایک فاتح کے دردناک انجام پر منتج ہونے والی داستانِ حیات

صبورا کی بستی کے ایک نسبتاً آباد محلے کے چند گھروں کی کھڑکیاں چند لمحوں کے لیے کھلیں۔ کچھ مخصوص نعرے بلند ہوئے اور پھر کھڑکیاں بند ہوگئیں۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ان گھروں میں سے کسی ایک میں بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ ایسی کھڑکیاں اکثر کھلتی اور بند ہوتی رہتی تھیں۔ کسی نے دھیان بھی نہیں دیا کہ ننھے مہمان کی آمد کس گھر میں ہوئی ہے۔ تیسرے دن صرف اس گھر کی کھڑکیاں کھلتی تھیں جس گھر میں ولادت ہوتی ہے لیکن کچھ دیر بعد ہی طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص "سیزر" کے گھر کی بالائی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اہل محلّہ نے دکھ اور افسوس کے ساتھ ان کھڑکیوں کو دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو نومولود پیدا ہوتے ہی چل بسا یا آپریشن کرکے بچے کو ماں کے پیٹ سے نکالا گیا ہے کیونکہ ایسی پیدائش کے نتیجے میں بچے کی ماں کا بچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لیے کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں۔ میت والے گھر کی کھڑکیاں کھول دی جاتی تھیں۔ رومن کہاوت تھی جو بیٹا ماں کے پیٹ کو پھاڑ کر پیدا ہوتا ہے وہ دنیا میں ممتاز مقام حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کی ماں اپنی جان کی قربانی دے کر اس کے لیے ایک خصوصی طاقت حاصل کرتی ہے۔ محلے کی عورتیں خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس گھر کی طرف چل دیں۔ راہ گیران کھڑکیوں کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے رک جاتے تھے اور پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔

محلے کی عورتیں اس گھر میں داخل ہوئیں۔ انہیں کسی تکلف کے بغیر "اورلیا" (زچہ) کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سرکاری اسپتال کی بڑی نرس دو ڈاکٹروں کے ساتھ ابھی ابھی اپنا کام مکمل کرکے باہر نکلی تھی۔ یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ اورلیا کے پاس اسپتال تک جانے کا وقت نہیں تھا۔ اس کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹروں کو آنا پڑا اور تھوڑی دیر کے لیے اس کمرے ہی کو چھوٹا سا آپریشن تھیٹر بنانا پڑا۔

اورلیا بے ہوش تھی۔ عورتوں نے اس کی حالت پر ترس کھایا اور عقیدے کے مطابق آئندہ ممتاز مقام حاصل کرنے والے بچے کی طرف اشتیاق سے دیکھا جسے ایک نرس نہلانے کے لیے لے جانے ہی والی تھی یا پھر نہلا کر لے آئی تھی اور اب اسے ایک خاص عقیدت کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ بچے کا قد لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ رنگ گورا تھا۔ سر پر بال بہت کم تھے اس کے چہرے پر سب سے زیادہ پرکشش اس کی سیاہ اور بڑی آنکھیں تھیں۔ بال اتنے کم تھے کہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پیشانی چوڑی ہے یا تنگ۔

''اورلیا کی حالت کیسی ہے۔'' ایک عورت نے نرس سے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے اسے کچھ ہی دیر میں اسپتال لے جانا پڑے یا پھر کل۔''

''ابھی کیوں نہیں۔''

''پیٹ کو ابھی سیا گیا ہے اور اسپتال دور ہے۔ مسٹر سیزر بھی ابھی تک گھر نہیں پہنچے ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر یہ سب کیسے ہوسکتا ہے۔''

''بے چاری اورلیا۔ اپنے بیٹے کے لیے جان کی قربانی دے دی۔ اب کیا بچے گی بے چاری۔'' عورتوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔

اس کے بعد عرصے تک اس گھر کی کھڑکیاں نہیں کھلیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اورلیا بچ گئی۔ وہ نہ صرف بچ گئی بلکہ اس بچے کی پیدائش کے پچاس سال بعد تک زندہ رہی۔

والدین نے اس بچے کا نام گائیس رکھا لیکن تاریخ میں جولیس سیزر کے نام سے مشہور ہوا۔ ہر رومن اپنے قبیلے کا نام اپنے نام کا حصہ بناتا تھا لہٰذا جولین قبیلے سے تعلق رکھنے کے باعث جولیس اس کے نام کا حصہ بنا۔ اضافی نام بھی شامل کرنا رومنوں میں عام تھا۔ باپ کا نام بھی اضافی ناموں میں شامل کیا جاتا تھا لہٰذا اس کے نام کا آخری حصہ اس کے باپ ''سیزر'' کا نام تھا۔ یوں وہ جولیس سیزر ہوگیا۔

جولیس سیزر کی پیدائش سے بہت پہلے روم شہر انتہائی کشادہ، عمدہ عمارتوں، فیشن ایبل دکانوں اور کھیلوں کے میدانوں سے مزین تھا۔ رومیوں کو تفریح کے بہت سے مواقع میسر تھے۔ کلوزیم (اسٹیڈیم) میں جنگی لڑائیاں اور جنگلی جانوروں سے مقابلے ہوتے تھے۔ دو جنگجوؤں کے درمیان خونی مقابلہ بڑا مقبول تھا۔ لوگ اس مقابلے کو بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ رتھوں کی دوڑ بھی معروف تھی۔ تھیٹر کی روایت عام تھی۔ رومیوں کی ایک اور تفریح کا ذریعہ حمام ہوا کرتے تھے۔ حمام میں جانا اور نہانا رومیوں کی عادت تھی۔

200 قبل مسیح میں روم دنیا کا سب سے بڑا اور گنجان شہر تھا۔ ابتدا میں رومی قوانین لکھے ہوئے نہیں تھے لہٰذا 400 ق م میں 12 کانسی کی تختیوں پر قوانین لکھے گئے اور انہیں شہر کے وسط میں کھلی جگہ پر رکھ دیا گیا تاکہ ہر شخص ان کو پڑھ سکے۔ ان قوانین کی ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ عورتوں کو چاہیے وہ بالغ ہی کیوں نہ ہوں بچوں کی کیٹگری میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان قوانین کے علاوہ قدیم روایات کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔

ان سب کے باوجود یہ بھی حقیقت تھی کہ شہر میں سب اچھا نہیں تھا۔ چند طاقتور خاندانوں کے پاس بے پناہ دولت تھی لیکن غریبوں کی کثرت تھی جو مایوسی کی زندگی گزار رہے تھے یا امیروں کو گلیوں اور بازاروں میں لوٹتے تھے۔

روم میں عزت و توقیر کے لحاظ سے قدیم خاندانوں میں فے بی ان، کارنی لین اور جولین (جس سے جولیس سیزر کا تعلق تھا) بڑے اعلیٰ وارفع تسلیم کیے جاتے تھے۔

جولین خاندان کا شمار نہ صرف اشرافیہ میں ہوتا تھا بلکہ رومن طاقت کا محور بھی سمجھا جاتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خاندان بھی اعلیٰ و ادنیٰ طبقات کی سیاسی کشمکش کا شکار ہوا اور وکٹورین ایرا جیسے پوش علاقے کو چھوڑ کر روم شہر سے کچھ فاصلے پر مضافاتی بستی صبورا میں رہنے پر مجبور ہوئے (جولیس سیزر یہیں پیدا ہوا اس چھوٹی سی بستی میں تاجر، طوائفیں اور بیرونی لوگ بشمول یہودی رہتے تھے۔)

صبورہ کی بستی یقیناً جولین خاندان کے شایان شان نہیں تھی۔

سیزر کی پیدائش (100 ق۔م) تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کا باپ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ آرمی سروس اور رومن روایات کی بناء پر اسے اپنے بیٹے سے بھی ملنے کے مواقع بہت کم میسر آتے تھے اور وہ 85 ق م میں ایشیائے کوچک میں اسی نوکری کے دوران مرگیا۔

جب اس کا باپ نہیں مرا تھا اس وقت بھی اس کی ماں ہی اس کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنی رہی۔ وہ گھریلو معاملات کو سلجھانے، غلاموں کی نگہداشت اور دیگر گھریلو مصروفیات کے باوجود سیزر اور اس کی بہنوں کی تعلیم و تربیت پر بھرپور

توجہ دیتی تھی۔

سیزر کا باپ کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا لیکن پھر بھی اتنا تھا کہ گھر میں غلام اور خدمت گار موجود تھے اور لیا اپنے بچوں کو آزادی اور تفریح کے پورے مواقع فراہم کرتی تھی۔ سیزر کی بہنیں گڑیوں کو کپڑے پہناتیں اور گڑیوں کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے فرنیچر سجاتی تھیں۔ سیزر خود بھی بھس بھرے جانوروں، گھومنے والے لٹوؤں، چھوٹی گھوڑا گاڑیوں، گیندوں اور بورڈز پر کھیلی جانے والی گیمز کھیلتا۔ ذرا بڑا ہوا تو ہم سائے کے بچوں کے ساتھ جھولا جھیلنے نکل جاتا۔

صہورہ ایک پسماندہ بستی تھی لیکن اس میں کئی پرائیویٹ اسکول تھے۔ اس کے والدین نے خوب اچھی طرح غور کیا اور اسے اسکول بھیجنے کی بجائے اس کے لیے پرائیویٹ ٹیوٹر کا انتظام کردیا۔ اس استاد نے اپنی تعلیم مصر کے شہر اسکندریہ سے حاصل کی تھی اور وہ یونانی اور لاطینی طرز خطابت کا ماہر تھا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح سیزر نے بھی تاریخی اور ادبی حوالوں کو حفظ کیا جن میں تاریخی بارہ ٹیبل بھی شامل تھے۔ ان بارہ ٹیبل میں روم کے بنیادی قوانین کو ترتیب دیا گیا تھا۔

جسمانی تعلیم سیزر کی تربیت کا ایک بنیادی حصہ تھی لیکن یہ یونانی طرز تعلیم سے مختلف تھی۔ ایتھنز کے نوجوان اپنے کھیل کھلی جگہ میں کھیلتے تھے لیکن رومن اس طریقہ کار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک زیادہ قابل عمل تربیت وہ تھی جو جنگ میں کام آسکے۔ رومن طالب علم لڑائی کا فن سیکھتے تھے۔ گھڑسواری کرتے تھے، دریائے ٹائبر میں تیرنے کی مشق کرتے تھے۔

سیزر گھڑسواری کا ماہر تھا اور گھوڑے کی ننگی پشت پر اپنے ہاتھ پیچھے کر کے سواری کرتا تھا۔

وہ جب تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کر چکا اور عملی زندگی کی طرف راغب ہوا تو اس نے ایک ایسے روم کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا جو شورشوں اور پے چیدگیوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف روم کے اٹلی جیسے اتحادیوں کے پے چیدہ تعلقات تھے تو دوسری جانب اندرونی شورشیں بھی کچھ زیادہ ہی خطرناک اور تباہ کن تھیں۔ قونصل "سُلا" فرار ہو گیا تھا اور اس کی جگہ "سینا" Cinna نے لے لی تھی اور رومن سلطنت کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس وقت کا روم Cinna اور Sulla کے درمیان شٹل کاک بنا ہوا تھا۔ سُلا مفرور تھا اور کسی وقت بھی واپس آسکتا تھا۔ Cinna روم کا حکمران بنا ہوا تھا۔

"سینا" نے حکمران بنتے ہی "فلے مین" (بڑا پادری) کو اس کے عہدے سے محروم کردیا۔ اس کی جگہ نئے پادری کو لانا تھا جس کی تلاش جاری تھی۔ ظاہر ہے اس عہدے کے لیے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو معاشرتی زندگی سے خود کو منقطع کر کے ان ہزار ہا رسومات اور توہمات کی زندگی گزار سکیں جو قدیم زمانہ سے رائج تھیں۔ انہی دنوں سیزر بھی عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ اس کے باپ نے اس عہدے کے لیے اسے راغب کیا۔ اس وقت سیزر کی عمر سولہ سال تھی۔ یہ عمر ہرگز اس لائق نہیں تھی کہ خود کو معاشرتی زندگی سے الگ کر لیا جائے لیکن باپ نے اسے سمجھایا۔ "ایک مرتبہ نظام مملکت کا حصہ بن جاؤ۔ اس کے بعد کوئی اور راستہ اختیار کر لینا۔"

"میرا مستقبل تو فوج ہونا چاہیے تھا۔"

"میں نے کہا نا کچھ روز اس عہدے پر رہنے کے بعد کوئی اور راستہ اختیار کر لینا۔"

سیزر اس قربانی کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ہزاروں درخواستوں کے جواب میں اس کا انتخاب ہو گیا۔

وہ سینیٹ کے اجلاسوں میں پادری کی حیثیت سے شامل ہوا۔ وہ صہورہ جیسی گندی بستی میں پل کر جوان ہوا تھا۔ روم کی گندی گلیوں کی خستہ حال زندگی سے بخوبی آشنا تھا۔ سینیٹ کی چمک دمک اور خوش حال زندگی کو دیکھتے ہی اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آئندہ چل کر سیاست میں حصہ ضرور لے گا تاکہ غریبوں کی نمائندگی کر سکے۔

اس عہدے کا سب سے بڑا نقصان اسے اس وقت اٹھانا پڑا جب اسے منگنی توڑنی پڑی۔ اس کی شادی جس لڑکی سے طے ہو چکی تھی وہ طبقہ اشرافیہ سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ قاعدے کے مطابق یہ لڑکی بڑے پادری کے عہدے پر فائز شخص سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اسے یہ منگنی توڑنی پڑی لہٰذا سیزر کو اس وقت کے حاکم Cinna کی بیٹی Cornelia سے منسوب کردیا گیا۔ یہ اس کی ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ اسی سال اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے گھر کا سربراہ مقرر ہوا۔ یہ اس کا دوسرا اعزاز تھا۔

حاکم Sulla کو ایشیا کوچک میں یونٹس کے حاکم متھری ڈیٹس کے خلاف جنگ کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

اس کے روانہ ہوتے ہی Cinna نے اپنی فوجوں کی مدد سے روم پر قبضہ کرلیا تھا۔

Sulla نے ایتھنز پر قبضہ کرنے کے بعد میتھری ڈیٹس کو اپنی شرائط پر صلح کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اب اسے روم پر قبضہ کرنے کے لیے روم کی طرف پلٹنا تھا۔

وہ جیسے ہی روم واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ Cinna کی اپنی فوجیوں کے ہاتھوں موت واقع ہو گئی ہے۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ رومن دنیا کا مالک بن گیا فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے نام کے ساتھ بادشاہ کا لفظ نہیں تھا۔ اس نے حاکم بنتے ہی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا طریقہ نکالا۔ ان تمام افراد کی ایک فہرست تیار کی جنھیں وہ موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا اور اسے ایک کھلی جگہ پر آویزاں کردیا۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا کہ قتل کرنے والے کو ایک بڑی رقم انعام کے طور پر اور مرنے والے کی جایداد اسے دے دی جائے گی۔ اس طرح ہزاروں افراد قتل کردیے گئے۔ ان میں ہر وہ آدمی شامل تھا جس کا تعلق Cinna سے رہا تھا۔

Sulla کی اصلاحات میں سے ایک ان عہدے داروں کی صفائی بھی تھی جنھیں Cinna نے مقرر کیا تھا۔ اس فہرست میں سیزر بھی شامل تھا لیکن Sulla اپنے کردار کے برخلاف سیزر کے معاملے میں خاصا ہمدرد ثابت ہوا۔ اس نے اس کے قتل کے احکام صادر نہیں کیے صرف اتنا مطالبہ کیا کہ وہ Cinna کی بیٹی کو طلاق دے دے۔

یہ مطالبہ اس نے سیزر کے علاوہ دوسروں سے بھی کیا تھا جس جنرل سے یہ مطالبہ کیا تھا اس نے پورا کیا تھا۔ جنرل پومپی نے بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی لیکن سیزر نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کردیا۔ اس کے اس انکار پر پورا روم ششدر رہ گیا۔ صرف ششدر رہنے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حیرتوں کے پہاڑ تو اس وقت ٹوٹے جب اس کا نام بھی موت کے گھاٹ اتار دیے جانے والی فہرست میں شامل کر کے فورم پر آویزاں کردی گئی۔

اب سیزر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ فرار ہوکر اپنی جان بچائے۔ اس نے راتوں رات روم چھوڑا اور اٹلی کی طرف واقع پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ یہاں بھی اس احتیاط سے چھپا کہ ہر رات اپنی جگہ تبدیل کرلیتا تھا تاکہ جاسوسوں سے محفوظ رہ سکے۔ ایک رات وہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں تھا کہ گرفتار ہوگیا۔ خوش قسمتی سے سیزر کے کئی بااثر حمایتی روم میں موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر چرچ سے وابستہ تھے۔ مذہبی طبقہ اتنا بااثر تھا کہ ان کی بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی متعدد بار کی درخواستوں کے بعد Sulla نے سیزر کو روم میں رہنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس نوجوان میں ہزاروں دشمن چھپے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

سیزر نے معافی ملتے ہی فوج میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ طاقت کا شائق تھا اور یہ طاقت اسے فوج میں رہ کر ہی مل سکتی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اب روم میں سول ادارے کمزور ہوتے جارہے ہیں اور فوجی عمل دخل بڑھتا جارہا ہے۔ وہ پہلے پہل رومن ایشیا فوج میں شامل ہوا۔ اس وقت یہ فوج مارکس تھرمس کی سربراہی میں ایک یونانی جزیرے کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ روم کے خلاف میتھری ڈیٹس کی بغاوت کا یہ آخری مقام تھا۔

یہ جزیرہ اتنا طویل تھا کہ محاصرہ پورا کرنے کے لیے مزید جہاز درکار تھے۔ تھرمس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے ایشیائے کوچک کے شمال میں واقع سلطنت Bithania کا خیال آیا۔ یہ سلطنت روم کی اتحادی تھی اور اس کا بادشاہ نکومیڈس تھا جس نے اتحادی ہوتے ہوئے روم کی فوج کی بہت کم مدد کی تھی۔ اس سفارتی مہم کے لیے چرب زبان سیزر ہی مناسب تھا۔ تھرمس نے اسے نکومیڈس کے پاس بھیجا کہ اسے اتحادی ہونے کا احساس دلائے اور اسے مجبور کرے کہ محاصرے کے لیے جہاز روانہ کرے۔

سیزر کے لیے نادر موقع تھا۔ اس مشن کی کامیابی میں اس کی ترقی پوشیدہ تھی۔ محاصرے کی کمان بھی تھرمس نے اس کے ہاتھ میں دے دی۔

19 سالہ سیزر جو ابھی شباب کی منزلیں طے کر رہا تھا جس کی خوب صورتی و رعنائی کے چرچے بھی ہو رہے تھے۔ اس مہم پر روانہ ہوا۔

کسی کو یقین نہیں تھا کہ نکومیڈس کچھ مدد کرسکے گا لیکن سیزر نے اس سے ایک بحری بیڑہ حاصل کر ہی لیا۔ یہ اس کی بہت بڑی جیت تھی لیکن اس جیت نے اس کے ماتھے پر بدنامی کا داغ بھی لگا دیا۔ اس کے دشمنوں نے مشہور کردیا کہ وہ نکومیڈس کا معشوق بن گیا ہے۔ کسی غیر فطری تعلق کی بدولت ہی وہ بحری بیڑہ حاصل کرسکا ہے۔ اس کے اپنے فوجی اسے پیچھے چوری نکومیڈس کی ملکہ کہتے پھر رہے تھے۔ ایک دن وہ محاصرے کی حالت دیکھنے گھوڑے پر سوار چلا جارہا

تھا کہ کسی نے چھپ کر ملکہ نکومیڈس کی آواز لگائی۔ آواز لگانے والا نظر نہ آیا لیکن سیزر غصے سے پاگل ہو گیا اس نے اس غصے کے عالم میں قصبے (میٹی لین) پر بھرپور حملہ کر دیا۔ شہریوں نے اپنا بھرپور دفاع کیا لیکن سیزر کی فوجیں شہر کو تباہ کرتی ہوئی سیزر کی سربراہی میں شہر میں داخل ہو گئیں۔

یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ اس خبر نے روم تک پہنچتے پہنچتے جشن کی صورت اختیار کر لی۔ نوجوان سیزر کی اس کامیابی نے رومن افواج کا سر بلند کر دیا۔ اسے سوک کراؤن سے نوازا گیا۔ شاہ بلوط کے پھولوں سے بنا ہوا یہ تاج دیکھنے میں شاید اتنا قابلِ دید نہ ہو لیکن اس نے سیزر کو دوسرے فوجیوں کے مقابلے میں منفرد مقام عطا کر دیا۔ اس تاج کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی تھی جب سیزر کسی رومن جشن میں داخل ہوتا اور تمام لوگ حتیٰ کہ سینیٹرز بھی اس کے اعزاز میں اٹھ کھڑے ہوتے۔

اس بہادری کے صلے میں اس نے اپنی عمر کے تین سال بحری قزاقوں کے خلاف بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر مہمات میں گزارے، یہاں لاتعداد چھپے ہوئے غار تھے جس میں بحری قذاق اپنے اغوا کردہ جہازوں کو چھپاتے اور منافع بخش اغوا برائے تاوان کا کاروبار چلاتے تھے۔ وہ ان مہمات میں مصروف تھا کہ اسے Sulla کی موت کی خبر پہنچی۔ یہ خبر بھی پہنچی کہ باا‌ثر سیاستدان مرحوم حاکم کی جگہ لینے کے لیے رسہ کشی میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے پر بازی لینے کے لیے بے قرار ہیں۔ ان میں سب سے آگے Sulla کا پرانا ساتھی لیپی ڈس تھا۔ اس نے بغاوت کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھ سیزر کو بھی ملانا چاہا۔ سیزر پر اس کے بہت سے احسانات تھے۔ اسے یقین تھا کہ سیزر اس کی بات مان لے گا۔ سیزر کو ایک انتہائی عہدہ بھی آفر کیا لیکن اس موقع پر سیزر انتہائی زیرک سیاست داں ثابت ہوا۔ اس نے محتاط طریقے سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ لیپی ڈس کی بغاوت ناکام ہو گئی اور سیزر اس میں شمولیت سے دور رہنے کی وجہ سے سیاسی طور پر محفوظ رہا۔

اس نے دو مقدمات کی پیروی کر کے رومن دنیائے قانون میں قدم رکھا۔ پہلا مقدمہ مقدونیہ کے سابق گورنر کے خلاف رشوت کے الزام پر مبنی تھا۔

وہ یہ مقدمہ ہار گیا لیکن اس کے دلائل اور تقریر اس قدر کامیاب تھی کہ حکومت نے اگلے سال ایک اور مقدمے کی پیروی اس کے سپرد کر دی۔

ان دونوں مقدمات میں اس کا زورِ خطابت دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فنِ خطابت میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لیے Rhools جزیرے پر یونانی فنِ خطابت کے ماہر اور سسرو کے استاد اپالونس سے تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جزیرہ ایشیائے کوچک میں سمندر کے جنوب مغربی ساحلی علاقے پر واقع تھا اور تعلیم کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ عظیم یونانی فلسفی اور سائنس داں یہاں لیکچر دیتے تھے۔

وہ آنکھوں میں مستقبل کا خواب سجائے سمندر کے سینے پر رواں دواں تھا کہ چیخوں اور شور کی آواز سن کر وہ اپنے کیبن سے باہر آیا اور یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی جہاز قذاقوں کے قبضے میں آ گیا ہے اور پھر اس وقت شک کی گنجائش نہیں رہی جب وحشی قذاق سامنے آ گئے اور اس وقت کے مروجہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر جہاز پر سوار تمام افراد کو قیدی بنا لیا۔ ان قذاقوں نے ان قیدیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ مضبوط اور توانا لوگوں کو جہاز کھینچنے کے لیے بطور مزدور رکھ لیا۔ ذرا کم محنت والوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے کے لیے رکھ لیا اور جو لوگ اہلِ ثروت دکھائی دے رہے تھے ان سے رہائی کے بدلے میں کثیر رقوم کا مطالبہ کیا۔ سیزر اپنے بیش قیمت لباس ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ روم کے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بحری قذاقوں نے اس کی رہائی کے لیے بیس ٹیلنٹ کا مطالبہ کیا۔ یہ رقوم 20 فوجیوں کی تنخواہ کے برابر بنتی تھی۔ سیزر نے اس رقم کو اپنی توہین قرار دیا اور اس رقم کو 50 ٹیلنٹ تک بڑھا دیا۔

”میرے ساتھیوں کو قریبی شہر ملیٹس تک جانے دو تاکہ مطلوبہ رقم کا بندوبست کریں۔“

”اگر یہ واپس نہ آئے؟“

”تم مجھے قتل کر دینا۔“

”ہم زندگی بھر ان کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتے۔“

”صرف ایک ماہ کافی ہوگا۔“

اس کے چند ساتھی روم کے مفتوحہ شہر ملی ٹیس چلے گئے۔

اب سیزر قیدی تھا اور دو غلام اس کے ساتھ تھے۔ قذاق ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ قیدی خوف کی حالت میں قذاقوں سے رحم کی بھیک مانگتے تھے لیکن سیزر تو ایسا ہشاش بشاش تھا جیسے یہ قذاق اس کے قیدی ہوں۔ ان سے ڈرنے کی بجائے بات بات پر انہیں ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ جب وہ نشے میں بہت زیادہ شور مچاتے تو

اپنے غلام بھیج کرانہیں چپ کروا دیتا۔ قذاقوں کو پیغام پہنچا کہ ان کا آقا آرام کر رہا ہے۔ شور مچا کر اسے پریشان مت کرو۔

وہ ان کے ساتھ کم و بیش چالیس روز رہا اور ان پر حکمرانی کرتا رہا۔

قذاقوں کو تاوان کی رقم مل گئی۔ انہوں نے سیزر کو رہا کر دیا۔ وہ جس شان سے رہ رہا تھا اسی شان سے رخصت ہوا اور ہنستے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ الوداع کہا۔ ”میں ایک دن واپس آؤں گا اور تم سب کو قتل کروں گا۔“

”تم بہت اچھا مذاق کر لیتے ہو۔“ قذاقوں نے کہا اور ان کے بے ہنگم قہقہے سیزر کا دور تک پیچھا کرتے رہے۔

سیزر نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ ملی ٹیس پہنچا اور وہاں کے کچھ مقامی جہازیوں اور فوجیوں کو اکٹھا کر کے فوری طور پر بحری قذاقوں کے مرکز پر پہنچا۔ اس کے اس اچانک حملے نے بحری قذاقوں کو حیران کر دیا۔ بہت سے قذاقوں کو بے دھیانی کے عالم میں پکڑ لیا گیا۔ سیزر نے تاوان کی رقم واپس حاصل کی اور تمام قذاقوں کو گرفتار کر کے ایک قریبی شہر میں لے گیا۔ وہاں کا رومن گورنر دوسرے شہر گیا ہوا تھا چنانچہ سیزر نے تمام قذاقوں کو جیل میں ڈال دیا اور گورنر سے مل کر ان مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کی درخواست کی۔ گورنر نے سیزر کی رپورٹ کو دیکھا اور مشورہ دیا کہ ان قذاقوں کو سزا دینے کی بجائے غلاموں کے طور پر فروخت کر کے اپنے لیے منافع حاصل کرے۔ سیزر نے گورنر کے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور گورنر کے حکم کی پروا کیے بغیر تمام قذاقوں کو جیل سے نکالا اور فوری طور پر پھانسی پر لٹکا دیا۔

سیزر ابھی قذاقوں کے قضیے سے نمٹ رہا تھا کہ اسے میتھری ڈیٹس کے خلاف جنگ میں کودنا پڑا۔ روم کے صوبائی گورنر کی طرف سے میتھری ڈیٹس کی بغاوت کا جواب انتہائی بے دلی سے دیا جا رہا تھا۔ سیزر نے اس بغاوت کو دبانے کے لیے سینیٹ کی منظوری کا انتظار بھی نہیں کیا اور ایشیائے کوچک کے گورنر کی اجازت کے بغیر ہی میتھری ڈیٹس کے خلاف کارروائی کر کے انہیں اتحادیوں سمیت صوبے سے باہر نکال دیا۔

وہ ابھی اس مہم میں مشغول تھا کہ اس کی عدم موجودگی ہی میں اسے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر روم میں پونٹی فیکس کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس میں تمام پادری اس کی نگرانی میں کام کرنے کے پابند تھے اور ان کا کام سرکاری مذہبی تقریبات کا انتظام کرنا اور حکومت کی معاونت کرنا تھا۔ اس عہدے کا حامل شخص کسی بھی سیاسی عہدے کے لیے منتخب ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ میدان جنگ میں فوج کی قیادت بھی کر سکتا تھا۔

اس عہدے پر فائز ہوتے ہی یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔

اس خبر کے سنتے ہی وہ ایشیائے کوچک سے پہلے یونان پہنچا اور پھر بحیرہ ظلمات کے ذریعے اٹلی پہنچا۔ یہ ایسی شوریدگی کا زمانہ تھا کہ اٹلی پہنچتے ہی اسے ایک نئی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بغاوت اسپارٹیکس نامی ایک شخص کی طرف سے کی گئی تھی۔ جنوبی اٹلی میں موجود غلاموں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو گئی۔ سینیٹ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے چند ہزار فوجیوں پر مشتمل دو فوجیں یکے بعد دیگرے روانہ کیں لیکن دونوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد سینیٹ نے مارکس کراسس کو جو روم کا امیر ترین شخص تھا اس جنگ کا کمانڈر مقرر کیا۔ اس جنگ میں اسپارٹیکس مارا گیا۔ اس کے بچے کھچے فوجی جنوب کی طرف بھاگ گئے جہاں پومپی پہلے سے موجود تھا۔ جنرل پومپی نے ان سب کو روک کر قتل کر دیا۔

تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ اس نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا یا نہیں لیکن واپسی پر روم کے لوگوں نے اسے ملٹری ٹرائبون کے طور پر منتخب کر لیا تھا۔ اب وہ باقاعدہ سیاسی کیریئر اختیار کر سکتا تھا اور روم کی امیر ترین اشرافیہ کا حصہ بن چکا تھا۔

اس موقع پر پومپی نے خوب طاقت پکڑ لی اور سیزر کو اسپین بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسپین روانہ ہوتا اس کی خالہ کا انتقال ہو گیا لیکن بوڑھی عورت کا خاوند اور بیٹا مر چکے تھے اس لیے سیزر پر لازم تھا کہ وہ اس بوڑھی عورت کی تجہیز و تکفین اس کے مقام و مرتبے کے مطابق کرے لیکن اس کے شوہر ماریس کے لیے حکمران نیک جذبات نہیں رکھتے تھے اس لیے ایک ابھرتے ہوئے سینیٹرز کے لیے ضروری تھا کہ وہ احتیاط سے کام لے لیکن سیزر نے بڑی دلیری سے غیر متوقع قدم اٹھایا۔ وہ تجہیز و تکفین کی صبح ایک جلوس کے ساتھ اس مقام پر پہنچا جہاں سیاست داں تقریریں کیا کرتے تھے۔ وہ خود ماریس کا مجسمہ اٹھائے ہوئے تھا حالانکہ حکومت نے ماریس کے مجسموں کی عوام میں تشہیر پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی تقریر میں ماریس اور اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کیے۔

خالہ کی موت کے بعد سیزر کو ایک اور زخم لگا کہ اس کی نوجوان بیوی سات سالہ بیٹی کو چھوڑ کر مر گئی۔ سیزر راجح چکا تھا لیکن اسے اپنا مستقبل عزیز تھا۔ اس نے بیٹی کو اپنی ماں کے پاس چھوڑا اور خود اسپین روانہ ہو گیا جہاں اسے خزانے کا انتظام سنبھالنا تھا۔

وہ اسپین کی طرف روانہ ہوا جہاں اسے گورنر کے ماتحت کام کرنا تھا۔

اسپین پہنچ کر اسے انتہائی مشکل کام دیا گیا کہ وہ مقامی لوگوں کے پاس جا کر ان کے مقدمات سنے اور ان کے تنازعات کو ختم کرے۔ وہ لوگوں کے پاس جاتا اور ان کے مسائل سنتا۔ اگرچہ یہ کام بڑا پیچیدہ تھا لیکن اس کام نے سیزر کو موقع فراہم کیا کہ وہ جان سکے کہ صوبوں کے لوگوں کو روم سے کیسی کیسی شکایات ہیں۔ اس نے اپنے کام کو آسان بنانے کے لیے لوگوں سے راہ و رسم استوار کیے اور اپنے دوستوں میں اضافہ کیا۔

وہ ایک قریبی جزیرے میں ایک مقدمہ سننے گیا ہوا تھا کہ ہرکولیس کا مندر دیکھنے کے لیے پہنچ گیا۔ وہ جیسے ہی مندر میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے الیگزینڈر دی گریٹ کا مجسمہ دیکھا جو تیس سال کی عمر میں دو صدی پہلے مر چکا تھا۔ سیزر کی اس وقت عمر تقریباً تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اپنا موازنہ الیگزینڈر سے کیا۔ اس کی عمر بھی تیس سال ہو گئی تھی لیکن وہ کیا بن سکا تھا۔ گورنر کے ماتحت کام کرنے والا ادنیٰ Questor۔ مجھے کچھ اور بننا ہے۔ الیگزینڈر کی طرح عظیم طاقت کا مالک ایک بڑے فاتح۔

اس پر ایسا غلبہ طاری ہوا کہ اس نے اپنے عہدے کا مقرر کردہ عرصہ مکمل ہونے سے قبل ہی اسپین چھوڑ دیا اور روم پہنچنے کے لیے شمالی اٹلی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک مقام ''پو'' کی وادی میں پہنچا۔ یہ زرخیز زمینوں کی سرزمین تھی جہاں 400 سال سے ایک قوم Cel آباد تھی۔ اس خطے میں بہت ساری رومن کالونیز تھیں۔ خصوصاً پو کے جنوب میں تقریباً تمام قصبے اور اراضیات بیس سال پہلے رومن شہریوں کو دے دی گئی تھیں لیکن دریا کے شمال میں واقع گال کو مکمل طور پر رومن تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایک بری صورتِ حال تھی اور کسی وقت بھی مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ ان غیر مطمئن لوگوں کی پشت پناہی کر کے اپنے کیریئر کو آگے بڑھائے گا۔ اس دن کے بعد سے اس کی تمام قوتیں کچلے ہوئے طبقے کی سرپرستی کرنے میں صرف ہونے لگیں۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے شاہراہ Appian کے محافظ کے طور پر رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ یہ شاہراہ نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ یہ سڑک بندرگاہ تک جاتی تھی اور تمام فوجیں اس سے آتی جاتی تھیں۔ اس نے قصبوں میں ٹرانسپورٹ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت سی رقم ادھار لی اور ان علاقوں میں زبردست پذیرائی حاصل کر لی۔

وہ تمام کام نہایت پلاننگ سے کر رہا تھا اور ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب سینٹ میں بل پیش ہوا کہ بحری قذاقوں کی سرکوبی کے لیے کسی ایک شخص کو مقرر کیا جائے جس کے پاس بے پناہ اختیار ہوں اور وہ خزانے سے جتنی چاہے رقم نکلوا سکے۔ اس بل کے پیچھے جنرل پومپی تھا کیونکہ اسے توقع تھی کہ یہ کام اس کو سونپا جائے گا۔ سینیٹ میں موجود طاقت ور پاپولسٹ نے اس بل کی مخالفت کی۔ سیزر بھی پاپولسٹ تھا لیکن اس نے خلافِ توقع اس بل کی حمایت کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس بل کے حق میں کھڑا ہونا جنرل پومپی اور رومن شرفا کو مستقبل میں اس کا ہم نوا بنا دے گا۔

دوسرے سینیٹرز نے بل کی زبردست مخالفت کی لیکن بالآخر جنرل پومپی کو کامیابی مل گئی۔ اس نے اختیارات ملتے ہی چالیس دنوں کے اندر اندر سمندر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سمندری قذاقوں سے پاک کر دیا۔ پھر وہ نئی فتوحات کے لیے روانہ ہو گیا۔ آرمینیا کو پار کیا۔ پہاڑی قبائل کو زیر کر کے یروشلم تک پہنچ گیا۔

سیزر اس دوران خاموش نہیں رہا۔ اس نے اپنے ہمنوا پیدا کیے اور Aedile منتخب ہو گیا۔ اس عہدے کا حامل شخص ایک سال کے لیے روم کا محافظ ہوتا تھا۔ وہ روم کی گلیوں اور مندروں کی مرمت کا کام کرتا تھا لیکن جو چیز طبقہ اشرافیہ کے فرد کو متوجہ کرتی تھی وہ پبلک فیسٹی ول کا انتظام تھا۔ سیزر اپنی شہرت اور طبقہ اشرافیہ کے دلوں کو جیتنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کو تیار تھا۔ اس نے شاہی خزانے سے قرض لیا اور ایسے فیسٹی ول منعقد کرائے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھے تھے۔

یہ قرضے اتنے زیادہ ہو چکے تھے کہ وہ بدحواس ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک دن اسے اس قرض کا حساب دینا ہو گا۔ اس نے جوڑ توڑ کی سیاست شروع کر دی تاکہ اپنے حمایتی پیدا کر لے جو کسی بڑے عہدے کے حصول میں اس کی مدد کریں۔ وہ کبھی ایک کے ساتھ چلتا کبھی دوسرے کے

ساتھ۔ کئی سازشوں میں بھی اس کا نام لیا جا رہا تھا۔

جنرل پومپی ابھی تک مشرقی بحیرہ روم میں تھا۔ کراسس اپنی آمدنی کا حساب کتاب کر رہا تھا اور سیزر خاموشی سے رومن سیاست کی سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہی دنوں روم کا ایک اہم ترین عہدہ Pontifex Maximus خالی ہوا۔ اس عہدے پر فائز شخص پادریوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ مندر میں موجود پاک دامن عورتوں کی نگرانی کرتا تھا۔ سرکاری رہائش گاہ میں رہتا تھا اور دوسری کئی مراعات اسے حاصل تھیں۔

سیزر نے تہیہ کر لیا کہ وہ یہ الیکشن لڑے گا حالانکہ اس کے مقابلے پر سینیٹ کے دو ممبران تھے جن سے جیتنا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہ سیزر کا حوصلہ تھا جو اسے ہر محاذ پر کامیاب کر رہا تھا۔ دست بردار ہونے کی بجائے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دولت کے بل پر یہ مقابلہ جیتے گا۔

یہ مقابلہ اربن قبائل کی وجہ سے جیتا جا سکتا تھا لہٰذا اس نے اربن ایریا کے ووٹرز پر توجہ دی۔ اس نے دولت خرچ کی اور ووٹرز کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

اس کا طاقتور حریف یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیزر کو اس دوڑ سے نکلنے کے لیے اس سے زیادہ دولت پیش کرنا چاہی جتنی وہ خرچ کر چکا تھا لیکن سیزر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

الیکشن والے دن سیزر کی ماں رو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سیزر پر بے پناہ قرض چڑھ گیا ہے۔ اگر وہ ہار گیا تو قرض خواہ سیزر کو روند ڈالیں گے اور اس کا سیاسی مستقبل ختم ہو جائے گا۔

وہ ابھی تک صبورہ ہی میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے مکان سے نکلتے وقت اپنی ماں کو چوما اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”ماں آج تم دیکھو گی کہ تمہارا بیٹا جیتے گا یا بھگوڑا بنے گا۔“

ووٹ پڑے اور سیزر دونوں امیدواروں کے مقابلے میں بڑے مارجن سے جیت گیا۔

اس دن شام کو وہ اپنے گھر میں پونٹی فکس میکسی میس کی حیثیت سے داخل ہوا۔

اب اسے صبورہ چھوڑ کر شہر کے وسط میں سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہونا تھا۔

اس نے چند روز صبورہ میں گزارے۔ اہل محلّہ سے مبارک بادیں وصول کرنے کے بعد اپنی ماں، بیٹی، نوکروں اور صبورہ میں گزارے ہوئے 30 برس کی یادوں کے ساتھ اس نے صبورہ چھوڑا اور سرکاری مکان میں منتقل ہو گیا۔

اب وہ روم کی سیاست میں ایک لیڈر کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے بہ حیثیت لیڈر بھی اپنا لوہا منوایا۔ اپنے حریفوں کو ہر قدم پر نیچا دکھایا۔ جو دوست تھے انہیں نوازتا رہا اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں لگا رہا اور صرف ایک سال کے عرصے میں Praetor کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ روم کا بہترین عہدہ تھا۔ اس عہدے کی ایک سال میعاد پوری ہونے کے بعد Praetor کو کسی صوبے کا گورنر بنا دیا جاتا تھا۔

سیزر پر الیکشن کے دوران اتنا قرض چڑھ چکا تھا کہ اگر اسے گورنر شپ دے کر اسپین نہ بھی بھیجا جاتا تو بھی وہ روم چھوڑ چکا ہوتا۔

وہ اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے روم چھوڑنے کے لیے اس قدر جلدی میں تھا کہ ابھی سینیٹ نے اسے یہ عہدہ باضابطہ طور پر اناؤنس بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اسپین جانے کے لیے کوچ میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے قرض خواہوں کو دھوکا دے کر نکل جانا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کی کوچ کو روک لیا۔ اس کی سخت بے عزتی ہونے والی تھی کہ اس موقع پر اس کا جگری دوست کراسس کام آیا۔

”اگر سیزر رقم ادا کرنے کے قابل نہ رہا تو میں آپ کے قرض کی رقم ادا کروں گا۔“ کراسس نے قرض خواہوں سے وعدہ کیا۔

سیزر کی جان چھوٹی اور وہ اسپین پہنچ گیا۔

اسپین پہنچنے کے بعد وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا سیاسی مستقبل اسپین کی فتوحات سے وابستہ ہے۔ اس طرح ایک تو وہ قونصل کا عہدہ حاصل کر سکتا تھا۔ روم کے نظام حکومت میں یہ ترقی کا آخری زینہ ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے قرضے ادا کر سکتا تھا۔

اس نے کسی جنگ کے بہانے ڈھونڈنا شروع کر دیے۔

شمال مشرقی پہاڑوں میں ڈاکو اودھم مچائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اسپین میں آباد ہوں۔ سیزر کو معلوم تھا کہ وہ یہ حکم کبھی نہیں مانیں گے۔ یہی ہوا بھی۔ ان کے انکار نے اسے جنگ مسلط کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ سیزر نے وقت ضائع کیے بغیر اپنے فوجی دستوں کو پہاڑوں کی طرف بھیجا۔ ان قبائل کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ اس نئے رومن گورنر کو شکست دے دیں گے۔ یہ غلط فہمی انہیں اس لیے ہوئی کہ ماضی قریب میں وہ

رومی نااہلوں کوروند چکے تھے۔

وہ جنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ سیزر نے ان ڈاکوؤں پر بھرپور حملہ کیا اور انہیں شکست سے دوچار کردیا جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے انہیں اپنے ساتھ لے کر بحرِ ظلمات کے ساحل پر پہنچا۔ یہاں سے ان قبائل کو ایک جزیرے پر بھیجا تھا۔ اس نے انہیں چند کشتیوں پر سوار کیا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ روانہ کردیا۔

ان قبائلیوں نے سپاہیوں کو مجبور کیا کہ وہ جزیرے تک پہنچنے کے لیے چوڑے پاٹ سے کراس کریں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ یہاں پانی کی گہرائی کہیں کم کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ کسی جگہ تو گہرائی محض چند انچ رہ جاتی ہے۔ رومن سپاہی اس حقیقت سے ناآشنا تھے۔ وہ کشتیوں کو اس طرف لے گئے اور سب کے سب ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ سیزر کو معلوم ہوا تو اس نے مزید جہاز منگوائے اور سمندر پار کرکے ان ڈاکوؤں کو عبرت ناک شکست دی۔

اس سے نمٹنے کے بعد اس نے اسپین کے شمال مغربی کونے کے انتشار زدہ علاقوں کا گھیراؤ کرلیا۔ ان مغرور قبائل کو کبھی بھی رومنوں نے فتح نہیں کیا تھا۔ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ ان قبائل کو اس کے حملے کا اس وقت پتا چلا کہ جب اس کا جہاز ان کی بندرگاہ تک پہنچ گیا۔ انہوں نے ہار تسلیم کرلی اور ہتھیار پھینک دیے۔

چند ہفتے نہیں گزرے تھے کہ اس نے مغربی حصہ فتح کرکے روم کا حصہ بنادیا۔

موسم سرما گزر چکا اور برف پگھلنے لگی تو سیزر واپس آیا تاکہ قونصل شپ کے لیے مہم کا آغاز کرے جو کہ ترقی کا آخری زینہ تھا۔

ان فتوحات کی بنا پر سینیٹ نے اس کے لیے فتح کا جشن منظور کیا۔ فتح کا یہ جشن اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ ایک کامیاب ملٹری کمانڈر رہے۔

سیزر کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سینیٹ سیزر سے نفرت کرنے والوں کی بھرمار تھی مگر ان سب نے سخت دشمنی کے باوجود اس جشن کی حمایت کی۔ یہ تو اس کو بعد میں پتا چلا کہ اس کے خلاف گہری سازش ہوئی ہے۔

رومن قانون کے مطابق سیزر کو جنرل کی حیثیت سے جشن فتح کا انتظار روم کی دیواروں سے باہر کرنا تھا۔ جبکہ قونصل کے امیدوار کو ذاتی طور پر سینیٹ کے سامنے پیش ہونا ضروری تھا۔ وہ جشن کا حامی بھی تھا اور قونصل کا امیدوار بھی۔

اس کی اس درخواست پر بحث ہوئی۔ اس کے مخالفین نے بازی الٹتے ہوئے دیکھ کر ایک سینیٹر Cato کو آگے کردیا۔ اس نے اس قدیمی روایت کا سہارا لیا جس کے مطابق وہ اس وقت تک تقریر کرسکتا تھا جب تک وہ چاہے چنانچہ وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا تو اپنی تقریر کو اس قدر طول دیا کہ سورج غروب ہوگیا۔

مخالفین نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی کہ سیزر ایک سال کے لیے قونصل شپ حاصل نہیں کرسکتا۔ اگلے سال کی اگلے سال دیکھی جائے گی لیکن سیزر تو سازشیں ناکام بنانے کے لیے پیدا ہوا تھا۔

دوسری صبح سیزر اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اس کا سنہرا چوغہ سورج کی سنہری کرنوں سے منور ہورہا تھا وہ شاہانہ چال سے چلتا ہوا شہر کے دروازے پر آیا۔ دروازہ عبور کیا اور شہر کی مقدس حد کو عبور کرگیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جشن فتح سے محروم ہوگیا۔

جشن فتح عوام میں سب سے بڑا اعزاز تھا جو ایک جنرل کو عطا ہوتا تھا۔ یہ اعزاز سیزر کا سالہا سال کا خواب تھا۔ کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس اعزاز کو چھوڑ دے گا۔ اس نے Cato کی تقریر اپنے پیروں تلے روند ڈالی تھی۔

قونصلر کے انتخاب کے لیے الیکشن ہونے تھے۔ سیزر نے اپنے پچھلے تجربے کو کام میں لاتے ہوئے رشوت کا بازار گرم کیا اور اپنے حریف کو چت کردیا۔

صبورہ کی گندی بستی میں پل کر جوان ہونے والا سیزر روم کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوچکا تھا۔

59 ق م کے پہلے مہینے میں سیزر نے روم کے سینئر قونصل کی حیثیت سے حلف اٹھالیا۔ اس کا جونیئر قونصل جو اس کا حریف تھا، اس نے کامیاب ہوتے ہی سیزر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری مدد کے لیے ہوں۔ تمہیں کسی امید میں بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں صاف صاف بتارہا ہوں کہ میں تمہیں ہر حال میں آگے بڑھنے سے روکوں گا۔“

سیزر نے اس دھمکی سے نبرد آزما ہونے کے لیے جنرل پومپی اور کراسس کو شریک اقتدار کرکے ایک زبردست شخصی حکومت قائم کی۔ اس نے کمال ہوشیاری سے دیگر سینیٹرز کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس طرح اپوزیشن کے ہر حربے کو وہ ناکام بناتا رہا۔ اس نے اپنی مرضی کے قوانین

بنائے اور ایسی اصلاحات عمل میں لایا جو روم کے نچلے طبقوں کے لیے مفید ثابت ہو رہے تھے۔ طبقہ اشرافیہ سیزر سے ہمیشہ ناراض ہی رہا۔

اس سال کے موسم بہار کے آتے آتے پومپی نے بہت سارے قوانین اپنے حق میں حاصل کر لیے تھے۔ اس کا مشرقی بحیرہ روم کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اس کے جوانوں کو شاہی فوج میں خدمات کے صلے میں من پسند اراضیات مل چکی تھیں۔ یہ وقت سیزر کے لیے بڑا نازک تھا۔ سہ فریقی حکومت خطرے میں پڑ گئی۔ اب پومپی اپنے کام نکل جانے کے بعد سیزر اور کراسس کے حق میں اپنا سیاسی جھکاؤ کم کرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ پومپی اگر اس کا ساتھ چھوڑ دیتا تو شاید کراسس بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ یہ اس کی سیاسی موت ہوتی۔ اسے پومپی کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ہر قیمت پر اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ قیمت اپنی بیٹی کی شکل میں ادا کی۔ اس نے اپنی بیٹی جولیا پومپی کو بیاہ دی حالانکہ پومپی اس کی بیٹی سے تیس سال بڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب تک پومپی اور جولیا ساتھ رہیں گے پومپی اور اس کے حواری اس کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ اس نے ان رشتوں کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اگلے سال منتخب ہونے والے قونصل کی بیٹی سے شادی کر لی۔

سیزر کی قونصل شپ کا ایک سال مکمل ہونے والا تھا۔ اس کے اردگرد یہ خطرہ منڈلانے لگا تھا کہ جیسے ہی وہ اس عہدے سے ہٹا اس سے تمام مراعات چھین لی جائیں گی۔ کیٹو اور اس کے اتحادی اس کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اسے ٹریبونل میں کھڑا کر کے اس پر ہر قسم کا الزام عائد کر سکتے ہیں۔ اس کے سیاسی مستقبل کو زبردست ٹھیس پہنچے گی۔ اس وقت اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ قونصل شپ کے بعد احتساب سے کیسے بچے گا۔ اس کا واحد حل اس نے یہی سوچا کہ وہ کسی صوبے کی گورنر شپ حاصل کر لے اور سینیٹ اسے فتوحات کے ذریعے علاقے میں توسیع کی اجازت دے اور وہ ایک فاتح جنرل کی حیثیت سے مال غنیمت کے ذریعے اپنے سیاسی عزائم کو جاری رکھ سکے۔

اسے ایسے سرحدی صوبے کی گورنر شپ درکار تھی جس کی سرحدیں گال، جرمن سے ملتی ہوں اور کوئی ناگزیر وجہ پیدا ہو جس کے باعث وہ ان قبائل پر حملہ آور ہو سکے۔

دوسری جانب اپوزیشن بھی اس کے سیاسی مستقبل کے بارے میں غور و خوض کر رہی تھی۔ نہایت غور کے بعد ایک بل سینیٹ میں لانے اور پاس کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

قاعدہ یہی تھا کہ عموماً ایک سابقہ قونصلر کو کسی اہم اور مال دار صوبے کا گورنر بنایا جاتا تھا لیکن سیزر کے معاملے میں اس قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر بل منظور کیا گیا کہ سیزر جب اپنا عرصہ تعیناتی ختم کرے تو اسے چراگاہوں اور جنگلات کی سرزمین کا انتظام و انصرام دیا جائے۔

سیزر نے ایک مرتبہ پھر پرانا حربہ استعمال کیا۔ بھاری رشوت دے کر نچلے طبقے کی اسمبلی میں قرارداد پیش کرائی گئی کہ سیزر کو "گال" کی گورنر شپ دی جائے۔ یہ گنجان آبادی شمالی اٹلی سے متصل تھی۔

جنرل پومپی سے رشتہ داری اس وقت کام آئی۔ پومپی نے اس قرارداد کی حمایت کی اور یہ بل بغیر سینیٹ کی حمایت کے منظور کر لیا گیا۔

گال کی وسیع اراضیات جو شمال میں رومن صوبے سے اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی بڑی زرخیز تھی لیکن انتشار زدہ تھی۔ سیزر نے محسوس کیا کہ یہ اس کے لیے سنہری موقع ہے کہ رومن لوگوں کو دکھا دے کہ وہ شاندار فتوحات حاصل کر سکتا ہے۔

روم سے روانگی کے وقت سیزر کا یہ منصوبہ مخالفین سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا کہ اب وہ بہ حیثیت جنرل ان کے سامنے اپنی نئی طاقت کا مظاہرہ کرے گا۔

گال کا علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے کی الگ زبان، الگ روایات اور الگ قوانین تھے۔ گال کا چوتھا حصہ اور سب سے بڑا حصہ وسطی جنوبی فرانس سے اٹلانٹک تک پھیلا ہوا تھا۔

گالش جنگجوؤں کے لیے ناموری اور بہادری ایک اعزاز تھا۔ اکثر اوقات دشمن کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کے لیے ننگے ہو کر لڑتے تھے۔ دائمی فتح کی صورت میں وہ دشمن کے سروں کا مینار بناتے تھے۔ زیادہ تر گال سادہ کسان اور چھوٹے گاؤں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ کاشت کاری کرتے اور بھیڑیں پالتے تھے۔ ان کے مکانات غیر معمولی گول اور مستطیل شکل کے ہوتے تھے جو لکڑیوں سے بنائے جاتے تھے۔ عورتیں گھریلو کام کاج کرتی تھیں اور بچوں کو پالتی تھیں لیکن عورتوں کی مجموعی تعداد پر رومی یونانی اور خطے کی دوسری خواتین سے زیادہ تھی۔

امراء کے دو طبقوں میں Knight اور دوسرا Druide تھا۔ نائٹ روحانیت پر یقین رکھتے، قربانیاں

دیتے اور الوہیت کا نظریہ پیش کرتے تھے۔ نائٹ کو کسی بھی معاملے میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔

ڈائنڈ طبقے کے لوگ ایک سردار کے ماتحت تھے جو بڑا قابلِ احترام اور سب سے بڑی اتھارٹی کا مالک تسلیم کیا جاتا ان کا عقیدہ تھا کہ روحیں مرتی نہیں بلکہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوجاتی ہیں۔

تمام اہل گال میں مذہبی رسومات رچی بسی تھیں۔ چاہے کوئی بیماری میں مبتلا ہو اور چاہے کوئی جنگ کے خطرے میں، قربانی کی رسم ضرور ادا کرتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ کسی شخص کی جان بچانے کے لیے انسانی قربانی ضروری ہے۔ عوام میں بھی قربانی کا رواج تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح دیوتا انہیں مختلف آفات سے بچاتے ہیں۔

سیزر یہاں آتے ہی طویل ترین جنگوں میں مشغول ہوگیا۔

☆......☆

سیزر نے ایک لمبا عرصہ پہاڑوں اور میدانوں میں گال کے بہادر قبائل سے لڑتے ہوئے گزار دیا۔

آٹھ سال کے لمبے عرصے کے بعد گال کی مہم بالآخر ختم ہوگئی لیکن اپنے پیچھے بربادی کی داستان چھوڑ گئی۔ سینکڑوں شہر کھنڈر بنا دیے گئے۔ جنگل اور اراضیات تباہ کردی گئیں۔ کتنے لوگ مارے گئے اس کا تخمینہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اس غارت گری کا دفاع کرتے ہوئے وہ کہا کرتا تھا۔ ”اہل گال، اہل روم کے لیے ایک دھمکی تھے اور اس کا واحد حل یہ تھا کہ بحیرہ روم کے تہذیب یافتہ لوگوں کی حفاظت کے لیے تمام گال کو مکمل طور پر رومن سلطنت میں شامل کیا جائے اور دریائے Rhine کو مشرقی جرمن قبائل کی حد بنا دی جائے۔“

اس دلیل پر ہر رومن متفق تھا۔ روم کے شہر کا ہر باسی اور اٹلی کے کھیتوں میں کام کرنے والا کسان خطرے سے پاک زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ وہ خطرہ جو انہیں شمالی خونخوار قبائل سے تھا۔

قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن گال کی جنگ رومن سلطنت اور سیزر دونوں کے لیے فائدہ مند رہی۔

☆......☆

51 ق م کا سال سیزر نے گال میں گزارا۔ اس نے اپنے بااعتماد ساتھیوں کو انعامات سے نوازا۔ گال کو رومن صوبوں کی طرح منظم کیا۔ شہر اور قبیلوں کے قابلِ اعتماد گالش اشرافیہ کو اختیارات سے نوازا اور انہیں روم کا ساتھی بھی قرار دیا۔ اس کے بعد گالش اشرافیہ نے اپنی مرضی سے رومن روایات کو اپنانا شروع کردیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے لاطینی استاد مقرر کردیے۔ وہ اب خود کو رومن کہلانے پر فخر کرنے لگے تھے۔

گال کو منظم کرنے کے بعد سیزر نے رومی سیاست پر بھرپور توجہ دی۔ سیزر کا دشمن Cato کوشش کے باوجود اگلے سال کی قونصل شپ حاصل نہ کرسکا تھا۔ اس کی جگہ ایک اور شخص ”ماری لیس“ نے یہ عہدہ حاصل کرلیا لیکن یہ Cato سے بھی زیادہ اس کا دشمن تھا۔ اس نے خود کو سیزر کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے وقف کردیا۔

وہ عورتوں میں بہت مقبول تھا۔ اس میں کوئی ایسی جادوئی کشش تھی کہ عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ اس نے اپنی اس خوبی کو استعمال کرتے ہوئے ماری لیس کی بیوی کو ورغلانے کی کوشش کی تاکہ وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اب اس نے پروپیگنڈہ مہم کا سہارا لیا۔

وہ ان رپورٹوں کو لے کر بیٹھ گیا جو اس نے سینیٹ کو گالش کے بارے میں لکھ کر بھیجی تھیں۔ اس نے ان رپورٹوں کو ایڈیٹ کیا اور Gallic war کے عنوان سے شائع کردیا جس نے پڑھے لکھے طبقے میں تہلکہ مچا دیا کیونکہ اس میں بہادر دشمنوں کے خلاف رومنوں کی جرأت مندانہ کارروائیوں کی کہانیوں کو بڑی سادہ اور صاف زبان میں لکھ دیا تھا۔ یہ ایک ایسی کتاب ثابت ہوئی جس نے ووٹرز کے ذہنوں کو تبدیل کردیا اور وہ سیزر کو بہادر جنرل کے نام سے یاد کرنے لگے۔

ان کوششوں کے باوجود حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ سہ شخصی حکومت اب دو شخصی رہ گئی تھی۔ اب اس کی باگ ڈور سیزر اور پومپی دی گریٹ کے ہاتھوں میں تھی لیکن جلد ہی اس میں بھی رخنہ پڑ گیا۔ سیزر کی بیٹی جولیا جو پومپی کی بیوی تھی اس کا اچانک انتقال ہوگیا۔

جنرل پومپی کو بھی رشتہ داری کا خیال نہیں رہا تھا اور جب سینیٹ نے پومپی کو ڈکٹیٹر کے اختیارات دے دیے تو سیزر اور پومپی میں اختیارات کی جنگ چھڑ گئی۔ پومپی کے ساتھ سینیٹ کی اکثریت تھی اور ایک اعلیٰ فوج رکھنے کے باعث اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی تھی۔

سیزر نے اسے شکست دینے کے لیے ایک دوسرا

راستہ اختیار کیا۔
گال کی فتوحات سے سیزر کی ذاتی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے غرض مند سینیٹرز کو ادھار کے طور پر کثیر رقم دے کر اپنا ممنون بنا لیا۔ دوسری جانب اس کی قوت عوام تھے جن کے لیے اس نے بہ حیثیت مجسٹریٹ کام کیا تھا اور وہ سپاہی تھے جنہیں اس نے بھرتی کیا اور گال کی ہر مہم پران کے ساتھ میدان جنگ میں موجود رہا۔ سیزر کی فوج جو اس نے اٹلی کے دیہاتوں اور فارمز سے بھرتی کی تھی نہ صرف اس کی وفادار تھی بلکہ اس کے مستقبل کی ذمہ داری تھی۔
اس کے مخالفین اب بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ مخالفین کے پاس سیزر کے خلاف کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس پر کئی الزامات لگائے جاسکتے تھے لیکن ان کے پاس آرمی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے آدمی سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جس کے پاس اچھی خاصی فوج موجود ہے۔
اپوزیشن پومپی سے بھی خوش نہیں تھی۔ اب انہیں دو دشمنوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے سیزر کو شکست دینے کے لیے پومپی کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔
مخالفین نے سیزر کے سامنے مطالبہ رکھ دیا کہ وہ گورنر شپ سے استعفیٰ دے اور الیکشن سے قبل فوج کے خاتمے کا اعلان کردے۔ دوسری جانب پومپی پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ سیزر کے خلاف اپوزیشن کا کردار ادا کرے۔
”میں اپوزیشن کا ہتھیار نہیں ہوں لیکن سیزر سے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ میرے فوجی دستے جو میں نے دو سال قبل اسے دیے تھے واپس کردے لیکن اس کے بدلے میں سینیٹ مکمل میری بات ماننے کی پابند ہوگی۔“ پومپی نے کہا۔
”اگر آپ کے کہنے پر اس نے فوجی دستے واپس نہیں کیے تو آپ کیا کریں گے۔“
”آپ کیا سمجھتے ہیں اگر میرا بیٹا مجھے چھڑی سے پیٹنا شروع کردے۔“
یہ ایسا جواب تھا جو مخالفین کو خوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پومپی ان کے قریب آرہا ہے۔
سینیٹ کا حال یہ تھا کہ کچھ لوگ سیزر کی مخالفت کررہے تھے۔ کچھ حمایت اور کچھ نے خانہ جنگی کے ڈر سے درمیانی راستہ اختیار کیا ہوا تھا۔
سینیٹرز، سیزر کی فتوحات کے معترف تو تھے لیکن اس کی بے باکی سے خوف زدہ تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ سابقہ قونصل شپ کے دوران سیزر نے قدیمی روایات کو بری طرح پامال کیا تھا۔ اگر اسے مزید طاقت مل گئی تو وہ ری پبلک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے گا۔
وہ صرف سینیٹ کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب حکمرانوں نے اس سے الجھنے کا تہیہ کرلیا تو اسے نظر آنے لگا کہ یہ مسئلہ سیاست کی بجائے ہتھیاروں سے حل ہوگا۔ اس نے اپنے ہزاروں سپاہیوں کو گال سے شمالی اٹلی میں بھجوادیا۔ اپنے فوجی دستوں کی تنخواہ دگنی کردی اور ہر سپاہی کو ایک گالش غلام دے دیا۔ اس نے نئے فوجی بھرتے کرنے کا کام بھی شروع کردیا۔
ایک طرف وہ اپنی فوجی طاقت بڑھا رہا تھا۔ دوسری جانب سیاسی محاذ کو بھی اپنے حق میں کرنے کے لیے کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس نے مخالف قونصل کو جسے رقم کی ضرورت تھی رشوت کے بدلے خرید لیا۔
اب اس کی آنکھیں ضرورت مندوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ اسے ایک ٹرائبون (ایک عہدہ) کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ قرضوں میں گھرا ہوا ہے۔ سیزر اس کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا کیونکہ اپنے باپ کی طرح وہ ٹرائبون بھی سیزر کا مخالف تھا۔ اس نے اس ٹرائبون کی کمزوری ہاتھ میں پکڑی اور اس کے پاس پہنچ گیا۔
”مجھے تمہارے پاس ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ تم ہر موڑ پر میری مخالفت کرتے آئے ہو۔“
”وہ تو میں اب بھی کرتا رہوں گا۔ تمہارے آنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“
”تم مخالفت کرتے رہو لیکن تمہاری حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔“
”تمہارا شکریہ۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔“
”تم قرضوں میں جکڑے ہوئے ہو۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ان قرضوں سے نجات دلا دوں۔“
”اس کے صلے میں تم مجھ سے کیا چاہو گے۔“
”کچھ بھی نہیں صرف اتنا کہ تم میرا ساتھ دو۔“
”تمہارا ساتھ دینے کا مطلب۔“
”تمہیں کسی عمل کو روکنے کے لیے ویٹو کرنے کا حق ہے۔“
”بالکل۔“
”تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ مارکس میرے پیچھے

ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔"

"یہ بھی معلوم ہے۔"

"ماری لس میرے خلاف جو بھی قانون پاس کرانے کی کوشش کرے تم اسے ویٹو کر دو گے۔ میں تمہارا پورا قرض ادا کرنے کو تیار ہوں۔ تمہیں قرض خواہوں سے نجات مل جائے گی اور مجھے ماری لس سے۔ بولو کیا کہتے ہو۔"

وہ ٹرائبون تیار ہو گیا۔ سیزر نے یہ محاذ بھی جیت لیا۔

وہ ان کوششوں میں مصروف تھا کہ ایک اور صورت حال سامنے آ گئی۔ سیریا کے گورنر کو رومن علاقوں سے Parhean (قدیم ایشیائی سلطنت موجودہ ایران) کو باہر دھکیلنے کے لیے مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس نے سینیٹ سے اضافی دو لیجن فوج (پیدل فوج) کا مطالبہ کیا جس کی سینیٹ نے فوری منظوری دے دی لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ فوج کہاں سے دی جائے۔ پومپی نے اس سے اتفاق کر لیا اور سیزر کو مجبور کیا گیا کہ اس کے پاس پومپی کی جو دو لیجن فوج ہے اسے شام کی طرف بھیج دے۔

اس نے یہ قدم اعتدال پسند سینیٹرز کو خوش کرنے کے لیے کیا اور فوج بھیج دی۔

شام کے حالات ٹھیک ہونے کے بعد یہ فوج سیزر کو دوبارہ مل جانی چاہیے تھی لیکن ماری لس نے ایسا کرنے کی بجائے ان فوجی دستوں کو پومپی کی کمانڈ میں اٹلی میں رہنے کے احکامات جاری کر دیے۔

سیزر اس نقصان کو بھی بھول گیا۔ وہ سینیٹرز کے درمیان اپنے حامی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسری جانب سینیٹرز اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ سیزر کی جگہ نیا گورنر لایا جائے۔ ماری لس نے اعلان کیا۔

"سیزر نے گال فتح کر لیا ہے لہٰذا وہ فوج ختم کر کے واپس روم آ کر عام شہری کی حیثیت سے قونصل شپ کا انتخاب لڑے۔ اس کی جگہ نیا گورنر مقرر کیا جائے گا۔"

اس اعلان پر سیزر کا خرید کردہ ٹرائبون اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنی تقریر میں کہا۔

"میں اس تجویز سے اتفاق کرتا ہوں بشرطیکہ پومپی بھی اسی دن اپنی ریاست اور فوج چھوڑ دے۔ اس وقت کی صورت حال پر غور کیجیے جب ایک فریق کو نہتا کر کے دوسرے کے پاس بے شمار فوج ہو۔ اگر سیزر اپنی فوج ختم کرے گا تو پومپی واحد شخص اٹلی میں باقی رہے گا جس کے پاس ہزاروں فوجی دستے موجود ہوں گے۔ پھر اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی کہ وہ روم کا آمر بن جائے۔"

یہ بحث ہفتوں چلتی رہی لیکن ہر بار سیزر کا زر خرید ٹرائبون اسے ویٹو کرتا رہا بالآخر ماری لس نے محسوس کیا کہ اس کے پاس اعتدال پسند سینیٹرز کی اتنی تعداد موجود نہیں کہ وہ اپنی تجاویز کو منظور کروا سکے لہٰذا وہ پیچھے ہٹ گیا۔

سیزر پچاس سال کا ہو چکا تھا لیکن اس کی جسمانی قوت اور حافظہ بے مثال تھا۔ اس نے مارک انطونی کو کاہن کے پاکیزہ عہدے پر فائز کروایا۔ پھر اسے درمیانی طبقے کے ٹریبون کا الیکشن جتوا کر روم کا ترجمان بنوایا۔

سیزر شمالی اٹلی میں واپس آیا اور اپنی ریاست کا دورہ کیا۔ اس کے بعد وہ گال واپس آیا اور جس جنگ کا خطرہ تھا اس کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

افواہوں کا بازار گرم تھا۔ یہ افواہیں برابر گردش کر رہی تھیں کہ بہت جلد سیزر اور پومپی کی فوجیں آپس میں ٹکرانے والی ہیں۔ دونوں کی فوجیں روم کو خون میں نہلا دیں گی۔

ان افواہوں نے بہت جلد دم توڑ دیا جب پومپی ایک خطرناک بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد روم آیا۔ راستے میں اس کا جس طرح استقبال ہوا اس کے سامنے وہ استقبال ماند پڑ گیا جو سیزر کا شمالی اٹلی میں ہوا تھا۔

پومپی کو ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ وہ عوام میں بہت مقبول ہے۔ اس سفر کے دوران اس کے اس احساس کو مزید تقویت ملی۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ اس کے لیے فوجی بھرتی بہت آسان ہوگی۔

اس تاثر کے ساتھ ہی جنگ کے بادل بڑھتے گئے۔ پومپی، سیزر کے مخالفوں سے مل گیا تھا اور سیزر کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں جنگ لازمی تھی۔ "سرو" یونان سے روم پہنچا اور محاذ آرائی کے خاتمے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس نے اعتدال پسند سیاست دانوں اور رومن پبلک کو اس لڑائی کے نتائج کے بارے میں مطلع کیا۔ وہ یہ کوششیں کر ضرور رہا تھا لیکن وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کا سیاسی مستقبل پومپی کی حمایت میں ہے۔ یہی صورت حال اعتدال پسند سیاست دانوں کے سامنے تھی۔

سیزر نے سینیٹ میں درخواست دی کہ اسے اس کی غیر حاضری میں انتخاب لڑنے کی اجازت دی جائے۔ سینیٹ نے پومپی کے ایما پر اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اب سیزر کا روم آنا لازمی تھا۔

رومن قانون یہ تھا کہ کوئی شخص روم کی قدرتی سرحد Rubicon کو ہتھیار کے ساتھ عبور نہیں کرسکتا۔ لیکن سیزر نے اس قانون کو توڑتے ہوئے اپنی فوجوں کے ساتھ دریائے ربی کون کو عبور کرلیا جس پر اس کا بہترین کمانڈر ”لیبی نس“ اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ نہ صرف ساتھ چھوڑ گیا بلکہ اس کے حریف پومپی سے مل گیا۔ یہ جنرل دلیر بھی تھا اور سیزر کی جنگی اسکیموں اور حربوں سے واقف تھا۔ اس کا پومپی سے مل جانا سیزر کا بہت بڑا نقصان تھا۔ اس نے اس نقصان کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا۔

سیزر جانتا تھا کہ دریا عبور کرنے کا مطلب جنگ اور صرف جنگ ہے۔ دوسری جانب سینیٹ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف زدہ تھی اور سیزر کو قائل کررہی تھی کہ وہ اپنی فوج کو ختم کر کے مذاکرات کی میز پر آئے جسے سیزر نے مسترد کردیا اس کے انکار نے نہ صرف پومپی اور سینیٹ کو اس کے بالکل ہی خلاف کردیا بلکہ رومن بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئے۔

ایک ایسی جنگ سر پر آکر کھڑی ہوگئی جس میں رومن ہی آپس میں برسرِپیکار ہونے والے تھے۔

سیزر نے ایک مرتبہ پھر معاملے کو افہام و تفہیم سے حل کرنے کی کوشش کی اور سینیٹ کو خط لکھا کہ اگر پومپی اپنی فوج کو ختم کر کے مستعفی ہوجاتا ہے تو وہ بھی ایسا کرگزرے گا لیکن سینیٹ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس سینیٹ میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ سیزر اپنی فوج مقررہ تاریخ تک ختم کردے ورنہ اسے غدار قرار دے دیا جائے گا۔

اسی رات شہر میں مارشل لا لگا دیا گیا۔

سیزر تمام حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جیسے ہی مارشل لاء نافذ کیا گیا اس نے اپنی فوج سے خطاب کیا۔

یہ بڑی ناانصافی ہے۔ مارشل لا تو اس وقت لگایا جاتا ہے جب آئینی بحران پیدا ہو۔ لوگ سولِ نافرمانی کریں یا مندروں اور مقدس مقامات کو نقصان پہنچائیں۔ اب آپ کا کام ہے کہ اپنے جنرل کی حفاظت کریں جس کی کمان میں تم نے 9 سال تک ملک کی خدمت کی جنگیں لڑیں اور تمام گال اور جرمن کو فتح کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔

اس خطاب کے بعد وہ اپنی فوج کے ہمراہ دریائے ربی کون سے دس میل پیچھے ہٹا اور اس علاقے کو خوب لوٹا اس مقام پر روم سے نکالے گئے ٹرائبونز جن میں مارک انطونی بھی شامل تھے۔ سیزر سے مل گئے۔

اس مقام پر اسے جنرل پومپی کا پیغام ملا۔

”مجھے اس تمام صورتِ حال سے بری الذمہ تصور کیا جائے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ سیزر میرے خلاف گستاخانہ انداز نہیں اپنائے گا۔ آؤ ہم ماضی کی طرح ملکی مفاد میں کام کرتے ہیں۔“

یہ بڑی پیشکش تھی لیکن سیزر کا غصہ اب اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اس کو اپنی طاقت کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے اس پیغام کو بھی رد کردیا۔

وہ اس پیغام کو رد کرنے کے بعد جنوب کی طرف روانہ ہوگیا۔ شمالی و وسطی اٹلی کا بہت بڑا علاقہ سیزر کے بینروں سے سجا دیا گیا۔ آگے بڑھا تو پومپی کے فوجیوں نے اس کی راہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے حملوں کی تاب نہ لاسکے اور راہِ فرار اختیار کرلی۔

ان خبروں نے روم میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ ملحقہ علاقوں کے لاتعداد لوگ روم میں داخل ہوگئے۔ ہر کوئی اپنی کہانی تراش رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس نے آسمان سے بارش ہوتے دیکھی ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سمندروں سے آسمانی بجلی ٹکراتے ہوئے دیکھی ہے۔ ایک نے یہ بدشگونی بتائی کہ ایک ٹٹو نے بچھڑی کو جنم دیا جب کہ دوسرے نے اپنی پیش گوئی میں کہا کہ سیزر اور پومپی کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ روم کی گلیوں میں قتلِ عام ہورہا ہے۔ روم کا کوئی وارث نہیں۔

سیزر غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ اس کا قصوروار پومپی کو قرار دے رہے تھے۔

”تم نے سیزر کو دریا پار کرنے ہی کیوں دیا۔“

”اس لیے کہ ایسا کرنے ہی میں حکمت تھی۔“

”اس میں کیا حکمت ہوسکتی ہے۔“

”تمہیں یاد ہوگا کہ Sulla روم سے فرار ہوگیا تھا۔ پھر اس نے طاقت جمع کر کے روم پر قبضہ کرلیا تھا۔ میں نے بھی روم خالی کردیا۔ پہلے اٹلی میں اپنی فوج مستحکم کروں گا اور پھر ضروری ہوا تو یونان کی طرف بڑھوں گا۔ میں اپنی بکھری ہوئی فوجیں اکٹھی کرلوں پھر سیزر سے بھی نمٹ لوں گا۔ جنگیں بلند و بالا عمارتوں سے نہیں فوج سے جیتی جاتی ہیں۔ میں جو کچھ کررہا ہوں روم کے مفاد میں کررہا ہوں۔ میری تجویز کو نہ ماننے والا روم کا باغی ہے۔“

وہ روم کے شہریوں کو سیزر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نکل

گیا۔ سیزر روندتا ہوا روم میں داخل ہوا اور خزانے کی وہ رقم لوٹ لی جو سینیٹ کے فرمان کے مطابق پومپی کو ادا کی جانی تھی۔ پومپی اور سیزر اب ایک ایسے سفر پر روانہ تھے جس میں کسی ایک کو زندہ رہنا تھا۔ کل کے دوست آج کے بدترین دشمن تھے۔ جنرل پومپی ”نیلپتر“ کے قریب تھا۔ وہ اراکین سینیٹ کی حمایت سے مقامی کسانوں کو اپنے فوجی دستوں میں شامل کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا جب کہ اس کے کیمپ میں متضاد رائے موجود تھی۔ اکثریت کا اصرار تھا کہ سیزر کو اٹلی پر قابض نہیں ہونے دیا جائے۔ جنرل پومپی اس رائے کے حق میں نہیں تھا لہٰذا بیشتر سینیٹرز اور سولجرز نے اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔

سیزر کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ مارچ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جو شہر آئے سیزر کے پرچم وہاں لہرانے لگے۔ ان شہروں کے حکمران پومپی کو مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن بوڑھا پومپی سیزر کی تیز رفتاری کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ ابھی تک نئی فوج بھرتی کرنے میں مشغول تھا۔ وہ اپنی قوت اتنی بڑھا لینا چاہتا تھا کہ سیزر کی تمام قوت ایک ہی جھٹکے میں واپس رکھوا لے۔ بالآخر ایک مقام Brindisium پہنچ کر اس نے اپنی آدھی فوج یونان بھیج دی اور آدھی کے ساتھ سمندر میں موجود رہا۔

سیزر بھی سکندرِاعظم کی طرح عظیم فاتح بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

سیزر کے پاس بحری فوج موجود نہیں تھی۔ وہ پومپی کے جہازوں پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ذرائع آمدورفت منقطع کرتے ہوئے بندرگاہ کو شدید نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ سمندر میں نہیں اتر سکتا تھا مگر اپنا غصہ بندرگاہ پر تو اتار سکتا تھا۔ اس نے جہاں پانی کم تھا داخلے کا راستہ مٹی سے بھر دیا جہاں پانی گہرا تھا وہاں چھوٹے جہاز کھڑے کر دیے اور تیز لہروں سے بچانے کے لیے لنگروں سے روک دیا۔

جنرل پومپی نے اپنے تجربے کو سامنے رکھا اور بندرگاہ پر کھڑے مال بردار جہازوں پر قبضہ کر کے ان پر ٹاور تعمیر کروائے اور پھر ایسے ہتھیار نصب کیے جنہیں میزائل کہا جا سکتا ہے۔ مسلح آرٹلری کو حکم دیا کہ سیزر کے دفاعی کاموں کو تباہ کر دے۔ تیر اور میزائل برسنے لگے۔

ان تیاریوں کو دیکھتے ہوئے سیزر مذاکرات پر اتر آیا۔ اس نے اپنے آدمی پومپی کے پاس بھیجے لیکن پومپی نے یہ کہہ کر مذاکرات سے انکار کر دیا۔

”تمام قونصلر یونان جا چکے ہیں۔ میں ان کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

اب دونوں کو وہ کرنا تھا جو وہ کر سکتے تھے چنانچہ رات ہوتے ہی پومپی کی باقی ماندہ فوج کو لے جانے کے لیے ایک چھوٹا بحری بیڑہ آ گیا۔

سیزر کے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا کہ اب وہ پومپی کی فوج پر حملہ آور ہو جائے۔ وہ اگرچہ اس وقت اٹلی کا حکمران تھا لیکن اس وقت نہ تو کوئی سینیٹرز اس کا ساتھ دے رہا تھا اور نہ ہی وہ گورنمنٹ کے کسی ادارے سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ وہ اگر یونان جاتا تو کئی مہینے لگ سکتے تھے۔ اس دوران پومپی کی وہ فوج جو اسپین میں تھی اٹلی کو روند سکتی تھی۔ وہ پومپی کی فوج پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ خوراک کے حصول کے لیے سسلی پر قبضہ ضروری تھا۔ سسلی پر قبضہ ایک پنتھ دو کاج کی طرح تھا کیونکہ سسلی کا حکمران سیزر کا ازلی دشمن Cato تھا۔ سیزر کو اس سے بدلہ لینے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

جنرل پومپی کے یونان روانہ ہونے کی وجہ سے Cato مایوس ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیزر وہاں پہنچتا اس نے سسلی خالی کر دیا۔

سیزر نے خون خرابے کے بغیر سسلی پر قبضہ کر لیا۔

اب اسے اسپین کی طرف دیکھنا تھا۔ یہاں پومپی کے تین نائبین حکومت کر رہے تھے۔ جنرل پومپی کی حامی فوج کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود تھی۔ پومپی کی اپنی فوج بھی قریب ہی خیمہ زن تھی جو کسی وقت بھی مدد کے لیے آ سکتی تھی۔

سیزر نے مقابلہ کیا۔ اپنے تجربے کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا لیکن اسے پسپا ہونا پڑا۔ اس شکست میں ان بارشوں کا ہاتھ بھی تھا جن کے سبب پل بہہ گئے اور سیزر کے اتحادی سامان رسد بھیجنے میں ناکام ہو گئے۔

سیزر کی شکست کی خبریں روم پہنچنا شروع ہو گئیں۔ ان رپورٹوں میں سیزر کی فوج کی تباہی کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ ان خبروں کو سن کر اٹلی میں اس کے ہمدرد نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے اور سڑکیں تباہ ہونے کے باعث گال سے سامان رسد کی ترسیل کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا لیکن وہ سیزر تھا۔ اس

نے اپنی فوج کو ایسی ہلکی پھلکی کشتیاں بنانے کا حکم دیا۔ ایسی ہی کشتیاں اس نے برطانیہ کی مہم کے دوران بھی بنوائی تھیں۔ ان کشتیوں کے ذریعے اس نے قریبی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ اس نے قریبی قبائل سے روابط کا سلسلہ شروع کیا اور پانچ طاقتور ریاستوں کو اپنا حامی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

مارسلیز میں ڈومیشن سیزر کی فوجوں کے خلاف تمام تر تیاری کے ساتھ صف آرا تھا۔ اس کا بحری بیڑہ ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھا۔ وہ بروٹس کے جہازوں کی جانب بڑھا جو مارسلیز کی مخالف سمت پر واقع جزیرے میں کھڑے تھے۔

سمندر میں جنگ چھڑ گئی۔ مارسلیز کے لوگ اپنے جہازوں کی تیز رفتاری اور ملاحوں کی عقل مندی پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے سیزر کے جہازوں کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن سیزر کی تجربہ کار فوج نے پہلے ہی حملے میں دشمن کے نو جہازوں کو تباہ کردیا۔ بہت سے فوجیوں کو قتل کیا، پھر وہ سمندر میں ڈوب کر مر گئے۔ سیزر کی قسمت عروج پر تھی۔ پانچ طاقتور ریاستیں اس کی حلیف بن چکی تھیں۔ فوڈ سپلائی شروع ہو چکی تھی۔ دشمن کی کیولری فورس سیزر کی فوج سے ٹکرانے سے گھبرا رہی تھی۔ سیزر مخالفین کا سامان رسد منقطع کرنے کی پوزیشن میں آچکا تھا۔

☆......☆

اپنے تمام دشمنوں سے نمٹتا ہوا سیزر بحرہ ظلمات کے ساحل کے مغرب کی طرف بڑھا۔ ایک ماہ کی مسلسل جنگ کے بعد سیزر نے سینیٹ کی ایک بڑی فوج کو شکست سے دوچار کردیا تھا لیکن ابھی تک اس کا جنرل پومپی اور سینیٹ کی مشترکہ فوج جو یونان میں موجود تھی، اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

جنرل پومپی کے لیے اسپین کی شکست ناقابل برداشت تھی لیکن وہ مشرقی بحرہ روم اور افریقا کی فوجوں کے کمانڈر کی حیثیت سے سیزر کی فوجوں کو تباہ و برباد کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

سیزر افریقا میں فوجی نقصانات کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جنرل پومپی یونان میں اپنی قوت بڑھا رہا تھا اور وہ کسی بھی وقت اٹلی کو روند سکتا تھا۔

اسے ایک اچھی خبر یہ ملی تھی کہ روم میں اس کے حامیوں نے اسے ڈکٹیٹر نامزد کردیا تھا۔ (جب ریاست انتہائی خطرے میں ہوتی تو سینیٹ کسی ایک مجسٹریٹ کو اس عہدے پر چھ ماہ کے لیے فائز کرتی تھی۔ وہ سول اور ملٹری سپریم کمانڈر ہوتا جس کے خلاف نہ تو کوئی اپیل ہوسکتی تھی اور نہ ہی وہ اپنی مدت کی تکمیل کے بعد بھی کسی کو جوابدہ ہوتا تھا۔)

جب وہ روم میں داخل ہوا تو اہل روم گھبرا گئے کیونکہ اہل روم سمجھ رہے تھے کہ ماضی پھر دہرایا جائے گا۔ وہ بھی ماضی کے حاکم Sulla کی طرح کارروائی کرکے اپنے تمام دشمنوں کو تہہ تیغ کردے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس عہدیداروں کے غصب شدہ حقوق کو بحال کردیا۔ فوری خوراک مہیا کرنے کا فرمان جاری کیا۔ ریاستوں میں اپنے گورنر متعین کیے۔ شمالی اٹلی کے اپنے حواریوں کو روم کی شہریت عطا کی۔ جیوپیٹر کے عظیم تہوار کو منانے کا حکم دیا جو کئی سال سے نہیں منایا جا رہا تھا۔ پھر گیارہ دن کی ڈکٹیٹر شپ سے مستعفی ہو کر سب کو حیران کرتے ہوئے جنرل پومپی کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

سیزر نے 49 ق م کا سال اٹلی، گال اور اسپین میں لڑتے ہوئے گزارا تھا جب کہ جنرل پومپی نے اس عرصے کو یونان میں ایک ایسی غیر معمولی بین الاقوامی قوت اکٹھی کرنے میں سرف کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ سمندر پر قابض رہنے کے لیے اس کے پاس ایشیائے کوچک یونانی جزیروں، شام اور افریقا سے حاصل کردہ 600 جہازوں کا بحری بیڑہ موجود تھا۔ جنرل پومپی کی زمینی فوج پانچ مکمل لیجن اٹلی کے رومن شہریوں پر مشتمل تھی۔ ہزاروں معاون انفنٹری سپاہ بھی جن کا تعلق یونان، ایشیائے کوچک، شام اور افریقا سے تھا۔

پومپی نے بڑے محتاط انداز سے اس فوج کے لیے مشرقی بحیرہ روم سے سامان رسد اور نقصان پہنچانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اس فوج کو بحیرہ ظلمات کے ساحل پر اٹلی کی مخالف سمت میں رکھے گا اور سیزر پر اس وقت حملہ آور ہوگا جب سمندر بالکل خاموش ہوگا۔

سیزر کے پاس اگرچہ خوفناک فوج موجود تھی لیکن ایک تو یہ تعداد پومپی کی فوج سے کم تھی دوسرے مختلف جنگوں میں مشغول رہنے کی وجہ سے تھک چکی تھی۔ اس سے بھی زیادہ مایوس کن صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس تمام فوج کو یونان پہنچانے کا بندوبست نہیں تھا۔ وہ ایک ماہ تک ایک بندرگاہ پر پڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے دلیرانہ مزاج کی بدولت

غیر معمولی فیصلے کیے۔ موسم سرما میں کوئی بھی شخص اس وسیع سمندر میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے حکم دیا کہ دستیاب جہازوں پر جتنے سپاہی سوار ہو سکتے ہیں سوار ہو کر یونان روانہ ہو جائیں۔ اس کی دلیر فوج نے اس حکم کی تعمیل کی۔

یہ سیزر کی خوش قسمتی تھی کہ دوسرے روز اس کی تمام فوج یونانی ساحل کے الگ تھلگ حصوں پر پہنچ چکی تھی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ راستے میں نہ تو کوئی سمندری طوفان آیا اور نہ ہی دشمن کے کسی بیڑے نے راستہ روکا۔ دونوں فوجیں جنوب میں بہنے والے دریا کی مخالف سمتوں میں صف آرا ہو گئیں اور انتظار کرنے لگیں کہ پہلے دوسرا فریق حملہ آور ہو۔ جنرل پومپی اب بھی محتاط تھا اور سیزر ایک چھوٹا دشمن ہے کہہ کر حملہ کرنے میں محتاط رہا۔

سیزر اس لیے محتاط تھا کہ اس کی پوری فوج ابھی پہنچی نہیں تھی۔ اس نے اپنی باقی فوج کو لانے کے لیے اپنے جہازوں کو بھیجا۔ اسے ان جہازوں کے واپس آنے تک جنگ نہیں کرنی تھی اسے وقت گزارنا تھا۔ مکمل فوج کی عدم موجودگی کے باعث اس کی فتح غیر یقینی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سیاست سے کام لیا اور پومپی کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔

''یہ ایک بڑا مشکل کام ہے۔ ہمیں عقل سے کام لیتے ہوئے غصہ تھوک دینا چاہیے اور ہتھیاروں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔ تم نے اٹلی اور اسپین گنوا دیا ہے جب کہ میں نے افریقا میں شکست کھائی ہے۔ تمہاری بہترین فوج اٹلی اور اسپین میں ماری گئی جب کہ میری فوج افریقا میں تباہ ہوئی۔ ہم دونوں کو ان نقصانات سے سبق سیکھنا چاہیے اور ری پبلک (روم) کو مزید نقصان نہ پہنچنے دیں۔ روم کے لوگ خود فیصلہ کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ جنگ سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔''

پومپی اپنے نشے میں سرشار تھا۔ اس نے سیزر کا پیغام پڑھا اور حقارت سے کہا۔ ''اب کیا میں اپنی زندگی کے مقاصد اور روم کی شہریت سیزر کی مہربانی سے حاصل کروں گا۔''

اس نے سیزر کی پیش کش کو رد کر دیا۔

سیزر نے اب ایک اور بڑا قدم اٹھایا۔ اس نے صلح کا پیغام پومپی کے فوجیوں تک بالواسطہ پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ دونوں فوجوں کے کیمپ نزدیک نزدیک تھے۔ اتنے نزدیک کہ دونوں طرف کے فوجی ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے۔ اس نے اپنے ایک حمایتی کو جو نہایت اچھا خطیب تھا دریا کے کنارے مخالف فوجیوں کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے بھیجا کہ وہ اپنے لیڈر کے انکار کے باوجود صلح کی طرف قدم بڑھائیں۔

پومپی کی فوج میں اس پیغام کا چرچا ہوا تو انہوں نے اس پیغام کو سراہا لیکن مخالف فوج کے ایک دستے نے ان مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لیے تیروں کی بارش کر دی جس سے سیزر کے بہت سے سپاہی زخمی ہو گئے۔ مذاکرات کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔

سیزر نے اپنی مجبوریوں پر غور کیا۔ اس وقت وہ دو بڑی مشکلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک یہ کہ اس کے پاس فوج کی قلت تھی۔ جب تک اس کی باقی ماندہ فوج نہیں آجاتی... وہ پومپی پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اٹلی سے اس کے حامیوں کی جانب سے کوئی پیغام موصول نہیں ہو رہا تھا۔ یہ افواہیں بھی گردش کر رہی تھیں کہ اٹلی میں موجود اس کے حامیوں میں زبردست اختلاف پیدا ہو چکا ہے اور وہ دانستہ اس کی فوج کو روکے ہوئے ہیں۔

اس کی فوج گزشتہ تین ماہ سے یونان کے نہایت سرد ساحل پر خیمہ زن تھی۔ اسے ہر حالت میں بچھڑی ہوئی فوج کو اپنے پاس لانا تھا۔

اس نے کسی کو کچھ بتائے بغیر ایک پلان مرتب کیا۔ اس نے بھیس بدلا اور رات کی تاریکی میں ایک چھوٹی کشتی کے ملاح سے ملا اور اسے بھاری رقم کا لالچ دیا۔ ''میں سیزر کا ایک خفیہ پیغام اٹلی پہنچانا چاہتا ہوں۔''

ملاح کو معلوم تھا کہ جنرل پومپی کے جہاز نگرانی پر مامور ہیں اور یہ مشن خطرے سے کم نہیں لیکن دولت کی چمک کے باعث وہ یہ بھول گیا غضب ناک سرد ہوائیں کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کے لالچ نے اسے آمادہ کر دیا اور وہ اپنے اس مسافر کو لے کر سمندر میں اتر گیا۔ وہ قطعی نہیں جانتا تھا کہ اس کی کشتی میں سوار مسافر اصل میں کون ہے۔

کشتی نے ساحل چھوڑ دیا لیکن جیسے جیسے رات ہوتی گئی اور کشتی کھلے سمندر میں پہنچی سرد ہواؤں نے کشتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ملاح کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے اپنے عملے کو واپسی کا حکم دے دیا۔

''تم واپس نہیں جا سکتے۔ تمہیں ضرور اٹلی جانا ہو گا۔''

سیزر نے کہا۔
''جناب! میری ساری عمر سمندر کے نخرے اٹھاتے ہوئے گزری ہے۔ میں سمندر کے تیور پہچانتا ہوں۔ مزید آگے جانا خطرناک ہے۔ ہمیں واپس جانا ہوگا۔''
''تمہیں معلوم ہے تمہاری کشتی پر کون سوار ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سیزر نے اپنا اوپری لبادہ اتار دیا اور ملاح کو اپنی شناخت کروائی۔ ''میرے دوست بہادر بنو، خوفزدہ مت ہو۔ تم سیزر کو لے جارہے ہو۔ سیزر کی خوش قسمتی تمہاری کشتی کی حفاظت کرے گی۔''
کشتی کا کپتان سیزر کو اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اب وہ انکار کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ کشتی کے عملے نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے پوری قوت سے اٹلی پہنچنے کی کوشش کی لیکن مغرب سے چلنے والی سرد ہواؤں کے آگے وہ بے بس نظر آئے۔ سیزر کو بھی احساس ہونے لگا کہ اب آگے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ سیزر نے بھی عملے کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے واپسی کا حکم دے دیا۔
سیزر کسی کو کچھ بتائے بغیر اس مشن پر روانہ ہوا تھا لیکن اس کی یہ جرأت کسی نہ کسی طرح اس کے فوجیوں تک پہنچ ہی گئی۔ وہ جوش میں آگئے اور اعلان کیا کہ وہ اٹلی میں موجود فوج کے بغیر ہی دشمن کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔
سیزر کی احتیاط اس خطرے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ وہ ''ابھی مزید انتظار کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس کی آنکھیں سمندر کو دیکھتے دیکھتے تھک چکی تھیں۔
آخر ایک دن اس نے جنوب کی جانب سے جہازوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہی وہ جہاز تھے جن کا عرصہ دراز سے انتظار تھا۔ مارک انطونی سیزر کی باقی ماندہ فوج کو لے کر پہنچ چکا تھا۔
جنوبی سرد ہواؤں کے باعث ان جہازوں کو چالیس میل دور لنگر انداز ہونا پڑا۔

☆......☆

سیزر، جنرل پومپی کی ایک گیریژن فوج کو روندتا ہوا پومپی کے کیمپ کے سامنے خیمہ زن ہوگیا۔ پومپی نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنا کیمپ ایک مقام ''پیٹرا'' منتقل کرلیا۔ یہ جگہ تیز ہواؤں سے محفوظ اور جہازوں کو لنگر انداز کرنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس نے اس جگہ ایشیا اور دوسری ریاستوں سے آنے والے سامان خورونوش کی ذخیرہ گاہ بنائی اور نزدیکی پہاڑیوں پر قبضہ کرکے اور اپنا کیمپ سب سے اونچی چوٹی پر منتقل کرلیا۔ یہ جگہ پومپی کے گھڑسواروں کے لیے آئیڈیل تھی۔
دوسری جانب سیزر کے لیے بڑا مشکل تھا کہ وہ اٹلی سے سامان رسد کی ترسیل کو تیز کرسکے۔ اس کے بحری بیڑے کی رفتار نہایت سست تھی چنانچہ اس نے دور دراز علاقے ''اپی رس'' کا انتخاب کیا اور سامان خورونوش کی ترسیل کو یقینی بنانے کے لیے مخصوص مقامات پر خصوصی انتظامات کیے۔
سیزر نے جنرل پومپی کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لیے سمندر میں گرنے والے تمام دریاؤں اور نالوں کا یا تو رخ موڑ دیا یا پھر ان کی مکمل ناکہ بندی کردی تاکہ پومپی صاف پانی حاصل نہ کرسکے۔ سیزر نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈیم تعمیر کرلیے۔
ان انتظامات کے بعد چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ یہ صورتِ حال پومپی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ دنیا میں اس کی بہادری کی دھاک تھی۔ اس کی جنگی چالوں سے روم کے دشمن مرعوب تھے۔ ایک جونیئر جنرل (سیزر) اس کی چالوں کو ناکام بنارہا تھا۔ وہ تو اس زعم میں تھا کہ سیزر کو جب چاہے گا روند ڈالے گا لیکن ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں اس کی حقیقت اس پر ظاہر ہوگئی۔ پھر اس نے جھنجلا کر وہ کیا جو اس کی عادت نہیں تھی۔ اس نے اپنی عادت کے برخلاف سیزر پر فوری حملہ آور ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ رات کی تاریکی میں اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ چھوٹے ہتھیاروں سے لیس کشتیوں میں سوار کرکے اس جگہ پہنچا دیا جہاں سیزر کا ایک کمانڈر کھڑا تھا۔ اس کے اس اچانک حملے سے گھبرا کر سیزر کی فوج بھاگ کھڑی ہوی۔ اس کی خبر جب انطونی کو ہوئی تو وہ مدد کو آگے بڑھا۔ سیزر کی فوج کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اس اثناء میں سیزر بھی مختلف گڑھیوں سے فوج اکٹھی کرکے جنرل پومپی کے سامنے خندق کھود کر مورچہ زن ہو چکا تھا۔
دونوں جنرل پینترے بدلتے رہے۔ اپنے منصوبے تبدیل کرتے رہے اور اپنے کیمپوں میں ردوبدل کرتے رہے یہ کشمکش اس وقت ختم ہوئی جب سیزر نے آگے بڑھ کر پومپی کے بازو پر تیز ترین حملہ کیا۔ یہ حملہ سیزر نے آن کی آن میں پلٹ کر رکھ دیا۔
پومپی کے لیے یہ منظر ناقابلِ یقین تھا۔ جب اس نے اپنی فوج کو بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن سیزر کی فتح اس وقت

پسپائی میں بدل گئی جب اس کے کیمپ کو سمندری طوفان نے تہہ و بالا کر دیا۔

اس دن تنگ دروں میں لڑی گئی دو جنگوں میں سیزر کے 960 سپاہی مارے گئے اور سیکڑوں لاپتا ہوئے۔ اس نے روم سمیت تمام ممالک کو اپنی فتح اور سیزر کی بدترین شکست کے خطوط لکھے اور بتایا کہ سیزر کی فوج تباہ کر دی گئی۔

اس ناگہانی شکست کے بعد سیزر نے حکمت عملی تبدیل کی اور وہاں سے اپنی فوج کا انخلاء شروع کر دیا۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین لیجین فوج ساز و سامان کے ساتھ اگلے ایک مقام پر منتقل کر دی۔ پومپی اس کے تعاقب میں تھا لیکن اس کے باوجود اپنے پرانے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ جلد از جلد اس مقام تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اس نے اپنی فوج کو پہنچایا تھا تاکہ زخمیوں کی عیادت اور فوج کی تنخواہیں ادا کرنے کے علاوہ اپنے اتحادیوں کو اعتماد میں لے سکے۔

اب یہ دونوں جنرل اپنی اپنی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونے کے لیے سرگرم تھے۔ پومپی اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مقدونیہ پہنچ گیا۔ سیزر نے ''تھسلی'' کا رخ کیا۔ سیزر کی شکست کا سن کر اس شہر کے لوگ پومپی کے ہم نوا بن چکے تھے۔ انہوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہوا کہ پومپی کی مکمل فتح کی خبر غلط ہے تو انہوں نے شہر کے دروازے کھول دیے۔

سیزر اس وقت تھسلی کے شہر Gomphi میں تھا۔ اسے یہ خبر ملنے میں دیر نہیں لگی کہ پومپی بھی مقدونیہ سے تھسلی پہنچنے والا ہے۔ سیزر اپنے کیمپ بار بار تبدیل کر رہا تھا۔ آخر وہ تھسلی کے ایک قصبے میں پہنچا۔ پومپی کی فوج پہلے سے وہاں موجود تھی اور پہاڑی علاقوں پر قابض ہو چکی تھی۔

اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ سیزر بھی اپنی فوج سے کہہ چکا تھا کہ اب جنگ کے سوا دوسرا راستہ نہیں۔ پومپی نے بھی اپنی فوج سے خطاب کیا۔

''میں نے جو فتح کا وعدہ کیا تھا وہ اب قریب ہے۔ جرأت کے ساتھ آگے بڑھو۔''

میدان جنگ سجا۔ دونوں نے اپنی اپنی حکمت کے مطابق صفیں آراستہ کیں۔ پومپی کو علم تھا کہ اس کی انفنٹری سیزر کی انفنٹری سے کم تجربہ کار ہے۔ لہٰذا اس نے حکم دیا کہ پہلے حملہ آور ہونے کی بجائے سیزر کے حملے کا انتظار کیا جائے۔

سیزر اپنی بیس ہزار فوج کے ہمراہ پومپی کی پچاس ہزار سپاہ پر حملہ آور ہو گیا۔

''ایک لمحے کے لیے ان کی سانسیں روک دو۔'' سیزر نے نعرہ لگایا۔

پومپی کی کیولری فورس نے نہ صرف سیزر کے اس حملے کو روکا بلکہ وہ سیزر کی فوج میں گھس گئے۔ سیزر نے فوراً اپنی چوتھی لائن کو حملے کا حکم دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ پومپی کے فوجی نہ صرف اپنی پوزیشن چھوڑ گئے بلکہ نزدیکی پہاڑیوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر سیزر نے اپنی فوج کو جنرل پومپی کے بائیں بازو اور پھر عقب پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

یہ حملے بھی اتنے شدید اور موثر ثابت ہوئے کہ پومپی کی فوج کے قدم نہ ٹھہر سکے۔ جنرل پومپی نے خوف و ہراس کا یہ عالم دیکھا تو چیخ کر اپنے سپاہیوں کو خبردار کیا۔

''کیمپ کی حفاظت کرو اور اس کا دفاع کرو۔''

اس عرصے میں سیزر کیمپ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ حفاظتی دستوں کو کمزور پڑتے ہوئے دیکھ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ وہ ساحل سمندر پر پہنچا جہاں اس کا جہاز تیار کھڑا تھا۔

سیزر کو اب پومپی کے تعاقب میں نکلنا تھا۔

اس نے اپنی فوج کی چوتھی لیجن کو ہمراہ لیا اور پومپی کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ اس جنگ میں پومپی کی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی مارے گئے۔ سیزر جب میدانِ جنگ سے گزرا تو اتنے بڑے خون خرابے سے بہت پشیمان ہوا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔

''یہ سب پومپی کا کیا دھرا ہے میرا نہیں۔''

اس جنگ میں شریک سرو، کیٹو اور دوسرے سینیٹرز مشرق کی جانب بھاگ گئے جب کہ جنرل پومپی مختلف مقامات پر رکتا ہوا۔ 2000 منتخب فوجیوں اور وسیع پیمانے پر ساز و سامان لے کر Pelusium پہنچ گیا۔ یہ جگہ ملک مصر میں تھی۔

☆......☆

بطلیموس سیزدہم بادشاہِ مصر بستر مرگ پر تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ دونوں بیویاں اس کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ اس نے اپنی بڑی بیٹی کو طلب کیا۔ سترہ سال کی ایک

نازک اندام لڑکی اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر کھڑی باپ کو دیکھتی رہی پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ بادشاہ کی بڑی بیٹی قلوپطرہ تھی۔

"میری کشتی ڈانواڈول ہے۔ کسی وقت بھی ڈوب جائے گی۔ میری وصیت کے مطابق تم اور تمہارا چھوٹا بھائی بطلیموس چہارد ہم مشترکہ طور پر مصر کے بادشاہ ہوں گے۔ میرے تخت کی حفاظت کرنا جس طرح میں نے کی۔ اس وصیت میں ہرگز ردوبدل نہ کرنا کیونکہ اس کی نقل سربہ مہر کر کے میں نے رومی خزانے میں رکھوادی اور پومپی اعظم سے دیوتاؤں کی قسم دے کر عہد لیا ہے کہ اگر تمہاری طرف سے زیادتی ہو تو وہ تم سے بازپرس کرے۔"

کچھ کہنے کے لیے قلوپطرہ نے لب کھولے ہی تھے کہ بادشاہ کا سانس اکھڑ گیا۔ اب دیوتاؤں کو آنے کے لیے جگہ دینی تھی اس لیے سب لوگوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ قلوپطرہ بھی اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ اسے اس وقت باپ کی موت کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا لیکن وہ اس وصیت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مشترکہ حکومت کی شرط کیوں رکھی گئی ہے؟ صرف اس لیے کہ میری شادی میرے بھائی سے ہوجائے۔ اسے مصری تہذیب یاد آگئی جس میں جایداد یا تخت بچانے کے لیے حقیقی بہن اور بھائی کی شادی کردی جاتی تھی۔ مصری قانون یہ بھی تھا کہ بڑی لڑکی تخت کی وارث ہوتی تھی۔

وہ مسلسل سوچے جارہی تھی۔ مشترکہ بادشاہت کا مطلب یہی ہے کہ میری اور دس سال چھوٹے بطلیموس کی شادی کرادی جائے۔ میں اس بےہودہ رسم پر کبھی عمل نہیں کروں گی۔ میں اکیلی تخت کی وارث رہوں گی اور وہ وصیت؟ اگر رومی حکومت کوئی رخنہ اندازی کرے گی تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں چپ ہوں۔

قلوپطرہ نے اس وصیت کو بہ ظاہر قبول کرلیا۔ تاج شاہی اس کے سر کا زیور بن گیا لیکن سازشیوں کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ اپنے دس سالہ بھائی کے ساتھ مل کر حکومت کرنے پر مجبور تھی لیکن سازشی کچھ اور سوچ رہے تھے۔

شہزادے کے نگراں پوتھی نوس، تھیوڈوٹس اور شاہی باڈی گارڈز کا کمانڈر ایکسیلاس شہزادے کو گھیرے ہوئے تھے۔ انہوں نے قلوپطرہ پر زور ڈالنا شروع کردیا کہ وہ شہزادے سے شادی کرلے تاکہ شہزادہ خودمختار ہوجائے اور پھر ہم اسے انگلیوں پر نچانا شروع کردیں۔ قلوپطرہ شہزادے کی کم عمری کو جواز بنا کر وقت ٹال رہی تھی۔ اس طرح اس نے تین سال گزار دیے۔

سازشی سمجھ گئے کہ قلوپطرہ اس شادی پر تیار نہیں۔ انہوں نے قلوپطرہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے وصیت پر عمل نہیں کیا اور شادی نہیں کی تو وہ رومی حکومت کو مطلع کردیں گے۔ وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تو اسے اپنے ہی محل میں قید کروادیا گیا۔ قلوپطرہ کے حمایتی اتنے کم رہ گئے تھے کہ کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ رومی حکومت اس سے بازپرس ضرور کرے گی اس لیے وہ یہاں سے فرار ہونے پر غور کرنے لگی۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ کھڑکی کے پاس آئی پھر ہٹ گئی۔ وہ اس جستجو میں تھی کہ کسی کی نظر اس پر پڑ جائے پھر یہی ہوا۔ ایک پہرے دار بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس آگیا۔

"سنو!" قلوپطرہ نے اس نوجوان پہرے دار کو پکارا۔

"جی ملکہ عالیہ۔"

"کیا تم مجھ سے کچھ دیر بات کروگے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"کیا بات کروں۔"

"میں بہت پریشان ہوں۔ میرا دل بہلاؤ۔"

"میں تو معمولی پہرہ دار ہوں۔ میں آپ کا کیا دل بہلا سکتا ہوں۔"

"تم اندر تو آؤ میں تمہیں دل بہلانے کا طریقہ بھی بتا دوں گی۔"

"یہ بہت مشکل ہے ملکہ عالیہ۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔"

"تمہاری جوانی ایسی دلفریب ہے اور دل اتنا کمزور۔"

"میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

"میری فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تمہارے پاس چابی ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں ہے لیکن میں حاصل کرسکتا ہوں۔"

"چابی لے آؤ تو میں تمہارے ساتھ بھاگنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے پسند آگئے ہو۔ تم مجھے اس محل سے نکال کر لے جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جا کر گمنام زندگی گزار لوں

گی۔"

"میں چابی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" نوجوان نے کہا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔

رات گزر گئی اور نوجوان لوٹ کر نہیں آیا۔ قلوپطرہ مایوس ہو گئی۔ وہ اس اندیشے میں بھی مبتلا ہوئی کہ اگر اس نوجوان نے کسی سے ذکر کر دیا تو میری نگرانی اور بھی سخت کر دی جائے گی۔

وہ دن میں بھی کئی مرتبہ کھڑکی تک گئی۔ اس کی آنکھیں اس نوجوان کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ شاید اس کی چوکیداری رات کے وقت ہوتی ہو۔ شاید وہ رات میں پھر آئے یہی سب سوچتے سوچتے دن گزر گیا۔ رات کا بھی آدھا پہر گزر گیا۔ وہ کھڑکی سے لگی کھڑی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔

"ملکہ عالیہ میں آ گیا ہوں۔ چابی مل گئی ہے۔"

"دروازہ کھولو۔ میں باہر آتی ہوں۔"

"باہر!"

"ہاں ہم قصر شاہی سے باہر نکلیں گے اور کہیں دور چلے جائیں گے۔"

"باہر نکلیں گے کیسے۔ ہر طرف نگراں موجود ہیں۔"

"مجھے خفیہ راستے کا علم ہے۔ تم مجھے اس کمرے سے تو باہر نکالو۔"

نوجوان اس پر ایسا فریفتہ ہو چکا تھا کہ فوراً عمل کیا اور اسے اس کے محل سے باہر نکال لیا۔ اس نے نوجوان کا ہاتھ تھام لیا۔ قلوپطرہ کا نرم و گداز ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ سانس لینا بھول گیا۔ "میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔"

وہ اندھیرے میں اندھیرا بنے آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت وہ ایک وسیع باغ سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر قلوپطرہ رک گئی۔ اس نے درخت گنے اور پھر زمین پر ہاتھ مار کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ آخر اس نے وہ زنجیر تلاش کر لی۔ نوجوان حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس زنجیر کو پوری طاقت سے کھینچو۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"دیکھتے جاؤ۔ تم زنجیر کھینچو۔"

نوجوان نے پوری طاقت سے زنجیر کھینچی۔ زمین اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔

"یہ وہ سرنگ ہے جو ہمیں قصر شاہی کے محلات سے باہر لے جائے گی۔"

"یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔"

"تم میرے ساتھ اندر اترو۔" قلوپطرہ نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اگر اجالا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ فرطِ جذبات سے نوجوان کی حالت کیا ہے۔

قلوپطرہ نے پہلے زینے پر قدم رکھا اور پھر سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ یہ سیڑھیاں تعداد میں تین چار سے زیادہ نہیں تھیں پھر ہموار زمین آگئی۔ نوجوان کا ہاتھ ابھی تک قلوپطرہ کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی ایک زنجیر لٹک رہی تھی۔ نوجوان نے وہ زنجیر کھینچی اور وہ سرنگ سے باہر آگئے۔

سرنگ سے باہر آتے ہی کچھ گھڑسوار نظر آئے۔

"شاید ہماری مخبری ہوگئی۔"

"ڈرومت یہ سب میرے آدمی ہیں۔"

"آپ نے تو کہا تھا آپ میرے ساتھ چلیں گی۔"

"تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

وہ پہرے دار اب سب کچھ سمجھ گیا تھا لیکن کچھ بولنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا یہ خوف جلد ہی دور ہوگیا ملکہ نے اپنا کام نکال لیا تھا۔ اب اسے اس نوجوان کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور نوجوان کا سر اتار کر زمین پر رکھ دیا۔

اب وہ بڑی آسانی سے فصیل کے عقب میں بہنے والی جھیل "سیر پونس" تک پہنچ سکتے تھے۔ اس جھیل کے شفاف سینے پر سیکڑوں کشتیاں تیرتی پھرتی تھیں لیکن اب دن نکلنے کو تھا۔ پکڑے جانے کے خوف سے انہوں نے کشتیوں کا رخ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ صحرا کی طرف موڑ دیا۔

☆......☆

اسکندریہ کے قصرِ شاہی میں اجلاس جاری تھا۔ تیرہ سالہ بطلیموس مرصع کرسی پر بے نیاز بیٹھا تھا۔ اس کے مشیر آپس میں گفتگو کر رہے تھے جیسے شہزادہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔

قلوپطرہ کے فرار ہوتے ہی کھلبلی مچ گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں گئی۔ جاسوس آج ہی خبر لائے تھے کہ وہ ملک شام میں ہے۔

"وہ صرف شام میں نہیں ہے بلکہ اپنی فوجیں جمع کر کے مقابلے کی تیاری کر رہی ہے۔" ایک مشیر نے دوسرے سے کہا۔

"کس سے مقابلے کی تیاری۔" شہزادے نے پہلی مرتبہ دخل دیا۔

"وہ آپ کے تخت پر قبضہ کرنے آرہی ہے۔"

"اب کیا ہوگا۔"

"ہونا کیا ہے ہماری فوجیں اس سے مقابلہ کریں گی۔"

"آپ لوگ تیاری کیوں نہیں کرتے۔" شہزادے نے کہا۔

"سپہ سالار ایکیلاس انتظام کر رہا ہے، فوجیں تیار ہیں۔"

اجلاس برخاست ہوگیا۔

شہزادے کی فوج ایکیلاس کی سربراہی میں اسکندریہ سے نکلیں اور مصر پہنچ کر بندرگاہ کے قریب خیمہ زن ہوگئیں۔ قریب ہی پیلوشیم کا قلعہ تھا جس میں شہزادہ بطلیموس اپنے مشیروں کے ہمراہ قیام پذیر ہوا۔

فوجوں کو یہاں صف آرا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر قلوپطرہ حملہ آور ہو تو اسے سرحد پر ہی روک لیا جائے۔

یہی وہ وقت تھا جب جنرل پومپی اسی جگہ سمندر میں نمودار ہوا۔ دور سے دیکھا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی رومی جہاز ہے۔

"شاید رومی ہماری مدد کو آگئے۔" شہزادے نے کہا۔

"نہیں اس وقت کوئی ہماری مدد کو نہیں آسکتا۔ اس جہاز میں یا تو پومپی اعظم ہے یا جولیس سیزر۔" پوتھی نوس نے خیال ظاہر کیا۔ "روم اس وقت خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے۔ اس وقت وہ ہماری مدد کو کیسے آسکتے ہیں۔"

"آپ ابھی تو کہہ رہے تھے کہ اس جہاز میں پومپی اعظم یا جولیس سیزر ہوں گے۔"

"میں نے اس لیے کہا تھا کہ دونوں میں سے جس کو شکست ہوئی ہوگی وہ فرار ہو کر پناہ کی تلاش میں اس طرف آیا ہوگا۔"

یہ معما حل نہیں ہو رہا تھا کہ ایک قاصد خشکی کے راستے دوڑا ہوا آیا اور پومپی کے آنے کی اطلاع دی۔

"پومپی اعظم میدان جنگ سے جولیس سیزر کے مقابلے میں شکست کھا کر اپنی بیوی کے ساتھ پہلے قبرص گیا اور وہاں سے اسکندریہ پہنچا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ اپنی فوجوں کے ساتھ پیلوشیم کے قلعے میں ٹھہرا ہوا ہے تو اس

نے جہاز کا رخ اس طرف موڑ لیا۔

اس وقت عنانِ حکومت ایسے مشیروں کے ہاتھ میں تھی جنہیں خوف تھا کہ جنرل پومپی مصر میں موجود شاہی سپاہیوں کی مدد سے مصر پر قابض ہو جائے گا۔

شہزادے نے اپنے مشیروں سے پوچھنا شروع کیا کہ پومپی کو پناہ دی جائے یا نہیں۔

''ہم اسے پناہ دے کر جولیس سیزر سے دشمنی مول نہیں لے سکتے لہٰذا پومپی کو صاف لفظوں میں جواب دیا جائے کہ وہ کسی اور ملک میں پناہ لے۔'' پوتھی نے پھر تجویز دی۔

''اسے پناہ دے دینی چاہیے ممکن ہے وہ کسی وقت سیزر پر غالب آجائے اور پھر ہمیں سزا دے۔ اس کے بعد تھیوڈوٹس تقریر کرنے کھڑا ہوا۔

''پناہ دینے میں بھی خطرہ ہے نہ دینے میں بھی۔ ہم سیزر سے بھی دشمنی مول نہیں لے سکتے، پومپی سے بھی۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ اس شکست خوردہ جنرل کو قتل کر کے سیزر پر احسان کیا جائے۔''

''جنرل پومپی کو قتل کرنا کوئی مذاق ہے کیا؟''

''سازشیں ہر کام کو آسان بنا دیتی ہیں۔''

یہ تجویز سب کو پسند آئی اور قتل کی ذمہ داری سپہ سالار ایکیلاس کے سپرد کی گئی۔ اس نے دو افسروں کو اعتماد میں لیا۔ یہ دونوں رومی تھے۔ ایک کا نام سیلوبس اور دوسرے کا نام سیٹیمیس تھا۔ ایکیلاس ان دونوں افسروں کے ساتھ کشتی میں بیٹھا اور کشتی جہاز کی طرف بڑھنے لگی۔

کشتی جہاز کے برابر لگی تو سیٹیمیس نے اٹھ کر پومپی کو باقاعدہ فوجی سلام کیا۔

''آپ کشتی میں آجائیں کیونکہ پانی گہرا نہیں ہے لہٰذا آپ کا جہاز ساحل تک نہیں آسکتا۔'' ایکیلاس نے کہا۔

''میں تمہارے بادشاہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو بادشاہ تک لے کر جائیں۔''

پومپی کے پاس یہ گنجائش ہی نہیں تھی کہ ان پر شک کرتا۔ وہ کچھ دیر ہچکچایا اور پھر کشتی پر آگیا۔

کشتی ساحل پر لگی۔ وہ کشتی سے اترنے ہی کو تھا کہ سیٹیمیس نے تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی سیلوبس اور ایکیلاس نے خنجروں کے پے در پے وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ قاتلوں نے پومپی کی لاش کو پانی میں ڈال دیا اور اس کا سر لے کر قلعے میں پہنچ گئے۔

روم کا جری جرنیل، مشرق کا فاتح اور سیزر کا دشمن پومپی جس کے قدموں میں آدھی دنیا سر جھکاتی تھی جس نے بڑے بڑے دشمنوں کو شکست دی۔ میدان جنگ سے بچ کر نکل آیا اور اس بدقسمت کی قسمت کا فیصلہ مصری حکومت کے تین مشیروں نے کر دیا۔

سازشی مشیر یہ سوچ رہے تھے کہ اس کٹے ہوئے سر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ سیزر اپنے حریف کا تعاقب کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچ گیا۔ پیلوٹیمی کے دربار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جولیس سیزر کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ پومپی کا سر اس کی خدمت میں پیش کر کے اس کی خوشنودی خریدی جا سکتی تھی۔ اگر وہ خوش ہو جاتا تو قلوپطرہ کے خوف سے ہمیشہ کے لیے نجات مل سکتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ سر سیزر کے پاس کون لے کر جائے۔ انعام کے لالچ میں تھیوڈوٹس آگے بڑھا۔ وہ روانہ ہوا اور اسکندریہ کی بندرگاہ پہنچ گیا۔ جولیس سیزر اپنے جہاز پر موجود تھا۔ وہ اپنی عمر کے 53 سال مکمل کر چکا تھا لیکن کشیدہ قامتی اور چھریرے بدن کی وجہ سے اپنی عمر سے کم معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اب بھی خوش رو کہا جا سکتا تھا۔

تھیوڈوٹس اجازت حاصل کرنے کے بعد اس کے جہاز پر گیا اور اسے پومپی کا کٹا ہوا سر پیش کیا۔ سیزر نے پومپی کا سر دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا۔ وہ اپنے دشمن کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سے گرفتار کر کے معاف کر دے گا اور پھر اس کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومت قائم کرے گا۔ وہ اس کا داماد بھی تھا۔ ماضی کے جھروکوں سے اسے نہ جانے کیا کیا نظر آنے لگا۔ وہ اس خونچکاں منظر کی تاب نہ لا سکا اور منہ پھیر کر بے اختیار رونے لگا۔

تھیوڈوٹس حیران کھڑا تھا کہ سیزر اسے انعام دینے کی بجائے آنسو بہا رہا ہے۔ سیزر کہہ رہا تھا۔ ''بدبخت دور ہو جا میری نظروں سے۔''

وہ سمجھ گیا کہ معاملہ بگڑ چکا۔ اس نے سیزر کی نظروں سے دور ہونے میں ذرا دیر نہیں کی۔ وہ نہ صرف جہاز سے بھاگ کھڑا ہوا بلکہ لوٹ کر شہزادے کے پاس بھی نہیں گیا۔ مصر سے بھاگا اور ایشیائے کوچک کی طرف نکل گیا۔

سیزر جس وقت مصر پہنچا تو ان دنوں اسکندریہ جھیل ماروٹک اور بحیرہ روم کے درمیان میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ دریائے نیل سے ایک بیس میل لمبی نہر اس شہر کو تازہ پانی

سپلائی کرتی تھی۔ واٹر سپلائی کا زیر زمین جدید ترین نظام تھا۔ شہر کی مشرقی جانب یہودیوں کی آبادی تھی۔ شاہی احاطے میں محلات اور سکندر اعظم کا مقبرہ تھا۔ یہ احاطہ مغربی جانب واقع تھا۔ اس علاقے میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ آباد تھے۔ رہائشی مکانات کے علاوہ بڑے بڑے کمرشل پلازہ تھے۔ ایک میوزیم اور لائبریری تھی۔ اس لائبریری میں ہزاروں نایاب قدیم کتب موجود تھیں۔

بندرگاہ کے درمیان پہاڑی کے اوپر مندر تھا جسے اسکندریہ کے لوگوں نے عالم آخرت کے دیوتا کے نام سے منسوب کر رکھا تھا۔ اس مندر پر حاضری دینے کے بعد لوگ تندرستی کے لیے دعا مانگتے تھے۔

لائٹ ہاؤس قدیم سات عجوبوں میں سے ایک تھا جو تین سو فٹ اونچا اور مشرقی جانب واقع تھا۔ اسے سمندر میں چالیس کلومیٹر دور سے دیکھا جا سکتا تھا اور جہازوں کو بندرگاہ میں داخل ہونے میں مدد دیتا تھا۔

اہل مصر کو اپنی آزادی پر بڑا ناز تھا لہٰذا اہل اسکندریہ سیزر اور اس کے سپاہیوں کو اس وقت سے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے جب سے انہوں نے بندرگاہ پر قدم رکھا تھا۔ وہ انہیں گالیاں دیتے تھے۔ انہوں نے بڑا زبردست احتجاج کیا، ہنگاموں میں سیزر کے کئی آدمی مارے گئے۔

سیزر اپنے جہاز پر جما بیٹھا تھا۔ اسے واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ صرف کمک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شہزادہ اور اس کے مشیر مطمئن تھے کہ سیزر کب تک جہاز پر پڑا رہے گا۔ ایک نہ ایک دن روم کی طرف پلٹ جائے گا۔

سیزر کمک کا انتظار کرتا رہا۔ جیسے ہی کمک پہنچی وہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ چار ہزار سور ماؤں کے جلو میں قصر شاہی کی طرف روانہ ہونے کے لیے جہاز سے اترا۔

روم کے مختار مطلق اور اس کی فوج کو یوں شہر میں داخل ہوتے دیکھ کر شہریوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کا بادشاہ اور فوجیں شہر میں تھیں پھر یہ کون ہوتا ہے شہر میں داخل ہونے والا۔ شہری اس کے فوجیوں سے الجھ پڑے لیکن وہ خود قصر میں داخل ہو گیا۔

شہزادہ بطلیموس ابھی تک پیلوشیم میں تھا۔ قلوپطرہ اپنے بھائی سے جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔

وہ شاہی محل میں ہر طرح سے محفوظ تھا لیکن خدشہ یہ تھا کہ شہریوں سے جھڑپیں شدت اختیار نہ کر لیں۔ اس کی توقع کے برخلاف شہریوں کا غصہ بہت جلد ختم ہو گیا۔

یہ ہو سکتا تھا کہ سیزر واپس لوٹ جاتا لیکن حالیہ جنگوں نے اسے معاشی طور پر کمزور کر دیا تھا اور اسے ابھی پومپی کے دوسرے ساتھیوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی چنانچہ اس نے سالوں پہلے کیے گئے وعدے کے مطابق دس لاکھ دینار کا مطالبہ کر دیا۔ پوتھی نس نے وعدہ کیا کہ وہ یہ رقم اٹلی پہنچا دے گا۔ سیزر نے یہ درخواست رد کر دی۔ اٹلی کی فضا سازگار نہیں اس لیے وہ یہ رقم لے کر جائے گا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ مصری خانہ جنگی سے جو خطرناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے اسے ختم کر کے واپس جائے تاکہ کوئی دشمن اس صورت حال سے فائدہ نہ اٹھا سکے چنانچہ وہ رقم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شاہی محل کے اس حصے میں خیمہ زن تھا جہاں وہ شاہی محل کی کھڑکی سے لائٹ ہاؤس اور سمندر کا نظارہ کر سکتا تھا۔

اس نے نوجوان بطلیموس اور قلوپطرہ کو حکم دیا کہ اپنی اپنی فوج ختم کر کے اس کے پاس حاضر ہوں تاکہ ان کے درمیان کشیدگی کو ختم کیا جا سکے۔

پوتھی نس اور ایکیلاس نے اس حکم کو بڑی حقارت سے دیکھا اور ایک منصوبہ بندی کے تحت اپنی فوج نیل ڈیلٹا سے اسکندریہ منتقل کر دی اور کیولری فورس کی مدد سے محل کی طرف جانے والے تمام راستے مسدود کر دیے۔ جس سے سیزر کے تمام سمندری اور زمینی رابطے منقطع ہو گئے۔ سیزر ایکیلاس سے وجہ دریافت کرنے کے لیے جب سفیر بھیجے تو اس نے پیغام سنے بغیر انہیں قتل کروا دیا۔

قلوپطرہ سخت پریشان تھی۔ اس کی بحالی کا واحد طریقہ یہ تھا کہ جولیس سیزر اس جھگڑے کا فیصلہ کرے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ سیزر سے ملاقات کرے لیکن ایکیلاس نے بڑی ہوشیاری سے قلوپطرہ کو بھی محل تک پہنچنے سے روک رکھا تھا۔ ہر طرف نگرانی کی جا رہی تھی۔ ایکیلاس تک اس کی ٹڈی دل فوج کے درمیان سے گزر کر جانا تقریباً ناممکن تھا۔

ایک روز اس نے وہ کیا جو صرف وہی کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی فوج کو پیلوشیم میں چھوڑا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر جہاز میں سوار ہو گئی۔ صرف ایک جاں نثار اپالوڈورس اس کے ساتھ تھا جس کے سہارے وہ اسکندریہ کی طرف چلی جا رہی تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ جہاز سے اتر کر ایک کشتی میں سوار ہو گئی۔ رات کی تاریکی میں کسی آنکھ نے کسی کشتی کو بندرگاہ میں داخل ہوتے ہوئے

نہیں دیکھا یا اگر دیکھا تو کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی کشتی دیوارِ قصر کے نیچے کھڑے ہوئے پانی میں ہولے ہولے ڈول رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں قصرِ شاہی تک پہنچنے اور داخل ہونے کے خطرات کا تصور کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شہزادے اور اس کے ساتھیوں کا پورے محل میں تصور ہو گیا۔ میں محل کی سیڑھیوں تک نہیں پہنچوں گی کہ شہزادے کے سپاہی مجھے قتل کر دیں گے۔ وہاں سے بچ نکلی تو کسی برآمدے میں قتل کر دی جاؤں گی۔ میں سیزر تک زندہ پہنچ بھی سکوں گی؟

وہ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ پھر اچانک اس کی ذہانت نے اسے ایک ترکیب سجھائی۔ اپالوڈورس اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ ایک کمبل میں لپٹ گئی۔

''مجھے بستر کی طرح لپیٹ کر اوپر سے رسی باندھ لو اور کاندھے پر اٹھا کر کسی دروازے سے محل میں داخل ہو جاؤ کوئی پوچھے تو کہہ دینا میں اپنے رومی دوست کے لیے بستر لے کر آیا ہوں۔''

اپالوڈورس نے یہی کیا۔ اسے کمبل میں لپیٹا اور بستر کی طرح رسیوں سے باندھ کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ اتنی نرم و نازک تھی کہ اپالوڈورس نے اسے کھلونے کی طرح اٹھایا۔ پھول کی طرح کندھے پر رکھ لیا اور قصر کی دیوار طے کر کے ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ پہرے داروں نے روکا تو اس نے یہی کہا کہ میں اپنے رومی دوست کے لیے بستر لے کر آیا ہوں۔ شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ بستر اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

محل میں مصری فوج کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ قدم قدم پر رومی سپاہی کھڑے تھے۔ ان سپاہیوں کو دیکھ کر اس کا کام آسان ہو گیا۔

''عزت مآب جولیس سیزر کہاں ہیں۔'' اس نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

''ان سے تمہیں کیا کام ہے۔''

''ان کے لیے تحفہ لایا ہوں۔ میں کون ہوں یہ میں انہی کو بتاؤں گا۔''

''ہمارے دو سپاہی تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

''بے شک جائیں۔''

دو سپاہیوں کی دھمکی تو انہوں نے اسے ڈرانے کے لیے دی تھی۔ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ سیزر سے اجازت لینے کے بعد اسے اندر بھیج دیا گیا۔

''ایسا کیا تحفہ لائے ہو جسے اس کمبل میں چھپانے کی ضرورت پڑی۔''

''آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیں۔'' اپالوڈورس نے کہا اور کمبل فرش پر رکھ کر کمبل کی رسی کھول دی۔

سیزر اس وقت حیران رہ گیا جب اس کمبل سے ایک نازک اندام حسینہ نکل کر کھڑی ہوئی۔ سیزر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے لیکن اس وقت تمام ماجرا سمجھ میں آ گیا جب اس کھلونے نے بولنا شروع کیا۔

''میں قلوپطرہ ہوں ملکہ مصر۔''

اس تعارف کو سنتے ہی اس کے ہاتھ سے جام چھوٹ گیا۔

''آپ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔'' قلوپطرہ نے کہا۔

''ہم حسن کا ایسا بے مثال مجسمہ آج ہی دیکھ رہے ہیں۔''

قلوپطرہ نے سیزر کے معاشقوں کی کئی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس نے وہ گیت بھی سن رکھا تھا جو سیزر کے لیے مشہور تھا۔

''شہر والو سنو! اپنی آبرو سنبھال رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جولیس سیزر تمہاری عورتوں کو فریفتہ کر لے۔''

اب سیزر کی نہیں قلوپطرہ کی باری تھی کہ وہ اسے فریفتہ کرے۔ وہ آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ سے جام تیار کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ کو میری مظلومیت کی داستان کا علم تو ہوگا۔''

''ہم نے کچھ باتیں سنی تو ہیں لیکن تمہاری زبان سے سن لیں تو اچھا ہے۔''

''میرے بھائی نے مجھے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں صحراؤں کی خاک چھانتی پھر رہی ہوں۔ سازشیوں نے اسے گھیر رکھا ہے اور وہ ان کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے۔'' وہ اپنی داستان شروع سے آخر تک سنا رہی تھی اور سیزر کا ذہن تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اگر میں قلوپطرہ کے دل میں اتر جاؤں تو بہت سے سیاسی مفادات حاصل کر سکتا ہوں۔ مصر کا یہ زرخیز ملک بحیرہ روم کی سب سے بڑی تجارتی منڈی اس عورت کی بدولت میرے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس عورت کے جذبات بھڑکا کر میں بہت سے فائدے حاصل کر سکتا ہوں۔ اس وقت ملکہ مصر بھی ضرورت مند ہے اور میں بھی۔ وہ جو کچھ سوچ کر نہیں آیا تھا اب سوچ رہا تھا۔

قلوپطرہ بھی اپنے حسن کے قصیدے سننے کے درمیان

سوچ رہی تھی۔ سلطنت سے باہر کی ایک طاقت ور کی حمایت ہی مجھے تاج شاہی دلا سکتی ہے۔ سیزر کے بغیر میری جنگ بے کار ثابت ہوگی۔ مجھے یا تو قتل کر دیا جائے گا یا جلاوطن۔

وہ نصف شب تک اپنی مظلومیت کی داستان سناتی رہی اور سیزر اس کی زلفوں سے کھیلتا رہا۔ کون جانے کس نے کس کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس وقت تو دونوں ہی مسحور تھے۔ شہزادہ ان دونوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شطرنج کی بساط پر اس وقت دو ہی کھلاڑی تھے۔ قلوپطرہ اور سیزر، سیزر اور قلوپطرہ۔

صبح ہوئی اور دونوں بستر عیش سے بیدار ہوئے تو سیزر نے قلوپطرہ کے بھائی کو پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے اور معاملات کو باہمی صلح پر حل کرے۔

سیزر کے بلانے پر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو پہلا دھچکا اسے یہ لگا کہ جس قلوپطرہ کو وہ غائب سمجھ رہا تھا محل میں موجود ہے۔ دوسرا دھچکا یہ لگا کہ وہ سیزر کے پہلو میں اس طرح بیٹھی ہے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ جیسے ملکہ ہو۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ سیزر اس کے استقبال کے لیے کھڑا تک نہیں ہوا اور اس کے دل خراش الفاظ اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگے۔

”جس وصیت کا بجالانا تم پر فرض تھا تم نے اس کی خلاف ورزی کس طرح کی۔ اب بھی یہی مناسب ہے کہ تم اپنی بہن سے صلح کر لو۔“

یہ سراسر قلوپطرہ کی طرف داری اور شہزادے کی توہین تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ بازی الٹ گئی۔ وہ روتا ہوا باہر کی طرف بھاگا اور اس مجمع کے سامنے پہنچا جو صبح سے فیصلہ سننے کے لیے محل کے باہر جمع ہو گیا تھا۔ شہزادے نے اپنا تاج سر سے اتار کر پھینک دیا اور زار و قطار رونے لگا۔

”مجھے فریب دیا گیا ہے۔ قلوپطرہ کی طرفداری کی جا رہی ہے۔ تم پر فرض ہے کہ اس ناانصافی پر علم بغاوت بلند کرو۔“

اہل مصر کو معلوم تھا کہ نوجوان بادشاہ بگڑا ہوا بچہ ہے اور اپنے مشیروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے لیکن یہ بات ان کے لیے قابل قبول نہیں تھی کہ ایک رومن اسے ذلیل کرے۔ مجمع بپھر گیا۔ سیزر کے خلاف نعرے بلند ہونے لگے۔ لوگوں نے محل پر زبردستی قبضہ کرنے کی دھمکی دے دی۔ شور سن کر سیزر اپنے کمرے سے نکلا اور محل سے باہر آیا۔ بپھرا ہوا مجمع اسے دیکھ کر مزید مشتعل ہو گیا۔ اس کے سپاہیوں نے بڑی مشکل سے مجمع کو قابو کیا۔ سیزر نے ان سے خطاب کیا۔ ”میں اس محل میں اکیلا نہیں ہوں اور نہ ہی میں تمہارے ملک پر قبضہ کرنے کا خواہش مند ہوں۔ جو بھی فیصلہ ہوگا وہ شہزادے اور اس کی بہن کی رضامندی سے ہوگا۔ میں تو محض ثالثی کا کردار ادا کرنے آیا ہوں۔ میں تو جھگڑا نمٹانے اور بھائی بہن کے درمیان صلح کرانے آیا ہوں۔ اگر میں چلا گیا تو بہن بھائی ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ کچھ دن صبر کریں۔ جو بھی فیصلہ ہوگا آپ کے فائدے کے لیے ہوگا۔ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

اس کی اس یقین دہانی کے بعد شورش میں کچھ کمی آئی۔ وہ شہزادے کو اندر لے آیا۔ ”آپ اپنی فوجوں کو حملے سے باز رکھیں تاکہ میں اسمبلی کا اجلاس طلب کر کے اس معاملے کا تصفیہ کراؤں۔“

جب اسے یقین دہانی کرا دی گئی تو اس نے اجلاس طلب کیا جس میں قلوپطرہ اور شہزادہ بھی موجود تھا۔

سیزر تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ تقریر کرنے سے پہلے اس نے وصیت پڑھ کر سنائی۔

”یہ وصیت اس وقت پومپی اعظم کے حوالے کی گئی تھی جب وہ مملکت روم کا مالک کل تھا۔ اب اس کے بعد میری وہی حیثیت ہے جو پومپی اعظم کی تھی لہٰذا رومۃ الکبریٰ کا نمائندہ میں ہوں۔ اس جھگڑے کا تصفیہ کرانا میری ذمہ داری ہے۔“

شہزادہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔

”یہ وصیت اس لیے کی گئی تھی کہ مصری قاعدے کے مطابق قلوپطرہ مجھ سے شادی کر لے گی اور اس کے پردے میں حکومت میں کروں گا لیکن اس نے اپنی خودمختاری قائم رکھنے کے لیے مجھ سے شادی نہیں کی۔“

”اس وصیت میں شادی کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔“ قلوپطرہ نے کہا۔

”شادی کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن وصیت کی روح بھی ہے۔ میرے والد یہی چاہتے تھے۔“

”وہ کیا چاہتے تھے ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں وصیت کے الفاظ سے بحث ہے۔“ سیزر نے دخل اندازی کی۔

”میں بڑا بیٹا ہوں حکومت میری ہونی چاہیے۔“

”مصری قانون کے مطابق حکومت بڑی اولاد کو ملتی

ہے۔ اس میں لڑکے یا لڑکی کی تخصیص نہیں۔" اجلاس میں موجود لوگوں نے اس کی تائید کی۔ سیزر نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "آپ نے پومپی اعظم کو قتل کرا کے اس وصیت کو مٹانا چاہا تھا۔ آپ مشترکہ حکومت کے حق میں تھے ہی نہیں۔"

پومپی کا قتل اپنے سر آتا دیکھ کر شہزادہ بوکھلا گیا۔ اس کی ضد اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ اس کی دلیلیں دم توڑ گئیں اور قلوپطرہ سے صلح کرنے پر مجبور ہوگیا۔ صلح کا مطلب یہ تھا کہ شہزادہ ہمیشہ قلوپطرہ کا زیردست رہے گا۔ قلوپطرہ کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس کی رات بھر کی محنت اس کے کام آگئی۔ سیزر اس کے دامِ الفت میں ایسا اسیر ہوا کہ گھر کا رستہ بھول گیا۔ قصرِ شاہی کے تعیشات اور ملکہ کا قرب اسے حاصل تھا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اسے تو یہ احساس بھی نہیں رہا کہ اس کی غفلت سے اس کا دشمن کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ایکیلاس بیس ہزار آزمودہ سپاہیوں کے ساتھ شہر کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ یہ فوج سیزر کی فوج سے پانچ گنا بڑی تھی۔ دوسری جانب بندرگاہ پر پچاس جہاز کھڑے تھے جو مصر نے پومپی کی مدد کے لیے بھیجے تھے اور تھسلی کی جنگ کے بعد واپس آگئے تھے۔ یہ جہاز جنگی آلات سے مزین تھے۔ ان کے علاوہ 22 جہاز الیگزینڈریا کے ساحل پر کھڑے تھے۔ اگر یہ بحری بیڑہ سیزر کے چھوٹے سے بحری بیڑے پر قبضہ کرلیتا تو سیزر کا سمندری رابطہ بھی ختم ہو جاتا اور اس کی سپلائی لائن بھی کٹ جاتی۔ تیسری جانب مصری عوام رومی سپاہیوں کا ناطقہ بند کیے ہوئے تھے۔ چوری چھپے ان پر حملے کررہے تھے۔

سیزر شام اور ایشیائے کوچک کی طرف اپنے سفیر بھیج سکتا تھا لیکن اس میں ہفتوں لگ سکتے تھے۔ قلوپطرہ اسے بھڑکانے کے لیے اس کے بستر پر موجود تھی۔ شاید اسی کے کہنے پر سیزر پرائی آگ میں کود پڑا۔ اس نے بادشاہ (قلوپطرہ کا بھائی) کو گرفتار کرلیا اور اس کے مشیر پوتھی نس کو قتل کروادیا۔

سیزر نے مصری فوج کی تعداد دیکھ کر دفاعی پوزیشن میں رہتے ہوئے جنگ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے محل کے اردگرد خندقیں اور ٹاورز تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ سیزر کا کوئی عمل بھی مصر پر کارگر ثابت نہیں ہورہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کا نعرہ مصر کی سیاست اور آزادی تھا۔

اہلِ مصر نے تمام ملحقہ قصبوں اور شہروں میں اس نعرے کے ساتھ رومیوں کے خلاف لوگوں کو جنگ کے لیے پکارا۔ ہزاروں مسلح جنگجو شہر میں داخل ہوگئے۔ ان کے پیچھے باقاعدہ آرٹلری فورس تھی۔ شہر کے لوگوں نے چالیس فٹ اونچی پتھروں کی رکاوٹیں بنا کر رومنوں کی موومنٹ کو روک دیا۔

مصر نے ایک جانب تو رومنوں پر حملے شروع کردیے اور دوسری جانب اپنے دفاع کو انتہائی مستحکم بنالیا۔ مصریوں کو علم تھا کہ سمندر پار امداد آنے سے قبل سیزر کو شکست دینا بہت ضروری ہے۔ زمینی جنگ کے ساتھ ساتھ سمندری جنگ کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ مصریوں کا خیال تھا کہ رومن بیڑے کی تباہی سے سیزر کا بیرونی دنیا سے رابطہ ختم ہوجائے گا لہٰذا وہ رومن جہازوں کو نشانہ بنا رہے تھے لیکن سمندری جنگ میں مصریوں کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ اپنے بیشتر جہازوں کو گنوانے کے بعد پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

سیزر نے اس موقع پر ایک ایسی حرکت کی جس نے سب کو چونکا دیا۔ یہ ایک بڑا خطرناک قدم تھا جو بظاہر ناقابلِ فہم تھا۔ اس نے اپنے بحری جہازوں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا۔

جہازوں کو جلانے کے بعد سیزر نے سمندر تک پہنچنے والے راستے کو محفوظ کرنے کے لیے جزیرے کے مشرقی حصے پر حملہ کرکے نزدیکی آبادی کو تباہ کردیا۔ لائٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا اور وہاں اپنی فوج کا ایک حصہ متعین کردیا۔

مصریوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ خطرناک قدم اٹھایا گیا۔ انہوں نے ان لائنوں میں سمندری پانی شامل کردیا جن سے سیزر کی فوج پانی حاصل کرتی تھی۔ پانی پینے کے لائق نہیں رہا۔ سیزر کی فوج ہفتوں بھوکی تو رہ سکتی تھی لیکن پیاس نے انہیں پریشان کردیا۔ انہوں نے سیزر سے التجا کی کہ وہ مصر کا محاصرہ اٹھا کر فوراً واپسی کا حکم صادر کرے۔ سیزر نے ماضی کی طرح غصے میں آنے کی بجائے بڑی نرمی سے اپنے سپاہیوں کو سمجھایا۔

"ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ دشمن ہمارے سروں پر مسلط ہے۔ یہ گال کا علاقہ نہیں کہ جہاں پہاڑیاں اور جنگلات تھے اور ہم روپوش ہوسکتے تھے۔ یہاں ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی دفاعی پوزیشن ختم نہیں کرسکتے۔"

وہ خود بھی سوچنے لگا تھا کہ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے

گا لیکن ایک ترکیب نے اسے یہاں رہنے کا موقع دے دیا۔ سیزر نے حکم دیا کہ قصر میں کنویں کھودے جائیں۔ مصری زمین میں پانی بہ آسانی دستیاب تھا جس کے لیے چند فٹ گہرا کھودنا پڑتا تھا۔ اس کی فوج نے راتوں رات کنویں کھود کر پانی کا مسئلہ حل کرلیا۔

قلوپطرہ ایک مرتبہ پھر بلاشرکت غیرے مصر کی ملکہ بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ اس کے خواب اس وقت حقیقت بنتے نظر آئے جب ایک طاقت ور بیڑا رسد، ہتھیار اور قلعہ شکن آلات لے کر سیزر کی مدد کو آگیا۔ یہ بیڑا کھلے ساحل پر لنگر انداز تھا۔ سیزر ایک کشتی پر سوار ہوا اور اس بیڑے سے جاملا۔ اس کے جہازوں نے جزیرے کے مغرب میں اتر کر اس کے قلعوں کو تابڑ توڑ حملوں سے فتح کرلیا۔ یکایک مصریوں نے بندرگاہ کے شمالی حصے پر اس زور کا حملہ کیا کہ سیزر کے سپاہی چاروں طرف سے نرغے میں آگئے۔ بہت سے قتل ہوئے باقی پانی میں کود پڑے اور اپنے جہازوں میں چڑھ کر جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔

جولیس سیزر بھی ایک جہاز پر چڑھ گیا مگر اس میں اتنے سپاہی چڑھ گئے کہ جہاز ان کے بوجھ سے ڈوب گیا۔ جہاز کو ڈوبتے دیکھ کر وردی سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دی اور جزیرے کی طرف تیرنے لگا۔ وہ لڑکپن میں دریائے ٹائبر میں تیرتا رہا تھا لیکن اب 53 سال کی عمر میں بھاری بھرکم ہتھیاروں کے ساتھ تیرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ وہ خطرے میں تھا پھر بھی اس نے کوشش کی کہ جنگی دستاویزات بچا سکے۔ بہت سے ضروری کاغذات اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے تھا اور سرخ لبادہ جو اس کے فوجی منصب کا نشان تھا اس کے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ ساحل کے قریب ہی قریب تیرتا رہے۔ ساحل پر جمع لوگوں نے اس کے سرخ لبادے سے اسے پہچان لیا۔

یہی ہے سیزر۔

سیزر یہی ہے۔

دیکھو جانے نہ پائے۔

ہماری آزادی کا دشمن سیزر یہی ہے۔

یہ آوازیں مختلف سمت سے ابھریں اور پھر لوگوں نے پتھراؤ شروع کردیا۔ وہ ان پتھروں سے بچنے کے لیے بار بار اپنے سر کو پانی میں چھپاتا تھا اور پھر باہر نکال لیتا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ ان میں سے کوئی پتھر اس کا کام تمام کردے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے تھے۔ وہ ڈوبنے ہی کو تھا کہ ایک جہاز پہنچ گیا اور اسے جہاز پر چڑھ کر جان بچانے کا موقع مل گیا لیکن وہ اپنے سرخ لبادے کو نہ بچا سکا۔

وہ قصر شاہی کے گھاٹ پر پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ قلوپطرہ بے چینی سے اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسے پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ اسے امید نہیں تھی کہ سیزر اس تک زندہ پہنچ جائے گا لیکن جب اس نے قصر میں قدم رکھا تو اس کی شجاعت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

مصری اس مسلسل جنگ سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے سیزر کے پاس امن کے لیے سفارت بھیج دی۔ ان کا اصرار تھا کہ اگر ان کے بادشاہ (قلوپطرہ کا بھائی) کو چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کی رہنمائی میں صلح کی شرائط طے کرنے کو تیار ہیں۔ سیزر اس مطالبے پر بڑا حیران ہوا۔ اسے علم تھا کہ نوجوان بادشاہ نالائق اور عسکری تجربے سے نابلد ہے۔ اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ لوگوں کو متاثر کرسکے۔ پھر بھی عوام اس کی رہائی کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اس نے بڑے محتاط انداز سے اس پیغام کا جائزہ لیا۔ بظاہر بادشاہ کی رہائی میں اسے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ اگر رہائی کے بعد بادشاہ اس کے خلاف ہو بھی جاتا ہے تب بھی اسے شکست دے کر یہ ثابت کرسکتا تھا کہ اس نے ایک جائز حکمران کو شکست دی ہے۔ مزید یہ کہ یہ بادشاہ مصریوں کی تقسیم کا باعث بھی بنے گا۔ کچھ اس کی حمایت کریں گے اور کچھ اس کی بہن کی اور پھر سیزر مصریوں کو شکست دینے کے بعد رومن لیڈر کی حیثیت سے نوجوان بادشاہ کو باغی قرار دے کر قلوپطرہ کو اقتدار سونپ سکتا تھا۔ اس نے سوچا بادشاہ کی رہائی ایک نیک شگون ہوگا۔ اس نے طے کیا اور قلوپطرہ کو لے کر خواب گاہ میں چلا گیا۔

☆......☆

شہزادہ جتنا پریشان ہوسکتا تھا اس وقت ہورہا تھا۔ اسے حکم ملا تھا کہ وہ محل سے نکل جائے اور اپنی فوج کے پاس چلا جائے۔ سیزر اسے رہا کررہا تھا۔ وہ اس حکم کی اصلیت پر غور کررہا تھا۔ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ اس کے خلاف گہری سازش ہے۔ جنگ کی صورت میں مصری فوج یقیناً شکست کھائے گی اور اس صورت میں سیزر ہرگز مجھ پر رحم نہیں کھائے گا۔ اگر قتل نہیں بھی کیا گیا تو بادشاہت تو ہاتھ سے گئی۔ اس کے برخلاف اگر محل میں رہا تو شکست کے

بادجود وصیت کے مطابق قلوپطرہ کے ساتھ مل کر حکومت کرنے کا حق دار رہوں گا۔ پھر اسی وقت اسے یہ خیال آیا کہ وہ بادشاہ ہے۔ سیزر اسے بلانے والا کون ہوتا ہے۔ اسے اگر کوئی بات کرنی ہے تو خود چل کر میرے پاس آئے۔ اس نے سیزر کو بلا بھیجا۔

سیزر اس کے حکم پر آیا ضرور لیکن اس شان سے جیسے کوئی جیلر کسی قیدی سے ملنے آتا ہے اور اجازت لیے بغیر ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"تم ایک قیدی ہو لیکن میں پھر بھی قلوپطرہ کا خیال کرتے ہوئے تمہارے بلانے پر آ گیا ہوں۔ جلدی کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"مجھے تمہارا حکم ملا ہے کہ میں شاہی محل چھوڑ دوں۔" شہزادے نے کہا۔

"بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے۔" سیزر نے کہا۔

"اس فوج کو میں نے نہیں بلایا۔"

"فوجیں ہیں تو تمہاری۔"

جب شہزادے نے دیکھا کہ دلیلوں سے کام نہیں چلے گا تو اس نے مصنوعی آنسو بہاتے ہوئے سیزر سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے مصری عوام کے حوالے کر دیا جائے۔

"سیزر میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ تمہارا وفادار رہوں گا۔"

"میں فیصلہ کر چکا ہوں۔"

اس کی التجا اس کے آنسو سب بے کار گئے۔ اس محل سے نکال کر مصری فوج میں بھیج دیا گیا۔ وہ بھی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق تھوڑی سی فوج محل کے محاصرے کے لیے چھوڑ کر شاہی فوج سے مقابلے کے لیے نکل گیا۔

سیزر بھی قصر شاہی کی دیوار سے اترا اور اپنے فوجیوں سے لدے ہوئے جہازوں کو لے کر سمندر میں کود گیا۔ ناتجربہ کار شہزادہ بھلا سیزر کی چال کو کیا سمجھتا۔ وہ تو اس وقت حیران ہوا جب اس نے دریائے نیل کے قریب ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر سیزر کو دیکھا جو شاہی فوج کے ساتھ مل کر اس پر حملے کے لیے چلا آ رہا تھا۔

شہزادے کی فوج دریائے نیل کے مغربی کنارے پر خیمہ زن تھی کہ رومنوں نے مصریوں پر حملہ کر دیا اور انہیں دریا کی طرف دھکیل دیا۔ پھر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ دریائے نیل میں ایک کشتی پڑی تھی۔ شہزادہ جان بچانے کے لیے اس میں سوار ہو گیا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر اس کے بچے کھچے فوجی بھی بڑی تعداد میں کشتی پر سوار ہو گئے۔ بوجھ اتنا زیادہ ہو گیا کہ کشتی ڈوب گئی۔ چند روز بعد بدنصیب شہزادے کی لاش مل گئی جو اس کی سنہری زرہ بکتر سے پہچانی گئی۔

سیزر اپنے رسالوں کے ساتھ اسکندریہ میں داخل ہوا۔ شہریوں نے اس کے استقبال کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے اور جان کی امان کے طلب گار ہوئے۔ انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے بت اس کی خدمت میں بھیجے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ہم پورے طور پر تمہاری اطاعت کریں گے۔

وہ شاہی محل میں داخل ہوا تو قلوپطرہ اپنے نجات دہندہ سے ہم آغوش ہونے کے لیے سولہ سنگھار کیے تیار تھی۔ اب کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ قلوپطرہ تخت نشیں ہو چکی تھی۔ پس پردہ سیزر ہی حکومت کر رہا تھا۔ قلوپطرہ کی محبت سے لطف اندوز ہونے کے ایسے مواقع مل رہے تھے کہ روم کی واپسی کا راستہ ہی بھول گیا۔ اس کا یہ احسان کچھ کم نہیں تھا کہ اس کی بدولت مصر کے تمام ذرائع ایک مستقل دھمکی ہوتا۔ نیل کی سرسبز و شاداب وادی اس گورنر کے لیے حد درجہ تحریص کی موجب بنتی اور وہ روم کو تجارت کی عارضی بندش کے ذریعے بھی زیر کر سکتا تھا جب کہ قلوپطرہ معاہدے کی پابند ہونے کے باعث محبت سے زیادہ ایک آئیڈیل وفادار حکمران ثابت ہو سکتی تھی۔ قلوپطرہ کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے سیزر اور اس کی فوج کی ضرورت تھی۔ سیزر نے بھی ضروری سمجھا کہ مصر کو آزاد رکھا جائے۔ یہاں اپنا گورنر متعین نہ کیا جائے۔

مصر بھی اس کے لیے دوسرا روم بنا ہوا تھا کہ قلوپطرہ نے اسے بتایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ یہ ایک اور موقع تھا جب وہ اس رسوائی سے بچنے کے لیے مصر چھوڑ سکتا تھا لیکن اس ملک کی دولت اس کے حوصلوں کو فروغ دے رہی تھی۔ دریائے نیل کے جنوب میں کالی زمین پر بحیرہ روم کے قدیم لوگ آباد تھے۔ اہرام سے نیل کی پہلی آبشار تک اس کالی زمین پر دس ہزار زرعی فارم موجود تھے جو سونا اگلتے تھے۔ یہ سرسبز و شاداب علاقہ نہ صرف رومنوں کو خوش کر سکتا تھا بلکہ اسکندریہ کے خزانے بھی سونے سے بھر سکتے تھے۔ مصر کے راستے ہندوستان کے ساتھ تجارتی سلسلہ

قائم تھا۔ اسی مصر کے جنوب میں ایتھوپیا کی سرزمین تھی۔ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کو تسخیر کرنے کی آرزو بھی اس کے دل میں کروٹیں لینے لگی تھی۔ اسے فکر تھی تو یہ کہ اگر قلوپطرہ کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تو مصریوں کا ردعمل کیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے روم کی طرف واپس لوٹنا پڑے جو کہ وہ ابھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے قلوپطرہ کی توجہ اس طرف دلائی۔

"قلوپطرہ! میں ایک بات سے بہت پریشان ہوں۔"

"سیزر پریشان بھی ہوتا ہے۔"

"قلوپطرہ اس وقت مذاق مت کرو، میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"چلو نہیں کرتی مذاق اب بتاؤ کیا بات ہے۔"

"تم نے بتایا ہے تم بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

"ہاں۔"

"سب جانتے ہیں کہ ہم نے شادی نہیں کی ہے۔ کہیں سکندریہ کے عوام ہمارے خلاف نہ ہوجائیں۔"

"ہماری شادی آسمان پر ہوچکی۔ زمین پر انسانوں کے رشتے ہوتے ہیں اور سیزر تم انسان نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں انسان نہیں تو اور کیا ہوں۔"

"تم زمین پر مشتری دیوتا کے اوتار ہو۔"

"میں تو دیوتاؤں کو مانتا تک نہیں اور تم کہہ رہی ہو میں اوتار ہوں۔"

"تمہیں یہی کہنا ہوگا بلکہ میں لوگوں کو یقین دلاؤں گی کہ تم اوتار ہو۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"لوگ تمہیں اوتار سمجھ کر سجدہ کیا کریں گے۔"

"لوگ مجھے اوتار مان لیں گے؟"

"اہلِ مصر بڑے ضعیف الاعتقاد ہیں۔ ایسے قصے بہت سے مصری بادشاہوں کے لیے مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے گناہ چھپانے کے لیے خود کو اوتار مشہور کرلیا تھا۔ تم انہی میں سے ایک ہو۔"

ابھی قلوپطرہ کو ماں بننے میں دو مہینے باقی تھے کہ اس نے سیزر کے مقدس آسمان اوتار ہونے کی خبر چاروں طرف پھیلادی اور یہ خوش خبری بھی دے دی کہ وہ اس اوتار کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ایسی خبروں کے تو پر لگے ہوتے ہیں۔ اسکندریہ سے مصر تک پرواز کرگئی۔ جہاں چند لوگ جمع ہوتے اس خبر پر تبصرے شروع ہوجاتے اور فخر کیا جاتا کہ آسمانی دیوتاؤں نے ان کے ملک کو اس قابل سمجھا۔ بعض لوگ توبہ کرتے کہ وہ اب تک سیزر کو برا کہتے رہے ہیں۔

مندروں میں ایسی تصاویر بنادی گئیں جن میں قلوپطرہ کو مشتری دیوتا کے اوتار سے ہم کلام دکھایا گیا تھا اور اس کے زچہ خانے میں آسمانی دیوتاؤں کو اہتمام کرتے دکھایا گیا تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے سیزر کے دل میں بادشاہت کا خیال پختہ کرنا شروع کردیا۔ روم میں جمہوریت تھی لیکن اب سیزر جمہوریت کو اپنے مرتبے سے پست سمجھنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا وہاں بادشاہ ہو اور پورا روم اس کے زیرِقدم ہو۔ قلوپطرہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر سیزر بادشاہ بن گیا تو ملکہ کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے گا۔ اس کا بچہ آدھی دنیا کا مالک بنے گا۔ روم کی دست برد سے اس کا ملک مصر بھی بچا رہے گا بلکہ مصر کی یہ حیثیت ہوگی کہ تمام روم پر حکومت کرے۔

سیزر کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ کسی شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اسے یہ اعزاز اسی وقت حاصل ہوسکتا تھا جب وہ قلوپطرہ سے تعلق جوڑے رکھے۔

قلوپطرہ پوری طرح اس کی مٹھی میں تھی۔ اب وہ پوری دنیا فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی عالم گیر سلطنت کا نقشہ بنانے میں مشغول ہوگیا جس پر اس کی اولاد مدتوں حکمرانی کرے۔ الیگزینڈر دی گریٹ تو جوانی سے اس کا آئیڈیل تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا جب وہ اس عظیم فاتح کی پیروی کرے۔ اس کے لیے پہلے مرحلے میں ضروری تھا کہ مصر کے مقبوضات و وسائل سے واقفیت حاصل کرے۔

وہ نیل کے راستے جنوبی مصر تک سفر کرنے کا خواہاں تھا۔ اس نے ایک شاہی بیڑا تیار کیا اور قلوپطرہ کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے آمادہ کرنے لگا۔ قلوپطرہ کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ سفر کی صعوبت برداشت کرسکے لیکن سیزر کے آگے بے بس تھی۔

سپاہیوں کی چار سو کشتیاں ساتھ چلیں۔ شاہی بحری سفر کے لیے اسکندریہ سے نکلا اور قاہرہ تک پہنچ گیا۔ دورانِ سفر اس نے مقامی لوگوں سے ان تجارتی شاہراہوں کی تفصیل معلوم کی جو اندرونِ ملک سے مختلف اہم شاہراہوں کو ایتھوپیا اور برنیس کی اس بندرگاہ سے ملاتی تھیں جہاں سے ہندوستان کا بحری سفر شروع ہوتا تھا۔

سفر سے واپسی کے چند روز بعد ہی قلوپطرہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ ولادت متوقع تھی لیکن یہ لڑکی بھی تو ہو سکتی تھی۔ سیزر اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کی خوش قسمتی اس کے ساتھ چلتی ہے۔ اس وقت بھی اس کا یہ دعویٰ سچ ثابت ہوا۔

قلوپطرہ نے اپنے بیٹے کا نام بطلیموس چہار دہم رکھا لیکن مصری لوگ اسے سیزارین یعنی چھوٹا سیزر کہہ کر پکارتے تھے۔

اب اس کا مصر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اب تو ان منصوبوں کی تکمیل کا وقت آگیا تھا جن کے خواب وہ قصر شاہی میں دیکھتا رہا تھا۔

اس نے مصر چھوڑنے سے قبل بحیرہ روم اور روم کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ حالات جونہی اس تک پہنچے اس کے ہوش اڑ گئے۔ قلوپطرہ کی محبت اور مصری جنگوں میں مشغول رہنے کے بعد اسے روم کا خیال تک نہیں آیا تھا اور اب یہ حالات سننے میں آرہے تھے اس کے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ یہ بدنظمی اس کی عالمی فتوحات میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔

اس نے مصر میں ایک سال گزارا تھا۔ ابتدائی چھ ماہ تک روم میں کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اسے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا تھا۔ جب ریاست انتہائی خطرے میں ہوتی و سینٹ کسی ایک مجسٹریٹ کو اس عہدے پر چھ ماہ کے لیے فائز کرتی تھی۔ وہ سول اور ملٹری سپریم کمانڈر ہوتا تھا جس کے خلاف نہ تو کوئی اپیل ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ اپنی مدت کی تکمیل کے بعد بھی کسی کو جواب دہ تھا۔

سیزر کو ڈکٹیٹر بنا تو دیا گیا تھا لیکن اس کی عدم دستیابی کے باعث اس کے دست راست اور وفادار کمانڈر مارک انطونی کو روم کے حالات درست کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مار انطونی نے نہایت بے رحمی اور سفاکی سے ملکی نظام چلانے کی کوشش کی جس پر دارالخلافہ فسادات کی زد میں آگیا۔ مارک انطونی نے فسادات کو دبانے کے لیے فوجی دستے تعینات کردیے اس کا الٹا اثر ہوا۔ گلی کوچے فسادات کی آگ سے بھر گئے۔ بحیرہ روم کی ریاستوں کا حال دارالخلافے کی ابتری سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ اسپین کی سرزمین جو سیزر کے گن گاتی تھی بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ سیزر کے مقرر کردہ گورنر کو مار بھگایا اور اسپین سیزر کے مخالفین کے ہاتھوں میں آگیا۔

سیزر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ افریقا میں اس کے بدترین دشمنوں ''کیٹو'' اور ''لیبی نوس'' نے نمیڈیا کے بادشاہ سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے اور ایک بہت بڑی فوج سسلی کے قریب جمع کر رکھی ہے۔ سیزر کو جس بات نے سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہ ایشیائے کوچک میں واقع ریاست پونٹس (مشرقی ترکی) پر فرناسس کا قبضہ تھا۔ راستے میں جو بھی رومی شہر آیا اسے تباہ و برباد کردیا اور پونٹس کی ریاست پر قابض ہو گیا۔

ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے مصر چھوڑا ضرور لیکن روم جانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا تاکہ روم پہنچنے سے پہلے وہ حالات اپنے حق میں کر سکے۔ وہ سب سے پہلے فلسطین پہنچا۔ اس نے اپنے مددگار ''ہائرنیس'' کو بادشاہ کنفرم کیا اور اسے بڑے پادری کا رتبہ دیا۔

اس سفر کے دوران اس نے ٹائر شہر میں واقع ہرکولیس کے مندر کو لوٹا اور اپنے وسیع اخراجات کو پورا کرنے کے لیے رقم حاصل کی۔

وہ سفر کرتا ہوا شام پہنچا۔ اس نے مقامی لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کافی وقت صرف کیا۔ وہ روم جانے سے قبل ہر حالت میں اس ریاست کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد وہ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا۔ ایشیائے کوچک کے وسط میں اس نے ایک مقام پر..... یہاں کے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بوڑھا چالاک بادشاہ عاجزانہ حیثیت سے عام لباس پہنے حاضر ہوا اور پومپی کی حمایت کرنے پر معافی مانگنے لگا۔

''تم اگر اب معافی مانگنے کی بجائے اس وقت بین الاقوامی جھگڑے میں فریق نہ بنتے تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''میں اس جھگڑے سے دور رہنا چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کردیا گیا تھا۔''

''میں نے تمہیں حکمران بنایا تھا لیکن تمہیں وفاداری نبھانی نہیں آئی۔''

سیزر نے اس وقت اسے کوئی سزا نہیں دی۔ اس کی فوج اپنی فوج میں ضم کرلی اور اس کی قسمت کا فیصلہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا۔

اس کے بعد اسے پونٹس کی طرف متوجہ ہونا تھا (اسے اب مشرقی ترکی کہا جاتا ہے) پونٹس میں اس وقت فرناسس اپنی پوزیشن مستحکم کررہا تھا۔

سیزر نے پونٹس کی سرحد پر پہنچ کر سب کو حیران کردیا۔

وہ ایک ایسا دشوار پہاڑی راستہ عبور کر کے آیا تھا۔ جو ہر وقت برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ اس نے سرحد عبور کی اور مغربی جانب پہاڑوں میں واقع ''زیلا'' کے مقام پر پہنچ گیا۔

پونٹس نے خوفزدہ ہو کر اپنے سفیر اس کے پاس بھیجے اور معافی کا طلب گار ہوا۔ سیزر اب تک تمام مخالفین کو معاف کرتا چلا آیا تھا لیکن پونٹس کو معاف کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

''میں ایسے شخص کو معاف نہیں کر سکتا جس نے بے شمار رومنوں کا خون بہایا ہو۔''

یہ پیغام جب پونٹس کے سفیروں نے اسے پہنچایا تو وہ اس کے غضب سے بچنے کے لیے اپنی تمام فوج کے ساتھ زیلا کی پہاڑی چوٹی پر واقع مضبوط قلعے میں قلعہ بند ہو گیا۔ سیزر اس وقت اس قلعے سے پانچ میل دور خیمہ زن تھا۔

رات نے اپنا اندھیرا مسلط کیا تو رومن فوج نے حرکت کی اور قلعے سے ایک میل دور ڈھلانی وادی پر پہنچ گئی تاکہ محاصرہ کیا جائے۔

صبح ہوئی۔ رومن فوج ابھی خندقیں کھود رہی تھی کہ پونٹس نے اپنی فوج کو نیچے اترنے کا حکم دے دیا۔ یہ ایسا مضحکہ خیز حکم دیا تھا کہ سیزر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے کہ پونٹس حملہ آور ہونے کے لیے اپنی فوج پہاڑی سے نیچے اتار رہا ہے۔''

رومن فوج کو واپس چھوڑ کر مقابلے پر آ گئی۔ پہلے دوبدو جنگ ہوئی پھر تیروں اور تلواروں کی بارش ہونے لگی۔ یہ جنگ صرف چار گھنٹے جاری رہی۔ ان چار گھنٹوں میں میدان جنگ لاشوں سے بھر گیا اور پھر پونٹس کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ رومن فوج نے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مال و اسباب لوٹ لیا اور عورتوں کو غلام بنا لیا۔

اس تاریخی فتح کے موقع پر سیزر نے وہ کلمات ادا کیے جو ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گئے۔

''میں آیا۔ میں نے دیکھا اور میں نے فتح کر لیا۔''

اسے آخری جنگ کے طور پر افریقا کی مہم پر روانہ ہونا تھا۔ وہ تیاری کر ہی رہا تھا کہ جنوبی اٹلی میں موجود فوج نے بغاوت کر دی۔ وہ اس بغاوت سے بے خبر مختصر وقت کے لیے روم پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے مارک انطونی کو طلب کیا۔ وہ اس کی وفاداری کے باعث اسے معاف کر سکتا تھا لیکن اس پر آرام دہ زندگی گزارنے، اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے، بے تحاشا شراب نوشی، لالچ، رشوت خوری جیسے سنگین الزامات تھے۔ سیزر انطونی کا مستقبل تاریک کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے صرف اتنی سزا دی کہ اسے دو سال کے لیے سیاسی طور پر کمزور کر دیا۔

اٹلی کی باغی فوج کو معلوم تھا کہ سیزر روم میں ہے لہٰذا وہ اس مطالبے کے ساتھ روم کی طرف بڑھے کہ انہیں کیے گئے معاہدے کے مطابق معاوضے ادا کیے جائیں۔ معاوضوں کا تو محض بہانہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سال ہا سال کی جنگوں نے ان فوجیوں کو تھکا دیا تھا۔ اب ایک اور تکلیف دہ مہم کا آغاز ہونے والا تھا۔

یہ فوجی روم کے نزدیک پہنچے اور دیواروں کے ساتھ خیمہ زن ہو گئے۔ وہ اس وقت حیران ہوئے جب انہوں نے سیزر کو اچانک اپنے درمیان دیکھا۔ وہ گرجدار آواز میں ان سے پوچھ رہا تھا۔

''آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔''

سپاہی تمام مطالبات بھول گئے اور صرف یہ کہہ سکے۔

''ڈسچارج۔''

سیزر نے مایوسی سے ان کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔

''میں تمہیں ڈسچارج کرتا ہوں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ان سے وعدہ کیا۔ ''تم ہر وہ چیز حاصل کرو گے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے لیکن افریقا سے واپسی پر۔ جشن فتح کے موقع پر۔''

وہ اپنے سپاہیوں کو ہمیشہ ''میرے ساتھی سپاہیو'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا لیکن اس وقت وہ انہیں میرے شہریو کہہ کر پکار رہا تھا۔ اس خطاب پر فوجیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے برخاستگی کا مطالبہ کر کے کتنی بڑی غلطی کی۔ انہوں نے بے اختیار روتے ہوئے سیزر کو گھیر لیا۔ وہ اس سے معافی مانگ رہے تھے۔

''ہم خوشی سے بغیر کسی مطالبے کے افریقا یا پھر کسی بھی دوسری جنگ میں شامل ہونے کو تیار ہیں اور اپنے تمام مطالبات سے دستبردار ہوتے ہیں۔''

اس نے فوجیوں کو جہاز پر سوار ہونے کا حکم دیا اور جگہ کا تعین کیے بغیر روانہ ہو گیا۔ اسے شمالی افریقا جانا پڑا جہاں پومپی کے کچھ وفاداروں نے عارضی حکومت قائم کر کے اپنی طاقت بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ سانپ کا پھن اس کے حملے کرنے سے پہلے کچل دینا ضروری تھا لہٰذا اسے پہنچنا پڑا اور صرف تین مہینے کی مدت میں باغیوں کا سر کچل دیا اور پچاس ہزار قیدیوں کی گردن مار دی گئی۔

اہل روم جشن فتح منانے کی تیاریاں کررہے تھے۔
سیزر کے دل میں ایک تمنا پیدا ہوئی کہ قلوپطرہ بھی اس کے اس شاندار استقبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس نے قلوپطرہ کو لکھ بھیجا کہ وہ اس عظیم جشن میں شرکت کے لیے روم پہنچ جائے۔
قلوپطرہ کے ذہن میں یہ وسوسے سر اٹھانے لگے تھے کہ کہیں سیزر اسے بھول تو نہیں گیا۔ اب جو یہ خط پہنچا تو وہ کھل اٹھی۔ اس نے اس شان سے تیاری کی جو ایک ملکہ کو زیب دیتا ہے۔ سیکڑوں غلاموں، متعدد خواجہ سراؤں کے ہمراہ ملکہ کا قافلہ روم پہنچا۔
دریائے ٹائر کے اس پار سیزر کی ایک دیہاتی اقامت گاہ تھی۔ اس نے باغوں اور پھولوں سے گھری ہوئی اس اقامت گاہ میں قلوپطرہ اور اس کے کارواں کو اتارا اور جشن کے دن کا انتظار کرنے لگا۔
موسم گرما کی ایک خوشگوار صبح کو روم کے دروازے کھل گئے۔ یہ مخصوص دروازے تھے جو صرف اس وقت کھولے جاتے تھے جب روم کے کسی شخص کو فاتح قرار دیتے ہوئے اس کے اعزاز میں جشن فتح کی پریڈ منعقد ہوئی تھی۔
یہ جشن چار جنگوں گال، مصر، ایشیائے کوچک اور افریقا میں شاندار فتوحات کی بنا پر منایا جارہا تھا۔
گال کی فتح سب سے بڑی تھی لہٰذا جشن کے پہلے دن فاتح فرانس کی حیثیت سے سیزر کا جلوس نکالا گیا۔ جلوس کیا تھا روم کی دولت و ثروت کا عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ اس کے رتھ میں اس کے ساتھ قلوپطرہ بیٹھی تھی۔ اس مصری حسن کو دیکھنے کے لیے خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ جلوس کو ایک قدم اٹھانا مشکل ہورہا تھا۔ سیزر اور قلوپطرہ کی سفید گھوڑوں والی بگھی کو درجنوں محافظوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک چھکڑا سونے اور چاندی کے خزانے سے بھرا ہوا غلاموں اور باوقار قیدیوں کے ساتھ شہر میں گشت کررہا تھا۔ فوجی دھنیں بجائی جارہی تھیں۔ جگہ جگہ کھیل تماشے ہورہے تھے۔
قلوپطرہ کے روم میں آتے ہی چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ عوام کو سیزر کی بیاہتا بیوی سے ہمدردی تھی جو سالہا سال سے شوہر سے دور پڑی ہوئی تھی اور اب وہ قلوپطرہ کو لے آیا تھا۔ سیزر یہ سب باتیں سن رہا تھا مگر اس نے چپ سادھ رکھی تھی۔
دوسرے دن سیزر کا جلوس فاتح مصر کی حیثیت سے نکالا گیا۔ ایکیلاس اور پوتھی نوس قتل کردیے گئے تھے لیکن ان

کسی بھی کمپیوٹرائزڈ نظام میں داخل ہوکر قیمتی معلومات ہی نہیں چراتے بلکہ ان میں تبدیلی بھی کرسکتے ہیں۔ اب ایک خطرناک بات سامنے آئی ہے کہ ہیکرز طبی آلات میں بھی مداخلت کرسکتے ہیں۔ ذیابیطس میں مبتلا ایک سائنس دان نے یہ ثابت کیا کہ انسولین پمپس کو دور سے کنٹرول کرکے بلڈ شوگر کی ریڈنگ تبدیل کی جاسکتی ہے۔ اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ مریض اس غلط ریڈنگ کی بنیاد پر بہت زیادہ یا بہت کم انسولین لے سکتے ہیں۔ جے ریڈکلف نے ہیکرز کی اس صلاحیت کو ثابت کرنے کے لیے ننھی سی ریڈیو ڈیوائس بنائی جو کسی انسولین پمپ پر حملہ کرسکتی ہے۔ یوں انسولین پمپ کو دور سے وائرلیس کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ لاس ویگاس میں منعقدہ بلیک ہیٹ کمپیوٹر سیکیورٹی کانفرنس میں اس نے یہ آلہ پیش کیا۔

مرسلہ: نذر محمد، لاڑکانہ

کے مجسمے لائے گئے تھے جنہیں دیکھ کر لوگ طرح طرح کی آوازیں کس رہے تھے۔ دریائے نیل اور فرعون کے مجسمے بھی تھے جن سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ مصر جب عظیم الشان ملک آج روم کے قبضے میں ہے لوگوں کی تفریح کے لیے مصر کے جنگلی جانور بھی جلوس کے ساتھ چل رہے تھے۔
تیسرے روز پونٹس کا جلوس نکالا گیا۔ سیزر کے آگے آگے ایک بڑی تختی اٹھائے لوگ چل رہے تھے جس پر سیزر کے کہے ہوئے الفاظ۔ ”آیا، دیکھا اور شکست دی“ کے الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔
چوتھے روز شمالی افریقا کی فتح کا جلوس نکالا گیا۔
ان ہنگاموں سے نمٹنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر قلوپطرہ کے عشرت کدے میں چلا گیا۔
جب کئی دن گزر گئے تو قلوپطرہ مختلف انداز سے اپنی خفگی ظاہر کرنے لگی۔ آخر اس خفگی کی وجہ بھی اس نے بتا ہی دی۔
”ہمیں روم میں آئے اتنے دن ہوگئے۔ ہماری شادی کا اعلان اب تک نہیں ہوا۔ اہل روم ہمیں صرف جولیس سیزر کی محبوبہ سمجھتے ہیں قانونی بیوی نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی ہنگامہ کھڑا ہوسکتا ہے۔

سیزر کے پاس بھی دلیل موجود تھی۔

"میری بیوی یہاں موجود ہے۔ اس کے طرفدار بھی بہت ہیں۔ مجھے موقع دیکھ کر اعلان کرنا ہوگا۔"

"یہ موقع شاید کبھی نہ آئے۔" وہ سیزر سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

"ایسا نہ کہو قلوپطرہ۔"

"اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہاں جمہوریت ہے۔ یہاں وہ ہوگا جو عوام چاہیں گے۔"

"تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میں بدست جلد اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے والا ہوں پھر وہ ہوگا جو میں چاہوں گا۔"

"آپ کی سینٹ آپ کو ایسا کرنے دے گی؟"

"میرا نام سیزر ہے۔ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔"

سیزر نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ ناکامی کے لفظ سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔ اس نے اپنی بادشاہت کے اعلان سے پہلے زمین ہموار کرنا شروع کر دی۔

اس نے سینٹ سے اپنے لیے کمانڈر انچیف کا عہدہ منظور کرا لیا اور یہ بھی منظور کرایا کہ یہ عہدہ اس کی نسل میں موروثی ہوگا۔ اب لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ وہ روم کا بادشاہ بننے والا ہے۔ اس کی ملکہ قلوپطرہ اور وارث وہ لڑکا ہوگا جو دیہات میں پرورش پا رہا ہے۔ یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگیں کہ ایسا قانون بنایا جا رہا ہے جس کے تحت وہ بہ یک وقت دو بیویاں رکھ سکے گا۔

اس نے اپنے آپ کو عوام کی نظروں میں مقدس بنانے کے لیے اپنا ایک مجسمہ دیوتاؤں کے مجسموں کے درمیان رکھوا دیا۔ کئی مندروں میں اپنے مجسمے رکھوا کر ان پر "غیر فانی دیوتا" کے الفاظ کندہ کروا دیے۔ پروہتوں کی ایک جماعت تنخواہ پر مقرر کر دی جو اس کے مجسموں کی پرستش کرتی تھی۔

انہی دنوں ایک تہوار کے موقع پر جب سیزر عوام کے ہجوم میں کھڑا تھا اس کے خریدے ہوئے لوگ اسے تخلیق کا دیوتا کہہ کر سلام پیش کرنے لگے۔ اس کے دوست انطونی نے اپنی جیب سے ایک سنہری تاج نکال کر سیزر کی خدمت میں پیش کیا۔

"اے آسمانی دیوتا، حقیر دنیا کی حکومت کا تاج بھی قبول کیجیے۔"

بہت سے آدمیوں نے جو اسی مقصد کے لیے کھڑے کیے گئے تھے رضامندی کے نعرے بلند کیے مگر عوام کی اکثریت خاموش تھی۔ سیزر نے اس بے دلی کو بھانپ لیا اور انطونی پر برس پڑا۔

"مجھے تاج کی تمنا نہیں۔ مجھے تو اپنے عوام کے لیے ملک کی سرحدوں کو وسیع کرنا ہے۔"

انطونی۔۔۔ اپنی حرکت پر نادم ہو کر آگے بڑھ گیا لیکن سیزر کو معلوم ہو گیا کہ عوام فی الوقت اس کی بادشاہت کے حق میں نہیں۔

قلوپطرہ اس کی آتش شوق بھڑکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اسے ملوکیت کا سبق پڑھا رہی تھی۔ اس کے اپنے ملک میں ملوکیت تھی لہٰذا روم کی جمہوریت اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ اس کا ذاتی مفاد بھی اسی میں تھا کہ روم میں بادشاہت کا نظام جاری ہو۔ وہ اسی وقت ملکہ بن سکتی تھی اور یہ بادشاہت اس کے بیٹے کو منتقل ہو سکتی تھی۔

ان باتوں کا سیزر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اعلان کیے بغیر ہی خود کو بادشاہ سمجھنے لگا۔ وہ تنہائی میں بادشاہ بننے کا شوق پورا کرتا رہتا تھا۔

ایک روز ارکان حکومت اس سے ملنے کے لیے گئے تو اسے بادشاہوں کی طرح تخت پر بیٹھے دیکھا۔ اس نے منقش کشیدہ کاری کی پوشاک پہنی ہوئی تھی۔ سر پر تاج تھا اور ہاتھی دانت کا عصا پہلو میں رکھا ہوا تھا۔

یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے ایک اور حرکت سرزد ہو گئی۔ وہ وینس ٹمپل کے پاس عوامی مسائل سن رہا تھا کہ سیزر کا ایک گروپ اس کے پاس آیا۔ وہ اسے اس نئے اعزاز کے بارے میں بتانا چاہتے تھے جس کے لیے انہوں نے ووٹنگ کی تھی۔ سیزر تمام اخلاقی روایات کے برعکس اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور تمام اراکین اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہے۔

اب تک عوامی حلقوں میں یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ وہ بادشاہ بننا چاہتا ہے اب سیاسی حلقوں میں بھی اس کی بھنک گردش کرنے لگی۔ اس کے فوراً بعد ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ سیزر کا جو مجسمہ نصب کیا گیا تھا اس کے سر کو ایک ربن سے سجا دیا گیا جو مشرقی بادشاہت کا انداز تھا۔

ان پے در پے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ بادشاہ بننے کے لیے بے چین ہے۔ آخر اس کے مخالفین کو کہنا پڑا کہ

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسر پیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ **سرگزشت** کے صفحات پر ملاحظہ کریں

سیزر کو خواہ کتنے ہی اعزاز دے دیئے جائیں وہ مطمئن اسی وقت ہوگا جب اسے بادشاہ بنا دیا جائے گا۔

سیزر اب اکیلا دنیا کے بڑے حصے کا حکمران تھا۔ روم کے لوگ اس پر اعزازات کی بارش کررہے تھے لیکن یہی طاقت بالآخر نفرت میں تبدیل ہوتی گئی۔ اب اس کے خلاف ایسی سازشیں تیار ہونے لگیں جو اسے موت سے ہمکنار کرنے کے لیے تھیں۔ اس کے مخالفین کو یقین آگیا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا تو جمہوریت کو بادشاہت میں ضرور تبدیل کردے گا۔ سیزر ان سازشوں سے بے خبر تھا جب کہ مقتدر حلقے سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آئے دن یہ باتیں ہوا کرتی تھیں۔

"بروٹس! سنتے ہیں اگلے ایوان حکومت میں سیزر کی بادشاہی کا اعلان کیا جائے گا۔" کیشں نے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ بڑا فاتح ضرور ہے لیکن شاہی خانہ ان کا فرد تو نہیں۔" بروٹس نے جواب دیا۔

"قلوپطرہ سے اپنی شادی کا اعلان کردے گا۔ قلوپطرہ کی رگوں میں تو شاہی خون دوڑ رہا ہے۔"

"وہ غیر ملکی ہے۔"

"وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرلے گا۔"

"مجھے اپنے ملک کی آزادی عزیز ہے۔"

"تمہیں کچھ بھی عزیز ہو لیکن میں تمہیں بتادوں کہ ایوان میں یہ سب ہونے والا ہے۔"

"کم از کم میں تو اس روز ایوان میں نہیں جاؤں گا۔"

"اگر تمہیں جانا پڑا۔"

"میں سیزر کی مخالفت کروں گا۔"

"تم پر سیزر کے احسانات ہیں۔"

"میں اپنے ملک کے لیے ان احسانات کا خیال نہیں کروں گا۔"

روم میں سیزر کے خلاف بڑی تیزی سے سازش تیار ہورہی تھی۔ اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ اعلانِ بادشاہت سے پہلے اسے قتل کردیا جائے۔

تین قسم کے لوگ سیزر کی موت کے خواہاں تھے۔ پہلی قسم ان پرانے دشمنوں کی تھی جنہوں نے پومپی کا ساتھ دیا لیکن سیزر نے پومپی کی موت کے بعد انہیں معاف کردیا تھا۔ یہ لوگ ایک مصلحت کے ساتھ سیزر سے آملے تھے ورنہ وہ اس کے وفادار نہیں تھے۔

سیزر کے دشمنوں کی دوسری قسم ان دوستوں کی تھی جنہوں نے سیزر کا ساتھ دیا تھا لیکن فتح کے بعد یہ چاہتے تھے کہ انہیں فتوحات کا ثمر ان کی خواہشات کے مطابق ملنا چاہیے۔

سیزر کے دشمنوں کی تیسری قسم ان اصول پرست طبقے پر مشتمل تھی جو ری پبلک پر یقین رکھتی تھی۔ اس محدود طبقے میں بروٹس بھی شامل تھا۔

بروٹس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سیزر کا صلبی بیٹا ہے جو سرویلیا نامی داشتہ کے بطن سے تھا چونکہ بروٹس کا باپ پومپی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اس لیے سیزر اس لڑکے پر بڑا اعتماد کرتا تھا لیکن اب بروٹس سینیٹرز کے نرغے میں تھا۔ بالآخر بروٹس پر غیر مطمئن سینیٹرز کا دباؤ بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ برداشت کرنے کے قابل نہ رہا اور اس نے اس بوڑھے شخص کو (سیزر) قتل کرنے کی ہامی بھرلی جو اسے بے حد پیار کرتا تھا۔

ان سازشیوں کے درمیان اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ انہیں سیزر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنا چاہیے چنانچہ انہوں نے روم کے سرکردہ لوگوں کے صلاح مشورے کیے۔ ساتھ مزید لوگ اس مشن میں شریک ہوئے جنہوں نے فیصلہ کیا کہ ہر کوئی سیزر پر وار کرے گا تاکہ کسی ایک پر الزام نہ آئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ سیزر کو روم کی گلیوں میں قتل کرنے کی بجائے عوامی جگہ پر قتل کیا جائے تاکہ سیاسی طور روم کے لوگوں کو باور کرایا جاسکے کہ یہ سب کچھ جمہوریت کے لیے کیا گیا ہے۔ تمام معاملات کو حتمی شکل دینے کے بعد اس کام کے لیے سینیٹ کی میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

سینیٹرز کی یقین دہانی کے بعد کہ وہ اس کی جان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس نے اپنے باڈی گارڈز فارغ کردیے تھے۔

وہ رات آگئی جس کی صبح اسے ایوان حکومت پہنچنا تھا کچھ خوشی کچھ فکر سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے گھر مقیم تھا۔ اس کی بیوی اس کے برابر لیٹی مزے سے سو رہی تھی۔ سیزر ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کی بیوی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ سیزر نے اس کی طرف دیکھا لیکن بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے سوچا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے خود ہی خاموش ہوجائے گی۔ پھر یہ بڑبڑاہٹ ایک چیخ میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی بیوی نے ایک چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھیں کیا۔"

"ہاں ایک بھیانک خواب۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں نے تمہیں قتل کردیا ہے اور میں تمہارا مردہ جسم اپنے

ہاتھوں میں اٹھائے ہوئی ہوں۔‘‘

’’تمہیں تو میں بہت بہادر عورت سمجھتا تھا۔ کیا تم بھی خوابوں پر یقین رکھتی ہو۔‘‘

’’نہیں یہ خواب نہیں تھا کوئی غیبی اشارہ تھا۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں کل گھر سے باہر ہرگز نہ جائیں۔‘‘

’’کل تو سینیٹ کا اجلاس ہے ممکن ہے مجھے بادشاہ بنا دیا جائے۔‘‘

’’کل کا اجلاس منسوخ کردیں۔ آپ زندہ رہیں گے تو بادشاہت پھر کبھی مل سکتی ہے۔‘‘

’’اچھا اس وقت تو سو جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔‘‘

اس کی بیوی نہ جانے کب سوئی مگر وہ بہت دیر سے جاگ رہا تھا۔ اسے نیند آگئی۔

صبح ہوئی اور وہ ایوان حکومت جانے کے لیے تیار ہونے لگا تو اس کی بیوی ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگئی۔ وہ بزدل نہیں تھی۔ نہ ہی توہم پرست تھی لیکن رات کے خواب نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کی منت سماجت کرنے لگی لیکن وہ اس کی استدعا کو نظر انداز کرتے ہوئے تیار ہوتا رہا۔ جب وہ جوتے پہن رہا تھا تو اس کی بیوی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

’’آپ کو اسی دیوتا کا واسطہ جس کے آپ اوتار ہیں۔ میری بات مان لیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ آج گھر سے باہر نہ نکلیں۔‘‘

’’پاگل ہوگئی ہو۔ میں کب تک گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔‘‘

’’بس آج کے لیے میری بات مان لیں۔ آج کا دن گزر جائے۔‘‘

سیزر نے اس کی بات مان لی اور ایوان حکومت جانا ملتوی کردیا۔ بیوی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے جوتے اتارنے لگی۔

سینٹ میں بے چینی سے اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ اگر آج وہ نہ آتا تو سارے منصوبے ہی دھرے رہ جاتے۔ اس کے آئے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ سازشیوں کو یہ بھی شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں سیزر کو اس سازش کا علم نہ ہوگیا ہو۔ تھک ہار کر انہوں نے ڈی سی مس کو اس کے گھر بھیجا۔

اس نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھے ہی تھے کہ ملازم نے ڈی سی مس کے آنے کی اطلاع دی۔ سیزر اسے اپنا دوست کہتا تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کے گھر آئے اور وہ اس سے ملاقات نہیں کرے۔ وہ اس سے ملنے ملاقاتیوں کے کمرے میں پہنچ گیا۔

’’آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور آپ ابھی تک پہنچے نہیں۔‘‘

’’شاید میں نہ آسکوں۔‘‘

’’ارے یہ کیا بات ہوئی۔ ارکان حکومت نے بالاتفاق آپ کو رومی مقبوضات کا بادشاہ تسلیم کرلیا ہے اور آپ کو تاج شاہی پیش کیا جانے والا ہے جسے آپ روم کے سوا ہر جگہ پہننے کے مجاز ہوں گے اور آپ......‘‘

’’بس کچھ ایسی بات ہے کہ میں آج گھر سے نہیں نکل سکتا۔‘‘

’’مگر کیوں؟‘‘

اس کے جواب میں ڈی سی مس ہنسے بغیر نہ رہ سکا بلکہ ایک طرح سے اس کا مضحکہ اڑانے لگا۔

’’مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسا آدمی ایک عورت کے خواب سے ڈر گیا۔ خواب تو خواب ہوتے ہیں جناب۔‘‘

’’بیوی کا دل بھی رکھنا تو ہوتا ہے۔‘‘

’’یہ تو سوچیے آپ کو تاج شاہی پیش کیا جا رہا ہے۔‘‘

سیزر اپنے سر پر تاج سجا ہوا محسوس کرنے لگا۔ قلوپطرہ میری ملکہ اور سیزرار بن ولی عہد بن جائے گا۔ اگر آج میں نہیں گیا تو کیا یہ موقع ہی ہاتھ سے نکل جائے۔ قلوپطرہ سنے گی تو کتنی خوش ہوگی۔

وہ ایسا بے خود ہوا کہ بیوی کو بتائے بغیر ہی ڈی سی مس کے ساتھ چل دیا۔

اس کی بیوی یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ مہمانوں کے کمرے میں ڈی سی مس سے باتیں کر رہا ہے۔

راستے میں حسب معمول عوامی مجمع اور اس کے خیر خواہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے خطوط اور درخواستیں پیش کیں جو اس نے فرصت کے لمحات میں پڑھنے کے وعدے پر وصول کرلیں۔ اس مجمع میں سیزر کا ایک خیر خواہ یونانی فلسفہ کا استاد بھی موجود تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سیزر کی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اتنے بڑے مجمع میں وہ تفصیل سے آگاہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ایک کاغذ پر وارننگ نوٹ لکھا اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے سیزر تک پہنچ گیا۔

’’اسے خفیہ طور پر ابھی پڑھیں۔‘‘ اس نے وہ خط سیزر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

وہ اتنا مصروف تھا کہ اس وقت اس نے اس خط کو اہمیت نہیں دی۔ اسے بعد میں پڑھنے کے لیے ایک طرف رکھ دیا۔

وہ ایوانِ حکومت کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر اس نجومی پر پڑی جس نے اس کے بارے میں پیش گوئی کر رکھی تھی کہ ''وہ 15 مارچ ق م کو شدید خطرے میں ہو گا۔'' سیزر نے اس نجومی کو مخاطب کیا۔ ''پندرہ مارچ آچکی ہے اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔'' اس نجومی نے عجیب جواب دیا۔ ''میری بتائی ہوئی تاریخ آچکی ہے لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔'' سیزر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

سیزر کے ایوان میں داخل ہوتے ہی سارا ایوان تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب وہ اپنے تخت پر اچھی طرح بیٹھ چکا تو ایک سازشی اس کے قریب آیا اور التجا کرنے لگا۔

''میرے بھائی کو جلاوطنی کی جو سزا ہوئی ہے اسے منسوخ کیا جائے۔''

اس کے ساتھ ہی کئی اور لوگ اٹھے اور سیزر کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ سیزر کو انہیں کچھ فاصلے پر کھڑے رہنے کا حکم دینا پڑا۔

جب انہوں نے حکم نہ مانا تو سیزر کو شک ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا مگر ایک شخص نے اس کا چوغہ پکڑ کر کھینچا۔ ایک امیر کیسکا نے اپنے خنجر سے سیزر کی گردن پر وار کیا۔ کیسکا اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے خنجر سے سیزر معمولی زخمی ہوا۔ سیزر نے کیسکا کو پوری طاقت سے دھکا دے کر باہر نکال دیا۔ تب تمام سازشی ایک ساتھ حملہ آور ہوئے کسی نے پشت پر چھری گھونپی کسی نے سامنے سے حملہ کیا۔

سیزر کے بدن سے خون کے فوارے نکل رہے تھے لیکن جونہی اسے موقع ملا اس نے اپنا خنجر نکالا اور زخمی شیر کی طرح ان کے دائرے سے نکل گیا اور بھاگتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کے حریف پومپی کا مجسمہ نصب تھا۔ یہاں اس نے ایک دلخراش منظر دیکھا۔ اس کا محبوب بروٹس جسے وہ بیٹا کہتا تھا خنجر لیے اس پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے سیزر نے اسے دیکھتے ہی نہایت مایوسی سے کہا۔

''میرے بیٹے تو بھی!''

بروٹس کا خنجر اس کے سینے میں اتر گیا۔ سیزر نے اپنا چوغہ اپنے چہرے پر لپیٹ لیا اور پومپی کے مجسمے کے قدموں میں دم توڑ گیا۔

اسی وقت دوسرے قاتل وہاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے تلواریں پڑنے لگیں۔ اب کسی کو شک نہ رہا کہ سیزر دم توڑ چکا ہے۔

تمام قاتل تلواریں گھماتے نعرے لگاتے چوک کی طرف بڑھے۔

''جمہوریت زندہ باد۔''

سیزر قتل ہو گیا۔ سیزر قتل ہو گیا۔ شہری ایک دوسرے کو اطلاع دیتے ہوئے بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ دکانیں اور کاروبار بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں انطونی بھی پہنچ گیا۔ چاند کی اداس روشنی میں اس نے اپنے سردار کی لاش کو دیکھا۔

لوگوں میں اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر طرف انتقام انتقام کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں تمام قاتل شاید فرار ہو چکے تھے۔

سیزر کی لاش پانچ دن تک شاہی اعزاز سے رکھی رہی۔ آخر اسے جلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ 20 مارچ کی شام کو انطونی آیا۔ عوام نالہ و ماتم کر رہے تھے۔ انطونی نے ایک جذباتی تقریر کے بعد سیزر کا خونی لباس لہرایا۔ اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ لوگوں نے اس میٹنگ ہال کو آگ لگا دی اور جہاں سیزر کا قتل ہوا تھا بروٹس اور دیگر سازشیوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔

انتقام کی آگ اور لکڑیوں کی آگ ایک ساتھ اٹھی۔ جلتی ہوئی لکڑیوں پر سیزر کی لاش رکھ دی گئی۔ دھواں بلند ہوا۔ چاند چھپ گیا۔ دیکھتے دیکھتے سیزر کی لاش جل کر راکھ ہو گئی۔

سیزر کی تدفین کے بعد انطونی نے سیزر کی وصیت کو دربار خاص میں پڑھا۔

''میری دولت میں سے ہر رومی کو تین سو درہم دیے جائیں۔ دریائے ٹائبر کے قریب واقع اس کی تمام جائیداد اور باغات قوم کے لیے وقف تصور ہوں گے۔''

میرا بھانجا اکیٹوین میرے بعد میرا جانشین ہو گا۔

قلوپطرہ کے بہتے ہوئے آنسو اسے یاد دلا رہے تھے کہ سیزر سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ ابھی تو شادی کا اعلان تک نہیں ہوا تھا۔ سیزر کا جانشین اس کا بیٹا نہیں سیزر کا بھانجا ہے۔ اسے روم چھوڑنا پڑے گا۔ اب اسے شاید مصر کے تخت پر ہی قناعت کرنا پڑے گی

ماخذات

جولیس سیزر۔ ڈاکٹر شاہد مختار

قلوپطرہ، مصنف آرتھر ویگل، مترجم ناظر حسن زیدی

لٹل ماسٹر

امیر حسین چمن

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس غیر ملکی کھیل میں بھی ہمارے کھلاڑی ہمیشہ سرفہرست رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ انگلینڈ، امریکا ہی نہیں دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں پاکستانی ٹیم جاتی اپنا جھنڈا گاڑ دیتی۔ اس ٹیم کے کھلاڑیوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے دنیا پاگل رہتی۔ ان میں لٹل ماسٹر کو وہ مقام حاصل تھا کہ لوگ انہیں جادوگر کہتے تھے۔

کرکٹ کی دنیا کے اس شہزادے کا ذکر جو دوشیزاؤں کے خوابوں کا محور تھا

1958ء کی بات ہے جب پاکستانی ٹیم ٹیسٹ میچ کھیلنے ویسٹ انڈیز گئی جہاں میں نے اپنی زندگی کی یادگار اور طویل ترین اننگ کھیلی جس میں 337 رنز بنائے اور یہ اننگ 16 گھنٹے 39 منٹ میں مکمل ہوئی۔ اس دلچسپ میچ کو اسٹیڈیم سے باہر ایک صاحب درخت پر چڑھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ویسٹ انڈیز میں چونکہ گرمی بہت زیادہ پڑتی ہے لہٰذا اس دوران ان صاحب کو Sun Stroke ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو کر درخت سے گر پڑے۔ اردگرد کے لوگوں نے انہیں
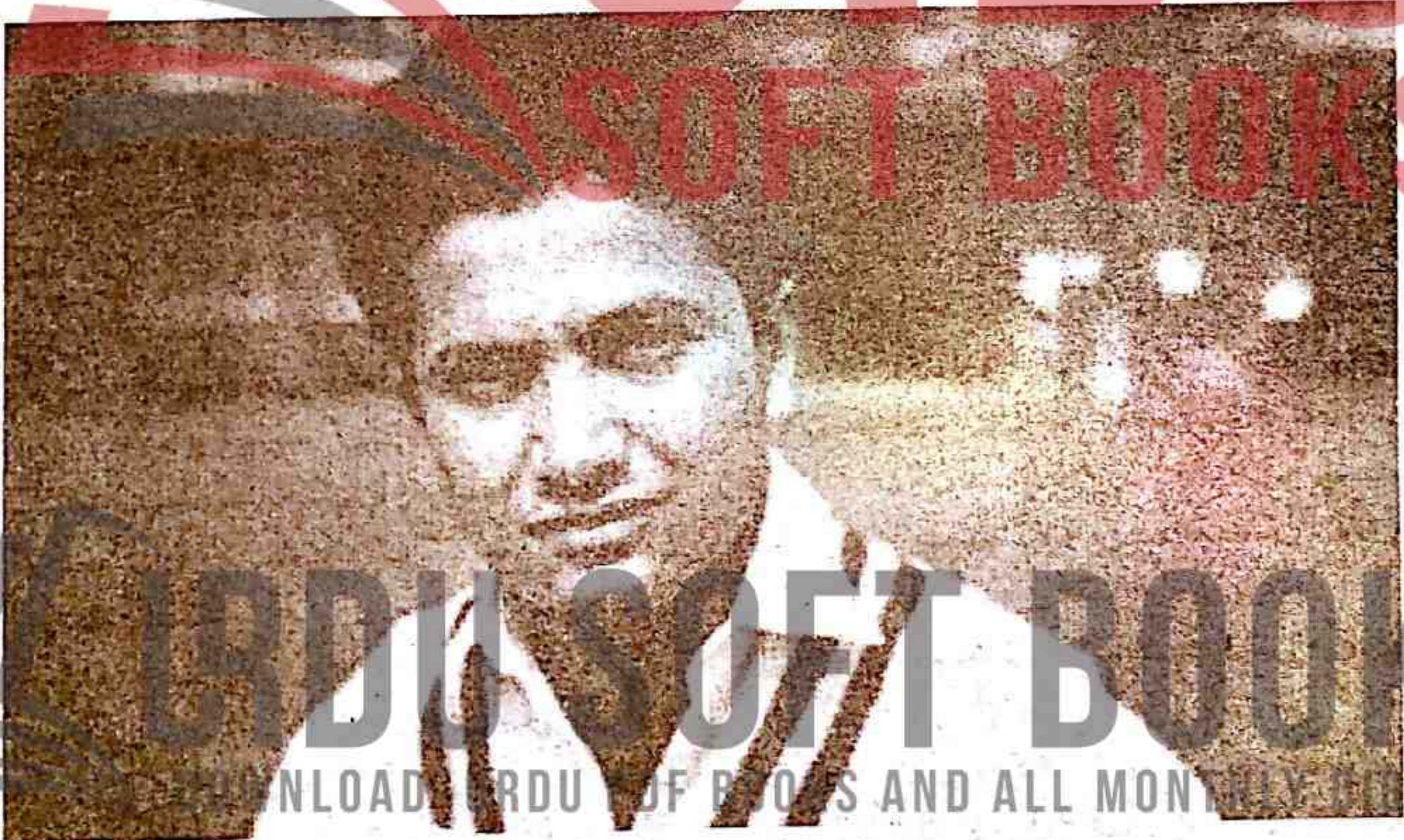
لٹل ماسٹر حنیف محمد کی تاریخ پیدائش 21 دسمبر 1934ء ہے۔ 1951ء سے 1976ء تک فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلی جب کہ ٹیسٹ میچ کھیلنے کا دورانیہ 1952ء سے 1969ء تک محیط ہے۔ بہاولپور، کراچی، پی آئی اے اور پاکستان کی ٹیموں کی طرف سے کھیل کر دنیائے کرکٹ کا عظیم بیٹسمین بننے اور طویل الاقانی اننگز کھیلنے والے حنیف محمد نے لٹل ماسٹر کا خطاب پا کر پاکستان کو بین الاقوامی کرکٹ میں متعارف کرایا۔ ان کی منفرد اور بڑی پیشہ وارانہ خصوصیات میں بیٹنگ کے دوران کھیل پر مکمل توجہ اور انہماک کے علاوہ تماشائیوں کے نعروں اور فرمائشوں سے بے نیازی اور مشکل رن بنانے کی بجائے پچ پر ٹھہرنے کو ترجیح دینا، گیند کو اس کے میرٹ کے مطابق کھیلنا اور بڑے تحمل، حوصلے اور بردباری کے ساتھ ہر قسم کی گیند سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت شامل تھی۔ ان کا ہر اسٹروک مکمل اور بھرپور ہوتا، خصوصاً کور ڈرائیو، اسکوائر کٹ، لیٹ کٹ اور سوئپ دیدہ ور آنکھیں کبھی نہیں بھلا سکیں۔ اپنے ٹیسٹ کیریئر میں صرف .... ایک مرتبہ اسٹمپ اور رن آؤٹ ہونا ان کی مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور غیر متزلزل استقلال کے زندہ ثبوت ہیں۔ حنیف محمد کی محتاط بیٹنگ کا پس منظر ان کی پوری ٹیم کا ان پر انحصار کرنا ہوتا۔ پچ پر کھڑے ہونے کا ان کا اپنا انوکھا انداز تھا۔ وہ فیلڈر کے لے آؤٹ اور پوزیشن کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد اپنی سبز کیپ کے اگلے حصے کو ایک مخصوص اسٹائل سے ٹھیک کرتے، پھر بلے کو فضا میں گھماتے اور اسے اپنی پشت پر تھوڑا سا اٹھانے کے بعد زمین پر جما دیتے۔ ان کی عقابی نگاہیں گیند کو فضا ہی میں اسیر کر لیتیں اور پھر اپنے قدموں کو صحیح پوزیشن میں لا کر اس گیند کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیتے۔ بالر کے لیے انہیں آؤٹ کرنا ہمیشہ ایک مشکل کام رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وکٹ بالر کے لیے کسی تمغے یا اعزاز سے کم نہ ہوتی۔ وہ اکثر ان گیندوں پر آؤٹ ہوئے جن پر بریڈ مین، جیک ہابز، بوائے کاٹ اور گواسکر بھی اپنی وکٹیں بچانے میں کامیاب

فوری طبی امداد کے لیے اسپتال پہنچا دیا۔ اسپتال پہنچ کر جب وہ ہوش میں آئے تو انہوں نے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر سے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا حنیف محمد آؤٹ ہو چکے ہیں؟ لیکن جب ڈاکٹر نے انہیں نفی میں جواب دیا تو ان پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہو گئی۔

اب ایک اور واقعہ بھی سن لیں۔

ہوا یوں کہ پاکستان کی ٹیم جب ہندوستان کا دورہ کر رہی تھی تو وہاں کے عوام میرے کھیل سے بہت زیادہ سہمے ہوئے تھے اور ہر لمحہ ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی طرح پاکستان کے اس نامور کھلاڑی کو نقصان پہنچایا جائے۔ لہٰذا ایک موقع پر جب ہماری ٹیم ٹرین کے ذریعے پونا جا رہی تھی تو میں ڈبے کے گیٹ پر کھڑا اپنے شائقین کو ہاتھ ہلا ہلا کر ان کی محبت کا جواب دے رہا تھا کہ اچانک ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جواباً جب میں نے بھی اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس شخص نے اپنے ہاتھ میں چھپائے ہوئے شیشے یا بلیڈ نما کسی چیز سے میرے ہاتھ کو بری طرح زخمی کرنے کی کوشش کی وہ تو خدا کا کرم ہوا کہ میں فوراً چوکنا ہو گیا اور اس دن یہ تمام مصیبت صرف میری ایک انگلی پر گزر گئی۔ تاہم انگلی پر آنے والی اس معمولی خراش سے بھی ایک دو دن میرا کھیل متاثر ہوا ورنہ اس شخص کا منصوبہ کامیاب ہونے کی صورت میں جو کچھ ہوتا اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

میری زندگی کا ایک اور دلچسپ واقعہ ابھی حال ہی میں پیش آیا۔ کسی اخبار نویس نے مجھے ٹیلی فون کر کے انٹرویو کے لیے شام کا ٹائم فکس کیا۔ حالانکہ اسی شام مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا تھا لیکن مذکورہ اخبار نویس کے اصرار کے پیشِ نظر مجھے اپنا یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا اور میں شام کو بڑے اہتمام سے ان کا انتظار کرنے لگا لیکن جب مقررہ وقت گزرنے کے بعد بھی کافی دیر تک کوئی نہیں آیا تو میں شش و پنج میں مبتلا باہر جانے کی تیاری کرنے لگا کہ سوا گھنٹے بعد ایک صاحب تشریف لائے اور انہوں نے اپنے صبح کے فون کا حوالہ دے کر مجھ سے باتیں شروع کر دیں اسی دوران جب ماحول کچھ بے تکلفی کا ہوا تو انہوں نے نہایت دلیری سے انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ میں اخبار نویس نہیں بلکہ آپ کا دیرینہ پرستار ہوں۔ آپ سے اس خصوصی ملاقات کے لیے انٹرویو کے بہانے میں نے فون پر آپ سے یونہی ''جوک'' کیا تھا۔

شادی کے ابتدائی دور کی بات ہے کہ میں اور میری بیوی چند روز کے لیے لندن سے پیرس گئے میں اکیلا تو خیر پہلے بھی پیرس جا چکا تھا لیکن بیوی کے ساتھ یہ میرا پہلا اتفاق تھا، ہم منزل کی طرف محوِ پرواز تھے کہ اچانک

نہیں ہوتے۔حنیف محمد اپنے 18 سالہ ٹیسٹ کیریئر میں پاکستانی بیٹنگ کی ایک مضبوط ترین ڈھال کہلائے۔ انہوں نے ہمیشہ اس وقت بڑا اسکور کیا جب ٹیم کو اس کی شدید ضرورت ہوئی۔فرسٹ کلاس کرکٹ میں ان کے سب سے بڑے انفرادی اسکور کا عالمی ریکارڈ 499 رنز ہے جو انہوں نے 59-1958ء میں کراچی بمقابلہ ویسٹ انڈیز، برج ٹاؤن 58-1957ء، جو سوبرز 365 رنز اور مین ہٹن 364 رنز کے بعد تیسرا سب سے بڑا انفرادی اسکور بھی ہے۔وہ ایک ہی ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں سنچریاں بنانے والے پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے بالترتیب 111 اور 114 رنز بمقابلہ انگلینڈ، ڈھاکا 61-1960ء میں بنائے۔انہوں نے اپنی بیٹنگ کی خداداد صلاحیتوں کے باعث کم از کم 9 مرتبہ اپنی ٹیم کو یقینی شکست سے بچایا اور کئی بار ''مین آف دی میچ'' قرار پائے۔انہوں نے پاکستان کے ابتدائی 57 ٹیسٹوں میں سے 55 میں حصہ لیا۔دو ٹیسٹ زخمی ہونے کی وجہ سے نہیں کھیل سکے وہ جس ملک کے خلاف جہاں بھی کھیلے اسکور کیا، طویل اننگز کھیلنا حنیف محمد کی شناخت تھی اس دوران نہ ان کا جسم تھکتا نہ دماغ۔طویل اننگوں کے دو عالمی ریکارڈ حنیف محمد نے قائم کیے۔وہ پاکستان کے پہلے ٹیسٹ وکٹ کیپر، سلپ کے ممتاز فیلڈر نیز دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں سے گیند کرانے کی یکساں صلاحیت رکھنے والے منفرد کھلاڑی کہلائے۔یہ حنیف محمد ہی تھے جنہوں نے واحد ٹیسٹ وکٹ بائیں ہاتھ سے گیند کرا کے حاصل کی۔کرکٹر صادق محمد اور مشتاق محمد، حنیف محمد کے چھوٹے بھائی ہیں ان دونوں کے بعد ان کے فرزند شعیب محمد نے بھی بحیثیت کرکٹر خاصی شہرت حاصل کی لیکن وہ حنیف محمد جیسی لازوال شہرت کے حامل ناقابل تسخیر کھلاڑی نہ بن سکے۔

حنیف محمد کہتے ہیں۔میری کرکٹ لائف میں یوں تو بے شمار واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کر دوں۔

مجھے جہاز میں خیال آیا کہ پیرس میں ہماری رہائش کا تو کوئی انتظام ہوا ہی نہیں، نہ تو ہم نے پیرس کے کسی ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی اور نہ ہی وہاں کے ہوٹلوں کے بارے میں ہماری معلومات کچھ اتنی اچھی تھی علاوہ ازیں وہاں کے لوگ ویسے بھی بہت کم انگریزی سمجھتے ہیں۔یہ سب کچھ سوچ کر مجھے خاصی تشویش ہوئی اور میں نے تصور میں جب اپنے تمام واقف کاروں پر نگاہ دوڑائی تو بدقسمتی سے وہ بھی فرانسیسی نکلے، مزید یہ کہ جس فلائٹ میں ہم سفر کر رہے تھے وہ صرف لندن اور پیرس کے درمیان ہی پرواز کرتی تھی اس لیے اس فیڈر سروس میں بھی بھانت بھانت کے مسافروں کے ہونے کا امکان کم تھا، خیر! میں نے کافی جدوجہد کے بعد انگریزی جاننے والے اپنے ایک ہم سفر کو تلاش کر لیا اور انہیں اپنی رہائش کے مسئلے سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔چنانچہ سفر ختم ہونے کے بعد ہوٹل کی تلاش میں وہ ہمیں اپنے ساتھ ٹیکسی میں کئی جگہ لے کر گئے اور تقریباً دو گھنٹے ہمارے ساتھ گھومتے رہے جب رہائش کا بندوبست ہو گیا تو مطمئن ہو کر وہ صاحب ہم سے رخصت ہو گئے۔دوسرے دن میں اپنی بیگم کے ساتھ شاپنگ کرنے نکلا، خریداری سے فارغ ہو کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھے، ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہمیں کافی دیر ہو گئی لیکن ہم حیران تھے کہ آخر ہمارا ہوٹل اب تک کیوں نہیں آیا۔کچھ دیر بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں انجان سمجھ کر دانستہ چکر دے رہا ہے۔میں نے کئی مرتبہ اشاروں کی زبان میں اسے اپنے ہوٹل کا راستہ بتانے کی کوشش کی بلکہ ہوٹل کے ایڈریس کا کارڈ بھی دکھایا لیکن وہ ہر مرتبہ اپنی زبان میں ہمیں کچھ کہہ کر خاموش کر دیتا تھا اور مجھے یوں لگتا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تم لوگ چپ کر کے بیٹھے رہو۔ہوٹل کے سامنے سے دو تین مرتبہ چکر لگانے کے بعد اس نے ہمیں ایک دوسرے راستے سے لا کر اسی ہوٹل پر چھوڑا اور تقریباً تین گنا زیادہ کرایہ طلب کرنے لگا۔مجھے ویسے ہی اس پر غصہ آ رہا تھا لہٰذا میں نے اوپر سے اس ہوٹل کے مینیجر کو بلوایا جو اتفاق سے مجھے کرکٹ کی وجہ سے جانتا تھا۔میں نے مینیجر کو اپنی پریشانی بتائی تو اسے بہت افسوس ہوا اس نے اپنی زبان میں ڈرائیور سے معلوم نہیں کیا کہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر ہم سے معافی مانگنے لگا اور ہم سے بمشکل اتنا ہی کرایہ لیا جو بنتا تھا بعد میں ہم نے ہوٹل مینیجر سے پوچھا کہ آپ نے اس سے ایسی کیا بات کہی تھی کہ وہ ہم سے معافیاں مانگنے لگا۔مینیجر نے ہمیں بتایا کہ میں نے اس

سے یہ کہا تھا کہ یہ صاحب پاکستان کے بہت بڑے جادوگر ہیں لاکھوں لوگ اسٹیڈیم میں ان کا جادو دیکھنے آتے ہیں اگر تم نے ان کے ساتھ کوئی فراڈ کیا تو یہ ابھی ٹیکسی سمیت تمہیں غائب کردیں گے۔ ویسے عام طور پر غصے میں یہ تم جیسے لوگوں کو کتا بناتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو ابھی تجربہ کرا دیتا ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے آپ سے معافی مانگنا شروع کردی۔

پونا میں ہمارا ایک ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا اس میں میرا چھوٹا بھائی مشتاق بھی ہمارے ساتھ کھیل رہا تھا۔ مشتاق جس وقت بیٹنگ کرنے گیا اس وقت دوسری طرف سے ایک بہت چالاک بالر بالنگ کررہا تھا۔ میں نے اس بالر کو کھیل سے پہلے سمجھا بھی دیا تھا کہ مشتاق کا ذرا خیال رکھنا وہ میرا چھوٹا بھائی ہے ویسے بھی ابھی نیا ہے۔ کھیل شروع ہوا اور مذکورہ بالر نے مشتاق کی طرف گگلی پھینکی۔ میں گیلری میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا گیند جیسے ہی مشتاق کی طرف آئی بے ساختہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مشتاق اس وقت آؤٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ دراصل مشتاق اس گیند کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ بہرحال خدا نے ہماری عزت رکھی، اس ٹیسٹ میں مشتاق نے دس رن کیے تھے اور اس موقع پر میری حالت کسی مضحکہ خیز بوکھلاہٹ سے کم نہ تھی۔ صورتِ حال کی اس دلچسپ نوعیت کے باعث یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں یہ کیفیت میری ہی نہیں بلکہ کبھی کبھار دیگر کھلاڑیوں کی بھی ہوتی ہوگی کہ اچانک کھیلتے میں کوئی خیال ذہن پر مسلط ہو جائے اور انسان لاشعوری طور پر دیر تک اس میں محو رہے۔ اس حوالے سے مجھے کراچی میں کئی مرتبہ بڑے میچ کھیلتے ہوئے اپنی والدہ اور کئی جاننے والوں کا خیال آیا اور میں کھیل کے دوران اس تصور میں کھو گیا کہ میری والدہ فلاں جگہ بیٹھ کر میچ دیکھ رہی ہیں۔ میرا فلاں دوست اس طرف گیٹ کے قریب بیٹھا ہے اور میرے فلاں رشتہ دار فلاں جگہ ریڈیو پر میرے اس کھیل کی کمنٹری سن رہے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ بعض کھلاڑیوں کے لیے اس قسم کے تصورات شکست کا پیغام بھی لاتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے مجھے ایسے خیالات نے کبھی منفی انجام سے دوچار نہیں کیا بلکہ اس قسم کے خیالات نے الٹا مجھے سپورٹ کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بڑا میچ کھیلتے ہوئے مجھے اپنے بچپن کا ایک دوست یاد آگیا جو اسکول میں اکثر مجھے غلط بالنگ کرایا کرتا تھا اور میں اس کی گیندیں خوب پیٹا کرتا تھا، اس وقت میں بظاہر تو گراؤنڈ میں کھیل رہا تھا لیکن میرا ذہن اس دوست کی طرف تھا۔ کھیل کے دوران گیند میرے پاس آئی مجھے یوں لگا جیسے اس وقت مجھے وہی دوست غلط بالنگ کرارہا ہے۔ چنانچہ میں نے جھلا کر اس زور سے ہٹ لگائی کہ پورا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا پتا چلا کہ خود میں نے چھکا مارا ہے۔

ایک مرتبہ غیر ملکی ٹور کے دوران میچ کھیلتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ میں اپنی قیمتی گھڑی ہوٹل کی ڈریسنگ ٹیبل پر بھول آیا ہوں، بات معمولی سی تھی لیکن تھوڑی دیر کے لیے میں کھیل سے غافل ہوگیا حالانکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کمرا مقفل ہے گھڑی کوئی نہیں لے گا لیکن خواہ مخواہ کا ایک وہم تھا جو پریشان کررہا تھا۔ اس سلسلے کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میں نے چیونگم منہ میں رکھتے ہی اپنے اس وہم پر قابو پالیا اور گھڑی کا خیال دوسرے دن تک نہیں آیا، واضح رہے کہ وہ چیونگم کوئی جادوئی نہیں تھی بلکہ اس چیونگم سے میں نے اپنے اوپر خود اعتمادی طاری کرنے کا سہارا لیا تھا جس میں سو فیصد کامیاب رہا۔

مجھے شروع سے کرکٹ کھیلنے کے مواقع میسر رہے ہیں اسکول میں بھی میں نے اپنے کھیل کے آگے تعلیم کو اور تعلیم کے آگے کھیل کو رکاوٹ نہیں بننے دیا ہے۔ البتہ بعض اوقات ہمارے اسپورٹس ٹیچر ماسٹر اے عزیز جو انڈیا کے سابق ٹیسٹ کرکٹر بھی رہ چکے تھے وہ ہمیں اسکول سے بلوالیا کرتے تھے اور ہم اکثر خاص پیریڈ کے دوران بھی اپنے ٹیچر صاحب کو گگلی دے کر آجایا کرتے تھے کیونکہ عزیز صاحب نے ہم سے کہا ہوا تھا کہ بیٹا جس دن کھیلنے کا زیادہ موڈ ہو اپنے ٹیچر کو گگلی دے کر آجانا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ سناتا ہوں کہ میرے ماتھے پر اس چوٹ کے نشان کا پس منظر کیا ہے؟ اس نشان سے سچ مچ ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے۔ ہوا یوں کہ میں بچپن میں اپنے گھر کی لان میں ٹینس کی بال سے کرکٹ کھیل رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح بال نے مجھے چکرا دیا اور میں وہیں دھڑام سے گر پڑا۔ قریب رکھے ہوئے لوہے کے صندوق سے ٹکرا کر میری پیشانی لہولہان ہوگئی۔ جارجٹ کے کپڑے کو جلا کر اگر زخم میں بھر دیا جائے تو سنا ہے اس سے فوراً خون بند ہوجاتا ہے شاید اسی خیال کے پیشِ نظر میری والدہ نے میرے ماتھے پر چوٹ لگتے ہی پریشانی کے عالم میں اپنی جارجٹ کی ساڑی دیوانہ وار تلاش کرنا شروع کردی جب وہ کئی جگہ جارجٹ کی ساڑی تلاش کر کے تھک گئیں تو انہیں اچانک پتا چلا کہ مطلوبہ ساڑی تو وہ خود

باندھے ہوئے ہیں۔ والدہ نے اسی وقت وہ ساڑی پھاڑ کر میرا زخم بھرنے کا بندوبست کیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ زخم اتنا گہرا تھا کہ میری پیشانی کی چربی تک دکھائی دینے لگی تھی اس واقعے کے حوالے سے مجھے بے اختیار اردو کا محاورہ "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا" یاد آجاتا ہے۔

1967ء میں پاکستانی ٹیم انگلینڈ کے ٹور پر گئی۔ اس موقع پر انگلینڈ کی ایک ٹائی بنانے والی فرم بوتھس (Booths) نے مجھے ایک تقریب میں دو ٹائیوں کا تحفہ دیا۔ یہ ٹائیاں بلاشبہ بہت خوب صورت تھیں۔ ان میں سے ایک میرے لیے تھی اور ایک میری بیگم کے لیے۔ چنانچہ تحفہ دینے کے بعد وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ یہ ٹائی آپ اسی محفل میں اپنے ہاتھ سے اپنی بیگم کے گلے میں باندھیں۔ خیر میں نے اپنی بیگم کی گردن سے بہت نیچے کر کے ٹائی کی ناٹ باندھ دی۔ میں اس ناٹ کو ابھی درست ہی کر رہا تھا کہ میرے ایک بے تکلف دوست نے مذاق میں برجستہ کہا حنیف ناٹ کچھ اور اوپر چڑھا دو۔ (بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا) اس سے بہتر موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔ میرے دوست کی بات سن کر میری بیوی شمی (شمشاد بیگم) سمیت یہاں موجود سب لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔

لاہور کی ریلوے اسپورٹس ٹیم میں میرے ایک دوست سلیم ہوا کرتے تھے، میں جب بھی لاہور جاتا انہیں ٹیلی فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دیتا اور پہلے دن ہم لوگ سب سے پہلے داتا دربار جاتے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا لاہور کا کوئی سفر ایسا نہیں ہوا جب میں پہلے دن داتا دربار نہ گیا ہوں۔ یہ بات ممکن ہے بہت سے لوگوں کے لیے کسی حیرت یا دلچسپی کا باعث ہو لیکن میرے لیے ہمیشہ باعث افتخار و عقیدت رہی ہے۔

دنیا میں بعض ممالک ایسے ہیں جہاں کرکٹر فلم سازوں سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں لیکن 70ء کی دہائی تک ہمارے ہاں ایسا نہیں تھا تاہم وحید مراد، ندیم اور محمد علی وغیرہ میرے بہت اچھے دوست رہے ہیں۔ ہم لوگ جہاں بھی اکٹھے پائے گئے لوگوں نے ہمیں علیحدہ علیحدہ پہچان لیا ہے۔ وحید اور ندیم کے فلم اسٹار بننے سے پہلے میں کرکٹرز کی حیثیت سے بھی ان سے متعارف تھا۔ میری شہرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پاک فلمی صنعت کے چند ڈائریکٹرز نے مجھے فلموں میں کام کرنے کی آفر کی لیکن میں نے اپنے لیے اس آفر کو ایک ناقابل عمل بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ظاہر ہے اس طرف میرا رجحان ہی نہیں تھا تاہم اب سے کئی سال پہلے میں فلم اسٹاروں کو کافی لمبا تڑنگا حسین اور خوب صورت سمجھتا تھا لیکن بعض اداکاروں کو حقیقی زندگی میں اس کے برعکس دیکھ کر جب میں فلم کے ایک صاحب سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے یہ سب کیمرا ٹریک ہوتی ہیں آپ اگر فلم میں کام کرنا پسند فرمائیں تو آپ بھی اسکرین پر اسی طرح نظر آئیں گے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی لیکن اس کے بعد جب چند ایک فلموں کی شوٹنگیں دیکھیں تو فلم اسٹاروں کے بارے میں اپنی اس خام خیالی پر مجھے بڑی ہنسی آئی۔

لیجیے اب ایک اور دلچسپ کم پُراسرار واقعہ سنیے۔ ہم بیرون ملک ٹور پر تھے، پوری پاکستانی ٹیم ایک ہوٹل کی ٹاپ فلور پر ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک رات میں تنہا اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شخص میرے تکیے کے نیچے سے پیسے نکال رہا ہے۔ اتفاق سے اس دن میرے پاس پیسے بھی کچھ زیادہ تھے کیونکہ مشتاق وغیرہ نے بھی کچھ پیسے میرے پاس رکھوائے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ شخص سامنے والی کھڑکی سے آیا ہے اور میرے کمرے میں چہل قدمی کر رہا ہے یقین کیجیے کہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ وہ خواب تھا یا حقیقت، بہرحال میں اس وقت بہت کچھ محسوس کر رہا تھا اور سہا ہوا اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، بستر سے اٹھ کر فون کرنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ غرض اسی کیفیت میں دو گھنٹے گزر گئے۔ خدا خدا کر کے صبح جب روشنی ہوئی تو میں نے فون کر کے ہوٹل والوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ مجھے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا شک ہے۔ آپ پلیز باتھ روم وغیرہ چیک کرائیں۔ ہوٹل والوں نے باتھ روم چیک کر کے مجھے سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ محض آپ کا خیال ہے میں وقتی طور پر کچھ مطمئن ہو گیا لیکن شام کو جب میں لفٹ سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے اپنے قریب سے بالکل ایک ایسے شخص کو گزرتے دیکھا جسے تصور میں رات کو دیکھتا رہا تھا۔ اس آدمی کی شخصیت سچ مچ بہت پُراسرار تھی بلکہ بعض زاویوں سے تو وہ مجھے ڈریکولا ٹائپ کا معلوم ہوا۔ میں جلدی جلدی اپنے کمرے میں پہنچا۔ دروازہ لاک کیا اور پھر اس کے بعد میں اپنے کمرے میں اکیلا نہیں سویا بلکہ جب تک ہوٹل میں رہا اپنے ساتھ ایک دوست کو سلایا۔

ایلی کوہن

عبداللہ احمد حسن

وہ مسلمان نہیں تھا، مسلمانوں کا دشمن تھا لیکن مسلمان بن کر وہ مسلم ممالک کو تباہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے اس طرح سے خود کو پیش کیا کہ لوگ اسے ایک محبِ وطن عرب سمجھنے لگے۔

جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا سبب بننے والے کا تذکرہ

آپ سب نے جیمز بونڈ کا نام ضرور سنا ہوگا، اس کی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔ وہ مختلف ممالک میں خطرناک مشن سر انجام دیتا ہے، مگر وہ ایک خیالی کردار ہے، آیئے آج آپ کی ملاقات ایک ایسے کردار سے کرواتے ہیں جو جیتا جاگتا انسان تھا۔ ایک خطرناک جاسوس تھا۔ اس کا تعلق اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد سے تھا۔

شول کوہن کا تعلق ایک صیہونی یہودی گھرانے سے تھا، وہ شام کے شہر ایلیپو کا رہنے والا تھا جہاں سے اس نے 1914ء میں نقل مکانی کی اور مصر کے شہر اسکندریہ میں آباد ہو گیا۔ 1924ء کو شول کوہن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ایلیاہو کوہن رکھا گیا جو بعد میں ایلی کوہن کے نام سے مشہور ہوا، اس کا شمار دنیا کے خطرناک ترین جاسوسوں میں ہوتا ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسکول کے بعد کالج میں پہنچا، ان دنوں مصر میں غیر مسلموں پر جزیہ دینا لازم تھا تاہم اگر وہ فوج میں

ہوں تو جزیہ معاف ہو جاتا تھا۔ جنوری 1947ء ایلی کوہن نے بھی جزیہ کی ادائیگی کے بدلے فوج میں بھرتی کی درخواست دی جو اس کی مشکوک وفاداری کی بناء پر رد کر دی گئی۔

ان دنوں اخوان المسلمین کا زور کافی بڑھ گیا تھا خصوصاً تعلیمی اداروں میں، کوہن یونیورسٹی میں تھا مگر اخوان کے خوف سے اس نے یونیورسٹی چھوڑ دی اور گھر پر پڑھائی شروع کر دی۔

اس دوران مغرب کی سازشوں اور حمایت کی بناء پر اسرائیل کا قیام عمل میں آ گیا جس کے بعد کئی یہودی خاندانوں نے مصر چھوڑ دیا اور اسرائیل میں بس گئے۔ کوہن کا رابطہ ان صیہونیوں سے ہو گیا اور وہ ایک سہولت کار بن گیا۔ کوہن کے والدین اور تین بھائی 1949ء میں اسرائیل چلے گئے مگر وہ اپنی الیکٹرونکس کی ڈگری مکمل کرنے اور صیہونی سازشوں میں حصہ لینے کے لیے رک گیا۔

1952ء میں فوج نے مصر کے آخری بادشاہ کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا، شاہ فاروق اٹلی فرار ہو گیا جہاں تین سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی صیہونی مخالف تحاریک کا آغاز ہو گیا جس میں شک کی بنا پر کوہن کو بھی پکڑ لیا گیا اور اس سے صیہونی سرگرمیوں سے متعلق پوچھ گچھ کی گئی، تاہم کوئی ثبوت نہ ہونے کی بناء پر اسے بعد میں رہا کر دیا گیا۔

اسرائیل نے موساد کے ذریعے 1948ء سے 1953ء تک ایک آپریشن چلایا تھا جسے آپریشن گوشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت مصر اور دیگر ممالک سے یہودیوں کو اسمگل کر کے غیر قانونی اور خفیہ طور پر اسرائیل پہنچایا جاتا تھا، اس آپریشن کے ذریعے صرف مصر سے تقریباً دس ہزار یہودیوں کو اسرائیل منتقل کیا گیا تھا۔ 1950ء میں کوہن بھی اس آپریشن کا حصہ تھا، اس نے کئی اسرائیلی خفیہ کارروائیوں میں حصہ لیا، مگر مصری حکومت شک ہونے کے باوجود آپریشن گوشن میں اس کے ملوث ہونے کی تصدیق نہیں کر سکی۔

1955ء میں اسرائیل نے ایک تخریبی یونٹ تشکیل دیا جس میں موساد اور مصری یہودی شامل تھے۔ ان کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ مصر میں بڑے پیمانے پر تخریب کاری کی جائے، خاص طور پر مصر میں موجود امریکی و برطانوی تنصیبات کو تباہ کریں اور یہ کام اس طرح کریں کہ کہیں موساد کا نام نہ آئے بلکہ یہ ظاہر ہو جیسے مصری مسلمان یہ تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ مگر مصری حکومت نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ تخریبی گروہ بے نقاب ہو گیا اور اس کے دو ارکان کو سزائے موت دے دی گئی۔ کوہن نے بھی اس یونٹ کی مدد کی تھی اور وہ اس سازش میں پوری طرح ملوث تھا مگر خوش قسمتی سے ایک بار پھر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا، اس بار بھی وہ بچ گیا۔

1936ء میں مصری حکومت نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا تھا جسے اینجلو اجپشن ٹریٹی کہتے تھے جس کے تحت برطانیہ اپنی فوجیں مصر سے نکال لے گا صرف دس ہزار فوجی وہاں رہیں گے جو نہر سوئز کی حفاظت پر متمکن ہوں گے۔ اب جمال عبدالناصر کی حکومت اس معاہدے کو منسوخ کرنا چاہتی تھی اور گزشتہ دو سال سے برطانیہ سے سوئز کنال کا علاقہ خالی کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

اس دوران مصری افواج اسرائیل کے ساتھ سرحدی جھڑپوں میں مصروف تھیں کہ 1956ء میں اسرائیل نے ایک اور سازش تیار کی جس میں بعدازاں برطانیہ اور فرانس بھی اس کے حلیف ہو گئے۔ اس سازش کے تحت نہر سوئز پر دوبارہ مغربی قبضہ بحال کرنا تھا ساتھ ہی جمال عبدالناصر کو صدارت سے ہٹانا تھا۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تینوں ممالک نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا، جب سوئز جنگ چھڑی تو امریکا، سوویت یونین اور اقوام متحدہ نے تینوں حملہ آوروں پر زور دیا کہ فوری جنگ بندی کر دی جائے، یہ جنگ بندی برطانیہ اور فرانس کے لیے ذلت آمیز تھی مگر مجبوراً انہوں نے یہ بات مان لی۔ اس کامیابی نے جمال عبدالناصر کو اور مضبوط کر دیا۔

سوئز بحران میں یہودیوں کا کردار، ان کی مکاری اور سازشوں کی وجہ سے مصری حکومت نے ان کو نکالنے کا فیصلہ کیا، جس کے نتیجے میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مصر سے نکال دیا گیا۔ 1956ء کے دسمبر میں کوہن کو بھی ایک ناپسندیدہ اور مشکوک شخصیت ہونے کی بناء پر مصر چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ وہ یہودی ایجنسی کی مدد سے اسرائیل چلا گیا، اسے نیپلز کے راستے حیفہ کی بندرگاہ پہنچایا گیا۔

1957ء میں کوہن کو اسرائیلی فوج میں بھرتی کر لیا گیا جہاں اس کو ملٹری انٹیلی جنس میں کاؤنٹر انٹیلی جنس اینالسٹ کا عہدہ دیا گیا۔ اسے یہ کام پسند نہیں آیا اس لیے بیزار ہو کر اس نے موساد کو جوائن کرنے کی درخواست دی، جسے موساد نے مسترد کر دیا، وہ بہت ناراض ہوا اور اس نے

انٹیلی جنس سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

اگلے دو سال اس نے تل ابیب میں ایک انشورنس آفس میں فائیلنگ کلرک کا کام کیا، اس دوران اس کی ملاقات ایک عراقی یہودی تارک وطن خاتون نادیہ مجلڈ سے ہوئی جلد ہی ان کی دوستی ہو گئی جو بعد ازاں محبت اور پھر شادی پر منتج ہوئی۔ ان کی شادی 1959ء میں ہوئی۔ ان کے ہاں تین بچے شائی، ارت اور صوفی ہوئے۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ بیت یام منتقل ہو گیا۔

ان دنوں موساد کو اپنے نئے منصوبے کے لیے ایک ایسے ایجنٹ کی ضرورت پڑی جو شام میں رہ کر شامی حکومت کے خلاف جاسوسی کر سکے۔ موساد کے ڈائرکٹر میئر امیت نے کئی فائل منگوائی تھیں ان میں ان لوگوں کی فائل بھی تھی جنہیں برسوں پہلے مسترد کیا جا چکا تھا۔ ان فائلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر ایلی کوہن کی فائل پر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ یہی ہے۔ اس نے فوری آرڈر جاری کیا کہ اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ ایجنٹوں نے پتا لگایا اور اسے لے آئے، میئر امیت نے اس سے بات کی۔ اس نے کچھ پس و پیش کے بعد ہامی بھر لی۔ اب اس کو دو ہفتے نگرانی میں رکھ کر اس کے مختلف ٹیسٹ لیے گئے جس سے پتا چلتا کہ وہ اس کام کے لیے موزوں ہے بھی یا نہیں، اس نے سارے امتحان پاس کر کے ثابت کر دیا کہ وہی اس کام کے لیے سب سے موزوں امیدوار ہے۔ چنانچہ اسے خوش خبری سنا دی گئی کہ موساد نے اسے اپنے کام کے لیے چن لیا ہے۔

1960ء میں اس کو باقاعدہ موساد میں بھرتی کر لیا گیا، اب اس کی ٹریننگ کا دور شروع ہوا۔ چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد اسے کٹسا یعنی فیلڈ ایجنٹ کا مرتبہ مل گیا۔ اس ٹریننگ کے دوران اسے ایک جعلی شناخت اور گھنی داڑھی کے ساتھ شیخ محمد سلمان، یروشلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے طور پر متعارف کروایا گیا۔ اگرچہ کوہن عرب مسلمانوں کے انداز زندگی و ثقافت سے اچھی طرح واقف تھا، مگر موساد چاہتی تھی کہ اس میں خود کو ایک مسلمان ظاہر کرنے میں کہیں بھی کوئی بھی کمی نہ رہ جائے کیونکہ مشن بہت اہم تھا۔ چند ماہ شیخ سلمان کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے تجارت کے رموز بھی سکھائے گئے۔

1961ء مارچ کی پہلی تاریخ کو ایلی کوہن سوئٹزر ائر کے طیارے میں سوار ہوا جو زیورخ سے بیونس آئرس ارجنٹینا جا رہا تھا، وہ ایک بڑے بزنس مین کی حیثیت سے فرسٹ کلاس میں تھا، اس کے کاغذات میں اس کا نام کمال امین ثابت درج تھا۔ پاسپورٹ اسے ایک لبنانی نژاد شامی ثابت کر رہا تھا۔ بیونس آئرس میں شام سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مقیم تھی۔

یہاں کوہن نے خود کو ایک سنجیدہ، متین، سمجھدار، متقی اور محب وطن شخصیت کے طور پر پیش کیا۔ وہ جلد ہی بیونس آئرس کی شامی برادری میں ایک مقبول اور ہر دلعزیز شخص مشہور ہو گیا۔ موساد نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ وہ اسے شام جانے سے پہلے ہی ایک ایسا بیک گراؤنڈ دیں اور ایسی مقبول شخصیت بنا دیں جو اسے شام میں آسانیاں مہیا کرے۔ موساد کو یقین تھا کہ شامی انٹیلی جنس یقیناً کمال امین ثابت کے بارے میں جاننا اور اس کے ماضی کو کھنگالنا چاہے گی اس لیے انہوں نے پہلے ہی سے سب کچھ تیار رکھا تھا۔ دراصل کمال امین ایک حقیقی شخص تھا۔ وہ لبنان میں شامی والدین کے ہاں پیدا ہوا تھا، مگر وہ کافی عرصہ پہلے مر چکا تھا، ہاں اگر وہ زندہ ہوتا تو کوہن کی ہی عمر کا ہوتا۔

اب کوہن نے اپنا کام شروع کیا۔ وہ بیونس آئرس کے شامی سفارت خانے کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں میں پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ سفارت خانے کے ملٹری اتاشی میجر امین الحافظ اس سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ اس نے خود کو محب وطن اور بعث پارٹی کا ہم خیال ظاہر کیا تھا۔ اس کا نتیجہ حسب توقع نکلا اور میجر نے کوہن پر زور دینا شروع کیا کہ دمشق جائے وہاں اس کا مستقبل روشن ہے وہ وہاں بعث پارٹی کے لیے بھی کام کرے۔ بالآخر اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی، تو میجر نے بات آگے پہنچا دی۔

جب شامی انٹیلی جنس تک یہ بات پہنچی تو ان کے ارجنٹین میں موجود ایجنٹوں نے کمال ثابت کے بارے میں تحقیقات شروع کیں۔ ایک دن جب وہ ذرا تاخیر سے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ کسی نے گھر میں گھس کر تلاشی لی ہے۔ اس کے کاغذات اور تصویروں کے البم الٹ پلٹ تھے۔ موساد نے اس کی جعلی شناخت کو مکمل بنانے اور ساتھ ہی امین ثابت کی پرانی خاندانی تصاویر اکٹھی کرنے میں جو مشقت اٹھائی تھی وہ آج کام آئی۔ شامی انٹیلی جنس نے اطمینان ظاہر کیا کہ سب ٹھیک ہے اور یہ ایک تصدیق شدہ شامی شہری ہے۔

اب موساد نے اسے دمشق جانے کا اشارہ دے دیا،

ان ہی دنوں جب کوہن جانے کی تیاری کر رہا تھا، میجر الحافظ کا تبادلہ دمشق میں ہوگیا۔ کوہن نے میجر کو لکھا کہ میں دمشق آنا اور بعث پارٹی کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔

دسمبر 1961ء میں کوہن نے میونخ کا دورہ کیا اور ایک ہوٹل میں تل ابیب سے آئے ہوئے اپنے کنٹرول سے ملاقات کی۔ ہوٹل کے کمرے میں کٹیا اور کنٹرول کے مابین اس کے دمشق مشن کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے ساری چیزیں پھر سے چیک کیں۔ اس دوران موساد کی ایک ٹیکنیکل ٹیم نے کوہن کا سامان تیار کر دیا جس میں ایک طاقتور ٹرانسمیٹر کو ایک الیکٹرک مکسر کے نقلی پیندے میں چھپایا گیا۔ ایک مینا کس مائیکرو کیمرا اسے دیا گیا جو بظاہر ایک الیکٹرک شیور لگتا تھا، ایک تار جس سے طویل فاصلے کے انٹینا کا کام لیا جاسکتا تھا ان کے علاوہ کچھ کیمیکلز جو دھماکا خیز مادہ بنانے میں کام آتے تھے انہیں ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبز اور شیونگ کریم کے ڈبوں میں چھپایا گیا تھا۔

1922ء جنوری کی پہلی تاریخ کو کوہن دمشق پہنچا۔ عارضی طور پر وہ میجر کے ہاں ٹھہر گیا، پھر چند دن کی تلاش کے بعد اس کو ایک مہنگے علاقے ابو رمانہ میں ایک نئی عمارت کی چوتھی منزل پر اپارٹمنٹ مل گیا۔ ابو رمانہ میں قریب ہی ملٹری ہائی کمانڈ اور انڈین ایمبیسی تھے۔

کوہن نے یہاں ایکسپورٹ بزنس شروع کیا اور جلد ہی شامی نوادرات، فرنیچر، زیورات اور فن پارے یورپی ممالک کو برآمد کرنے شروع کر دیئے۔ وہ اکثر حمیدیہ مارکیٹ کے قہوہ خانوں میں ترکش کافی پیتا اور کاروبار یا سیاست پر گفتگو کرتا پایا جاتا تھا۔ اب وہ ایک خطرناک جاسوس بن چکا تھا۔

اس نے اپنے گھر پر بھی پارٹیاں دینا شروع کر دیں جس میں اعلیٰ حکومتی اہلکار اور وزراء کے علاوہ اعلیٰ کاروباری شخصیات وغیرہ بھی شامل ہوتی تھیں۔ ان دعوتوں میں اعلیٰ حکومتی عہدیدار شریک ہوتے تھے جو اپنے دفتری معاملات اور فوجی نقل و حرکت کے بارے میں کھلی گفتگو کرتے تھے۔ کوہن نشے کا بہانہ کر کے خود کو بے خبر ظاہر کر کے ان کی باتیں غور سے سنتا تھا اور ضروری باتیں ذہن نشین کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سرکاری حکام کو قرض فراہم کرتا تھا اور خود کو ان کا خیر خواہ ظاہر کرتا تھا۔ سرکاری حکام اس کی فراہم کی ہوئی مفت شراب کے نشے میں اکثر خفیہ معاملات پر اس سے مشورے لیتے تھے۔ کوہن بذات خود ایک جاسوس کے طور پر رنگینیوں سے دور تھا۔ مگر اس کے تعلقات شام میں سترہ خوبصورت خواتین سے تھے جن کا تعلق بااثر خاندانوں سے تھا۔ اس کا اثر و رسوخ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ گرفتاری سے پہلے اس کا نام بطور نائب وزیر دفاع زیر غور آچکا تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کی اصلیت سامنے آگئی۔

کوہن نے 1961ء سے 1965ء تک بیشمار خفیہ معلومات اسرائیل کو فراہم کیں۔ وہ معلومات ساتھ لائے ہوئے طاقتور ٹرانسمیٹر سیٹ کے ذریعے بھیجتا تھا۔ لمبی رپورٹیں اور مائیکرو فلمیں وہ ایکسپورٹ کیے جانے والے فرنیچر میں بنی مخصوص جگہوں پر چھپاتا تھا اور کبھی کبھار ذاتی طور پر پہنچاتا تھا، اس نے تین بار خفیہ طور پر اسرائیل کا سفر کیا تھا۔

اس نے خود کو ایک شوقیہ فوٹوگرافر کے طور پر بھی مشہور کر رکھا تھا۔ اس کے تعلقات بہت اونچے حکومتی اور اعلیٰ فوجی حکام سے تھے اس لیے وہ آزادانہ فوجی تنصیبات کے دورے کرتا رہتا تھا اور تصویریں اتارتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حساس مقامات میں بھی گھس کر تصویر کشی کرتا تھا۔ اس کی اتاری ان تصویروں سے اسرائیلی فوج اور موساد نے 1967ء کی چھ دن کی جنگ میں بہت کام لیا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی گولان کی پہاڑیوں کا دورہ تھا جہاں سے اس نے شامی افواج کے مورچوں اور پناہ گاہوں کے بارے میں انتہائی حساس نوعیت کی معلومات اکٹھی کیں۔

اس نے دیکھا شامی فوجی تپتے ہوئے سورج تلے مورچوں میں ڈیوٹی دے رہے ہیں گرمی سے سب کا برا حال ہے، تو شامی فوجیوں سے ہمدردی کا بہانہ کرتے ہوئے اس نے ان کی تمام پوسٹس پر درخت لگوا دیے کہ سورج کی تپش سے بچیں اور یہ ساری معلومات اسرائیل بھیج دیں۔ 1967ء میں دوران جنگ، اسرائیلی فوج نے انہی درختوں کو ہدف بنا کر حملہ کیا اور محض دو دن میں گولان پر قبضہ کر لیا۔ کوہن نے کئی بار جنوبی سرحدوں کا دورہ کیا اور وہاں سے شامی افواج کی پوزیشنوں کی تصاویر و نقشے بنائے۔ وہاں اس کے علم میں شامی افواج کا ایک خفیہ منصوبہ آیا جو دفاع کے لیے بنکرز اور توپوں کی تین دفاعی لائنیں بنانے کا تھا، جبکہ اسرائیل کے علم میں صرف ایک ہی دفاعی لائن تھی۔

شام کے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں نئے چیف کی تقرری ہوئی جس کا نام کرنل احمد سویدانی تھا وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا اور کوہن کو تو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ شام میں کوئی اسرائیلی جاسوس ہے جو خفیہ معلومات

اسرائیل کو دے رہا ہے۔ اس کی وجہ سے کوہن کو اپنے پکڑے جانے کا خوف ہوا۔ اس نے آخری خفیہ اسرائیلی دورہ جو 1964ء نومبر میں کیا، اس دورے کے دو مقاصد تھے ایک تو خفیہ معلومات پہنچانا دوسرے اپنے تیسرے نوزائدہ بچے کو دیکھنا۔ اس نے موساد کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے شام میں اپنی خدمات سے سبکدوشی کی درخواست دی۔ مگر موساد نے اس سے کہا کہ بس ایک آخری بار اور جاؤ اس کے بعد تمہیں سبکدوش کر دیا جائے گا۔ واپسی سے قبل اس نے اپنی بیوی سے مل کر کہا کہ اب میں آخری بار جا رہا ہوں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں گا۔

جنوری 1965ء میں شام نے روس کی مدد سے اعلیٰ سطح پر اسرائیلی جاسوس کی تلاش شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں روس کے بنے جدید ترین آلات سراغرسانی روسی ماہرین کی زیرنگرانی استعمال کیے جا رہے تھے۔

انڈین ایمبیسی کا معمول تھا وہ روز رات کو نئی دہلی سے وائرلیس پر رابطہ کر کے اپنے کام نمٹاتے تھے مگر اکثر انہیں شکایت ہوتی تھی کہ ان کے سگنلز میں کوئی مداخلت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ صاف رابطہ نہیں کر پاتے تھے۔ آخر انہوں نے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کو شکایت دی کہ ہمیں یہ مشکل پیش آرہی ہے۔ شامی ماہرین نے علاقے میں جا کر چیک کیا تو پتا چلا کہ یہاں کہیں سے غیر قانونی ریڈیو نشریات جاری ہیں۔ انہوں نے سوویت یونین سے درآمد شدہ گاڑی منگوائی جو ٹریکنگ کے آلات سے لیس تھی۔ اس کے ذریعے وہ اس علاقے میں تلاش کرتے رہے۔ یہ تلاش چند دن تک جاری رہی اور بالآخر انہوں نے ان نشریات کے مخرج کا پتا لگا لیا۔ 24 جنوری شامی سیکیورٹی آفیسرز نے ایسے وقت کوہن کے اپارٹمنٹ پر اچانک چھاپا مارا جب وہ ٹرانسمیٹر پر اسرائیل سے رابطہ کر رہا تھا۔ اسے ملٹری ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا جہاں اس پر مقدمہ چلا اور وہ جاسوسی و خفیہ معلومات کی ترسیل کا مجرم پایا گیا۔ اسے مارشل لاء قانون کے تحت سزائے موت سنائی گئی۔ کوہن نے مؤقف اختیار کیا کہ اسے بار بار تشدد کا نشانہ بنا کر تفتیش کی گئی اور زبردستی اعتراف کروایا گیا ہے، مگر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود تھے نیز اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا۔ اسرائیل نے اس کے لیے ایک بین الاقوامی مہم چلائی کہ شام اسے سزائے موت نہ دے۔ اسرائیلی وزیر خارجہ گولڈا میئر کی قیادت میں بین الاقوامی برادری سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ دمشق پر دباؤ ڈالے کہ کوہن کو پھانسی دیے جانے سے پہلے نتائج پر غور کر لے۔ سیاستدانوں، وزراءاعظم اور پوپ پال 6 نے اس کی جان بخشی کی سفارش کی، یہاں تک کہ گولڈا میئر نے سوویت یونین سے بھی اپیل کی۔ فرانس، بلجیم اور کینیڈا کی سفارشات کے باوجود بھی شامی حکومت نے سزائے موت برقرار رکھی۔

15 مئی 1965ء کو کوہن نے اپنا آخری خط اپنی بیوی نادیہ کے نام لکھا۔ میری پیاری نادیہ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ جو گزر چکا اس پر رو کر اپنا وقت مت ضائع کرنا، اپنی ذات پر توجہ مرکوز کرو اور بہتر مستقبل کی طرف دیکھو۔

پھانسی کے دن جیل میں اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کسی ربی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے منظور کر لیا گیا المرجہ چوک کی طرف جاتے ہوئے ٹرک میں اس کے ساتھ 80 سالہ شام کے چیف ربی نسیم اندابو بھی تھے۔ 18 مئی 1965ء کو کوہن کو دمشق کے المرجہ چوک میں سرعام پھانسی پر لٹکا دیا گیا، اور اس کی لاش کسی نامعلوم مقام پر دفنا دی گئی۔

نومبر 1965ء میں کوہن کی بیوی نادیہ نے صدر حافظ الاسد (موجودہ صدر بشارالاسد کے والد اسی وجہ سے یہودی عالم اسلام کے تمام سربراہان سے زیادہ ان دونوں سے نفرت کرتے ہیں) کو خط لکھا جس میں اس نے اپنے شوہر کے کیے گئے جرائم و ملک دشمن اقدامات کی معافی مانگی اور اس کی باقیات کی وصولی کی اُمید ظاہر کی۔ مگر شامی حکام نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد بھی کوہن کے خاندان کی طرف سے ایسی درخواستیں دی جاتی رہیں مگر شامی حکام نے سب مسترد کر دیں۔ اگست 2008ء میں منذر موصلی سابقہ بیورو چیف آف آنجہانی شامی صدر حافظ الاسد نے انکشاف کیا کہ ایلی کوہن کا مدفن نامعلوم ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ شامیوں نے کوہن کو تین بار دفن کیا ہے، تاکہ موساد اس کی باقیات کو حاصل کر کے اسرائیل لے جانے کے لیے کوئی خصوصی کارروائی نہ کر سکے۔ کوہن کے بھائی ابراہام اور موریس نے اس کی باقیات کو واپس لانے کی مہم شروع کی تھی، موریس 2006ء میں مر گیا اب کوہن کی بیوہ نادیہ اس مہم کو چلا رہی ہے۔ کوہن کو اسرائیل میں قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا ہے۔ بہت سی سڑکیں اور جگہیں اس کے نام سے موسوم ہیں۔

اس نے شام کو اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اس کی وجہ سے اسرائیل بآسانی گولان پر قابض ہو گیا۔ اسے بیسویں صدی کا سب سے خطرناک جاسوس قرار دیا جاتا ہے۔

سوہنا دیدی

سلمیٰ اعوان

دسمبر، سیاہ دسمبر کا مہینا پھر آگیا۔ بہت سارے زخم ہرے کرگیا۔ سقوطِ مشرق پاکستان کے المیہ نے ہزارہا کہانیوں کو جنم دیا۔ ایک ایسی ہی اَن کہی کہانی معروف مصنفہ کی زبانی ۔ سقوط کے المیہ سے متاثر ایک عورت کے دکھ کی عکاس تحریر، قصہ دل پذیر۔

ملک کے دولخت ہونے سے بہت سارے خاندان بھی دولخت ہوگئے

''ایک خبر ہے ماں۔''

ایلش ماچھ کے گودے، موٹے سفید چاول، اچار اور ٹماٹر کے قتلے کے ملغوبے سے بنا نوالہ ابھی اس کے منہ سے قدرے فاصلے پر ہی تھا جب اس کی غلافی آنکھوں کے بھاری پپوٹے اس کی کمان جیسی ابروؤں سے جا جڑے اور ہاتھ معلق سا ہوگیا۔

''کیا'' ہونٹوں پر تو سناٹا تھا بس سارا چہرہ جیسے ''کیا'' کے سوال میں لتھڑا پڑا تھا۔

"اروما دت اس پنجابی میجر سے نکاح کر کے آج ویسٹ پاکستان چلی گئی۔"

"اور کل کانجی وارم کی ساڑی اور کندن کا زیور پہن کر تم اسی کے نکاح میں گئی تھیں نا۔ منی، تم سے ایسی امید نہیں تھی مجھے۔"

پانچ فٹ سات انچ کی چنبیلی جیسی رنگت والی منی، آبی رنگی ساڑی کا پلو ننگے سڈول بازو پر پھینکتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ تلخی تھی اس کے لہجے میں جب وہ بولی۔ "ماں کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ دوست ہے وہ میری۔ دوستی کے بھرم رکھنے پڑتے ہیں۔"

دکھ اور شکایت کا عنصر لہجے میں واضح گھلا ہوا تھا۔

بھات تو گویا حرام ہوگیا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ کا لقمہ بھی پلیٹ میں گر گیا تھا۔ ایلش ماچھ دنوں بعد پکی تھی اور پورے گھر میں اس کی خوشبو تیرتی پھر رہی تھی۔ پر من پسند کھانا نگلنا اب ممکن کب رہا تھا۔ سویتا دیدی تو دل سے نکل کر سامنے آ بیٹھی تھیں۔

سویتا دیدی جن دنوں بیاہ کر کلکتے سے ڈھاکا آئیں۔ میں چھوٹی بوا کے ہاں مانک گنج گئی ہوئی تھی۔ پرکاش چاچا کی حویلی اور ہماری راجباڑی ایک ہی گلی کی دو انتہائیں تھیں۔ پورا مہینا مانک گنج میں گزار کر آنے پر پتا چلا کہ رمیش دادا کی دلہن آگئی ہے تو میں اسے دیکھنے حویلی پہنچ گئی۔

اس وقت ڈھاکا کا آسمان بادلوں سے جھکا پڑا تھا۔ بارش کھل کر برسی تھی اور ابھی اور برسنے کے موڈ میں تھی۔ ان کے گھر کے کشادہ آنگن کی سرخ اینٹیں بارش کے پانیوں سے دھل کر اپنی نکھری صورت سے بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ غربی برآمدے کے سامنے اگے کرشنا چوڑا کے درخت میں لگے سرخ سرخ پھول، گویا آگ لگی ہوئی تھی۔ مالوتی کے بوٹوں کا جوبن غضب ڈھا رہا تھا اور کیلے کے پتے ہواؤں کے زور سے سراٹے مارتے رہے تھے۔ حسبِ معمول گھر پر ویرانی کا راج تھا۔ رسوئی میں کھٹ پٹ کی آواز پر میں ادھر بڑھ گئی۔ دروازے کی ایک سمت کھڑے ہو کر میں نے اندر جھانکا۔ اونچی سی رنگین چوبی پیڑھی پر نرم و نازک سی بڑی آپا جیسی من موہنی، لڑکی شاہی رنگی بوتھ کی ساڑی میں لپٹی، ہاتھوں میں پکڑی رنگین صافی میں لپٹی روٹیوں کو کھولتے ہوئے خود کلامی میں مصروف تھی۔

"بنگال کی عورتوں کو کبھی اچھی روٹی نہیں بنانی آئے گی۔ اب اگر یہ نرم ہوتی تو وہ کم از کم ایک تو کھاتا۔ یہ اتنی اکڑی ہوئی تو اس کے بوڑھے دانتوں تلے کسی پتھر کی طرح ہی محسوس ہوئی ہوں گی۔ آج پانچ دن ہو گئے ہیں تپ چڑھتے ہوئے۔"

وہ یقیناً پرکاش چاچا کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ شاید وہ بیمار تھے۔

میں نے جوتوں سے ذرا کھٹ پٹ کی۔ انہوں نے گھوم کر دروازے کی سمت دیکھا۔ ایک اجنبی صورت دیکھ کر پہلے حیران اور پھر مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔

اٹھنے سے ساڑی کے پلو میں بندھا چابیوں کا گچھا ان کی پشت پر چھن کی آواز پیدا کرتے ہوئے گرا۔ ان کے محرابوں والے پاؤں آلتا سے سجے ہوئے تھے اور ان کی چال میں ایک بانکپن تھا۔

ہم دونوں کمرے میں آگئیں، وہ بھرے پرے گھر سے آئی تھیں۔ یہاں تنہائی اور سناٹا تھا۔ گنتی کے لوگ شوہر، سسر اور نوکر۔ یقیناً اسی لیے وہ میری آمد پر بہت خوش تھیں اور ملتجی تھیں کہ میں گاہے بگاہے چکر لگایا کروں۔

ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ سویتا دیدی اکثر اس کا اظہار بڑے دکھی لہجے میں کرتیں۔ "ارے اتنے زمانوں سے اکٹھے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ دھرم علیحدہ علیحدہ ہے تو کیا ہوا؟ بھاشا تو ایک ہے۔ رہن سہن ایک سا ہے۔ محبت پیار ہے۔ ہمیں تو سوراج چاہیے۔ یہ دیس کو بانٹنے والی باتیں تو پاگل پن ہیں۔"

دراصل پرکاش چاچا تو انڈیا جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ ان کی ڈھاکا اور کومیلا میں لمبی چوڑی زمینداری نقل مکانی کے راستے میں مانع تھی۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ انڈیا گورنمنٹ زمینداری، جاگیرداری اور ریاستی نظام کے خاتمے کے بارے میں بڑی واضح تھی۔

سویتا دیدی کو جو فکر دن رات گھائل کیے جاتا تھا وہ بٹوارے سے تھا کہ اگر یہ ہوگیا تو لکیریں کھنچ جائیں گی اور سرحدوں کی لکیروں کو من چاہنے پر بھی پاٹا نہ جا سکے گا۔ پاسپورٹ اور ویزا کا چکر شروع ہو جائے گا اور کلکتہ میں اس کی بہنیں تو اس کی لمبی جدائیوں کی تاب نہ لا پائیں گی۔

پھر پاکستان بن گیا۔ میں بیاہ کر چند سالوں کے لیے بیروت چلی گئی۔ جب واپس آئی تو سویتا دیدی سے ملنے گئی اور میرے لیے یہ کس قدر تعجب کی بات تھی کہ وہ بے حد دکھی اور اداس تھیں۔ ارمنی ٹولہ میں ان کا وسیع و عریض گھر ابھی بھی ویسا ہی شاندار تھا۔ پر گھر کی ویرانی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ گو گھر میں دو

بچوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔
اروما کی عمر کوئی دس سال ہوگی۔ میری مینی جتنی اور سوشیل بھی کوئی سات آٹھ سال کا تھا، میرے شہید جتنا۔
اس ملاقات میں میرا دل بوجھل ہو گیا۔ پرکاش چاچا بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ بیمار بھی تھے۔ سویتا دیدی کی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر آنسو نہ تھمتے تھے۔ اروما ان دنوں دار جلنگ کے کونونٹ میں تھی اور سوشیل سوئٹزرلینڈ کے کسی اقامتی اسکول میں۔
مجھے حیرت تھی۔ رنیش دادا ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ کیا وہ ان کی طرف سے دکھی ہیں یا بچوں کی جدائی نے اتنا ملول کر رکھا ہے۔
میں نے پوچھا تھا۔ ”دیدی یہ سب کیا ہے؟ ان خوبصورت آنکھوں میں تو ہمیشہ خوشی و سرشاری کے عکس رقص کرتے دیکھے ہیں۔ ان ہونٹوں پر ہنسی کی پھلجڑیاں پھوٹتے دیکھی ہیں۔ دیدی، رنیش دادا کیا تمہارا خیال نہیں رکھتے؟“
”بہت رکھتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں گلے گلے تک طنزیہ ہنکارے تھے۔ دکھ اور ملال کی گھلاوٹ تھی۔
ٹیگور کی وہ خوبصورت نظم بے اختیار ہی ان کے ہونٹوں پر آ گئی تھی جو گیتا نجلی کے صفحوں پر جگمگاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا رنیش نے اسے لفظوں کے ہیر پھیر سے سجا کر میرے ماتھے پر چپکا دی ہے۔ پر کوئی پوچھے میں نے اسے کب کہا تھا کہ وہ مجھے شاہزادیوں جیسے کپڑے پہنائے اور میری گردن کو ہیرے جواہرات سے لاد دے۔ اور پھر میرے لیے یہ لازم ہو جائے کہ اس سنگھاسن پر جا بیٹھوں، بیٹھی رہوں اور نیچے نہ اتروں اس ڈر سے کہ کہیں میری پوشاک دنیا کی مٹی سے گرد آلود نہ ہو جائے۔
ٹیگور نے تو ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ اس نے تو اس پوشاک کو ہی ناپسند کیا جو انسان کو گرد آلود ہونے سے روکے۔ جو اسے تکبر سے بھر دے، جو اسے عام لوگوں سے ملنے سے روکے، جو اسے زندگی کے میلے میں داخل نہ ہونے دے۔
میں بھی تو دنیادار عورتوں کی طرح اسے اپنے گھر میں، اپنے دروازوں میں، اپنے آنگن میں، اپنے پیڑوں کی چھاؤں میں اور زندگی کی تو تو میں، میں میں دیکھنا چاہتی تھی۔
وہ چپ ہو گئی تھیں۔ چپ ان کے رسیلے گداز ہونٹوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ چھوٹے سے دہانے کو بھی نمایاں کرتی تھی۔
بہت سالوں بعد ان سے ملنا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے میری آنکھ ان کے چہرے کے خدوخال اور اندرونی جذبات کے اس پھیلاؤ کو گہری نظر سے دیکھتی تھی۔
”آمنہ، سواستک اور ہندو دھرم کی عظمت ہندو جاتی سے ہے جو قربانیاں مانگتی ہے۔ کوئی اور دے نہ دے اس مشکل بیڑے کو اٹھانے کا ذمہ کلی طور پر رنیش نے خود لے لیا ہے۔“
وہ بولتے بولتے رکی پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”جدائی میرے لیے کتنی اذیت ناک ہے؟ اسے سوچنے کی اسے قطعی ضرورت نہیں۔
میرا جسم اور روح فرقت کی آگ میں جل جل کر کیسے راکھ ہو رہے ہیں؟ یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ تنہائی کی ڈستی ہوئی سولیوں کے پھندے کیسے میرا گلا گھونٹ رہے ہیں؟ اسے محسوس کرنے اور دیکھنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں، بس مجھے تو قربانی دینے کا حکم ملا ہے۔“
”سویتا دیدی۔“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔
”ہاں نا! ٹھیک تو کہہ رہی ہوں۔“ اور جیسے وہ پھٹ پڑی تھیں۔ آنسوؤں کا پرنالا ان خوبصورت آنکھوں سے پھر بہہ نکلا تھا۔ جنہیں میں نے اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے انہیں دلداری کے پھیکے روکھے لفظوں سے بہلانا چاہا۔
”میرے اندر تنہائی کے گہرے گھاؤ ہیں۔ میرے ہونٹ مسکرانا بھول گئے ہیں کہ وہ کہیں نہیں ہے جو کہا کرتا تھا کہ سویتا یہ تم ہنسی ہو یا کہیں گھنٹیاں بجی ہیں؟“
ان کا بے قرار دل نہ کہتے کہتے بھی بہت کچھ کہہ گیا تھا۔
”مجھے وہ کلکتہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر لے جانا چاہتا ہے۔ شادی کے شروع دنوں میں میں بے چین رہتی تھی نا۔“
اور مجھے بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ سویتا دیدی تقسیم کے خلاف تو تھیں نا۔
گھر آکر میں نے اپنے بھائی سے وجہ پوچھی۔ ”پور بو پاکستان میں اس کے آنے پر پابندی ہے۔“ میرے بھائی نے عام سے لہجے میں بات کی۔ پر میرے دیور نے اس کے بخیئے ادھیڑ دیئے تھے۔
تعجب سے میں نے یہ سب سنا تھا۔
رنیش دادا کلکتے میں بیٹھا تخریبی سرگرمیوں میں الجھا ہوا تھا ہفت روزہ اخبار شنکھرام کا ایڈیٹر تھا۔ اینٹی پاکستانی طلبہ اور لوگوں کا ہر دل عزیز لیڈر بنا ہوا تھا۔ وہ خوب خوب زہر اگل رہا ہے۔ عام عوام کے ذہن کو بدلنے کے لیے لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مضامین لکھتا ہے۔ ابھی تو پاکستان بنا ہے۔ لوگوں کے دل میں وطن کی محبت ہے لیکن یہ مضامین آنے والی نسل کے ذہن کو خراب ضرور کریں گے۔ اسی لیے اس کے یہاں آنے پر

پابندی ہے۔

ہمارے گھرانے نے جدوجہد پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا اور میرا سسرال تو بدنامی کی حد تک پرو پاکستانی مشہور تھا۔ یہ تھوڑی کہ انہیں مغربی پاکستان سے شکایات نہیں تھیں۔ ڈھیروں ڈھیر تھیں۔ اپنی ماتری بھاشا، بنگلہ بھاشا کو نظر انداز کرنے پر سب کو دکھ تھا۔ ضیاء اکثر اپنے فوجی اور کاروباری دوستوں کے خوب لتے لیتے۔ جی بھر کر انہیں رگیدتے۔ پر وہ علیحدگی کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔

کوئی ایک ماہ بعد سوتیا دیدی کا فون آیا۔ مجھے بہت اصرار سے بلایا کہ بچے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہیں۔ میں بھی بچوں کے ساتھ آؤں۔ ان کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مصروفیت کے اژدہام میں پھنسے ہونے کے باوجود بھی جانا پڑا۔ سارا دن ان کے ساتھ گذرا۔ ان کے دکھ سنے۔ اروما اور سوشیل گھلنے ملنے والے بچے تھے۔

اب ایک طرح آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ بچوں کی دوستیاں گہری ہوگئیں۔

پھر ملکی منظرنامے پر بنگالیوں کے جائز مطالبات کے ساتھ ساتھ، کہیں اجتماعی اور کہیں انفرادی سطح پر ظلم و ستم، قتل و غارت، بربریت کے واقعات رونما ہونے لگے تھے۔ نوجوان طبقہ بے چینی اور اضطراب کا شکار تھا اور اس اضطراب کو کلکتے سے بڑھایا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آندھیاں چلنے لگیں۔ چھ اور گیارہ نکات پر بحث اور علیحدگی کی باتیں سرعام ہونے لگی تھیں۔

ڈھاکا یونیورسٹی سیاست کا گڑھ بن گئی تھی۔

منی انگریزی میں آنرز کر رہی تھی۔ اروما اور وہ دونوں کلاس فیلو تھیں۔ ”اروما اپسو“ کے پروانڈیا گروپ کی سرگرم رکن تھی اور اینٹی پاکستان سرگرمیوں میں اپنے باپ کی طرح بڑی فعال تھی۔ منی اگر اینٹی پاکستانی نہیں تھی تو کچھ اتنی پرو پاکستانی بھی نہ تھی۔ اپنی ایک واضح سوچ رکھتی تھی۔

ملک انجانے خطرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے جیسی سرگوشیاں فضاؤں میں رقصاں تھیں۔ ایسے ہی بے یقینی والے دنوں میں ایک دن منی نے مجھے بتایا۔ ”کمال انتہائی واہیات اور شیطان صفت لڑکا ہے۔ ڈپارٹمنٹ کی ہر لڑکی پر رالیں ٹپکاتا پھرتا ہے۔ اروما پر تو دل و جان سے عاشق ہے۔ خیر وہ تو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتی اسے پر اب مجھے بھی تنگ کرنے لگ گیا ہے۔ کسی دن میرے ہاتھوں پٹ گیا تو بابا مجھے کچھ کہیں مت۔“

کمال ضیاء کے لندن میں مقیم دوست کا بیٹا تھا جو ڈھاکا یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ کم اور سیاست دانوں کا آلۂ کار زیادہ تھا۔ مغربی پاکستان کا جانی دشمن۔ ہمارے گھر جب بھی آتا۔ بحث مباحثے میں اس قدر جذباتی اور مشتعل ہو جاتا کہ کبھی کبھی اس سے خوف محسوس ہونے لگتا۔ ضیاء پر اسے بہت اعتراضات تھے۔

”منی اس کے باپ نے تو تمہارے لیے پروپوزل بھیجا ہے۔“

”کیا؟“

اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ چلا کر بولی تھی۔ ”اس اتنے بڑے ڈھاکا میں آپ کو میرے لیے کوئی نہیں ملا جو اس اچکے کو میرے اوپر مسلط کرنا چاہتی ہیں۔“

منی کے انداز پر مجھے بڑی تپ چڑھی تھی۔ میں نے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چلا چلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے کون سا اسے فائنل کر دیا ہے۔“

یہ بھی ایک دن منی نے ہی کھانے کی میز پر ہنستے ہنستے بتایا کہ اروما آج کل آرمی انٹیلی جنس کے کسی میجر سے بڑی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ خیال ہے کہ اس کی پارٹی اسے کسی خاص کام کے لیے تیار کر رہی ہے۔ کبھی کبھی اس کے پاس سراغ رسانی جاسوسی اور انٹرنیشنل اسٹڈیز پر لکھی ہوئی کتابیں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ٹیسٹوں میں نمبر کم تھے۔ اسی بات پر سر زمان نے کلاس میں ہی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی تھی۔ بڑی جز بز ہو رہی تھی وہ۔

”میرے پاس کب اتنا وقت ہے کہ میں ان کے نوٹس پر مغز کھپاؤں۔ آج کل تو میں والٹ روسٹو اور سی آئی اے کے ولیم کو بی کو پڑھ رہی ہوں۔ سنسنی خیز اور تھرل سے بھری ہوئی دنیا کچی بات ہے بندے کی تو سٹی گم ہو جاتی ہے۔“

اور خود وہ بھی کوئی معرکہ مارنے کی خواہش مند دکھتی ہے۔

منی نے جب یہ باتیں بتائیں تو میں سوچے چلی جا رہی تھی کہ یہ کیسا بدقسمت ملک ہے جسے مخلص لوگ نہیں ملے۔ نالائق سیاست دان، خود غرض اور بے اصولی بیوروکریسی، اقتدار کے بھوکے جرنیل، جاہل عوام، جوشیلے اور عقل سے عاری پوربو پاکستانی لیڈر اور ان کے پیچھے لگے طلبہ، مکار اور چالاک ہندو اقلیت جو اوّل دن سے ہی اسے توڑنے پر درپے ہے۔

”لو یہ تھوڑے تھے جو اب لڑکیوں کو ان گندے کاموں

میں الجھا دیا ہے اور اس اروما کو تو دیکھو۔ باپ کیا کم تھا جو بیٹی بھی وہی کچھ کر رہی ہے۔"

میرے اندر نے دکھ اور تاسف سے بھری لمبی آہ باہر نکالی تھی۔

ایک پل کے لیے میرا جی چاہا کہ میں سویتا دیدی سے بات کروں۔ لڑکی ذات ہے کسی بڑے خطرے میں نہ گھر جائے۔ پر حالات کی گمبھیرتا اور اس کا افسوس ناک بہاؤ مجھے خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ سو میں چپ رہی۔

اور آج میں یہ خبر سن رہی تھی کہ اروما کسی میجر کے ساتھ......

میری ابتر حالت کے پیش نظر منی میرے پاس بیٹھ گئی۔ ماں اگر آپ اپنے پُرکشش چہرے پر سجے اظہار افسوس کے اس پچ پچ جیسے پوسٹر کو تھوڑی سی دیر کے لیے نوچ کر پھینک دیں اور مجھے سنیں تو شاید یہ چیز آپ کے ڈوبتے دل کے لیے زیادہ تسکین کا باعث ہوگی۔

"وہ تو گئی شکار کرنے تھی۔" منی اس کے ساتھ گذرے دنوں میں چلی گئی تھی۔ امریکن لٹریچر کی کلاس تھی۔ میں پورے انہماک سے سر سو بھاش چندر کے ارنسٹ ہیمنگوے کی THE OLD MAN AND THE SEA. پر تجزیاتی لیکچر سن رہی تھی... کلاس کی آخری نشستوں پر ہم دونوں گو پاس پاس بیٹھے تھیں پر اروما کس حد تک کلاس میں تھی، یہ میں نہیں جانتی تھی۔

پھر جیسے کوندا سا لپک جائے والی بات ہوگئی تھی۔ میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی تھی اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی اور میری ساری توجہ اور انہماک جیسے ہوا میں دھویں کی طرح تحلیل ہوگیا تھا۔

نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا تھا۔ قد و قامت سے لے کر نقش و نگار ساتھ مردانہ وقار اوپر سے ملٹری یونیفارم سونے پر سہاگہ شاید اسی کا نام ہے۔

"میں نے اسے پھانسا ہے۔ انٹیلی جنس کا میجر بڑی توپ شے ہے۔" اروما نے سرگوشی کی تھی۔

میں بظاہر سر سو بھاش چندر کے ہلتے ہونٹ دیکھ رہی تھی، پر وہ کیا بول رہے تھے، میری سماعت گویا بہری ہوگئی تھی۔

"کہاں ملا تھا؟" میں نے تصویر پر ایک بار پھر نظریں گاڑ دی تھیں۔ رشک بھی محسوس ہوا تھا اور حسد بھی۔

"مگ بازار میں۔ سائیکل رکشے والے نے پھڈا ڈال

دیا تھا۔اس سے جھگڑ رہی تھی۔ یہ گاڑی میں وہاں سے گذرا۔ رکا۔ لفٹ دی۔ شاہ باغ میں چائے کا ایک کپ پینے کی آفر کی۔"

اور نوٹس کاپی پر تیزی سے چلتے قلم نے پہلی پہلی ملاقات کا احوال سنا دیا تھا۔

میرے لیے یہ بات تھوڑی سی حیران کرنے والی تھی کہ جب اس نے کلاس ختم ہونے پر کہا تھا۔" یہ تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والا کام ہوا ہے۔ٹیسٹ کیس سمجھ لو۔ 1967 میں عرب اسرائیل جنگ میں جو کردار یہودی عورتوں نے مصری فوجیوں کے ساتھ کیا تھا کچھ ویسا ہی کرنے کا میرا ابھی ارادہ ہے۔"

پر ہوا کچھ یوں کہ اس میدان کی وہ ناتجربہ کار کھلاڑی تھی۔اس کے ہاں بڑھکیں ضرور تھیں پر دار جلنگ اور شیلانگ کے کونونٹ میں تعلیم پانے اور ڈھاکا یونیورسٹی کی منفی سیاست میں ملوث ہونے کے باوجود اس میں مشرقی خوبو بھی تھی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے متاثر ہونے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

اور وہ میجر تو کردار کا مجاہد تھا۔ ایک کردار کی مضبوطی دوسرے بڑی پسندیدہ عادات واطوار گویا دو آتشہ والی بات اور سہ آتشہ بھی کہ اروما سے گہرا پیار۔

اب بھلا شکار کیسے نہ ہوتی۔شکار تو اسے ہونا ہی ... تھا۔ ہوئی اور یوں ہوئی کہ اس نے تو صاف صاف کہا۔

"منی میں تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ میں نے اپنا دھرم، گندی سیاست، زبان، کلچر، تہذیب سبھی ایک پوٹلی میں باندھ کر بوڑھی گنگا برد کر دیئے ہیں۔"

مزے کی بات اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ اسے بتا دیا اور میجر نے اس کی ساری باتوں کے جواب میں اس کا ماتھا چوما اور بس اتنا کہا۔" تم جو کچھ بھی تھیں وہ تمہارا ماضی ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے۔"

اور سچ صرف اتنا ہے کہ اروما کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جا گری تھی۔ وہ چاہتا تو رس چوس کر پھونک پھینک دیتا۔ پر نہیں۔ ماں ایسی ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک ہے وہ کہ اگر کہیں اس کی جگہ میں ہوتی تو میں نے بھی بھاگ جانا تھا۔

"کچھ شرم کرو منی۔" میں نے ڈپٹا۔

"فار گاڈ سیک یہ اتنی کنزرویٹو باتیں مت کیا کریں۔" منی بولی۔ "ہاں تو اور سنیں۔" منی نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔" کلمہ اسے میجر توصیف نے ہی پڑھا دیا تھا۔ نام ایمان بھی اسی نے رکھا۔ پر اسے لینے کے لیے اس کا پورا خاندان آیا۔ ماں، بہنیں، بہنوئی اور بھائی۔ مستقبل کسی نے نہیں دیکھا پر جو کچھ سامنے ہے قیاس اسی پر کیے جاسکتے ہیں۔ اروما بخت ور ہے۔ میجر اور اس کے گھر والے بہت سادہ اور محبت والے لوگ ہیں۔

میجر کے بھائی اور بہنوئی اروما کی طرف سے شامل ہوئے۔ اس کی بوڑھی ماں نے لاہور میں بیس مرلے پر اپنا خوبصورت گھر اس کے حق مہر میں لکھوایا۔ نکاح کے بعد اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا۔" جو میری عمر بھر کی پونجی تھی وہ میں نے تیرے قدموں میں ڈال دی ہے تاکہ تجھے کبھی عدم تحفظ کا احساس نہ ہو۔"

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر میرا اندر مضطرب اور بے کل سا تھا۔ سویتا دیدی کے دکھ اور اداسی کے کتنے رنگ میرے سامنے تھے جو اکساتے تھے کہ مجھے ابھی اور اسی وقت اٹھنا اور ان کے پاس جانا چاہیے۔ میں اٹھی بھی، تیار بھی ہوئی، پھر بیٹھ گئی۔ ایسا ڈپریشن تھا کہ جیسے کسی عزیز کی موت ہوگئی ہو۔

پر تیسرے دن جب دوپہر نے ابھی سہ پہر کے گرد اپنا آخری چکر پورا ہی کیا ہوگا میں ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور نوکروں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت پوکھر (تالاب) پر ہیں۔ میں وہیں چلی گئی تھی۔

اس وقت گلابی جل پدو (کنول) دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پوکھر کے کنارے کنارے پھیلی جل بیل خوبصورت لگتی تھی۔ سبزی مائل پانی ہواؤں کے زور سے کسی نازنین کے بالوں میں پڑے لہروں جیسے ڈیزائن بنا رہا تھا۔

وہ پوکھر کنارے بیٹھی تھیں۔ میں قریب جا کر کھڑی ہوئی مگر وہ متوجہ نہیں ہوئیں۔ پتا نہیں کہاں تھیں۔ بظاہر پانیوں پر گہری نظریں جمائے۔ شاید وہ ان پانیوں میں ماضی کی کچھ یادوں کے عکس اور ان کے رنگوں کو دیکھ رہی تھیں جو شوہر اور بیٹی کی صورت کبھی یہاں بکھرتے تھے۔

میں نے پکارا تھا۔"سویتا دیدی۔"

پہلی بار تو میری اپنی آواز حلق کے کنوئیں سے جیسے مرتے دھرتے نکلی تھی جو خود میری سماعت میں نہ آئی۔

دوسری بار بول اونچے تھے پر وہ بھی انہیں متوجہ نہ کرسکے تیسری پکار پر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میرا کلیجہ ابھی کٹ کر ٹکڑوں کی صورت میرے پاؤں میں آگرے گا۔ آنسو ان کے بھی ذبح ہوئے بکرے کی گردن سے دھاریں مارتے خون

کی طرح بہہ نکلے تھے اور میرے بھی۔ میں نے انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ میرے کندھے پر دھرا ان کا سر گھائل ہو کر تڑپتا اور وجود ہچکولے کھاتا رہا۔

''آمنہ۔'' بہت دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر بوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور تڑپتے ٹوٹتے لہجے میں کہا تھا۔ ''منی کو معلوم تھا۔ وہ ہمیں بتا تو سکتی تھی۔ میں اس کے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیتی۔ گھر کی دیواروں کو آسمانوں تک اونچا کر دیتی۔ اسے کمرے کی تنہائی میں مار دیتی پر اپنے سامنے تو مارتی۔''

میرے اللہ ان کا بلکنا ان کا تڑپنا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ گذشتہ دو دنوں سے وہ اسی حالت میں تھیں۔ تسلی کے بول بولنے بڑے مصنوعی سے لگ رہے تھے۔

دلداری کروں تو کیسے؟ سمجھاؤں تو کیوں کر؟ تسلی کیسے دوں؟ یہ کوئی نرالا اور انوکھا تو تھا نہیں کہ مثالیں ملنی مشکل ہوتیں۔ عزیزوں، ملنے ملانے والوں، گلی کوچوں، پرنٹ میڈیا کے ذریعے شہروں، ملکوں اور اس سے بھی پرے تاریخ کے صفحات میں ڈھیر لگے پڑے تھے۔ ہاتھ ڈالو، حسب حال اور موقع محل کی مناسبت سے مواد نکال لو۔

پر پتا نہیں کیوں مجھے یہ ساری کاوشیں بڑی بے معنی اور انتہائی فضول سی نظر آئیں میں نے انہیں بصد اصرار تھوڑا سا بھات کھلایا، تھوڑی سی چائے پلائی۔ سر میں تیل ڈالا۔ مالش اور کنگھی کی۔ ساڑی بدلوائی۔ پر میرے ہونٹوں پر تسلی سے بھرا کوئی لفظ نہ ابھر سکا۔

رات کو جب رخصت ہونے کی اجازت چاہی، انہوں نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ ''آمنہ منی کا خیال رکھنا۔ اسے خطرہ ہے۔ کمال عبداللہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''سویتا دیدی کمال عبداللہ، ضیا کے دوست کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ منی کے لیے خواہش مند ہے۔''

''آمنہ میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں؟'' ان کی ویران آنکھوں میں کچھ تھا۔ میں لرز اٹھی۔

گھر واپسی کا راستہ کیسے کٹا؟ میں نہیں جانتی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے لیے ابھی راہداری میں تھی کہ جب منی کے کمرے سے آتی آواز نے قدموں کو روک دیا۔ میں اس آواز کو پہچانتی تھی۔ جیوتی تھی یہ۔ منی اور اروما کی دوست۔ کمال عبداللہ کی پارٹی کی جنرل سکریٹری۔

''اف زخمی سانپ کی سی کیفیت میں ہے وہ۔ بس گھورتا، بل کھاتا، گھونٹ گھونٹ جن پیتا، تمہیں گالیاں نکالتا، کلکتے کے نکسل باڑی غنڈوں سے اٹھوانے کے منصوبے بناتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتا۔ ''میرے من کی شانتی تھی وہ۔''

میں نے تو کہا۔ ''ڈوب مرو کسی پوکھر میں جا کر۔ کس منہ سے کہتے ہو شانتی۔ اور وہ شانتی تمہاری چھاتی پیٹتی، تمہاری آنکھوں میں دھول ڈالتی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

''بدمعاش۔'' منی نے منہ بھر کر گالی نکالی تھی۔

صورت نہیں دیکھتا اپنی؟ جتنا کوڑھی کرتوت اس سے زیادہ کوڑھی۔ اروما کے باپ کا پتا نہیں کیسے لاڈلا بنا ہوا ہے؟ نفرت ہے مجھے اور دیکھو اس کا باپ میرا رشتہ چاہتا ہے۔

اروما کا نکاح اور اس کا پچھمی پاکستان چلے جانا ہمارے لیے قہر بن کر آیا۔ کمال ہمارے گھر آیا۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ کسی مست سانڈ کی طرح۔ کون سی گالی تھی جو اس نے ہماری بیٹی اور ہمیں نہ دی۔ منی کو غنڈوں سے اٹھوانے کی دھمکیاں تھیں۔ ضیا اور میں نے اس کے باپ سے دوستی کے ناطے منت سماجت کرتے ہوئے اس کے غصے کو زائل کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور ہمارا خیال تھا ہم اسے ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو یقیناً ہماری بھول تھی۔

ملک کی بدقسمتی اور منحوسیت دھیرے دھیرے اپنے نقطہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ ایسے ہی بے رحم دنوں میں ہمیں وہ منحوس خبر ملی جو منی کے اغوا سے متعلق تھی۔ اب فوج کی مدد ضروری تھی۔ رات کے تیسرے پہر جگن ناتھ ہال پر اچانک ریڈ ہوئی۔ دونوں طرف سے دھواں دھار قسم کی فائرنگ اور اس آپریشن کے نتیجے میں کمال مارا گیا۔

اس کے مرنے پر اگرچہ ہم نے سکھ کا سانس لیا تھا پر ہم اب شرپسندوں کی ہٹ لسٹ پر آ گئے تھے۔ پرو پاکستانی ہونے کا کلنک تو ہمارے ماتھوں پر پہلے ہی سجا ہوا تھا۔

انتخابات کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ اپنے عروج کی طرف بڑھنے لگیں۔ ہمارے دلوں میں، ہمارے ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ بہتری کی، سلامتی کی، ملکی بقا کی۔ پھر یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ اچھے اور منصفانہ انداز میں۔

پر مصیبت تو یہ تھی کہ اکثریتی پارٹی کو اس کا حق نہیں دیا جا رہا تھا۔ ایک طرف ہمارے لیے یہ بات سوہان روح تھی کہ آخر اقتدار کی منتقلی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ محلاتی سازشوں کے تانے بانے حالات کو انتہائی بھیانک سمتوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔

''آمنہ نکل جاؤ یہاں سے۔'' سویتا دیدی مسلسل فون

کیے جاتی تھیں۔

آدھی سسرال باہر جا چکی تھی۔ مسئلہ مصر تھا کہ فکر کی بات نہیں ہم جو ہیں۔ ہم بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے خود کو بلی سے محفوظ سمجھے بیٹھے تھے۔ لیکن زیادہ وقت بھی نہ گذرا تھا کہ نوشتہ دیوار ہمارے سامنے واضح ہو گیا تھا۔ گھر پر حملہ ہوا۔ قدرت کو زندہ رکھنا تھا۔ تن والی ساڑی کے ساتھ بھاگے۔ سوچتا دیدی نے بازو کھولے اور ہمیں سمیٹ لیا۔

کیسی وحشت بھری رات تھی۔ اپنی زمین اپنی جنم بھومی بے مہری پر اتر آئی تھی۔ اپنی زبان بولنے والے ہمارا رشتہ دوسری زبان والوں سے جوڑ رہے تھے۔ پوربو پاکستان کا کون سا شہر تھا جو ہمارے آباؤ اجداد کی ہڈیوں سے بھرا ہوا نہ تھا۔ مگر حالات کے جبر نے سب کچھ کتنا اجنبی اور غیر محفوظ کر دیا تھا۔ ضیاء نے لمبا سانس بھر کر باہر آسمان کو دیکھا تھا۔ کہاں جائیں؟ اب تو سارے راستے جیسے بلاک ہو گئے تھے۔

اسی دوران ملٹری آپریشن شروع ہو گیا تھا۔ ظلم و ستم کے نئے باب رقم ہونے لگے اور ہوتے چلے گئے۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ وقت پیغمبری پڑا کہ جس نے انسانیت کے پرخچے اڑا دیئے۔ زمین انسانی خون سے اشوک کے پھولوں جیسی سرخ ہو گئی تھی۔ انسان درندوں کا روپ دھار بیٹھے تھے۔

کتنا بڑا جگرہ تھا اس عورت کا۔ کمال رازداری سے اپنی وسیع و عریض باڑی میں کئی دن رکھا اور پھر یہیں سے نیپال اپنے بھائی کے پاس پہنچا دیا۔

جب نفرت اور تعصب کی آگ قدرے بجھنے لگی۔ ہم لوگ لوٹے۔ یہ ضیاء الرحمٰن کی حکومت کا ابتدائی دور تھا۔ ضیاء الرحمٰن، ضیاء کے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ سب کچھ لٹ لٹا گیا تھا۔ گھر ضرور بچا تھا۔ پر اس میں تھا کیا؟ ہماری یادوں کے مدفن۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور بین ڈالنے کو جی چاہ رہا تھا۔ زندگی نئے سرے سے شروع ہو رہی تھی۔ بیٹی بیاہنے کی موزوں عمر سے باہر نکل آئی تھی۔ غریب الوطنی میں کیا کرتے؟ جانیں اور عزتیں بچ گئی تھیں جو بہت غنیمت تھیں۔

سوچتا دیدی جیسی مہان عورت سے ڈھاکا خالی ہوا پڑا تھا۔ اپنے نیپال قیام کے دوران جس باقاعدگی سے میں نے انہیں خط لکھے شاید میں نے اپنے کسی عزیز کو بھی نہ لکھے ہوں گے۔ وہ بھی مجھے جواب دینا یاد رکھتیں۔ حوصلہ بڑھاتیں کہ وقت ضرور مشکل ہے۔ پر تم دونوں ساتھ ساتھ ہو۔ یہ دو ساتھ ... مشکلوں کو مشکل نہیں رہنے دے گی۔

"ان کے سارے خط میں نے بہت سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آج پرانے کاغذات دیکھنے بیٹھی تو بیچ میں سے دیدی کے خط نکل پڑے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انہیں پڑھنے بیٹھ گئی۔"

تمہارے کم و بیش ہر خط میں ایک چھوٹی سی درخواست، ایک التجا ہے، آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ دیدی اگر برا لگے تو معاف کر دیجیے گا۔

تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ جس کے لیے تمہیدیں باندھ رہی ہو۔ کوئی دوسرا پڑھے تو یہی سمجھے۔ پر میرے لیے تمہی روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ اسی طرح جب تم ڈھاکا میں تھیں۔ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک تمہارے ہونٹوں پر لرزتے کانپتے چند الفاظ تو ضرور ابھرتے، پر شاید میرے جامد چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے وہ دم توڑ دیتے۔ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ میرے لیے اسے سمجھنا دشوار نہ تھا۔

آمنہ، اروما کو میں نے بیٹی نہیں اپنی سہیلی کے روپ میں دیکھا تھا۔ جب وہ چھوٹی سی تھی اور رنیش کے ساتھ کلکتے میں رہ رہی تھی۔ شسمیتا دیدی کا نیپال سے ایک دن فون آیا۔ میں بھری بیٹھی تھی۔ بلک بلک کر رو دی۔ انہوں نے کہا۔ "پاگل ہو۔ بھگوان نے تمہیں سہیلی دے دی ہے۔ ذرا بڑی ہونے دو اسے۔ تمہاری تنہائی کا روگ کٹ جائے گا۔" پر رنیش نے میری یہ سہیلی بھی مجھ سے چھین لی۔ میں نے بہت کہا۔ ہولی کراس کونونٹ ڈھاکا میں بھی تو ہے۔

"نہیں نہیں سوچتا۔" ہمیشہ کی طرح اس کی آواز میں اپنی بات منوانے والی ہٹ دھرمی تھی۔ "شیلانگ کے کونونٹ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جونیئر کیمرج کے بعد دارجلنگ سے سینئر کیمرج کرے گی۔" یوں سینئر کیمرج کے بعد وہ ڈھاکا آ گئی۔

اروما مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ پر بے تکلف نہ تھی۔ اس نے مجھ سے اس معاملے پر کوئی بات ہی نہیں کی اور چلی گئی۔ میں اسے یہ بھی طعنہ نہ دے سکی کہ کلچر، دھرم اور بھاشا کا فرق بہت سے دکھوں اور دردوں کو جنم دیتا ہے۔ تم کہاں کہاں ان کے آگے ایک آدمی کی محبت کا بند کھڑا کرو گی۔

آمنہ! دوپہر ڈھلنے لگتی تو انجانے میں نظریں بیرونی پھاٹک کی کھڑکی پر جم جاتیں۔ یوں لگتا جیسے ابھی یہ کھلے گی اور اروما کھل کھلاتی اندر آ جائے گی۔

کان بجتے۔ "ماں ماں کہاں ہو تم؟" جیسی آوازیں تعاقب کرتیں۔ میں تو بھگوان کا شکر ادا کرتی کہ باپو کی یادداشت نہیں رہی تھی۔ میں رنیش کے جذبات سے تو لاعلم ہی

رہتی کہ اس نے ذاتی دکھ کبھی شیئر کرنے کی عادت ہی نہیں ڈالی تھی۔ ہاں البتہ رشتہ داروں کی باتیں سوہان روح ضرور تھیں۔ یہ کوئی پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہیلو کہا۔ دوسری طرف ہیلو کہنے والی اروما تھی۔ میں نے فون بند کر دیا۔ گھنٹیاں بجتی رہیں اور میرے آنسو بہتے رہے۔ پھر ہر روز کا معمول ہو گیا۔

ادھر گھڑیال کی سوئیاں گیارہ اور بارہ پر آئیں، ادھر میرے فون کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ بجتیں، بند ہوتیں۔ یہ چکر پورے ایک بجے تک چلتا۔

ایسے ہی دنوں میں منی بھی میرے پاس آئی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی وکالت کرنے آئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ آپ اسے معاف کر دیں۔

میرے ہونٹوں پر چپ تھی۔ ایک نہ ٹوٹنے والی چپ اور وہ تھک ہار کر چلی گئی۔ یقیناً تمہیں اس کا علم ہوگا۔ مگر جاتے جاتے بہت سارے خط مجھے دے گئی۔ وہ خط جو وہ منی کے نام پر بھیجتی تھی اور جو میرے لیے تھے۔ میں نے انہیں اٹھائے اور ڈسٹ بن میں ڈال دیئے۔

پر یہ کیا! آمنہ میں تو جیسے بے کلی کی سان پر جا چڑھی تھی۔ اندر باہر کے چکر شروع ہو گئے۔ کبھی کوئی کام کرتی کبھی کوئی۔ پر اپنا دھیان بٹانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ میری نظریں بار بار کونے میں دھری ٹوکری کی طرف اٹھتیں، واپس لوٹتیں۔

جب رات آئی تو میں لیٹ گئی۔ آنکھوں پر یونہی پپوٹے گرا لیے۔ اگلی صبح کا منظر سامنے تھا۔ چندن کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ایک ایک بات کا دھیان رکھتا ہے۔ ان ڈھیر سارے خطوں کو دیکھ کر پوچھنے آئے گا۔

”بی بی یہ تو پتر (خط) ہیں۔ انہیں کوڑے میں پھینک دوں کیا؟“

منہ پرے کرتے ہوئے میں کہہ بھی دوں کہ ہاں ہاں پھینک دو۔ پر کہیں میرا لہجہ بھیگا ہوا ہوگا۔ میری آنکھوں میں نمی اتر رہی ہوگی۔

یہی سب تو میں اروما سے چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرے۔ اپنے اندر کو میرے ساتھ بانٹے۔ اب وہ بانٹنے لگی تھی تو کیسی خلیج بیچ میں حائل ہو گئی ہے۔ اور پھر مجھ سے رہا نہ گیا میں اٹھی۔ میں نے خط نکالے اور پڑھے بغیر دراز میں رکھ دیئے۔

ہاں تو آمنہ، ایک دن اس کا فون نہیں آیا۔ یہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا۔ اور دیکھو ذرا میرا اندر جیسے چیخنے لگا۔ کیوں؟ کیوں نہیں، کیوں نہیں کیا اس نے فون؟ میں خود سے کہتی۔ اندر باہر ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ میرے شریر کی ہر زخمی بوٹی کا منہ کھل گیا اور خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔ میں نڈھال بستر پر پڑ گئی۔

کوئی دس دنوں بعد اسی مخصوص وقت پر فون کی گھنٹی بجی۔ کس بیتابی سے میں نے اٹھایا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت تھی۔ اروما تھی۔ اس کا شوہر تھا۔ اس کا دس دن کا بچہ تھا۔

آنسوؤں میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ تھے۔ پھر یہ معمول بنا۔ کبھی میں ان تینوں کی، کبھی ماں بیٹے کی اور کبھی اروما کی آوازیں سنتی۔ ان سے باتیں کرتی۔ میری راتیں اس کے خطوں سے بہلنے لگیں۔ میں خط نکالتی اسے پڑھتی۔ وہ تو اب میری سہیلی بنی تھی۔ جب رابطوں میں گڑبڑ ہونے لگی۔ فون بند ہو گئے تو لندن کے راستے خط آنے لگے۔ اور آمنہ جانتی ہو۔ میں نے کتنی بار بھگوان سے ان شہروں کی خیر مانگی جہاں میری اروما تھی۔ اس کا بیٹا سلمان تھا۔ پھر خطوں میں بھی تعطل آنے لگا۔

یہ اداسیوں اور ویرانیوں میں لپٹی دسمبر کی ایک سردی سہ پہر تھی۔ وہ اپنے وسیع و عریض گھر میں داخل ہوا تھا۔ میں اس وقت آنگن میں آرام کرسی میں دھنسی ہڈیوں کی مٹھ سی بنی آنکھیں بند کیے دھوپ میں بیٹھی تھی۔ کوئی آیا تھا۔ کوئی میرے پاس کھڑا تھا۔ کوئی مجھے دیکھتا تھا۔ ایک دھواں دھواں سا چہرہ میرے اوپر جھکا اور بولا۔

”سوبیتا آنکھیں کھولو۔ میں آیا ہوں۔ اس وچن کے ساتھ کہ تم کلکتہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر جاؤ گی۔“

میں نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے کھڑے اسے دیکھا۔

”رنیش۔“ کتنا عام سا لہجہ تھا میرا۔ رنیش کہنے میں نہ اندر سے محبت کی گرمی دہکی تھی، نہ چاہت کا کوئی انداز ظاہر ہوا تھا۔ یوں ٹکٹکی لگائے دیر تک اسے ایسے ہی دیکھا جیسے بالمقابل کوئی اجنبی کھڑا ہو۔ پھر ہونٹ ہلے اور آواز نکلی۔ ”بڑے مورکھ ہو۔ پیٹ اور جگر کے رشتوں میں فرق ہی نہیں جانتے۔ بھلا جگر کے رشتے سے آگے کون؟ پاسپورٹ اور ویزا کے نئے چکر شروع کروانے میں تم نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنا حصہ ڈال کر ممتا کے کلیجے پر چھری چلا دی ہے۔ میں تو اب من چاہنے پر اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر کبھی پاکستان بھی نہ جا سکوں گی۔“

دسمبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے بارہویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

کیا آپ کو کوئی دستک سنائی دیتی ہے؟ یا کسی کے قدم کی چاپ؟

ذرا دھیان لگا کر سنیں، شاید کوئی نزدیک آ رہا ہے۔ آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ دھیرے دھیرے دستک دے رہا ہے۔ قارئین یہ نئے سال کی دستک ہے۔ 2017 کے آغاز میں چند ہی روز باقی ہیں۔ 2016 رخصت ہوا چاہتا ہے کہ ماہ دسمبر کا آغاز ہو گیا ہے۔ دسمبر گریگورین سال کا بارھواں اور آخری مہینا ہے۔ پرانی رومی تقویم میں یہ دسواں مہینا ہوا کرتا تھا۔ لاطینی میں دسم (decem) کا مطلب دس ہے۔ اسی تعلق سے یہ دسمبر کہلایا۔ اس ماہ دنیا کے کئی ممالک میں موسم سرما شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ البتہ جنوبی نصف کرہ میں گرمیاں ہوتی ہیں۔ دسمبر میں مسیحی برادری کا سب سے بڑا تہوار کرسمس منایا جاتا ہے۔

پاکستانی سیاست میں ماہ دسمبر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کئی اہم سیاست دانوں کا تعلق اس ماہ سے ہے۔ پہلا اور سب سے نمایاں نام ہے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا، جن کا یوم پیدائش اس ماہ منایا جاتا ہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ بیسویں صدی کے چوٹی کے سیاست دانوں میں ان کی گنتی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد سے تاریخ کا دھارا بدل دیا، دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست وجود میں آئی۔ محمد علی جناح 25 دسمبر 1876 کو کراچی کے ایک تاجر پونجا جناح کے ہاں پیدا ہوئے۔ لندن کے لنکنز ان سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وطن لوٹ کر وکالت کے پیشے میں قدم رکھا۔ 1896 میں کانگریس میں شامل ہو گئے، مگر ولبھ بھائی پٹیل، کرم چند موہن داس (گاندھی) اور دیگر رہنماؤں کی متعصبانہ سوچ کے باعث اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کچھ برس برطانیہ میں رہے۔ 1916 میں وہ راجا صاحب محمود آباد اور دیگر مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے وطن واپس آئے تو انہیں مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ پیش کر دیا گیا۔ 1929 میں انہوں نے مشہور زمانہ چودہ نکات پیش کیے۔ 1940 کی قراردادِ پاکستان کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی جدوجہد شروع کی۔ 1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریتی علاقوں میں کامیابی حاصل کی۔ اگلے برس پاکستان قائم ہوا تو وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ انہیں قائداعظم اور بابائے قوم قرار دیا گیا۔ 11 ستمبر 1948 کو ان کا انتقال ہوا۔

پاکستان کے پانچویں وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کی برسی بھی اسی ماہ منائی جاتی ہے۔ ان کا شمار پاک و ہند کے اہم

سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ بنگال کی سیاست ان کے تذکرے کے بنا ادھوری ہے۔ بٹوارے سے قبل انہوں نے بنگال کے وزیرِ اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ 8 ستمبر 1893 کو وہ مدناپور میں پیدا ہوئے۔ علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ آکسفورڈ کے طالب علم رہے۔ سیاست میں قدم رکھنے کے بعد کلکتہ کا میئر بننا اُن کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد اِسے بنگال میں منظم کیا۔ مسلم لیگ بنگال کے جنرل سیکریٹری رہے۔ 16 اگست 1946 کا راست اقدام اُن کی وجۂ شہرت بنا۔ تقسیم کے بعد وہ بیوروکریسی اور غیر جمہوری قوتوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے تھے اور وہ مسلم لیگ سے الگ ہوگئے۔ 1949 میں سہروردی نے جناح عوامی لیگ کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں عوامی لیگ کے نام سے معروف ہوئی۔ 12 ستمبر 1956 کو وہ ملک کے وزیرِ اعظم مقرر کیے گئے، تاہم جلد ہی یہ عہدہ ان سے چھین لیا گیا۔ انہوں نے ایوب مارشل لا کے خلاف احتجاج کیا اور عوامی تحریک چلائی۔ 5 دسمبر 1963 کو بیروت میں اُنھیں دل کا دورہ پڑا۔ 8 دسمبر 1963 کو انہیں ڈھاکا کے رمنا ریس کورس میں مولوی فضل الحق کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کے اہل خانہ ان کی موت کو قتل قرار دیتے رہے۔

شہنشاہ جذبات کہلانے والے برصغیر کے ممتاز اداکار یوسف خان المعروف دلیپ کمار بھی ماہ دسمبر ہی میں پیدا ہوئے۔ اس عظیم اداکار کا سحر آج بھی قائم ہے۔ اسی طرح ملکہ ترنم میڈم نور جہاں... جنھوں نے پاک و ہند کی فلم انڈسٹری پر اَن مٹ نقوش چھوڑے، ان کی برسی بھی 23 دسمبر 2000 کو منائی جاتی ہے۔ اتفاق دیکھیں، دو نگار ایوارڈ اپنے نام کرنے والے فلم اور ٹی وی کے نامور آرٹسٹ اظہار قاضی کا بھی میڈم کے مانند 23 دسمبر ہی کو انتقال ہوا۔ وہ 2007 میں ہم سے جدا ہوئے۔ اسکواش کے بین الاقوامی شہرت یافتہ کھلاڑی جہانگیر خان بھی 10 دسمبر 1963 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں دنیا کا عظیم ترین اسکواش کا کھلاڑی تصور کیا جاتا ہے۔ 1981 تا 1986 جہانگیر خان ناقابل شکست رہے۔ انہوں نے لگاتار 555 مقابلوں میں فتح حاصل کی۔ ”خدا کی بستی“ اور ”جانگلوس“ جیسے شہرہ آفاق ناول لکھنے والے شوکت صدیقی کا تعلق بھی اِسی مہینے سے ہے۔ اس جدید ادیب کے بنا نہ تو اردو ادب کا تذکرہ مکمل ہے، نہ ہی اردو صحافت کا ذکر ممکن ہے۔ 20 مارچ 1923 کو لکھنؤ میں پیدا ہونے والے اس فکشن نگار کے بیشتر ناول بیسٹ سیلر ٹھہرے۔ 18 دسمبر 2006 کو ان کا انتقال ہوا۔

یہ تو وہ شخصیات تھیں، جن کا ان صفحات میں ماضی میں تذکرہ ہوچکا ہے، اب توجہ ان افراد پر مرکوز کرتے ہیں، جن پر پہلے تفصیلی بات نہیں ہوئی ہے۔

☆ اسماعیل گل جی

فنونِ لطیفہ کی برصغیر میں جڑیں بڑی گہری ہیں۔ مصوری، مجسمہ سازی، رقص، گائیکی... یہاں ہر فن کی تاریخ دفن ہے۔ فنون لطیفہ کے سفر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، یہاں تک کہ برصغیر پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ مقامی لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا، مگر ہندوستانی آرٹسٹوں کے فن کے روبرو کوئی بند نہیں باندھ سکا۔ ان کے ہنر کی شہرت پوری دنیا میں پھیل گئی۔ سمراٹ اشوک کی لاٹ (ستون) جنتر منتر (دھوپ گھڑی) تاج محل ایک شاہکار ٹھہرا، سر جگدیش چندر بوس کا مقالہ کہ پیڑ پودے بھی سانس لیتے ہیں۔ ٹیگور کو نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری تھا کہ ہندوستان میں آزادی کی بازگشت سنائی دینے لگی، ایک نئی ریاست قائم کرنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ بالآخر 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا۔ مسلمان کی ایک آزاد ریاست۔ یہ ایک عظیم کامیابی تھی۔ ملک بنانے کے بعد مسلمانوں نے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ گو ہمارے حکمرانوں کی نیت نیک تھی، مگر جب ذمے داری بڑی ہو تو سہو کا بھی امکان رہتا ہے۔ تقسیم کے بعد کچھ حلقوں کی جانب سے پاکستانی ثقافت کا نعرہ بلند کیا گیا، فنون جیسے رقص، گائیکی اور مصوری کے گرد گھیرا تنگ کیا جانے لگا۔ وہ فنکار، جنھیں پوجا جاتا تھا، یکدم اپنی اہمیت سے محروم ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ استاد بڑے غلام علی پاکستان آئے، مگر پھر لوٹ گئے۔ ساحر لدھیانوی بھی خاموشی سے واپس چلے گئے۔ قرۃ العین جیسی ادیبہ نے بھی پاکستان چھوڑ دیا۔ حسرت موہانی جیسا نام بھی اس فہرست میں شامل۔ بے شک ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوئیں، جس کے نتیجے میں ہمیں ایسے نابغۂ روزگار فنکاروں

سے محروم ہونا پڑا۔ البتہ کچھ فنکار ایسے بھی تھے، جنھوں نے نامساعد حالات کے باوجود یہیں رہتے ہوئے نہ صرف آرٹ سے اپنا رشتہ جوڑا، بلکہ اس کے ذریعے پاکستان کا دنیا میں نام بھی روشن کیا۔ صادقین اس کی بڑی مثال۔ چغتائی کا کام قابلِ فخر۔ استاد حاجی محمد شریف اور استاد اللہ بخش بھی روشن مثال۔ بعد میں جس شخص نے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا نام روشن کیا، وہ تھے اسماعیل گل جی۔ دنیا کی کئی ممتاز ہستیوں اور سربراہ مملکت کے پورٹریٹ انہوں نے بنائے۔ ان کی خطاطی کے نمونے فیصل مسجد میں آویزاں ہوئے۔ اس مسجد کے میناروں پر موجود چاند بھی گل جی ہی کے ڈیزائن کردہ ہیں۔ پاکستان کا پارلیمنٹ ہاؤس بھی ان کی مصوری سے مزین۔ افغانستان اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کے انہوں نے پورٹریٹ بنائے۔ ملکی و بین الاقوامی سطح پر انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ سعودی عرب، جاپان، فرانس اور پاکستان کے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ان کے حصے میں آئے۔ ایک سمت انہوں نے تجریدی آرٹ میں خود کو منوایا، وہیں خطاطی میں بھی جدید راستے اختیار کیے۔

اس انوکھے فنکار نے 25 اکتوبر 1926 کو پشاور کے مردم خیز علاقے میں آنکھ کھولی۔ رنگوں سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی، مگر ان کے خاندان میں تعلیم پہلی ترجیح رہی۔ اوائل میں وہ لارنس کالج میور گئے۔ پھر انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کا رخ کیا، جہاں سے انہوں نے سول انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ اب انہوں نے امریکا کا رخ کیا۔ ان کے انٹرویوز سے پتا چلتا ہے کہ امریکا میں انجینئرنگ کے تربیتی زمانے میں مصوری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اوائل میں وہ کولمبیا یونیورسٹی کا حصہ تھے۔ کچھ وقت ہارورڈ میں بھی گزرا۔ وہاں کے زرخیز ماحول نے انہیں مصوری کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد کی۔ وہ اس زمانے میں پاکستان کے ان گنے چنے مصوروں میں سے ایک تھے، جو جدید رجحانات کی شدبد رکھتا تھا۔ پورٹریٹ بنانے پر انہیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس صنف پر گرفت رکھنے والے شاید دنیائے مصوری میں جگہ نہ بنا سکیں، مگر مالی طور پر وہ پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ گل جی کا بھی تھا۔ انہیں بڑے اداروں کی جانب سے اسائنمنٹ ملتے، معروف شخصیات ان کی خدمات حاصل کرتیں۔

گل جی کی پہلی نمائش 1950 میں ہوئی۔ اس میں پورٹریٹ کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی عکاسی کرتے فن پارے بھی تھے۔ البتہ جو صنف مستقبل میں انہیں بین الاقوامی شہرت عطا کرنے والی تھی، وہ تھی تجریدی مصوری... جس کے پیچھے خطاطی کا تجربہ بھی تھا اور "action painting" کی تحریک بھی، جو 1950 کی دہائی میں عروج پر تھی اور جسے جیکسن پولک اور ایلین ہیملٹن جیسے فنکاروں نے شہرت بخشی۔ دونوں ہی اصناف میں روانی اور یگانگت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ مشرقی اور مسلم پس منظر کی وجہ سے یہ ملاپ گل جی کے لیے فطری رہا۔ پھر دیگر مصوروں کے برعکس وہ بڑے کینوس پر پینٹ کیا کرتے تھے۔ عجیب عجیب میٹریل استعمال کرتے۔ کبھی شیشہ، کبھی پتے، کبھی چاندی اور سونے کے ورق۔ یہ مشق مستقبل میں ان کے بڑی کام آنے والی تھی۔

1959 میں پورٹریٹ پینٹنگ پر ان کی گرفت انہیں افغانستان لے گئی۔ امریکا اور برطانیہ کی اشرافیہ کے وہ پسندیدہ مصور تھے۔ مگر آنے والی نمائشوں میں لوگوں نے گل جی کو بدلتے دیکھا۔ اب وہ پورٹریٹ سے اکتا گیا تھا اور اپنے بڑے سے کینوس پر کسی خیال کی رو میں بہتا ہوا پینٹ کیا کرتا تھا۔ 1960 میں آتے آتے ان کے تجریدی فن پارے موضوع بحث بن چکے تھے۔ مغرب کے لیے وہ ایک ایسے تجریدی مصور تھے، جس کی تخلیقات میں اسلامی خطاطی کی روایت کا رنگ جھلکتا۔ اس بات نے مداح تو پیدا کیے، مگر مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ خطاطی کے روایتی اساتذہ کی جانب سے اُن پر کڑی تنقید کی گئی۔ ہم عصر بھی متذبذب تھے۔ مگر انہیں کسی دوست کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا فن ہی ان کا دوست تھا۔ پھر انہیں حکومتی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ اس معاملے میں بھی پورٹریٹ بنانے کا فن کام آیا۔

60 کی دہائی کے اوائل میں مجسمہ سازی کا فن انہیں اپنی سمت پکارنے لگا مگر انہوں نے فگرز بنانے کے بجائے اس فن کو تجریدی انداز میں برتا۔ خطاطی کو جدید آہنگ دیا۔ مختلف میٹریل استعمال کرنے کی وجہ سے ان کا فن بولتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ دمکتا، چمکتا۔ کچھ حصہ دھیرے دھیرے ہل رہے ہوتے۔ کچھ سیال ہوتے۔ یہ گل جی ہی کا کمال تھا۔ دراصل غیر روایتی چیزوں کا استعمال انہیں انفرادیت بخشتا تھا۔

ان کے بیٹے امین گل جی نے بھی مصوری کے ساتھ مجسمہ سازی میں اہم مقام حاصل کیا۔ آج ان کا شمار پاکستان کے اہم ترین فن کاروں میں ہوتا ہے۔ انہیں وہ ہی دیوانگی وراثت میں ملی تھی، جو گل جی کو ودیعت ہوئی تھی۔

گو اس عظیم فنکار کی کہانی میں کئی موڑ آئے، اس نے مشکلات کو شکست دی اور ایک ہیرو کے مانند ابھرا، مگر بدقسمتی

سے اس کہانی کا کلائمکس دردناک ہے۔ 19 دسمبر 2007 نہ صرف گل جی کے مداحوں کے لیے ایک کرب ناک دن تھا۔ بگاڑ کا آغاز اس وقت ہوا، جب امین گل جی اپنے والد اسماعیل گل جی سے ملنے کلفٹن میں واقع ان کے گھر پہنچے، مگر مسلسل دستک دینے کے باوجود کوئی باہر نہیں آیا۔ آخر پولیس بلوائی گئی۔ اندر ایک دردناک منظر ان کا منتظر تھا۔ گل جی، ان کی بیگم اور ایک ملازمہ کو قتل کردیا گیا تھا۔ تینوں کے منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ گل جی کے سر پر زخم تھا۔ تینوں لاشیں گھر کے مختلف حصوں سے پائی گئی تھیں۔ دیگر ملازم غائب تھے۔ گاڑی اور قیمتی اشیا بھی موجود نہیں تھیں۔ پوسٹ مارٹ سے پتا چلا کہ گل جی کے انتقال کو 72 گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یعنی انہیں 16 دسمبر کو قتل کیا گیا تھا۔ اگلے روز 81 سالہ گل جی کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

اگلے برس ماہ فروری میں کراچی پولیس نے دو ملازمین گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا، جس کے قبضے سے گل جی کے دو فن پارے اور دیگر قیمتی اشیاء بھی برآمد ہوئی تھیں۔ واضح رہے کہ قتل کے بعد ان کا ڈرائیور کار سمیت غائب ہوگیا تھا۔ کار اگلے روز ایک ویران سڑک پر کھڑی پائی گئی تھی۔ گرفتار ڈرائیور نے تہرے قتل کا اعتراف کیا۔ یہ ڈاکے کی واردات تھی۔ ہلاک ہونے والی ملازمہ بھی ابتدا میں منصوبے کا حصہ تھی۔ اوائل میں ان کے بیٹے پر بھی شک کیا گیا، مگر وہ ملوث نہیں پائے گئے۔ گل جی زندگی کے آخری دنوں میں جس سیریز پر کام کررہے تھے، اس کا عنوان ''نقطہ'' تھا۔ یہ قرآنی آیات اور اسمائے تعالیٰ پر مشتمل تھی۔

چوہدری محمد علی

وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب لیاقت علی خان آخری بار قائداعظم سے ملے، اس موقع پر بھی وہ موجود تھے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد پاکستانی سیاست میں اُن کا کردار یکدم بڑھ گیا۔ پاکستان کے چوتھے وزیراعظم کا منصب ان ہی کے حصے میں آیا۔ انہیں 1956 کے آئین کا خالق ٹھہرایا جاتا ہے۔

15 جولائی 1905 کو جالندھر میں پیدا ہونے والے چوہدری محمد علی کا شمار کسی زمانے میں پاکستان کی اہم ترین شخصیات میں ہوا کرتا تھا۔ برطانوی راج میں انہیں ایک باصلاحیت اکاؤنٹنٹ کے طور پر شناخت کیا گیا۔ اس میدان میں انہوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی تھی۔ پھر مقابلے کا امتحان دے کر انڈین سول سروس کا حصہ بن گئے۔ وہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس کا حصہ تھے۔ تیزی سے ترقی کے زینے طے کیے۔ 1936 میں ریاست بہاول پور کے اسٹیٹ اکاؤنٹنٹ رہے۔ 1945 میں قابلیت نے انہیں سیکریٹری آف دی اسٹیٹ کا فنانس ایڈوائزر بنادیا۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پارٹیشن کونسل جن سیکریٹریز پر مشتمل تھے، چوہدری محمد علی بھی ان میں شامل تھے۔ اس سے قبل کوئی مسلم بیوروکریٹ اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا۔ تقسیم کے بعد انہوں نے پاکستان کے لیے opt کیا، جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اہم عہدے سونپے گئے۔ ان کی اہمیت دوچند ہوگئی تھی۔ وہ پاکستان کے سیکریٹری جنرل بنے۔ بیوروکریسی کے سربراہ کی حیثیت سے وہ انتہائی بااثر شخص تھے۔ لیاقت علی خان سے لے کر غلام محمد کے دور حکومت تک وہ اس گروہ کا حصہ رہے، جس کا کہا پتھر پر لکیر ہوا کرتا تھا۔

انہوں نے 12 اگست 1955 کو وزیراعظم کا منصب سنبھالا۔ آئین سازی کی بھرپور کوششیں کیں۔ ان دنوں کا تذکرہ اپنی کتاب ''ظہورِ پاکستان'' میں انہوں نے کچھ یوں کیا: ''اکتوبر 1954 میں آئین ساز اسمبلی ہی توڑ دی گئی۔ اگلے سال ایک نئی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جس نے ہمت کے ساتھ اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور 6 ماہ کے اندر اسے مکمل کردیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین اسی قرارداد (قراردادِ مقاصد) پر مبنی تھا، جسے لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا۔ اس آئین کا نفاذ 23 مارچ 1956 سے عمل میں لایا گیا۔ اس آئین کا سنگ بنیاد، جسے وزیراعظم کے طور پر مجھے ملک کے اندر پیش کرنے کی عزت حاصل ہوئی، ہر شعبے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین مساوی شراکت تھا۔''

اس آئین میں صدر کا عہدہ سپریم تھا۔ ایک قومی اسمبلی کی گنجائش تھی۔ 2 مارچ 1956 کو گورنر جنرل نے اس آئین

کی منظوری دی اور 23 مارچ کو اسکندر مرزا نے پاکستان کے پہلے صدرِ مملکت کے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ چوہدری محمد علی کو احساس تھا کہ طاقت کا محور اب اسکندر مرزا ہیں۔ ان کی اپنی جماعت نے انہیں چھوڑ دیا تھا، جس کا تذکرہ ایک بار انہوں نے ایوب خان کے سامنے بھی کیا۔ بگڑتے حالات کے پیشِ نظر انہوں نے 12 ستمبر 1956 کو استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ دینے کے بعد انہوں نے ”نظامِ اسلام پارٹی“ بنائی۔ اب وہ جمہوریت کے ساتھ تھے۔ صدارتی انتخاب میں انہوں نے فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ جلسے جلوسوں میں آگے آگے رہتے۔ انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ میں ان جلسوں کی قیادت روزِ قیامت یہ جواب دینے کے لیے کر رہا ہوں کہ اے اللہ! میں نے اپنی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت بحال ہو جائے۔

پاکستان میں پہلا مارشل لا لگانے والے ایوب خان نے اپنی کتاب ”فرینڈز ناٹ ماسٹرز“ میں چوہدری محمد علی کا تذکرہ بڑے منفی انداز میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ”چوہدری محمد علی نے جیسے تیسے آئین تیار کرلیا، جو 23 مارچ 1956 کو نافذ کیا گیا۔ یہ بڑی مایوس کن دستاویز تھی۔ وزیرِ اعظم نے، جو اس امر کے سخت متمنی تھے کہ انہیں تاریخ میں آئین کے مصنف کی حیثیت سے یاد رکھا جائے۔ اپنی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کے نظریات کو اس آئین میں سمو لیا تھا۔ آئین کیا تھا، بس چوں چوں کا مربہ تھا۔“

کچھ حلقوں کا الزام ہے کہ وہ حکومتیں بنانے اور گرانے میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ کئی اہم واقعات ان کے سامنے ہوئے، جہاں وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظم سے اپنی آخری ملاقات کا ”ظہورِ پاکستان“ میں جس طرح انہوں نے تذکرہ کیا، وہ حقائق کے منافی تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات فاطمہ جناح کی کتاب ”مائی برادر“ میں خاصی مختلف ہیں۔ جو لوگ چوہدری محمد علی کے مداح ہیں، ان کا موقف ہے کہ وہ ایک انتہائی باصلاحیت بیوروکریٹ تھے، جنھوں نے وزیرِ اعظم بننے کے بعد بھی حالات میں بہتری کی بھرپور کوشش کی، مگر ایک زیرک سیاست دان نہ ہونے کی وجہ سے حالات سنبھال نہیں سکے۔ سیاست دان عوامی ہوتا ہے، جب کہ بیوروکریٹ صاحبِ اقتدار اور سسٹم کے ساتھ چلتا ہے۔ پیچیدہ آئینی اور قانونی مسئلے تو حل کر لیتا ہے، مگر عوام کے احتجاج سے نمٹنے کا تجربہ نہیں رکھتا۔ ان کا بھی یہی معاملہ تھا۔

اسی باعث انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ 2 دسمبر 1980 کو 75 برس کی عمر میں کراچی میں وفات پائی۔ ان کے صاحب زادے خالد انور نے وکالت میں نام کمایا۔ وہ سینیٹر رہے اور وفاقی وزیر کا عہدہ سنبھالا۔

بابرہ شریف

انہیں پاکستانی فلم انڈسٹری کا مقبول ترین چہرہ کہا جا سکتا ہے، حسن تو خدا نے دیا ہی تھا، طبیعت میں شوخی بھی تھی، رقص پر بھی خوب گرفت تھی۔ ان ہی صلاحیتوں کی وجہ سے کچھ ناقدین انہیں پاکستانی سری دیوی کہتے ہیں، مگر کچھ کو اس پر اعتراض... ان کا کہنا ہے کہ وہ سری دیوی سے زیادہ باصلاحیت تھیں۔ اس ضمن میں ان کے ٹی وی کے تجربے کا بالخصوص ذکر کیا جاتا ہے، جس نے انہیں ایک منجھا ہوا فن کار بنا دیا۔ جب وہ انڈسٹری میں داخل ہوئیں، اس وقت وہ خود کو بطور اداکارہ منوا چکی تھیں اور پورے ملک میں ایک جانا مانا چہرہ تھیں۔

معروف قلم کار عارف وقار کے بہ قول: ”سن ستر کے عشرے میں فلم انڈسٹری کو اداکاری کے میدان میں تازہ خون مہیا کرنے والا ادارہ پاکستان ٹیلی ویژن ہی تھا، جو نئے آرٹسٹوں کے لیے ایک ایسی تربیت گاہ بن چکا تھا، جہاں سے ٹریننگ ختم کرتے ہی فن کار کسی اسٹوڈیو کا رخ کرتے، تاکہ بڑی اسکرین پر جلوہ گر ہو کر ان لاکھوں کروڑوں ناظرین تک رسائی حاصل کر سکیں، جو ٹیلی ویژن کے دائرہ کار سے باہر تھے اور جن کے لیے فلم ہی تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔“ اپنے مضمون میں انہوں نے اس تناظر میں جن فنکاروں کا تذکرہ کیا، ان میں غلام محی الدین کے ساتھ دوسرا نام بابرہ شریف کا تھا، جنھوں نے ٹی وی پر تو شہرت حاصل کی ہی، مگر فلم کی سمت گئیں، تو اپنے وقت کی سب سے بڑی ہیروئن بن گئیں۔ شاید آپ کو یاد ہو، بابرہ شریف نے ٹی وی پہ چلنے والے واشنگ پاؤڈر کے ایک اشتہار سے عوام میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ کچھ عرصے انہوں نے ماڈلنگ کی۔ پھر ڈراموں کا رخ کیا۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ کا زمانہ تھا۔ انہوں نے چند ٹی وی ڈراموں میں کام کیا تھا۔ البتہ حسینہ معین کا لکھا اور کنور آفتاب کا پروڈیوس کیا ہوا کھیل ”پہلی عید مبارک“ بابرہ کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ اسی کے وسیلے سے ان پر فلمی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ ”انتظار“ ان کی پہلی فلم تھی، جو 1974 میں ریلیز ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مستقبل میں چوٹی کے اداکار بننے والے غلام محی الدین نے بھی اسی برس ”دل والے“ کے ذریعے فلم

انڈسٹری میں قدم رکھا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ بابرہ اور غلام محی الدین کی قسمت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھی۔ جلد انہیں شباب کیرانوی نے اپنی فلم میں کاسٹ کرلیا۔ "میرا نام ہے محبت" اگست 1975 میں ریلیز ہوئی جو سپرہٹ ثابت ہوئی۔ یہ جوڑی ناظرین کے دلوں کو بھا گئی تھی۔ پھر بابرہ شریف نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان کا ماضی کھنگال لیں۔ بابرہ شریف 10 دسمبر 1954 کو لاہور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ شوخ اور چنچل تھیں۔ بچپن سے اداکاری میں دلچسپی تھی۔ اسکول میں اسٹیج شو کیا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں، جب انہوں نے ماڈلنگ کیریر شروع کیا، اس وقت عمر ان کی فقط 12 برس تھی۔ واشنگ پاؤڈر کا اشتہار، جو انہیں ملک گیر شہرت عطا کرنے والا تھا، 1973 میں نشر ہوا۔ یہ خوبرو لڑکی سب کے دلوں میں گھر کرگئی۔ اسی برس انہیں کراچی ٹیلی وژن سے بلاوا آیا۔ "کرن کہانی" نے انہیں بطور اداکارہ شناخت دی، جس کا شمار کلاسیک ڈراموں میں کیا جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں انہیں روحی بانو اور جمشید انصاری جیسے پختہ اداکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

گو "انتظار" ریلیز ہونے والی پہلی فلم تھی، مگر یہ فلم "بھول" تھی، جس میں انہیں پہلے پہل سائن کیا گیا۔ یہ شمیم آرا کی فلم تھی۔ آنے والے دنوں میں انہوں نے چند فلموں میں سپورٹنگ کردار کیے، جنھیں سراہا تو گیا، مگر مضبوط لیڈ رول کے لیے انہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ 1975 میں "میرا نام ہے محبت" ریلیز ہوئی، جس میں انہوں نے کینسر کی مریضہ کا کردار کمال مہارت سے ادا کیا۔ یوں بابرہ نے اپنے کیریر کا پہلا نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ 1976 میں ان کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں، جن میں ظفر شباب کی فلم "شبانہ" بھی شامل تھی، جس نے ریکارڈ بزنس کیا۔ بابرہ کا دور شروع ہوچکا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد اور شاہد کے مدمقابل انہوں نے جم کر اداکاری کی۔ فلم نے گولڈن جوبلی کی۔ انہوں نے بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ اپنے نام کرلیا۔ "وقت" ان کے کیریر کی ایک اور اہم فلم تھی، جس کا خاصا چرچا تھا۔ 1977 میں انہوں نے فلم "عاشی" میں مرکزی کردار کیا، جسے ان کی مضبوط ترین پرفارمینس تصور کیا جاتا ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق پاکستانی فلم انڈسٹری سینما کی تعداد اور فلموں کی ریلیز کے لحاظ سے ضیا دور میں عروج پر تھیں۔ فلمیں تواتر سے بنتی رہیں اور خاصا بزنس کرتی تھیں۔

اسی زمانے میں بابرہ بھی تواتر سے فلمیں سائن کر رہی تھیں۔ کچھ کامیاب رہتیں، کچھ ناکام، مگر 1982 میں "سنگ دل" ریلیز ہوئی، تو بڑا غلغلہ ہوا۔ وہ بہترین اداکارہ کا ایک اور ایوارڈ لے اڑیں۔ اخبارات میں اب انہیں پاکستان کی سب سے بڑی ہیروئن کہا جانے لگا۔ 1980 سے 1990 تک انہوں نے ندیم، وحید مراد، محمد علی، شاہد، غلام محی الدین اور سلطان راہی کے مدمقابل مختلف کردار بڑی مہارت سے نبھائے اور کئی ہٹ فلمیں دیں، مگر اب فلم انڈسٹری کا مزاج بدل رہا تھا۔ معیار میں گراوٹ آگئی۔ وہ زوال کی سمت جارہی تھی۔ اس کے باوجود بابرہ چند اچھی فلمیں کرنے میں کامیاب رہیں، جیسے دیوانے دو، خواہش، جوانی دیوانی، موسم ہے عاشقانہ، انسان، دو دل، مس کولمبو، مس بینکاک۔ پنجابی فلموں کا دور آیا، تو انہوں نے خود کو چیلنج کیا۔ اپنے آخری دو نگار ایوارڈ انہوں نے پنجابی فلموں ہی کے لیے وصول کیے۔ وہ سنجیدہ کرداروں میں بھی نظر آئیں۔ "ایک چہرہ دو روپ"، "مہک" اور "ساتھی" ایسی ہی فلمیں تھیں۔ پاکستان کی پہلی سائنس فکشن فلم "شانی" میں بھی بابرہ نے کلیدی کردار نبھایا۔

1990 کے بعد کا زمانہ بہت سے اچھے اداکاروں کے مانند بابرہ کے لیے بھی کٹھن تھا۔ ان کی بیش تر فلمیں ناکام ہوئیں۔ اب وہ فلمیں کم ہی سائن کرتیں۔ طویل وقفے کے بعد 1992 میں بابرہ ٹی وی کی سمت لوٹیں۔ انور مقصود کے تحریر کردہ پلے "نادان نادیہ" میں وہ دکھائی دیں۔ گو ڈراما مقبول ہوا، مگر کچھ ناقدین کا خیال تھا کہ وہ فلمی اداکارہ کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔ 1995 میں ان کی فلم "ہم نہیں یا تم نہیں" ریلیز ہوئی۔ مخالفین کے اندازوں کے برعکس فلم سپرہٹ ثابت ہوئی۔ فلم انڈسٹری کی ملکہ واپس آچکی تھی۔ اب وہ "پیاسے ساون" اور "دوستانہ" میں دکھائی دیں۔ سندھی فلم "سجاول" بھی ہٹ ہوئی۔ اس فلم کے بعد انہوں نے انڈسٹری کو خیرباد کہنے کا اعلان کردیا۔ لوگ محوِ حیرت تھے۔ ایک شان دار کم بیک کے بعد جب ان کی ساکھ بحال ہوچکی تھی، انڈسٹری چھوڑنے کا بھلا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ دراصل بابرہ

یہی ثابت کرنے لوٹی تھیں کہ وہ اپنے عروج پر ہیں اور ان کے لیے یہی انڈسٹری چھوڑنے کے لیے بہترین وقت تھا۔ آخری بار سینما ناظرین نے انہیں اظہار قاضی کے مدمقابل فلم ”گھائل“ میں دیکھا۔ اپنی ریٹائرمنٹ سے متعلق انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا: ”آپ کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ ایسے پیشے میں جہاں آپ کو آئیڈلائز کیا جائے، مناسب یہی ہے کہ آپ کے پیر زمین پر رہیں۔ میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ اپنے کیریر کے عروج پر انڈسٹری کو الوداع کہوں۔ میں اس کے لیے ذہن بنا چکی تھی۔ میرے لیے یہ فیصلہ یوں بھی آسان رہا کہ میں نے انڈسٹری میں زیادہ دوست نہیں بنائے۔ وحید مراد کی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسٹارڈم کی چوٹی سے اتر کر ناکامیوں کا تجربہ کروں۔ زندگی لائٹ، کیمرا اور ایکشن سے بڑھ کر ہے۔“

وہ فلموں سے دور ضرور ہو گئیں، مگر انڈسٹری سے لاتعلق نہیں ہوئیں۔ کم کم ہی سہی، ایوارڈ شوز میں شریک ہوتیں، ٹی وی پر دکھائی دیتیں، اخبارات میں ان کے انٹرویوز شائع ہوتے۔ وہ کچھ اشتہارات میں بھی دکھائی دیں۔ وہ جیولری کے کاروبار سے بھی منسلک رہیں۔

دانش کنیریا

وہ ایک فسوں گر تھا۔ گگلی نامی فن پر اسے مکمل عبور حاصل تھا۔ اس کی گھومتی، بل کھاتی گیند بلے باز کے ہوش اڑا دیتی۔ بلاشبہ وہ ایک خطرناک بالر تھا۔ کوئی اسے نہیں روک سکتا تھا، ماسوائے بدبختی کے اس آسیب کے جس کے سامنے بڑے بڑے سورما ہار جاتے ہیں۔ تقدیر سے مقابلہ ممکن نہیں۔ اس کی کہانی میں تقدیر کا عمل دخل بڑا واضح نظر آتا ہے۔

انٹرنیشنل کرکٹ میں اپنی پہلی وکٹ لینے کے بعد فیصل آباد اسٹیڈیم کی زمین کو بوسہ دینے والا یہ کرکٹر جب 16 دسمبر 1980 کو کراچی کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا، تو اس کا نام دانش پربھاشنکر کنیریا رکھا گیا۔ وہ متوسط طبقے میں پروان چڑھا۔ بچپن میں سیدھا سادہ بچہ تھا۔ اس کے والد پربھاشنکر لال جی ہاکی کے بہترین کھلاڑی تھے۔ اس کے ماموں انیل دلپت نے بطور وکٹ کیپر پاکستان کی نمائندگی کی۔ یعنی اسپورٹس میں دلچسپی اور ڈسپلن دانش کو وراثت میں ملا۔ دانش نے خود کو اس کھیل کے لیے وقف کر دیا۔ اس میدان میں والد کے ایک دوست کاوس ملا نے بھرپور سپورٹ کیا، جن کا شمار کراچی کے نمایاں وکٹ کیپرز میں ہوتا تھا۔ کاوس ملا اکثر اُن کے والدین سے کہتے: تیار رہنا، یہ بچہ ایک دن پاکستان کے لیے کھیلے گا!

ان کی یہ بات درست ثابت ہوئی۔ دانش نے نہ صرف ٹیم تک رسائی حاصل کی، بلکہ خود کو لیگ اسپن کا... جسے ایشیائی فن کہا جاتا ہے وارث قرار دیا۔ پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے والے اسپنر کا اعزاز بھی اپنے نام کر لیا۔ ٹیسٹ کرکٹ میں مجموعی طور پر دانش کنیریا وسیم اکرم، وقار یونس اور عمران خان کے بعد چوتھے نمبر پر براجمان ہے۔

اس نے 61 ٹیسٹ میچز میں 34.79 کی اوسط سے 261 وکٹیں حاصل کیں۔ اننگز میں پانچ وکٹیں حاصل کرنے کا کارنامہ 15 مرتبہ انجام دیا۔ دو بار ٹیسٹ میچز میں دس سے زائد وکٹیں اس کے حصے میں آئیں۔ بنگلہ دیش کے خلاف 77 رنز کے عوض 7 وکٹوں کا حصول بہترین کارکردگی رہی۔ گو وہ ون ڈے کا بھی اچھا کھلاڑی تھا، مگر اسے تواتر سے مواقع نہیں دیے گئے۔ 18 ون ڈے میچز میں 15 وکٹیں حصے میں آئیں۔ 31 رنز کے عوض 3 وکٹوں کا حصول بہترین کارکردگی رہی۔ فرسٹ کلاس کرکٹ میں بھی اس نے خوب نام کمایا۔ پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن اور حبیب بینک کی نمائندگی کی۔ کاؤنٹی کرکٹ میں ایسکس کا حصہ بنا۔ فرسٹ کلاس ہزار وکٹیں اپنے نام کیں مگر یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہو گئیں، جب بدقسمتی کے آسیب نے اس پر حملہ کیا۔ پھر کچھ بھی ویسا نہیں رہا، جیسا پہلے تھا۔ زندگی پر سیاہ دبیز بادل چھا گئے... مگر بدقسمتی کے تذکرے سے پہلے ہم پھر ماضی میں چلتے ہیں۔ کرکٹ کا اسے جنون تھا۔ اپنی صلاحیت کو سنوارنے کے لیے اس نے بڑی جدوجہد کی۔ اس کے سامنے عبدالقادر، مشتاق احمد اور شین وارن جیسے بالرز کی مثال تھی۔ سینٹ پیٹرک اسکول کا وہ طالب علم تھا۔ قابل تھا، مگر سارا وقت کرکٹ میں صرف ہوتا۔ اوائل میں اس نے کراچی کے ڈان باسکو کلب کی نمائندگی کی۔ وہیں سے صحیح معنوں میں کیریر شروع ہوا۔ پرفارمنس تو شاندار تھی، مگر ”عمر کرکٹ کلب“ سے وابستہ ہونے کے بعد اس کے کارناموں کا اخبارات میں تذکرہ ہونے لگا۔ پرفارمنس میں بھی بہتری آتی گئی۔

96ء میں انڈر 15 کے لیے ٹرائلز ہوئے، تو دانش کنیریا نے بھی قسمت آزمائی۔ کڑے مقابلے کے بعد وہ 32 کھلاڑیوں میں جگہ بنانے میں کامیاب رہے، مگر حتمی 16 کھلاڑیوں میں شامل ہونے میں ناکام رہا۔ وہ مایوس کن لمحہ تھا، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ خوب محنت کی۔ نیشنل آرٹس

کالج کی طرف سے کھیلتا رہا۔ جلد کراچی انڈر 19 میں جگہ بنا لی۔ "پاکستان ایمرجنگ ٹیم" کے ساتھ نیدرلینڈ اور ڈنمارک کے دورے کیے۔ "پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن" سے وابستگی ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ متاثر کن کارکردگی 99ء میں "حبیب بینک" لے گئی۔ حسن رضا کی کپتانی میں سری لنکا میں ہونے والے انڈر 19 ورلڈ کپ کا تجربہ کیا۔ کراچی کی نمائندگی کی۔ بالآخر جب 2000 میں انگلینڈ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی، تو دانش کو کیمپ سے بلاوا آیا۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

کیمپ میں کوچ جاوید میاں داد کے ساتھ ساتھ مشتاق احمد اور ثقلین مشتاق نے بھی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ پریکٹس میچ میں موقع دینے کا عندیہ دیا گیا، مگر پھر جانے کیا ہوا۔ دانش کا نام ٹیم سے کاٹ دیا گیا۔ نوجوان بڑا پریشان تھا۔ راتوں کو کروٹیں بدلتا۔ لگتا تھا یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا، مگر پھر قدرت نے اشارہ کیا۔

کرکٹ بورڈ کے سربراہ کی کال موصول ہوئی، اُسے فیصل آباد میں ہونے والے میچ میں آزمایا گیا اور دوسرے ہی اوور میں وہ مارکوس ٹریسکوتھک کی وکٹ لے اڑا اور سجدے میں گر گیا۔ گو سیریز کے بعد اسے ڈراپ کردیا گیا، مگر وہ انتظامیہ کی نظروں میں آ گیا تھا۔ محنت سے بھی جی نہیں چرایا۔

متاثر کن کارکردگی نے جلد قومی ٹیم کا حصہ بنا دیا۔ ملتان میں ہونے والے ایشین کپ کا وہ میچ سب ہی کو یاد ہے، جس میں اِس لیگ اسپنر نے بارہ وکٹیں حاصل کیں۔ پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ ٹیم کا مستقل حصہ بن گیا۔ 2002 میں بنگلہ دیش کے خلاف ایک اننگز میں 77 رنز کے عوض 7 وکٹیں حاصل کر کے ایک بار پھر اپنی اہمیت ثابت کردی۔ آنے والے برسوں میں کئی مقابلوں میں پاکستان کی فتح میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اکتوبر 2004 میں سری لنکا کے خلاف کراچی ٹیسٹ میں دس مہرے کھسکائے، تو سب اش اش کر اٹھے۔ انگلینڈ کے خلاف ملتان میں ہونے والے ایک میچ میں 260 رنز کا تعاقب کرنے والی حریف ٹیم دانش کی بولنگ کے جال میں پھنس گئی اور فتح پاکستان کی جھولی میں آن گری۔ 2004 میں کاؤنٹی کیریر کا آغاز ہوا اور دانش "ایسکس" پہنچ گیا۔

2005 میں ہندوستان کا دورہ یادگار رہا۔ انضمام الحق کپتان تھے، جو اپنے کھلاڑیوں کو استعمال کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ دانش کی کارکردگی میں تو تسلسل تھا، مگر حالات کٹھن تھے۔ پہلے میچ میں پاکستان کو شکست ہوئی۔ دوسرا ڈرا ہوا۔ بنگلور میں آخری مقابلہ تھا۔ اس روز وہ اپنی صلاحیتوں کے عروج پر تھا۔ پہلی اننگز میں پانچ وکٹیں لے اڑا۔ دوسری اننگز میں بھی دو اہم وکٹیں حاصل کیں۔ یوں تین ٹیسٹ میچز میں 19 کھلاڑیوں کو پویلین کی راہ دکھانے والے دانش کنیریا نے ہندوستان کی زمین پر ایک سیریز میں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والے بالر کا اعزاز حاصل کرلیا۔ برائن لارا کی وکٹ تو حاصل کر ہی چکے تھا، اس سیریز میں سچن ٹنڈولکر جیسے عظیم کھلاڑی کو بولڈ کیا۔

دسمبر 2009 میں نیپئر میں نیوزی لینڈ کے خلاف پہلی اننگز میں 168 رنز کے عوض 7 وکٹیں حاصل کیں۔ دانش نے آخری ٹیسٹ میچ 2010 میں انگلینڈ کے خلاف کھیلا، جس میں کارکردگی متاثر کن نہیں رہی اور اسے ڈراپ کردیا گیا۔ یہ اتنا بڑا صدمہ نہیں تھا۔ بظاہر زندگی معمول پر جارہی تھی، مگر مئی 2010 میں سب کچھ بدل گیا۔ دراصل ستمبر 2009 کے ڈومیسٹک سیزن کے ایک میچ میں اس پر اسپاٹ فکسنگ کا سنگین الزام لگا تھا۔ اس سے تفتیش کی گئی۔ الزامات میں شدت تھی، مگر ستمبر 2010 میں پولیس نے اسے کلیر قرار دے دیا۔ اس زمانے میں پاکستان ساؤتھ افریقا سے ٹیسٹ سیریز کھیلنے جارہا تھا۔ کیمپ لگا تو دانش بھی اس میں شامل تھا، مگر کرکٹ بورڈ نے کوئی وجہ بتائے بغیر اسے گھر بھیج دیا۔ اس کا ایک سبب میچ فکسنگ کا وہ اسکینڈل تھا، جس نے اگست 2010 میں پاکستان کرکٹ بورڈ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ قومی ٹیم کے کپتان سلمان بٹ اور فاسٹ بولر محمد آصف اور محمد عامر اس میں ملوث پائے گئے تھے۔ کرکٹ بورڈ دانش کو کھلا کر مزید کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ خیر، وہ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتا رہا، مگر فروری 2012 میں حالات پھر بگڑ گئے، جب دانش برطانیہ میں میچ فکسنگ کے ایک مقدمے میں انگلش کرکٹر میری وین ویسٹ فیلڈ کے ساتھ قصوروار پایا گیا۔ دانش کنیریا پر انگلینڈ میں کھیلنے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابندی لگادی گئی۔ دانش نے لاکھ کہا کہ یہ الزامات جھوٹے ہیں، اسے پھنسایا جارہا ہے، مگر جب بدبختی وار کرتی ہے تو کوئی کوشش کام نہیں آتی۔ اپنوں نے بھی منہ موڑ

ماہ دسمبر اور دو چیف جسٹس

یہ امر خاصا دلچسپ ہے کہ پاکستان کے دو ایسے سابق چیف جسٹس صاحبان کا تعلق ماہ دسمبر سے ہے، جن کی زندگیاں بھی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ ایک کے عدالتی فیصلے نے براہِ راست دوسرے کو متاثر کیا اور یہ فیصلہ پاکستان کی تاریخ کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ ان ہی فیصلوں کے نتیجے میں عدلیہ بحالی کی وہ تحریک چلی، جو پاکستان کی پہچان ٹھہری اور جمہوریت کو پٹری پر لانے کا محرک بنی۔ یہ جسٹس (ر) رانا بھگوان داس اور جسٹس (ر) افتخار چوہدری کا تذکرہ ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو، جب افتخار چوہدری نے پرویز مشرف کے سامنے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں معطل کیا گیا۔ یوں عدلیہ بحالی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس وقت رانا بھگوان داس نے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھالا۔ کچھ حلقوں کو غلط فہمی تھی کہ منکسر المزاج اور اقلیتی برادری سے ہونے کے باعث وہ کسی تنازعے میں پڑنے سے اجتناب برتیں گے اور نظریۂ ضرورت کا نسخہ ایک بار پھر استعمال کیا جائے گا، مگر اُنھوں نے سب کی توقعات غلط ثابت کر دیں۔ افتخار چوہدری کی معطلی کو غیر آئینی قرار دے دیا گیا۔ اور یوں پاکستان کی تاریخ کی سب سے مضبوط عدلیہ وجود میں آئی۔

رانا بھگوان داس سادہ اور اصول پسندی کا امتزاج تھے۔ وہ 20 دسمبر 1942 کو نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ 1967 میں جج ہو گئے۔ کئی سال سیشن جج کے طور پر فرائض انجام دیے۔ پھر سندھ ہائیکورٹ کے جج بنے۔ 2000 میں سپریم کورٹ میں

لیا۔ پی سی بی نے بھی انگریز عدلیہ کا فیصلہ تسلیم کر لیا اور اس پر پابندی لگا دی۔ دانش کنیریا نے انگلش کرکٹ بورڈ کے خلاف اپیل کی اور تاحیات پابندی کو غیر منصفانہ قرار دیا، مگر یہ اپیل رد کر دی گئی۔ گوروں سے مرعوب پاکستانیوں نے بھی دانش کنیریا کی کوئی مدد نہیں کی۔ بورڈ اپنے اس ہیرو کو بھول گیا۔ گو اس نے کئی پلیٹ فورمز پر آواز اٹھائی، مگر کہیں شنوائی نہیں ہوئی اور یوں ایک انتہائی باصلاحیت کھلاڑی، جس کا ریکارڈ شاندار تھا دھیرے دھیرے گمنامی کے اندھیرے میں چلا گیا۔

معین اختر

آخر وہ کیا تھا؟

ایک باکمال ٹی وی میزبان، ایک شاندار اداکار، ایک جینیئس، ایک سیلیبریٹی... یا شاید ایک عظیم انسان۔ ایک سخی شخص، جو اوروں کو مشکل میں دیکھتا تو فوراً آگے بڑھ کر اُن کی مدد کرتا۔ لوگوں کا سہارا بنتا، ان کے دکھ درد بانٹتا۔ زخموں پر مرہم رکھتا۔ معین اختر کو ہم ایک ایسے شخص کے طور پر جانتے ہیں، جو پل میں محفل کو زعفران زار بنا دیتا تھا، جس کی شگفتگی دلوں میں گھر کر جاتی، جس کے چٹکلوں پر ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ جاتے، جو اتنے پُروقار انداز میں ٹی وی شوز کی میزبانی کرتا کہ لوگ اش اش کر اٹھتے۔ کامیڈین کے طور پر معروف معین اختر درحقیقت ایک سنجیدہ اور متین شخص تھا۔ بظاہر بولڈ، پرجوش اور خوش مزاج مگر حقیقتاً تنہائی پسند اور منکسر مزاج آدمی۔

اصل زندگی میں وہ بڑے سادہ تھے۔ نئے فنکاروں کو کام دلوانے کے لیے دوستوں سے سفارش کرنا، ہارٹ سرجری کے فقط چند ہفتوں بعد کینسر میں مبتلا بچوں کے لیے فنڈز اکٹھے کرنا، کسی کی مدد کرنے کے لیے اپنی گاڑی بیچ دینا... یہ سب معین اختر جیسا عظیم شخص ہی کر سکتا تھا۔

ان کے صاحب زادے سرجیل اختر نے 2016 میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں اس پہلو پر کچھ یوں روشنی ڈالی: ”معین اختر کے لفظی معنی مددگار ستارہ کے ہیں اور ان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے نام کی لاج رکھی۔ دنیا میرے والد کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے جانتی ہے، جبکہ میں انہیں ایک سخی شخص کے طور پر جانتا ہوں۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ میں انہیں اپنے گھر اور انسانیت کی بے لوث خدمت کرتے دیکھتا ہوا بڑھا۔ ہر ضرورت مند شخص کے لیے وہ ایک گمنام مددگار رہتے۔ ان کی کئی سخاوتیں ایسی ہیں، جن پر میں پردہ پڑا رہنے دینا چاہتا ہوں، کیوں کہ یہی ان کی خواہش تھی لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ ان میں دوسروں کی مشکلات اور مسائل سمجھنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ وہ لوگوں کی دل جوئی کرتے، ان کے غموں کو اپنا غم سمجھتے، اور ان کا بوجھ تقسیم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔“

تعینات ہوئے۔ 9 مارچ 2007 کو افتخار چوہدری کی معزولی کے بعد قائم مقام چیف جسٹس تعینات ہوئے۔ اس وقت بھگوان داس پاکستان میں موجود نہیں تھے۔ سیاسی نظام میں ڈیڈلاک پیدا ہوگیا تھا۔ وطن لوٹ کر انہوں نے ایک یادگار فیصلہ دیا۔ ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد وہ ان جج صاحبان میں شامل تھے، جنھوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا۔ اس دوران انہوں نے نظر بندی کا کرب سہا۔ نومبر 2009 تا دسمبر 2012 وہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کا انتقال 23 فروری 2015 میں ہوا۔ ان کی اسلام پر گہری نظر تھی۔ اسلامیات میں انہوں نے ماسٹرز کیا تھا۔ انہوں نے نعت کی صورت رحمت العلمین ﷺ کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

جہاں تک افتخار چوہدری کا تعلق ہے، وہ 12 دسمبر 1948 کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ 2005 تا 2013 چیف جسٹس رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے پاکستانی تاریخ پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ انہیں معطل کرنے کا سبب حکومت کے خلاف دائر درخواستیں بنیں، جن کا فیصلہ حکومت کے خلاف آنے کا امکان تھا۔ وکلا تحریک میں سول سوسائٹی نے بھرپور کردار ادا کیا۔ 20 جولائی 2007 کو وہ بحال ہوئے، مگر 3 نومبر 2007 کو ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد وکلا تحریک کا دوسرا فیز شروع ہوا۔ اس دوران کئی نشیب و فراز آئے۔ آخر 21 مارچ 2009 کو انہیں بحال کیا گیا۔ 11 دسمبر 2013 کو وہ سبک دوش ہوئے۔ ان کے بولڈ فیصلوں اور سوموٹو ایکشن کو میڈیا اور عوام کی جانب سے خاصی توجہ ملی۔

اولاد کا باپ کے لیے تعریفی کلمات کہنا ایک رسم ہے، مگر معین اختر کے معاملے میں یہ جملے لفظ بہ لفظ درست ہیں۔ کراچی کے کتنے ہی گمنام آرٹسٹ، صحافی اور ان کے قریبی دوست اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ جب بھی کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی میں انھیں مدعو کرتا، تو پہلے مبارک باد دیتے، آنے کا وعدہ کرتے اور پھر معقول رقم ایک لفافے میں ڈال کر اُسے سونپتے ہوئے کہتے: ”دو منع مت کیجیے گا، یہ ہماری طرف سے بیٹی کے لیے شادی کا تحفہ ہے!“ یوں بھی ہوا کہ جس کے گھر میں شادی تقریب ہے وہ مالی مسائل میں گھرا ہوا معین اختر کے پاس پہنچا۔ مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے فوراً ایک نمبر ملایا۔ پریشان حال شخص کا مسئلہ بیان کیا اور کہا، جناب کھانے کا انتظام آپ کریں۔ دوسرا نمبر ملایا اور کہا: ہال کے انتظامات آپ دیکھ لیں۔ ایسے تھے معین اختر۔ انہیں اللہ نے صلاحیت دی تھی کہ وہ اپنی روشنی اور فکر سے اردگرد کی ہر شے تبدیل کر ڈالتے۔ وہ پاس ہوں، تو کچھ بھی انوکھا رونما ہوسکتا ہے۔
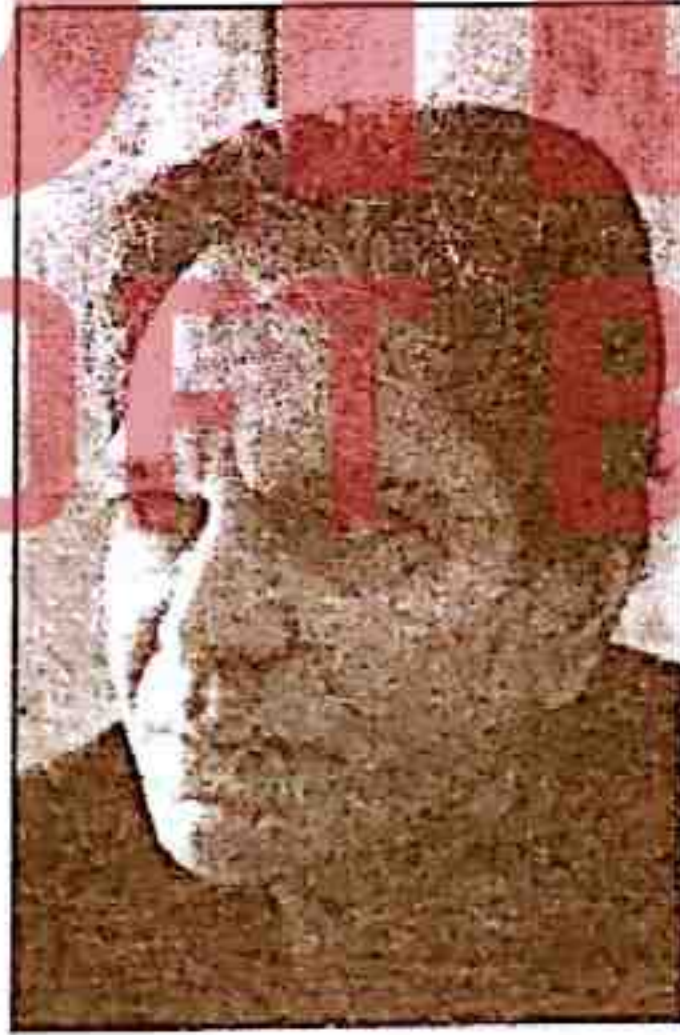
معین اختر 24 دسمبر 1950 کو کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان سے ہجرت کرکے اس شہر کو اپنا مسکن بنانے والے محمد ابراہیم کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بڑا ہوکر خاندان کا نام روشن کرے، مگر انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ شوبز میں جائے اور اداکار بنے۔ معین کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ مزاح پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ لطیفے سناتے، تو لوگ لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ خود کو منوانے کی خواہش تھی۔ سمجھ لیجیے پیدائشی فنکار تھے۔ ان کی کیریر میں 6 ستمبر 1966 کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب وہ پہلی بار ایک ورائٹی شو میں شریک ہوئے۔ جب وہ اسٹیج پر پہنچے، تو حسب روایت ان کی صحت پر خوب ”ہوٹنگ“ ہوئی، مگر وہ مطمئن کھڑے رہے۔ حاضرین سے درخواست کی کہ انہیں اپنا ٹیلنٹ دکھانے کے لیے صرف دس منٹ دیے جائیں۔ پھر جو ہوا، وہ یادگار تھا۔ ان کی پرفارمنس نے حاضرین کو مبہوت کر دیا۔ وہ آدھے گھنٹے پرفارم کرتے رہے۔ جب اسٹیج سے اترے، ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ کراچی کے مختلف ورائٹی شوز میں دکھائی دیے۔ اگلی منزل ریڈیو تھی۔ وہاں داخلہ آسان نہیں تھا، مگر معین کی صلاحیتوں نے پروڈیوسروں کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ اس وقت ٹی وی تو تھا نہیں، سو اسٹیج ڈراموں کا رخ کیا۔ اب معین کا محلے میں چرچا

ہونے لگا۔ جب ان کے والد کو ان سرگرمیوں کا علم ہوا، تو بہت آگ بگولا ہوئے۔ بیلٹ سے انہیں خوب پیٹا۔ شکر ہے، معین نے وہ مار سہہ لی اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے، ورنہ پاکستان اپنے سب سے بڑے آرٹسٹ سے محروم ہو جاتا۔ خیر، کئی برس بعد جب معین اختر نے اپنا سکہ جما لیا تھا اور انہیں بین الاقوامی شہرت مل گئی تھی، ان کے والد نے ایک روز فرمائش کی کہ وہ اپنے شو میں انہیں بھی ساتھ لے کر چلیں۔ دراصل اس شو کے مہمان خصوصی اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف تھے۔ جب وہ معین اختر کے والد سے ملے، تو کہا: آپ کا بیٹا اس قوم کا اثاثہ ہے۔

ریڈیو کے ساتھ معین اختر ایک عرصے تک میمنی تھیٹر کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے انہیں شناخت ملنے لگی، مگر یہ ٹی وی تھی، جنھوں نے شہرت کے راستے پر ڈال دیا۔ 70ء کے انتخابات کے دوران پیش کیے جانے والے مزاحیہ خاکوں میں معین اپنے اوج پر نظر آئے۔ انہوں نے ناظرین کو گرویدہ بنالیا۔ اُردو تو ان کی اپنی زبان تھی، لیکن انہیں بنگالی، سندھی، میمنی اور گجراتی پر بھی عبور حاصل تھی، جس کے طفیل ان کی رسائی بڑھتی گئی۔ اب وہ تواتر سے ٹی وی پر نظر آنے لگے۔ اس عرصے میں اردو کمرشل اسٹیج بھی اپنی جگہ بنا چکا تھا، جس کے معین بے تاج بادشاہ بن گئے۔ سید فرقان حیدر کے ساتھ انہوں نے کئی یادگار ڈرامے کیے۔ 70ء کی دہائی ان کے لیے جو شہرت لائی تھی، وہ آخری وقت تک ان کے ساتھ رہی۔ کچھ ناقدین کے مطابق معین اختر کی داستانِ حیات دراصل پاکستانی ٹیلی وژن کی تاریخ ہے۔ دونوں ایک ساتھ منظر عام پر آئے، ساتھ ساتھ مقبولیت کا سفر طے کیا۔ ساتھ ہی چیلنجز کا سامنا کیا اور دونوں کا نام دنیا بھر میں ایک ساتھ گونجا۔

Mimicry یعنی نقالی مزاحیہ اداکاری کا اہم جزو ہے۔ نئے آرٹسٹ اسی سے آغاز کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ہی اپنی شناخت بنا لیتے ہیں کیونکہ اسے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ معین اختر میں بھی Mimicry کی بے پناہ صلاحیت تھی، مگر وہ جانتے تھے کہ یہ اداکاری کی معراج نہیں۔ اس فن میں مہارت کے باوجود انہوں نے خود کو اس تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وہ تو کامیڈی تک بھی محدود نہیں رہے۔ انہوں نے اداکاری کے میدان میں طرح طرح کے تجربے کیے۔ مس روزی کا کردار سب سے بڑی مثال ہے، جب انہوں نے عورت کا گیٹ اپ کر کے اسے کمال مہارت سے نبھایا اور خوب داد وصول کی۔ معین اختر شو میں بھی انہوں نے اپنے خاکوں میں طرح طرح کے تجربے کیے۔ ٹیکنالوجی کے فقدان کے باوجود ڈبل رول کیا۔

وہ بھارت میں بھی بے پناہ مقبول تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے کے ہندوستانی اسٹینڈ اپ کامیڈین ان کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ انہوں نے کئی بار بھارت میں اپنے فن کے جلوے بکھیرے۔ دبئی میں ہونے والے شوز میں جہاں پاکستانی اور ہندوستانی فنکار ساتھ پرفارم کیا کرتے تھے، معین اختر چھائے رہتے۔ معین اختر نے مشرق وسطی میں کئی یادگار شوز منعقد کیے۔ دلیپ کمار تو ان کے مداح تھے۔ ان سے دیرینہ تعلقات رہے۔ امیتابھ بچن اور گووندا بھی ان کے گرویدہ ہونے والوں کی فہرست میں شامل تھے۔

ان کی اور انور مقصود کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں جب جب ساتھ ہوتے، مزاح کا طوفان آجاتا، مگر یہ مزاح بڑا بامعنی ہوتا ہے کہ اس میں گہرا طنز چھپا ہوتا تھا۔ سیاسی اور سماجی حالات پر کاٹ دار تبصرے ہوتے، مظلوم کی کہانی ہوتی۔ آخر کے برسوں میں معین اور انور مقصود پروگرام "لوز ٹاک" میں دکھائی دیے۔ اس پروگرام نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ "لوز ٹاک" میں معین اختر طرح طرح کے گیٹ اپ کیا کرتے۔ اور ہر گیٹ اپ کو کمال مہارت سے نبھاتے۔ 22 اپریل 2011 میں ہارٹ اٹیک نے اس عظیم...... زندگی سے بھرپور فن کار کو ہم سے چھین لیا۔

ماہرہ خان

اِن ہی صفحات میں گزشتہ ماہ ہم نے ایک اداکارہ کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ جہاں اس کی صلاحیت اور پرکشش شخصیت تھی، وہیں ایک سبب پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتی کشیدگی اور ثقافتی تعلقات کی معطلی بھی تھی۔ ایک جانب بالی ووڈ میں کام کرنے والے پاکستانی اداکار زیرِ عتاب آئے اور انہیں ممبئی چھوڑنا پڑا تو دوسری طرف پاکستان میں بھارتی فلموں کی ریلیز پر غیر اعلانیہ پابندی عاید کر دی گئی اور تمام ٹی وی چینلو بند کر دیے گئے۔ اس صورتِ حال کے باعث فواد خان کا نام عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان کی کرن جوہر کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم "اے دل ہے مشکل" کو ریلیز سے قبل شدید مشکلات کا سامنا رہا۔ آخر انڈین فلم انڈسٹری کو ہندو انتہاپسندوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے، کشمیر میں ظلم ڈھانے والی بھارتی فوج کو بھتا دیا گیا، تب کہیں جا کر کرن جوہر کو فلم ریلیز کرنے کی اجازت

ملی۔ اس کی وجہ سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے دعوے دار بھارت کے چہرے سے سیکولرازم کا نقاب اتر گیا، بڑی سبکی ہوئی، مگر مودی سرکار کے ایجنڈے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

فواد خان کا معاملہ تو حل ہوا، مگر ماہرہ خان ہنوز خبروں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ بنیادی وجہ تو یہی ٹھہری کہ انہیں دیگر پاکستانی ہیروئنوں کے برعکس انڈیا میں ایک بہت بڑے بینر کی فلم ملی اور ان کے مدمقابل سپر اسٹار شاہ رخ خان نے مرکزی کردار نبھایا۔ ہم فلم ''رئیس'' کی بات کر رہے ہیں، جسے ریلیز تو 2016 میں عید کے موقع پر ہونا تھا، مگر شاید قسمت فلم سازوں کے ساتھ نہیں تھی۔ انہیں چند وجوہات کے باعث فلم کی ریلیز ملتوی کرنی پڑی۔ اس وقت پاک بھارت تعلقات دوستانہ تھے، مگر پھر کشمیر میں کرفیو کے بے انت سلسلے اور سرحدی کشیدگی نے حالات بگاڑ دیے۔ ہندو انتہا پسندوں نے جب فلم نگری پر دھاوا بولا اور ''اے دل ہے مشکل'' کے ساتھ ساتھ ''رئیس'' کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور اعلان کر دیا کہ جس فلم میں پاکستانی اداکار ہوں گے، اسے ریلیز کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ساتھ ہی انہیں سائن کرنے والے پروڈیوسروں کی پٹائی کی جائے گی۔ بظاہر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا، مگر کیا خبر ''رئیس'' کی ریلیز تک، جو اگلے برس جنوری میں متوقع ہے، کیا واقعہ ہو جائے اور ایک پھر جنونی ہندو سڑکوں پر نکل آئیں۔

ماہرہ خان کا شمار پاکستان کی بہترین آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ وہ بلا کی پُرکشش ہیں، ماڈلنگ میں بھی خود کو منوایا۔ فن اداکاری پر بھی انہیں خوب گرفت ہے۔ ان ہی صلاحیتوں کے طفیل تو انہیں ہندوستان سے فلموں کی آفرز ہوئیں۔ کئی پروڈیوسروں نے رابطہ کیا، مگر انہوں نے بہترین کا انتخاب کیا۔ دو ماہ میں فلم کی شوٹنگ مکمل کی اور لوٹ آئیں، اس اُمید پر کہ جلد وہ برصغیر میں ایک اسٹار کا درجہ حاصل کر لیں گی، بین الاقوامی شہرت ان کے قدموں میں ہوگی۔ شہرت تو انہیں بین الاقوامی ہی ملی، مگر بدقسمتی سے اس کا سبب ان کی اداکاری نہیں، بلکہ ایک تنازع ٹھہرا۔

ماہرہ خان 21 دسمبر 1982 کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ایک پڑھے لکھے متمول گھرانے میں ان کی پرورش ہوئی۔ اداکاری کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ گھر والوں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ پہلے پہل انہوں نے بطور وی جے اپنا کیریئر شروع کیا۔ اس وقت ماہرہ کی عمر فقط 16 برس تھی۔ تب پرائیوٹ چینلز تازہ تازہ تھے اور تیزی سے مقبول ہو رہے تھے، بالخصوص میوزک چینلز کی بڑی ڈیمانڈ تھی۔ ماہرہ ایم ٹی وی پاکستان کے شو Most Wanted میں نظر آئیں، جو خاصا مقبول تھا۔ پھر ہم نے انہیں آگ ٹی وی کے شو Weekends with Mahira میں دیکھا۔ بدقسمتی سے میوزک چینلز اپنی جگہ نہیں بنا سکے، مگر یہ امر ماہرہ کے لیے خوش بختی لایا۔ ورنہ وہ ایک وی جے تک ہی محدود رہتیں اور ان کی اصل صلاحیتیں کبھی ہمارے سامنے نہ آتیں۔

سال 2011 میں انہیں ممتاز ہدایت کار شعیب منصور کی فلم ''بول'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم متنازع ٹھہری، مگر اس کے طفیل ماہرہ بطور اداکارہ دنیا کے سامنے آگئیں۔ ان کا معصوم چہرہ فلم بینوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ ان کی صلاحیتوں کا ہندوستان میں بھی چرچا ہوا۔ اس زمانے میں پاکستانی فلم انڈسٹری اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ آرٹسٹوں کے لیے ٹی وی اصل میدان تھا۔ ماہرہ بھی ٹی وی کی سمت آئیں۔ انہوں نے مہرین جبار کے ڈرامے ''نیت'' میں اپنی اداکاری کے جلوے دکھائے، جس میں ان کے مدمقابل ہمایوں سعید تھے۔ ان کی اداکاری کو سراہا گیا۔

''نیت'' ہی کی پرفارمنس کی بنیاد پر انہیں ''ہم سفر'' میں کاسٹ کیا گیا، جس نے ان کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دی۔ عرفان کھوسٹ کی ہدایت کاری میں بننے والے اس ڈرامے میں فواد خان نے ہیرو کا کردار کیا۔ ڈراما بے حد مقبول ہوا۔ ماہرہ اور فواد کی جوڑی آسمانوں پر پہنچ گئی۔ یہ دونوں رومانس کی علامت اور جوان دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ''ہم سفر'' ہی تھا، جو ڈراما انڈسٹری کی تجدید کا سبب بنا اور اس صنف سے مایوس ہونے والے ناظرین پھر اس کی طرف لوٹ آئے۔ پاکستان کے ساتھ اسے یورپ، امریکا اور وسطی ایشیا میں بھی بہت پسند کیا گیا۔ یہ ہندوستان میں بھی ٹیلی کاسٹ ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ 23 اقساط پر مشتمل ''ہم سفر'' کو پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا ڈراما بھی کہا جاتا ہے۔

پھر ماہرہ نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب وہ ''شہر ذات'' میں

دو وزرائے اعظم پاکستان

80 کی دہائی کے بعد جن دو شخصیات نے پاکستانی سیاست میں کلیدی کردار ادا کیا اور مجموعی طور پر پانچ بار وزیراعظم کا منصب سنبھالا، ان دونوں ہی کا تعلق ماہ دسمبر سے ہے۔ یہ ہیں محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف۔ آخر الذکر اس وقت بھی وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہیں۔ مسلم لیگ ن کے وہ صدر ہیں۔ ان کی سیاسی بصیرت کے نتیجے میں ان کی جماعت نے تین بار وفاق میں حکومت بنائی۔ میاں نواز شریف 25 دسمبر 1949 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معروف صنعت کار تھے۔ نوجوانی میں وہ کرکٹ کے دلدادہ تھے۔ شوبز کی دنیا بھی نوجوانی میں اُن کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے لا کی ڈگری حاصل کی۔ سیاسی سفر کا آغاز ضیا دور میں کیا۔ 1981 میں صوبائی کابینہ میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ 9 اپریل 1985 کو پنجاب کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ مئی 1988 میں جنرل ضیاء نے جونیجو حکومت کو تو برطرف کردیا، تاہم میاں نواز

نظر آئیں۔ یہ ایک رومانوی کہانی تھی، جس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ڈراما عمیرہ احمد کے ناول پر مبنی تھا۔ یہ 2012 میں ہم ٹی وی پر نشر ہوا۔ ناظرین میں بہت مقبول رہا۔ اس میں میکائل ذوالفقار نے مرکزی رول کیا۔ اب ماہرہ نے ایک بار پھر میزبانی کا تجربہ کرنے کا سوچا۔ وہ TUC The Lighter Side of Life میں نظر آیا۔ اس تجربے کو بہت سراہا گیا۔ اب وہ معروف ڈراما رائٹر خلیل الرحمان قمر کے ڈرامے ''صدقے تمہارے'' میں نظر آئیں۔ یہ ڈراما در حقیقت مصنف کی آپ بیتی بھی تھی۔ یہ ڈراما بھی بے پناہ مقبول ہوا۔ ہندوستان چینلو پر بھی اسے ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ اسی زمانے میں انہیں فرحان اختر کی جانب سے شاہ رخ کے مدمقابل ''رئیس'' میں کاسٹ کیا گیا۔ اس فلم کی وجہ سے کچھ عرصے پاکستانی نگری سے دور رہیں، مگر جب فلم کی ریلیز ملتوی ہوگئی تو وہ پھر انڈسٹری کی طرف لوٹ آئیں۔ انہوں نے ہمایوں سعید کے مدمقابل فلم ''بن روئے'' کی، جسے بعد میں ڈرامے کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اکتوبر 2016ء میں جب اس کی پہلی قسط ریلیز ہوئی، تو اسے حیران کن ردِعمل ملا۔ توقع کی جارہی ہے کہ یہ ڈراما بلاک بسٹر ثابت ہوگا۔

روشن آرا بیگم

کیسے کیسے ستارے تھے، کیسی چمک دمک تھی، کیا ان کی روشنی تھی، افسوس، سب کچھ وقت کی کائنات میں گم ہوگیا۔ وقت سب سے بڑی حقیقت ہے صاحب۔ پھر اس کا ایک سبب اور ٹھہرا۔ معروف شاعر اجمل سراج کا شعر ہے:

سن یہ رونا نہیں گرانی کا
یہ تو بے قیمتی کا رونا ہے

ہمارے ہاں ناقدری کی وبا عام ہے۔ نگینے پتھر ہوجاتے ہیں۔ سچے ستھرے لوگوں کو، حقیقی فن کاروں کو بھلادیا جاتا ہے، جعلی لوگ شہرت اور دولت کی مسند پر براجمان ہوئے۔ زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ کیا آرٹسٹ تھیں روشن آرا بیگم۔ کیسا دل کش انداز تھا، اپنے فن پر کتنی گرفت تھی۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ آج کی نسل کو خبر ہی نہیں کہ یہ نابغۂ روزگار گلوکارہ کون تھیں، ان کا فن کس پائے کا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب انہیں ملکۂ موسیقی کہہ کر پکارا جاتا۔ جب وہ آتیں، تو لوگ احتراماً کھڑے ہوجاتے۔ جب کبھی پرفارم کرتیں، تو لوگ سانس روک کر سنا کرتے اور اس میں اچنبھے کی کیا بات۔ کلاسیکی موسیقی کے فن پر انہیں خوب گرفت تھی۔ اس ہنر کی استاد تھیں۔ ان کا احترام لازمی تھا۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ ستارۂ امتیاز بھی ان کے حصے میں آیا۔ ان کی آواز نے ہمیں ''پیا جاؤ میں تو سے نا ہی بولوں''، ''ڈولے رے من ہولے ہولے''، ''نظریا تم ہی سے لگی''، ''دلیش کی پُر فضاؤں میں کہیں'' جیسے یادگار گیت دیے۔

کہتے ہیں، جب وہ کوئی راگ پیش کیا کرتی تھیں، تو پہلے اس کا الاپ کرتیں۔ اس دوران راگ کے مرکزی سُروں کو کھول

شریف نگران وزیر اعلیٰ رہے۔ 1988 کے انتخابات میں انہوں نے پنجاب سے کامیابی حاصل کی۔ 1990 میں اُنھوں نے بطور وزیر اعظم حلف اُٹھایا، مگر پانچ سالہ مدت پوری نہیں کرسکے۔ دوسری بار وہ ہیوی مینڈیٹ لے کر اقتدار میں آئے، مگر فوج سے ان کی نبھ نہیں سکی۔ پرویز مشرف نے انہیں برطرف کردیا۔ ایک عرصے جلاوطن رہنے کے بعد وہ وطن لوٹے۔ وکلا تحریک میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ 2013 الیکشن میں ان کی پارٹی نے ایک بار پھر بھرپور کامیابی حاصل کی اور اقتدار سنبھالا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کو دختر مشرق کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ذہین باپ کی وراثت سنبھالی، اس سلسلے کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ اپنی جان قربان کردی۔ بینظیر بھٹو 21 جون 1953 کو پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں گریجویشن کیا۔ اس زمانے میں وہ طلبا سیاست میں خاصی سرگرم رہیں۔ 1977 میں وطن لوٹیں۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد انہوں نے کئی صعوبتیں برداشت کیں۔ باپ کی پھانسی کے بعد مشکلات مزید بڑھ گئیں۔ وہ جلاوطن رہیں۔ مارشل لا ختم ہونے کے بعد پاکستان لوٹیں تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ 1988 میں پہلی بار اقتدار میں آئیں۔ فقط بیس ماہ بعد ان کی حکومت رخصت کردی گئی۔ 1993 میں یہ پارٹی پھر ابھر کر آئی۔ بینظیر پھر وزیر اعظم بن گئیں۔ مگر ایک بار پھر بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے ان کی حکومت کو برطرف کردیا گیا۔ اب انہوں نے خودساختہ جلاوطنی اختیار کرلی۔ 18 اکتوبر 2007 کو وہ پاکستان لوٹیں، مگر کراچی میں ان کے قافلے پر ایک ہولناک خودکش حملہ ہوا۔ اس حملے میں تو وہ بچ گئیں، مگر موت تعاقب میں تھی۔ 27 دسمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں انہیں قتل کردیا گیا۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی پاکستان کے چاروں صوبوں کو جوڑنے والی زنجیر ٹوٹ گئی۔

کر بیان کردیتی تھیں۔ یعنی الاپ ہی سے راگ کی شناخت سامنے آجاتی۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی خاصا متعلقہ ہے کہ ان کا تعلق کیرانا گھرانے سے تھا۔ یہ گھرانا الاپ گائیکی میں منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ماہرین موسیقی کے مطابق راگ کے دوران تان لگانا دشوار ہے، سانس پر گرفت ضروری، بڑی پختگی درکار۔ روشن آرا بیگم ایسی تان لگاتیں کہ لوگ جھوم اٹھتے۔ ان کی گائیکی کا انداز بہت سہل اور میٹھا تھا۔ ندی سی بہتی محسوس ہوتی۔

ان کے والد استاد عبدالحق خان چوب کار تھے۔ لکڑی پر نقش و نگار بناتے۔ ان کی خالہ عظمت النسا کا تعلق موسیقی کی دنیا سے تھا۔ وہ نوری بیگم کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ یاد رہے کہ برصغیر کے کئی خطوں میں موسیقی تہذیب اور تمدن کی علامت سمجھی جاتی ہے اور بنگال تو اس کا گہوارہ تھا۔ کلکتہ کی گلیوں میں خیال کی سرگم کا بسیرا تھا۔ ستار کے تار روشنی بکھیرتے تھے۔ سو وحید النسا کا اس سمت آنا حیران کن نہیں تھا۔ انہیں روشن آرا کا نام وارثی سلسلے کے ایک بزرگ حافظ پیاری صاحب نے دیا، جو اکثر ان کے والد سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے جب وحید النسا کو قرآن کی تلاوت کرتے سنا، تو کہا... تو وحید النسا نہیں، ارے تو روشن جہاں ہے۔ بس، اسی دن سے وہ روشن آرا ہوگئیں۔

1925 میں یہ گھرانا کلکتہ سے نکل کر پٹنہ میں جابسا۔ وہ علاقہ موسیقی کے لیے بڑا سازگار تھا۔ روشن آرا بیگم کو شوق بھی تھا۔ ریاض باقاعدہ سے کیا کرتی تھیں۔ کسی نے سنا، تو ان کے والد کو استاد عبدالکریم خان سے فیض حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ (کچھ کتابوں میں استاد عبدالکریم خان کو ان کا قریبی عزیز بھی لکھا گیا ہے)

معروف کالم نویس وجاہت مسعود اپنے مضمون ”روشن آرا بیگم، من ڈولے ہولے ہولے“ میں اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں:

”سولہ برس کی روشن آرا حضرت خواجہ شمس الدین کی درگاہ پر جا پہنچی۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد عبدالکریم خان نے روشن آرا پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیا۔ روشن آرا پانچ برس تک سنگیت کے ساگر سے موتی چنتی رہیں۔ 1937 میں استاد انتقال کرگئے مگر کیرانا گھرانے کی میراث روشن آرا کے ہاتھ رہی۔ کلا کا فیض ماہ و سال کی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ خود کہا کرتی تھیں کہ استاد کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے مگر جو کسی کو نہ مل سکا، وہ بھی روشن آرا کے حصے میں آیا۔“

وہ بڑی قابل شاگرد تھیں۔ سبق منٹوں میں یاد کرلیتیں۔ تیزی سے تمام مراحل طے کیے۔ پہلی ہی پرفارمنس سے دھاک

بٹھا دی۔ جلد کلکتہ کی نجی محفلوں میں ان کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ تان پورے کے ساتھ پرفارم کرتی تھیں۔ اردگرد زیادہ ساز نہیں ہوتے۔ ایک سارنگی نواز دوسرا طبلہ نواز۔ دوران پرفارمنس انہیں ہدایات بھی دیتی رہتیں۔ قدردانوں نے اس باصلاحیت فنکارہ کو خوب سراہا۔ سننے والوں نے تعریفوں کے پل باندھے۔ یوں دھیرے دھیرے ان کے نام کا چرچا ہونے لگا۔ خیال گائیکی میں انہوں نے اپنی منفرد شناخت بنائی۔ ان کی پہنچ دیگر بڑے ثقافتی مراکز تک پہنچی۔ وہ بمبئی منتقل ہو گئیں۔ اب وہ بمبئی والی روشن آرا بیگم کے نام سے معروف ہوئیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے ان کی آواز برصغیر کے کونے کونے تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت لاہور گانے بجانے کا بڑا مرکز تھا۔ تقسیم سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کے لیے وہ اکثر لاہور آیا کرتی تھیں۔ انہیں یہاں کی فضا اچھی لگی۔ لاہور میں انہوں نے کئی بڑی محافل میں پرفارم کیا۔ موچی گیٹ کے قریب محلہ پیر گیلانیاں میں چن پیر کے ڈیرے پر ان کی محفل سجائی جاتی تھی۔ 1945 میں ریلیز ہونے والی فلم ”نظر“ میں ان کی آواز سنائی دی پھر 1947 میں انہوں نے فلم ”جگنو“ کے گیت گائے۔

1948 میں وہ پاکستان چلی آئیں۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ ایک پولیس افسر چوہدری احمد خان سے شادی کر لی تھی۔ ان سے روشن آرا کی پہلی ملاقات دلی ریڈیو پر ہوئی تھی۔ احمد خان کا تعلق لالہ موسیٰ، ضلع گجرات سے تھا۔ روشن آرا بیگم لالہ موسیٰ منتقل ہو گئیں۔ وہ چھوٹا سا شہر تھا، بمبئی اور لاہور کے برعکس وہاں فضا خاموش تھی۔ قدردان بھی حالات کے جبر میں گم ہو گئے۔ کچھ عرصے وہ گوشہ نشیں رہیں۔ کسی کے اصرار پر پرفارم کرتی بھی تو سامعین کے ذوق موسیقی سے انہیں مایوسی ہوتی۔ ہاں، ریڈیو پاکستان سے تعلق قائم ہوا، تو حالات میں کچھ بہتری آئی۔ وہاں قابل لوگ تھے۔ پی ٹی وی آنے کے بعد جن فنکاروں نے اپنی آواز سے اِسے اعتماد بخشا، ان میں روشن آرا بیگم کا نام نمایاں تھا۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کے لیے باقاعدگی سے لاہور کا سفر کیا کرتیں۔ پہلی باقاعدہ تقریب، جس میں عوام نے روشن آرا بیگم کو سنا، وہ 1958 میں منعقد ہوئی۔ یعنی ان کے پاکستان آنے کے دس برس بعد۔ اتنے عرصے وہ گلوکارہ، جس نے ایک زمانے میں پورے ہندوستان میں اپنے فن کی دھاک بٹھا دی تھی... لگ بھگ خاموش رہی۔ پاکستانی فلموں میں بھی ان کی مدھر آواز سنائی دی، گو ان گیتوں کی تعداد زیادہ نہیں، مگر معیار بہت بلند ہے۔ ان گیتوں کی دھنیں نوشاد، فیروز نظامی اور تصدق حسین جیسے قدآور موسیقار ترتیب دیا کرتے تھے۔ ”قسمت“، ”بہادر“ اور ”نیلا پربت“ جیسی فلموں کے لیے انہوں نے خوبصورت اور یادگار گیت گائے۔ 6 دسمبر 1982 کو مختصر علالت کے بعد اس عظیم گلوکارہ کا انتقال ہوا۔ لالہ موسیٰ، ضلع گجرات میں ان کی تدفین ہوئی۔

ان کے انتقال کے بعد لاہور میں ان کے اعزاز میں تقریب ہوئی، تو فیض صاحب نے کہا تھا: ”روشن آرا بیگم گانے کے لیے پیدا ہوئی تھیں مگر ہم نے انہیں بھینسوں کی دیکھ بھال پر لگا دیا!“

ثقلین مشتاق

99ء ورلڈکپ سے قبل پاکستانی ٹیم نے ہندوستان کا دورہ کیا، تو کرکٹ کی گہری سمجھ رکھنے والے راشد لطیف نے اس دورہ کو ورلڈکپ سے بھی اہم ٹھہرایا تھا۔ پہلا ٹیسٹ 28 جنوری کو چنائی میں ہوا۔ بھارتی گھر کے شیر کہلاتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی ٹیم بھی مضبوط تھی، مگر پاکستانی بھی جذبے سے سرشار تھے۔ پہلی اننگز میں پاکستان نے بمشکل 238 رنز اسکور کیے۔ البتہ بالروں نے بڑی نپی تلی بولنگ کی۔ بھارتی ٹیم کو 254 پر ٹھکانے لگا دیا۔ اس اننگز میں آف اسپنر ثقلین مشتاق نے پانچ شکار کیے تھے۔ سچن ٹنڈولکر بھی ثقلین ہی کا شکار بنے، مگر یہ کہانی کا اختتام نہیں، بلکہ آغاز ہے... اگلی اننگز میں شاہد آفریدی نے 141 کی زبردست اننگز کھیلی۔ بھارت کو 271 کا ٹارگیٹ ملا۔ اوپر کے بلے باز جلدی پویلین لوٹ گئے۔ پاکستان کی گرفت مضبوط تھی۔ 82 پر 5 کھلاڑی آؤٹ ہو گئے تھے۔ مگر پھر سچن کا تجربہ اور مہارت آڑے آ گئی۔ لٹل ماسٹر اپنی صلاحیتوں کے عروج پر تھا۔ اس نے ایک زبردست سنچری بنائی۔ وکٹ کیپر بیٹسمین مونگیا نے بھرپور ساتھ دیا۔ پاکستان کے ہاتھ سے میچ نکلنے لگا۔ 218 کے اسکور پر وسیم اکرم نے آخر مونگیا کو اپنے جادو میں پھانس ہی لیا، مگر سچن رکنے والا نہیں تھا۔ جیت کے لیے فقط 17

بلڈ پریشر، نعمت سے زحمت تک

عمر میں اضافے، کچھ بیماریوں مثلاً ذیابیطس وغیرہ، موٹاپے اور ورزش نہ کرنے کی وجہ سے انسانی بلڈ پریشر معمول سے زیادہ بڑھا رہنے لگتا ہے۔ جب وہ مستقلاً ایک خاص حد سے زیادہ بڑھا رہے تو ہم کہتے ہیں کہ اسے ”ہائی بلڈ پریشر“ یا ”ہائپر ٹینشن“ کا مرض ہو گیا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں شریانیں تنگ نہیں ہوتیں تاہم ان کے اندر خون کے خلاف مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے جسے ختم کرنے کے لیے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ دل کا شدت سے دھڑکنا اور شریانوں میں مزاحمت، دونوں مل کر ہائی بلڈ پریشر کو جنم دیتے ہیں۔ انسانی جسم کے لیے آئیڈیل بلڈ پریشر کم و بیش 120/80 (اوپر والا 120 اور نیچے والا 80) ہے۔

رنز درکار تھے... شکست پاکستان کی سمت بڑھ رہی تھی... تب وسیم اکرم نے ثقلین کو گیند سونپی اور کاندھا تھپکا۔ ”اسے تم ہی آؤٹ کر سکتے ہو۔“

ثقلین کو خود پر اعتماد تھا۔ وہ اپنی جادوئی گیند ”دوسرا“ استعمال کرنے کی تیاری کر رہا تھا، گو سچن نے اس گیند پر چار چوکے رسید کیے تھے، مگر وہ ایک دلیر کھلاڑی تھا، اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی جادوئی گیند پھینکی۔ سچن کی خود اعتمادی اس کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوئی۔ گیند ہوا میں کھڑی ہو گئی۔ وسیم اکرم نے کیچ پکڑا، تو پورے گراؤنڈ میں... یک دم اداسی چھا گئی۔ فقط پاکستانی کھلاڑی پُرجوش تھے اور ایک دوسرے کے کاندھے تھپک رہے تھے۔ پھر جو ہوا، اس کی کسی کو اُمید نہیں تھی۔ وسیم اکرم کی دو گھومتی گیندوں نے دو بھارتی کھلاڑیوں کو پویلین بھیج دیا۔ آخری کھلاڑی کو ثقلین نے پھانس لیا۔ پاکستانی کھلاڑی چنائی کے گراؤنڈ میں سجدے میں گر گئے۔ ایک ناقابلِ یقین فتح ان کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ پرفارمنس اتنی شاندار تھی کہ چنائی کے وسیع القلب شہریوں نے کھڑے ہو کر داد دی۔ گو سچن ٹنڈولکر کو مین آف دی میچ قرار دیا گیا، مگر میچ میں دس وکٹیں لینے والے ثقلین کو کسی اعزاز کی ضرورت نہیں تھی... وہ اٹھارہ کروڑ عوام کے دل جیت چکا تھا۔

کرکٹ کی تاریخ میں مرلی دھرن کامیاب ترین آف اسپنر ہے، لیکن ثقلین مشتاق اپنی مثال آپ تھا۔ ایک فائٹر، ایک جینئس۔ اس کی ایجاد کردہ گیند ”دوسرا“ ایک انوکھا ہتھیار تھا، جس سے اُس نے کئی شکار کیے اور پاکستان کو ناممکن فتوحات دلائیں۔ انہیں مرلی دھرن پر ایک پہلو سے فوقیت بھی حاصل ہے۔ مرلی دھرن کا ایکشن متنازعہ تھا۔ ان پر کئی بار پابندی لگی۔ دوسری طرف ثقلین کا ایکشن مکمل تھا۔ اس کا دامن بھی ہر نوع کے تنازع سے پاک رہا۔ ثقلین نے 48 ٹیسٹ میچز میں 207 وکٹیں حاصل کیں۔ 164 رنز کے عوض 8 وکٹیں ان کی بہترین بولنگ رہی۔ انہوں نے 169 ون ڈے انٹرنیشنل کھیلے، جن میں انہوں نے 288 وکٹیں اپنے نام کیں۔ 20 رنز کے عوض 5 وکٹیں لینا ان کی بہترین کاوش رہی۔ ون ڈے میں ان کی اوسط 21.78 تھی، جو انتہائی متاثر کن ہے۔

ثقلین مشتاق 29 دسمبر 1976 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں کرکٹر بننے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ کرکٹ کے لیے سب کچھ تج دیا۔ خوب محنت کی۔ اس زمانے میں پاکستانی ٹیم میں اسپن کا شعبہ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ عبدالقادر اور توصیف احمد ریٹائر ہو چکے تھے۔ مشتاق احمد کی کارکردگی میں تسلسل نہیں تھا۔ ثقلین کا ساتھ ملنے کے بعد مشتاق بھی خاصے سنبھل گئے۔ دونوں گھاتک ہتھیار بن گئے۔ ایک طرف وسیم اور وقار ہوتے، دوسری طرف ثقلین اور مشتاق۔ ثقلین نے بہت جلد خود کو منوا لیا۔ ان کی مخصوص گیند جو پڑ کر باہر نکلتی تھی، انتہائی خطرناک تھی۔ وہ ٹیسٹ اور ون ڈے کا مستقل حصہ بن گئے۔ کپتان وسیم اکرم کو ان پر بھرپور اعتماد تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وسیم ہی کے زمانے میں ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ انہیں رنز روکنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ مسلسل سوچتے رہتے۔ اپنے انداز بدلتے۔ بلے باز کی سوچ پڑھنے میں جٹے رہتے اور اکثر فاتح ٹھہرتے۔ وہ آخر اوور میں بولنگ کرتے تھے۔ بعد میں جب سعید اجمل آخری اوورز میں بولنگ کرنے لگے، تب وہ ثقلین ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہوتے تھے۔

ٹیسٹ کرکٹ اور ون ڈے کرکٹ دونوں میں انہوں نے وکٹوں کی ڈبل سنچری مکمل کی۔ اگر وہ مسلسل کھیلتے رہتے تو جانے کتنے ریکارڈ بناتے۔ انہیں ٹیم سے الگ کرنا کرکٹ بورڈ کا ایک غلط فیصلہ تھا۔ ان میں بہت کرکٹ باقی تھی۔ بعد میں دنیا کے کئی ممالک نے ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ آج وہ ٹی وی پر بطور ایکسپرٹ دکھائی دیتے ہیں۔

فلم نگری

من موہنی آوازیں

انور فرہاد

وہ دونوں گلوکار اپنی محنت و جانفشانی سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ پاکستان کی فلمی صنعت انہیں بھلا نہیں سکتی۔ انہوں نے کس طرح جہد مسلسل کے ذریعے منزل حاصل کی یہ باتیں ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

پاکستانی فلم کے دو نامور گلوکاروں کا ذکر خاص

تصور کی آنکھ سے دیکھیں بلکہ یوں سمجھیں کہ اُس نے دنیا میں آنے کے بعد آنکھیں کھولیں تو اُسے ہر طرف روشنی نظر آئی اور مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کہاں آگیا ہے۔ اس نے گھبرا کر یہ پوچھنا چاہا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے۔ میں کہاں آگیا ہوں؟“ مگر اس کے منہ سے جو آواز نکلی وہ کچھ اور تھی۔ ہلکی سی...... باریک سی...... اسے جنم دینے والی ماں، اپنے سارے دکھ درد بھول کر مسکرا دی۔ اسے لگا جیسے نومولود رو

نہیں رہا ہے۔ گا رہا ہے۔ میٹھی سروں میں کوئی راگ الاپ رہا ہے۔

ماں...... ماں بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ جسے اس نے جنم دیا ہوتا ہے۔ پھر بھی اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ جنم جنم سے اسے جانتی ہے۔ پہچانتی ہے۔ اس کے دل میں اس کے لیے پیار کا ایسا چشمہ ابلنے لگتا ہے کہ وہ اس کے رونے کو بھی اس کا گانا سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی ہر بات...... ہر ادا اسے پیاری لگنے لگتی ہے۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا کہ کسی نے ایک ننھی منی سی، کلبلاتی اور بلبلاتی شے اس کے پہلو میں رکھ کر کہا۔ ”بچہ بھوکا ہے...... رو رہا ہے...... اسے دودھ پلاؤ۔“

اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی روتا رہے۔ اپنی مدھر آواز میں گاتا رہے اور وہ اس کی راگ راگنی کے سحر میں جھومتی رہے...... مگر ”وہ بھوکا ہے“ والی بات پر اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر سکی۔ اسے بہت آہستگی سے بہت دھیرے سے...... بہت پیار سے اپنے اور قریب کیا اور اس کا منہ اپنی چھاتی سے لگا دیا۔ ننھے گائیک کا گانا بند ہو گیا۔ رونا ختم ہو گیا۔

ماں کو لگا جیسے یہ ننھا منا جادوگر اسے اپنے ساتھ لے کر ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ اس کے منہ اور اس کے ننھے منے ہاتھوں کا لمس اس کے وجود کو وہ کیف و سرشاری بخش رہے تھے۔ جس سے وہ اب تک نا آشنا تھی۔ کچھ دیر بعد ننھے وجود کی طرف اس نے دیکھا وہ اب رو نہیں رہا تھا۔ گا نہیں رہا تھا، خاموش تھا۔

ماں نے اسے اپنے سے تھوڑا پرے کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ ”چلو اب تم سو جاؤ۔ اس نئی دنیا تک آنے میں...... یہاں تک کا سفر طے کرنے میں تم بھی تھک گئے ہو گے۔ اس لیے سو جاؤ۔ سونے سے تھکن دور ہو جاتی ہے۔“

جانے کیسے اس کا انگوٹھا اس کے منہ میں چلا گیا تھا اور جانے کیا سوچ کر اسے وہ چوسنے لگا تھا۔ اور سوچنے لگا تھا‘ تھوڑی دیر پہلے تک میں جہاں تھا یہ وہ جگہ تو نہیں۔ وہ تو کوئی چھوٹی سی تنگ سی اندھیری سی جگہ تھی جہاں میں سمٹا ہوا سکڑا ہوا رہتا تھا۔ تھوڑی بہت حرکت کر لیتا تھا مگر ہاتھ پیر مار نہیں سکتا تھا نہ ہی یہاں کی طرح لیے ہو کر لیٹ سکتا تھا۔ نہ ایک جگہ سے، دوسری جگہ جا سکتا تھا جس طرح یہاں کبھی کسی کے پاس ہوں تو کبھی کسی اور کے پاس۔ وہ کون سی جگہ تھی؟ اور یہ کون سی ہے؟ میں کس سے پوچھوں؟ کون بتائے گا مجھے؟ یہاں تو نہ کوئی میری بولی سمجھتا ہے نہ میں کسی کی بات سمجھتا ہوں۔ یہ جو میرے پاس لیٹی ہے ابھی کیا کچھ بول رہی تھی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ جو کوئی بھی ہے بہت اچھی ہے۔ اس کا قرب...... اس کا لمس...... کچھ عجیب ہی ہے۔

زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے کیونکہ وہ مجسم پہلی بار ہی تو نظر آتا ہے کیونکہ ابھی ابھی تو اس نے اسے اپنا انگوٹھا چوستے چوستے اور ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔ بہت دنوں تک اسے اس کے سوالوں کا جواب نہیں ملا تھا۔

اس کے روتے ہی جو سب سے پہلے اس کے پاس آتی تھی اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھاتی تھی۔ اس سے اس کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اسے بڑی اچھی لگنے لگی تھی۔ دوسرے لوگ بھی اسے گود میں لیتے تھے۔ پیار کرتے تھے مگر کسی دوسرے میں اس جیسی بات نہیں تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا۔ اس کی باتیں دوسرے سمجھنے لگے اور وہ دوسروں کی باتوں کا مطلب و مقصد سمجھنے لگا مگر اچھی طرح ان کی بولی بول نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس نے امی، ابو بولنا سیکھ لیا تھا۔ اب جب اسے بھوک لگتی تو وہ بھاگ کر امی کی گود میں سما جاتا۔

ماں بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ اپنے جگر کا خون اپنے جگر گوشوں کو پلاتی ہے۔ اپنے خون سے ان کی بھوک مٹاتی ہے اور اس بات پر فخر محسوس کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہ اس نے اسے اولاد جیسی نعمت سے نوازا اور اس کی پرورش کا شرف ادا کیا۔

اس ننھی سی جان کا نام اخلاق رکھا گیا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس سے سب کا پیار بڑھتا گیا۔ وہ خاصا بڑا ہو چکا تھا۔ اسکول جانے لگا۔ لکھنے پڑھنے لگا تھا۔ تب اسے اس کے سوالوں کا جواب آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگا۔

وہ جہاں پیدا ہوا تھا وہ ہندوستان کا نامی گرامی شہر دلی تھا۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور جیکب لائن کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ اخلاق احمد کا بچپن، لڑکپن اسی جیکب لائن کی گلیوں میں گزرا۔ اسی علاقے کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے اس نے 1965ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

اس کی ماں جو اس کے رونے کو بھی اس کا گانا سمجھتی تھی شاید اسی کا اثر تھا کہ اسے بچپن ہی سے گانے کا شوق پیدا ہو

گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ گانا اور رونا کسے نہیں آتا مگر حقیقت یہ ہے کہ گانا وہی ہوتا ہے جو سننے والوں کو بھلا لگے۔ سمع خراشی نہ ہو۔ اخلاق احمد نے جب گنگنانا اور پھر گانا شروع کیا تو اس کے ارد گرد موجود افراد اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔

جب وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے درمیان ہوتا تو دوست فرمائش کرتے۔ ”یار! کچھ گانا وانا سناؤ۔“

نام کا اثر یقیناً آدمی کی شخصیت پر بھی پڑتا ہے۔ اخلاق احمد کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا۔ وہ دوستوں کی خوشنودی کے لیے گانے لگتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کے نامور گلوکار محمد رفیع کا طوطی بولتا تھا اور اکثر شوقیہ گلوکار محمد رفیع کے گائے نغمات کو اپنے دوستوں کی محفلوں میں گایا کرتے تھے۔

اخلاق احمد بھی دوستوں کی فرمائش پر محمد رفیع کا کوئی مقبول گیت گا دیتا۔ دوست احباب جھومتے، واہ وا کے ڈونگرے لٹاتے۔ ”کیا آواز ہے تیری۔ کتنی مٹھاس ہے تیری آواز میں۔ کتنا درد ہے، کتنا سوز ہے۔“

ایسے میں کوئی دوست بول پڑتا۔ ”اللہ کرے تو آنے والے دنوں میں ایک بڑا سنگر بن جائے۔ محمد رفیع کی طرح تیرے گانے بھی مقبول عام ہوں۔ تیرا شہرہ بھی چار دانگ ہو۔“

اخلاق احمد شرما جاتا۔ ”کیوں میرا مذاق اڑا رہا ہے یار۔“

”مذاق نہیں...... یہ میرے دل کی دعا ہے۔“

”کہاں محمد رفیع...... کہاں میں...... اس جیسی مقبولیت تو بڑے بڑوں کو نصیب نہیں۔“

”بھولے بادشاہ! محمد رفیع کا تو محض حوالہ دیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تجھے بھی رب العزت ایک مقبول گلوکار بنا دے۔“

شاید یہ اس کے دوستوں کی دعاؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا ہی ثمر ہے کہ اللہ نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے ایک گلوکار کی حیثیت سے نہ صرف تسلیم کروایا بلکہ اپنے وقت کا ایک بے حد پسند کیا جانے والا گانے والے کی حیثیت سے اس کا لوہا منوایا۔

وقت کو گزرتے دیر نہیں لگتی۔ گزرنے والا وقت ذرے کو آفتاب بناتا جاتا ہے۔ وہی گلیوں اور محلوں کا گانے والا ایک دن ملک خداداد پاکستان کا ایک مایہ ناز سنگر بن گیا۔ اس کے گائے ہوئے ان گیتوں نے جو تاریخ مرتب کی اس کا اعتراف کون نہیں کرے گا۔

اخلاق احمد کی آواز میں مٹھاس کے ساتھ ساتھ اداسی کی کیفیت بھی پائی جاتی تھی۔ جو رومانوی گیتوں کے لیے بے حد موزوں ہوتی ہے۔ وہ گائیکی کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے اور اس کا بہترین ادراک بھی رکھتے تھے۔

یہ بات ہر شخص کو پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عزت، شہرت اور مقبولیت کسی بھی شخص کو یونہی نہیں ملتی۔ اس کے لیے لگن، محنت اور جدوجہد لازمی ہوتی ہے۔ اخلاق احمد کو بھی شہرت و مقبولیت کے فرش سے عرش تک پہنچنے میں پتا پانی کرنا پڑا۔ ایک ایک زینہ اوپر چڑھنے کے لیے جان توڑ کوشش کرنی پڑی۔ گلوکاری کے شوق اور دوستوں کی حوصلہ افزائی نے اخلاق احمد کو ریڈیو اور ٹیلی وژن تک جانے پر مجبور کیا۔ اس کی آواز چونکہ خداداد تھی۔ دونوں جگہ اسے مایوسی نہیں ہوئی اور گانے کے مواقع ملتے رہے۔ جس طرح خوشبو کو پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ چاند کی چاندنی کو روشنی کا دیا جلانے سے کوئی رکاوٹ نہیں بنتا۔ اسی طرح بالکل اسی طرح اخلاق احمد کی دل کو چھو لینے والی آواز کو بھی آگے بڑھنے اور اپنا جادو جگانے سے کوئی روک نہیں سکا اور یہ 1972ء کے اوائل کی بات ہے کراچی کے ہدایت کار یوسف نصر نے جب اپنی فلم ”تم سا نہیں دیکھا“ شروع کی تو اس کی موسیقی کے لیے ریڈیو پاکستان کے معروف موسیقار امیر احمد خان کی خدمات حاصل کیں۔ امیر احمد خان نے ریڈیو سے اخلاق احمد کی آواز میں کئی گانے نشر کیے تھے۔ امیر احمد خان موسیقی کے نامور استاد امراؤ بندو خان کے بھانجے تھے۔ بعد میں وہ استاد امراؤ بندو خان کے داماد بھی بنے۔ ہدایت کار یوسف نصر نے اپنی فلم ”تم سا نہیں دیکھا“ کے لیے امیر احمد خان کو موسیقار کے طور پر متعارف کرایا تو استاد نے اپنے قریبی دوستوں کو بھی اس فلم میں استعمال کیا۔ مثلاً یونس ہمدم سے کچھ گانے لکھوائے اور اخلاق احمد کی آواز میں دو گانے ریکارڈ کیے۔ یونس ہمدم کے لکھے دو گانے یہ تھے۔

☆ آپ سے پیار کا اظہار بڑا مشکل ہے۔

☆ اک بے وفا سے ہم نے بھلا پیار کیوں کیا۔ میں بے وفا نہیں ہوں، زمانہ ہے بے وفا۔

یہ دونوں گیت اخلاق احمد کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے۔ دوسرا گیت ڈوئیٹ تھا جو اخلاق احمد نے اسماء احمد کے ہمراہ گایا تھا۔ اسماء احمد جو ٹی وی گلوکارہ افشاں احمد کی والدہ ہیں۔ یونس ہمدم صحافی تھے۔ شاعر تھے اس ناتے انہوں نے

فلموں کے لیے نغمہ نگاری بھی کی۔

یونس ہمدم اور اخلاق احمد دونوں کی یہ پہلی فلم تھی۔ مگر اس فلم سے دونوں کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ سست روی سے بننے والی فلم 1974ء میں ریلیز ہوسکی اور باکس آفس پر بری طرح ناکام ہوگئی۔

اداکار ندیم بیگ اور ان کے سسر کیپٹن احتشام نے لاہور میں ''مٹی کے پتلے'' کے نام سے فلم بنائی تو اس کا تھیم سانگ ''یہ ٹوٹے کھلونے یہ مٹی کے پتلے یہ بھی تو انسان ہیں'' اخلاق احمد سے گوایا اس کے موسیقار مصلح الدین تھے۔ ''مٹی کے پتلے'' احتشام کی بنگالی زبان کی فلم ''ماٹیر پوتل'' اردو زبان میں ری میک تھی۔ ''مٹی کے پتلے'' کسی حد تک نیم کلاسیکی فلم تھی۔ اس لیے اپنے موضوع کے لحاظ سے تو پسند کی گئی مگر باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔

اسی دوران کراچی کے موسیقار لعل محمد اقبال نے فلم ''پازیب'' کے لیے اخلاق احمد کی آواز میں کچھ گانے ریکارڈ کیے۔ جب کہ ندیم کے دوست نجمی صدیقی نے بطور فلمساز ''بادل اور بجلی'' شروع کی تو اس میں بھی اخلاق احمد کو گلوکاری کا چانس ملا۔

مٹی کے پتلے، پازیب، بادل اور بجلی کے ہیرو ندیم تھے۔ ان فلموں میں ہدایت کار رفیق علی راکھن کی فلم ''پازیب'' 22 دسمبر 1972ء کو نمائش پذیر ہوئی اور اخلاق احمد کی پہلی فلم جس میں انہوں نے پلے بیک سنگر کی حیثیت سے گایا ریلیز شدہ پہلی فلم قرار پائی۔ ''پازیب'' میں اخلاق احمد کا گایا ہوا یہ نغمہ ''او ماما میرے، چاچا میرے، تایا میرے، میرے بھائی'' اداکار قوی خان پر فلمبند ہوا تھا۔

اخلاق احمد کی ریلیز ہونے والی دوسری فلم ''بادل اور بجلی'' 1973ء میں پیش کی گئی جس کے لیے سہیل رعنا کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں اخلاق احمد نے جو گیت گایا اور جو ندیم پر پکچرائز ہوا یہ تھا۔

''بھٹکے قدم، انجانی راہیں میری منزل ہے نہ جہاں''

اخلاق احمد کی ریلیز ہونے والی تیسری فلم ''مٹی کے پتلے'' تھی جس میں اس کا گایا ہوا تھیم سانگ

''یہ ٹوٹے کھلونے یہ مٹی کے پتلے یہ بھی تو انسان ہیں''

بیک گراؤنڈ میں ایکسٹراز پر فلمایا گیا تھا۔

اخلاق احمد کی چوتھی فلم رنگیلا کی ''صبح کا تارہ'' تھی جس میں روبینہ بدر کے ہمراہ اس نے ڈوئیٹ میں رنگیلا کے لیے پلے بیک دیا تھا۔ ''مٹی کے پتلے'' اور ''صبح کا تارہ'' 1974ء میں منظر عام پر آئی تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''صبح کا تارہ'' نے کسی حد تک کامیابی حاصل کی تھی، باقی فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ کامیابی کے لحاظ سے اخلاق احمد کی پہلی فلم ''چاہت'' تھی۔ یہ فلم نہ صرف سپر ہٹ ثابت ہوئی بلکہ اس کا اس فلم کا گایا نغمہ ''ساون آئے ساون جائے'' شہرۂ آفاق ثابت ہوا اور اس کے ذریعے اخلاق احمد پہلی بار پبلک کی چاہت سے آشنا ہوئے۔ رحمٰن اس فلم کے فلمساز و ہدایت کار تھے۔ روبن گھوش موسیقار اور اختر یوسف نغمہ نگار۔ اس فلم نے اخلاق احمد کے لیے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے دروازے کھول دیے۔ موسیقاروں نے اس کی آواز کی جادوگری سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ روبن گھوش کے علاوہ جس نے ''ساون آئے ساون جائے'' کی کمپوزیشن کی تھی یعنی نثار بزمی، ایم اشرف اور کمال احمد انہوں نے بھی اخلاق احمد کی آواز میں شاندار نغمات تخلیق کیے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رحمٰن کے ایک شریک فنانسر ''چاہت'' کے تمام نغمے مہدی حسن کی آواز میں ریکارڈ کروانا چاہتے تھے مگر اپنے وقت کے جینئس موسیقار روبن گھوش نے ان کو بتایا۔ ''جناب اونچے سروں میں جو نغمہ اخلاق احمد گا سکتا ہے۔ وہ مہدی حسن نہیں گا سکتے اور جو نغمہ مہدی حسن گا سکتے ہیں وہ اخلاق احمد نہیں گا سکتا۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً دو شر میلے نین۔ روبن گھوش نے انہیں یقین دلایا۔ اخلاق احمد ایسا نغمہ کبھی نہیں گا سکے گا۔''

رحمان کے شریک فنانسر روبن گھوش کی اس دلیل کے بعد قائل ہوئے اور روبن گھوش کو ''ساون آئے ساون جائے'' اخلاق احمد سے گوانے کی اجازت دے دی اور یہ نغمہ نہ صرف فلم کی کامیابی کا بہت بڑا سہارا بنا بلکہ اخلاق احمد کا شہرۂ آفاق نغمہ ثابت ہوا۔

بات راستہ بنانے کی ہوتی ہے۔ دشوار، کٹھن اور اندھیروں میں سے گزر کر راستے کو سفر کے مطابق بنانا کسی ایک باہمت کا کام ہوتا ہے۔ پھر جب راستہ بن جاتا ہے تو دوسرے بھی اس پر چل کر اپنی منزلوں کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخلاق احمد کی طلسمی آواز کی دریافت روبن گھوش نے کی تو تقریباً سب ہی موسیقاروں نے اس سنہری آواز سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مصلح الدین، لعل محمد اقبال، ناشاد، خلیل احمد، نثار بزمی، ماسٹر رفیق، کمال احمد،

سہیل رعنا، ایم اشرف، وجاہت عطرے، امجد بوبی، ایس سی، چندر موہن، بیلی رام، آئی اے ربانی، ایم ارشد، نیاز احمد، طافو، نذیر علی اور اے حمید کے نام یاد آرہے ہیں جنھوں نے اخلاق احمد کی جادوئی آواز سے اپنے نغموں اور اپنی فلموں کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ متذکرہ موسیقاروں کی دھنوں پر تیار نغموں میں سے چند ایک گیت کا حوالہ دوں گا جو اخلاق احمد کے ناقابلِ فراموش نغمے ثابت ہوئے۔

☆کبھی خواہشوں نے لوٹا، کبھی بے بسی نے مارا۔ گلہ موت سے نہیں ہمیں زندگی نے مارا (فلم مہربانی۔ موسیقار ایم اشرف)۔

☆سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا (فلم بندش۔ موسیقار روبن گھوش)۔

☆اے دل اپنا درد چھپا کر۔ گیت خوشی کے گائے جا (فلم پہچان، موسیقار نثار بزمی)۔

☆یہی ہے پیارے زندگی۔ کبھی ملے غم کبھی خوشی (فلم پرنس موسیقار کمال احمد)۔

یہ اور ایسے کئی گانے گا کر اخلاق احمد نے گائیکی کی دنیا میں اپنے آپ کو نہ صرف منوایا بلکہ ایسے امر گیت گا کر خود بھی امر ہو گیا۔

فلمی پنڈتوں کا خیال ہے کہ اخلاق احمد کی آواز ندیم کی آواز سے بہت میل کھاتی ہے اس لیے ندیم پر اخلاق احمد کا گایا ہوا ہر گانا بہت بھلا لگتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دیگر فنکاروں پر پکچرائز ہونے والے اخلاق احمد کے گانے بھی بہت جچے اور شائقین فلم نے انہیں پسند کیا۔ ملاحظہ کیجیے ستاروں کی حسین کہکشاں کے سنگ، اخلاق احمد کی دلنشیں و دلنواز گیتوں کے رنگ۔

☆دیکھو یہ کون آگیا۔ بن کے نشہ چھا گیا۔ (فلم دو ساتھی۔ اداکار رحمٰن پر پکچرائز ہوا)۔

☆ہم کو کس کے غم نے مارا یہ کہانی پھر سہی۔ کس نے توڑا دل ہمارا یہ کہانی پھر سہی (فلم بسیرا ندیم پر فلم بند ہوا)۔

☆ساتھی میرے بن تیرے۔ کیسے بیتے گی عمریا بن تیرے (فلم زبیدہ وحید مراد پر فلم بند ہوا)۔

☆تقدیر کے ہاتھوں کھلونا ہے آدمی۔ دنیا ہے تماشائی (فلم آدمی محمد علی پر پکچرائز ہوا)۔

☆میں ہوں راستے کا پتھر۔ میرا نصیب ٹھوکر (فلم راستے کا پتھر سلطان راہی پر عکس بند ہوا)۔

☆لوٹا قرار میرے من کا۔ ہائے رے ہائے مس لنکا

بشیر احمد کے سدابہار گیتوں کی مالا کے کچھ پھولوں کا تحفہ

☆گلشن میں بہاروں میں تو ہے۔ ان شوخ نظاروں میں تو ہے۔

☆ہم چلے چھوڑ کر تیری محفل صنم۔ دل کہیں نہ کہیں تو بہل جائے۔ جب مرے دل میں ہے پیار کی آرزو۔ مجھ کو کوئی نہ کوئی تو اپنائے گا۔

☆میرا دل نہ جانے کب سے۔ ترا پیار ڈھونڈتا ہے۔

☆یہ موسم یہ مست نظارے۔ پیار کرو تو ان سے کرو۔

☆جب تم اکیلے ہوگے۔ ہم یاد آئیں گے۔ دن رات آہیں بھروگے ہم یاد آئیں گے۔

☆چل دیئے تم جو دل توڑ کر۔ یوں اکیلا مجھے چھوڑ کر۔ زندگی کے ہر اک موڑ پر۔ ہمیشہ تمہیں میری کمی محسوس ہوگی۔

☆تم جو ملے، پیار ملا دل کو قرار آگیا۔ اجڑے ہوئے گلشن میں جیسے نکھار آگیا۔

☆جب تصور کسی تصویر میں ڈھل جاتا ہے۔ جانے کیا کیا مجھے اس وقت خیال آتا ہے۔

☆اے بہارو اے شوخ نظارو۔ کیا یہ سچ ہے مجھے ان سے پیار ہے۔

☆دن رات خیالوں میں تجھے پیار کروں گا۔ پر نام ترا لے کے نہ بدنام کروں گا۔

☆جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔

☆آؤ چلیں ہم دونوں کسی دور گگن کی چھاؤں میں۔

☆آپ نے حضور کیا نشہ پلا دیا۔ میں تو ڈوب چلا مستی بھری آنکھوں میں۔

☆محبت کی وفا کی پیار کی توہین کی تو نے۔ ہنسی ہونٹوں کی خوشیاں دل کی ظالم چھین لی تو نے۔

☆جا دیکھا پیار تیرا۔ خوشیوں کے گیت چھنے۔ لوٹا قرار میرا۔

☆تم سلامت رہو مسکراؤ ہنسو۔ میں تمہارے لیے گیت گاتا رہوں۔

(فلم نادانی کا یہ گیت اداکار فیصل پر صدابند کیا گیا)۔
☆ یہ دل ہے سوہنے دلدار کا۔ پیاسا ہے پیار کا (فلم نکاح احسن خان پر پکچرائز ہوا)۔
☆ کیسے جیئیں تیرے بن۔ کیسے کٹیں رات دن (فلم گھونگھٹ اربازخان پر فلمبند کیا گیا)۔

یہ اور ایسے کئی گیت ہیں جو جن پر بھی پکچرائز کیے گئے ان پر بھلے لگے۔ یہ خوبی بھی عطیہ خداوندی ہے۔ تمام گانے والوں میں یہ خصوصیت موجود نہیں ہوتی۔ اللہ رب العزت نے اخلاق احمد کو جہاں ایسی دل موہ لینے والی آواز سے نوازا تھا وہاں ایسی اضافی خوبیاں بھی دی تھیں۔

موسیقار اپنی کمپوزیشن میں جن گانے والوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں ان میں صرف ان کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ فلم کے ہدایت کار کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ اکثر ہدایت کار موسیقار کو اپنی پسند کے گلوکار یا گلوکارہ سے گوانے کو کہتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر جائزہ لیا جائے تو پاکستانی فلمی صنعت کے تقریباً سارے ہی نامور ہدایت کاروں کی فلموں میں اخلاق احمد کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ انمول آواز کا جادوگر سارے ہدایت کاروں کا پسندیدہ گلوکار تھا۔ حسن طارق، شباب کیرانوی، ظفر شباب، نذر شباب، سید سلیمان، نذرالاسلام، احتشام، اسلم ڈار، محمد جاوید فاضل، پرویز ملک، رحمان، خالد خورشید، سنگیتا، شمیم آراء، اقبال یوسف، جان محمد، حسن عسکری، اقبال اختر، ایم اے رشید، مسعود پرویز، الطاف حسین وغیرہ کا پسندیدہ گلوکار کوئی عام گائیک نہیں ہوسکتا۔ یہ اعزاز چند ایک ہی گانے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اخلاق احمد نے بہت مختصر مدت میں یہ مقام حاصل کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ پیدائشی فنکار تھا۔ اس کی ماں جو اس کے رونے کو بھی اس کا گانا سمجھتی تھی شاید یہ قدرت کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ یہ بچہ آنے والے دنوں میں بہت بڑا گانے والا بنے گا۔ اپنی جادواثر آواز سے ایک عالم کو متاثر کرے گا۔

واضح رہے کہ فلم والے ہر دور میں چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ جن کے سر پر عوامی مقبولیت کا تاج دیکھتے ہیں اس کی شہرت اور مقبولیت سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چاہت کی عوامی چاہت کے بعد جب اخلاق احمد کے جوہر کھل کر سامنے آنے لگے تو فلم سازوں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں نے اس کی شہرت اور مقبولیت کو کیش کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

جن دنوں وہ بیمار تھا اور اکثر الیاس رشیدی سے ملنے نگار کے دفتر آیا کرتا تھا انہی دنوں کی بات ہے ایک دن میں نے اخلاق احمد سے سوال کیا۔ ''یار! یہ تو بتاؤ تمہیں سپر گلوکار بنانے میں کس کا کردار اہم ہے؟ تمہاری شعلہ سی لپکتی ہوئی آواز یا بہترین میوزک کمپوزیشن یا بہترین شاعری۔''

اس نے میری طرف دیکھا مسکرایا اور کہا۔ ''انور فرہاد صاحب! جب اچھی آواز کو اچھی میوزک کمپوزیشن اور اچھی شاعری کا سپورٹ اور سہارا ملتا ہے تو ایک اچھا، ایک سپرہٹ گانا یا گیت تخلیق ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہوا تم اپنی انمول اور جادوئی آواز کو کوئی کریڈٹ نہیں دیتے؟''

''میں نے عرض کیا نا۔'' میری آواز یا کسی کی بھی آواز کتنی بھی اچھی ہو۔ جب تک اسے اچھی موسیقی اور اچھی شاعری نصیب نہ ہو کوئی اچھا بڑا اور سپرہٹ سانگ وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر سارا کریڈٹ آواز کا ہوتا تو میرے سارے گیت سپرہٹ ہوتے جب کہ میرے ایسے گانوں کی تعداد بھی بہت ہے جو عام لوگوں ہی کو نہیں مجھے بھی یاد نہیں۔

بڑے لوگ بڑے ظرف کے مالک ہوتے ہیں۔ اخلاق احمد بھی بلاشبہ پاک فلم انڈسٹری کا بہت بڑا گائیک تھا۔ اس نے اپنی کامیابی کا سارا کریڈٹ اپنی آواز کو نہیں دیا۔ موسیقی اور شاعری کو بھی اہمیت دی۔ اس کے لیے اس دور کے تقریباً تمام ہی بڑے شاعروں نے گیت اور گانے لکھے، جن میں قتیل شفائی، سیف الدین سیف، مسرور بارہ بنکوی، عبیداللہ علیم، تسلیم فاضلی، ریاض الرحمٰن ساغر، سرور انور، فیاض ہاشمی، شیون رضوی، کلیم عثمانی، سعید گیلانی، خواجہ پرویز، اختر یوسف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی ہی شاعری میں جب جب اور جہاں جہاں اچھی موسیقی نے اس کی آواز کا ساتھ دیا سپرہٹ گانے وجود میں آئے۔

اخلاق احمد نے ایک محتاط اندازے کے مطابق کم و بیش سو فلموں کے لیے لگ بھگ ڈیڑھ سو گیت ریکارڈ کرائے جن میں اردو کے علاوہ کچھ پنجابی فلموں اور ایک سندھی فلم کے لیے بھی گایا۔

گیتوں کی بات چلی تو اخلاق احمد کو ان کی بہترین گائیکی پر ملنے والے ایوارڈز کا ذکر بھی لازمی ہو جاتا ہے۔

1974ء میں جب اخلاق احمد نے ''چاہت'' کے لیے ساون آئے ساون جائے جیسا گیت گا کر اپنی بہترین گائیکی

کا ثبوت دیا اس سال مہدی حسن کو فلم ”شرافت“ میں بہترین گلوکاری کا نگار ایوارڈ دیا گیا مگر جیوری نے فیصلہ کیا کہ اخلاق احمد کو بھی اعزاز دیا جائے۔ لہٰذا اسے خصوصی نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اخلاق احمد نے فلم ”چاہت“ کے علاوہ

فلم ”بندش“ (سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا)۔

فلم ”مہربانی“ (تو ہے زندگی، میں امنگ ہوں)

فلم ”نادانی“ (لوٹا قرار میرے من کا، ہائے رے ہائے مس لنکا)

فلم ”دوریاں“ (بس ایک تیرا میرا)

فلم ”قاتل کی تلاش“ (تیرے بنا میرا دل نہیں لگتا)

فلم ”کندن“ (کھلونے تیری زندگی کیا)

فلم ”بلندی“ (آخری سانس تک چاہوں گا میں تجھے)

کے لیے نگار ایوارڈز حاصل کیے۔

اخلاق احمد کو نیشنل فلم ایوارڈ بھی ملا اور اس کے ساتھ 25 ہزار روپے کا چیک بھی۔ فلم تھی ”کندن“ جس کے بول تھے ”کھلونے تیری زندگی کیا“۔

اخلاق احمد کی پنجابی اور سندھی فلموں کے ضمن میں یہ بتاتا چلوں کہ اس کی پہلی پنجابی فلم ”فرض تے اولاد“ 1975ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی موسیقی ماسٹر رفیق علی نے ترتیب دی تھی۔ دوسری پنجابی فلم ہدایت کار ارشد مرزا کی ”باغی تے فرنگی“ تھی جو 1976ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے ایک نغمے میں اخلاق احمد نے مسعود رانا کا ساتھ دیا تھا۔ 1979ء میں ریلیز ہونے والی اخلاق احمد کی پنجابی فلم ہدایت کار امتیاز قریشی کی ”پرمٹ“ تھی جس میں اخلاق احمد نے اے نیّر کی ہمنوائی میں ایک گانا ریکارڈ کرایا تھا۔ ”بھلکے بٹیرے“ 1985ء میں ریلیز ہونے والی فلم پنجابی زبان کی تھی۔ اسی سال پنجابی فلم ”بارش“ بھی ریلیز ہوئی جس میں اخلاق احمد نے اے نیّر، رجب علی اور مہناز کے ساتھ یہ نغمہ گایا تھا۔ ”دکھ سکھ دے وچ نال رہو ایک دوجے نوں پیار کرو۔“ جب کہ ایور نیو پکچرز کی ڈبل ورژن فلم ”انٹرنیشنل گوریلے“ میں اخلاق احمد نے نور جہاں کے ساتھ گلوکاری کی۔ یہ فلم 1990ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اخلاق احمد کی سندھی فلم کا نام ”پوتی ایں پگ“ (دوپٹا اور پگڑی) تھا۔ 1986ء میں ریلیز ہونے والی یہ سندھی فلم محبوب عالم کی تھی۔ اس فلم کے لیے اخلاق احمد نے وجاہت عطرے کی موسیقی میں یہ گیت گائے۔

☆ دل توں ساں لگی وئی بجن موں کی رٹھیں وئی (ہمراہ مہناز)

☆ موھنجا دلدار بہادر (ہمراہ مہناز اور افشاں بٹ)

لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اخلاق احمد اپنے گھرانے کے واحد فرد تھے جو شوبز کی دنیا میں آئے۔ انہوں نے شوقیہ گلوکار کے طور پر کیریئر کی ابتداء کی تھی۔ شروع میں انہوں نے کراچی میں اقبال قریشی سے موسیقی کی شدھ بدھ حاصل کی تھی پھر لاہور جا کر استاد امانت علی خان کے شاگرد بن گئے تھے۔ وہاں ان کا ریکارڈ ہونے والا پہلا نغمہ موسیقار اختر حسین اکھیاں نے ریکارڈ کیا۔ اس کے شاعر قتیل شفائی تھے۔ اس کے بول تھے۔

”دینے والے میں تیرے در کا سوالی ہوں“

1987ء کی ایک فلم تھی ”کندن“ اس کے لیے کمال احمد نے موسیقی کی دھن کمپوز کی تھی جب کہ اخلاق احمد نے خواجہ پرویز کا لکھا ہوا یہ نغمہ بڑے چاؤ سے گایا تھا۔

☆ کھلونے تیری زندگی کیا۔ آخر ٹوٹ ہی جائے گا۔

کسے معلوم تھا کہ یہ اثر انگیز نغمہ اخلاق احمد کی زندگی کی عکاسی کرے گا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ بھری جوانی اور کیریئر کے عروج میں اس سورج کو گرہن لگ گیا۔

ایک موذی مرض اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ وہ خون کے سرطان میں مبتلا ہو گیا۔ یہ سن 1985ء کا منحوس سال تھا۔ اس کی اہلیہ جو قومی ایئر لائن میں ملازمت کرتی تھی اسے علاج کے لیے لندن لے گئی مگر اس مرض کا علاج بہت مہنگا تھا جو کچھ جمع پونجی دونوں میاں بیوی کے پاس تھی جلد ہی ختم ہو گئی۔ ایسے میں ایک شخص جو فلمی صنعت و تجارت کا ہی نہیں، تمام فلم والوں کا بھی خیر خواہ تھا وہ الیاس رشیدی تھا۔ اس نے اپنے اخبار نگار کے ذریعے اس جواں سال اور بے مثال گلوکار کی زندگی بچانے کے لیے ہر سطح کے لوگوں اور حکومت سے اپیل کرنا شروع کی جس کا رسپونس حوصلہ افزا تھا۔ فلم والوں نے لاہور کے الحمرا ہال میں ایک چیریٹی شو کا انعقاد کیا جس سے کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے جمع ہوئے جب کہ ملکہ ترنم میڈم نور جہاں نے اپنی طرف سے ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا۔ حکومت کی طرف سے بھی کچھ مدد ملی اور اخلاق احمد کا دوبارہ علاج شروع ہو گیا۔ اس دوران اخلاق احمد کے ایک دوست محمد ایوب نے بھی خوب دوستی نبھائی اور

اخلاق احمد کے علاج کے لیے بڑی دوڑ بھاگ کی۔ بڑا مالی تعاون حاصل کیا یہاں تک کہ اخلاق احمد کی زندگی میں ہی اس مہربان دوست کا انتقال ہو گیا۔ 1988ء میں اخلاق احمد کو فلم ''کندن'' کے نغمے ''کھلونے تیری زندگی ہے کیا'' پر بہترین گلوکار کے طور پر نیشنل ایوارڈ 25 ہزار روپے کے چیک کے ساتھ ملا جب کہ میڈم نور جہاں نے بھی اپنے ایوارڈ کے ساتھ ملنے والی رقم اخلاق احمد کے علاج کے لیے دے دی۔

بیماری کے باوجود باہمت اخلاق احمد گاہے بگاہے گاتا بھی رہا۔ یہ فلمی گیت ''اے دل اپنا درد چھپا کر گیت خوشی کے گائے جا''۔ یہ گیت جو اس نے گایا تھا اس کے اس حال کی عکاسی کرتا رہا۔ چودہ برس تک اس کا علاج جاری رہا۔ اس کو اس خونی کینسر سے بچانے کی جنگ جاری رہی لیکن آخرکار موت جیت گئی۔ زندگی ہار گئی۔ بلڈ کینسر نے شعلہ سی لپکتی ہوئی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ یہ 4 اگست 1999ء کی منحوس گھڑی تھی اور بدھ کا دن تھا۔ ایک عالم کو اپنی آواز کے سحر میں گم کر دینے والا اس عالم ناپائیدار سے افق کے اس پار جا کر گم ہو گیا۔ اسے لندن ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔

جو لوگ اپنی زندگی میں کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں وہ مر کر بھی نہیں مرتے۔ ان کا نام انہیں ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔ اخلاق احمد بھی اپنے گیتوں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ اس کی زندگی ہی میں اسے پاکستانی فلمی صنعت کے ٹاپ ٹین سنگر میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اخلاق احمد کا بیٹا آفاق احمد اب جوان ہو چکا ہے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ باپ کی طرح گلوکاری میں وہ بھی کچھ کر دکھائے گا مگر اسے سرے سے گانے بجانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اخلاق احمد کے ہم عصر گلوکاروں میں ایک گلوکار بشیر احمد بھی تھا جو اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کی بھی فنی رہنمائی اپنے وقت کے انمول موسیقار روبن گھوش نے کی۔ اخلاق احمد کو گانے کا پہلا موقع تو روبن گھوش نے نہیں دیا تھا مگر اسے مقبول گانے والا بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا جب کہ بشیر احمد کو روبن گھوش نے بطور گلوکار متعارف کرایا اور موسیقی کے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ اخلاق احمد نے کراچی میں شوقیہ گانے والے کی حیثیت سے اپنے فنی کیریئر کی ابتداء کی تھی۔ بشیر احمد نے بھی کلکتہ اور پھر ڈھاکا میں اپنی نوعمری کے زمانے سے شوقیہ گلوکاری کی ابتداء کی تھی۔ دونوں کے خاندان میں ان سے پہلے کسی کو گانے بجانے کا شوق نہیں تھا۔ دونوں میں ان مماثلت کے باوجود یہ نمایاں فرق تھا کہ اخلاق احمد ایک بھولا بھالا اور سیدھا سادا انسان تھا جب کہ بشیر احمد بڑا چالاک اور چلتا پرزہ نوجوان تھا۔ اخلاق احمد نے ابتداء ہی سے اپنی آواز کو اپنا رہنما، رہبر بنایا اور اپنے بڑوں اور سینئرز کی سپورٹ سے اپنی ترقی کی راہیں تلاش کیں۔ بشیر احمد نے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے محض اپنی آواز پر بھروسا نہیں کیا۔ نغمہ نگاری کی فیلڈ میں بھی قدم رکھ دیا اور موقع ملتے ہی فلموں کی موسیقی بھی ترتیب دینی شروع کر دی اور ان سب کے لیے غلط اور صحیح ہر طریقہ اپنایا۔ ترقی کی منزل کی طرف قدم بڑھانا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا بری بات نہیں لیکن اس کوشش میں غلط روش پر چل پڑنا بری بات ہے۔ بشیر احمد نے جب جب اور جہاں جہاں محسوس کیا کہ اسے آگے بڑھنے کے لیے کوئی نامناسب قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، اس نے بے دھڑک اس کا ارتکاب کیا۔ جھوٹ بولا۔ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی۔ جب کلکتے میں تھا اور اس کی صغیرسنی کا دور تھا تو پہلے وہ اپنے دوستوں اور ہم عمر لڑکوں کو اپنی آواز سے محظوظ کرنے کی کوشش کرتا پھر جب اسے چھوٹی موٹی تقریبات اور محفلوں میں گانے کا موقع ملتا تو وہ شوقیہ فن کا مظاہرہ کرتا۔ جب ڈھاکے آیا تو یہاں بھی اس کی شوقیہ فنکاری جاری رہی۔ جب جہاں موقع ملا گا کر اپنی تسکین کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی تفریح کا ذریعہ بنا مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا سازشی ذہن اس سے جائز اور ناجائز جرائم کا ارتکاب کراتا رہا۔

اس کی آواز اچھی تھی۔ حقیقتاً یہی اس کا سرمایہ تھا۔ چھوٹی موٹی تقریبات، محفلوں اور اسٹیج پر پرفارمنس سے اس نے اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر سرسنگیت کے استادوں نے اس کی مدد کی۔ اس کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا۔ ایسے لوگوں میں روبن گھوش پیش پیش تھا کیوں کہ وہ سچا فنکار تھا۔ سچا موسیقار تھا اس لیے ابھرتی ہوئی خوب صورت آوازوں کو پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کرتا تھا۔

1960ء میں جب کیپٹن احتشام کی بنگالی فلم ''راج دھانیر بوکے'' کی میوزک ترتیب دی تو بشیر احمد کو بھی گانے کا چانس دیا۔ بشیر احمد کی پیدائش چونکہ کلکتے کی تھی جہاں کے

رہائش بنگالی زبان بھی آسانی سے بول اور سمجھ سکتے تھے اس لیے اس بنگالی فلم میں بنگالی گیت گانے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آواز اچھی تھی اس لیے اس کے گائے ہوئے نغمے کو پسند بھی کیا گیا۔ روبن گھوش چونکہ اچھی آواز کا شروع سے سپورٹر رہا تھا۔ اس لیے اس نے بشیر احمد کو مزید چانس دینے کا پروگرام بنایا اور جب ''چندا'' کی کامیابی کے بعد ہدایت کار مستفیض نے ''تلاش'' کے نام سے اردو فلم شروع کی اور روبن گھوش کو موسیقی کی ذمہ داری سونپی تو روبن گھوش نے بشیر احمد کی آواز کو جلا بخشنے کا بڑا فیصلہ کیا اور ''تلاش'' کے لیے مختلف موڈ اور مزاج کے کئی نغمے بشیر احمد کی آواز میں ریکارڈ کروائے۔

☆ میں ہوں رکشا والا، متوالا، دل والا۔ ☆ آج میں نے پی لی تو کیا۔ آج میں نشے میں ہوں تو کیا۔ تھوڑا تھوڑا ہوش میں تو ہوں۔ ☆ کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیے۔ یہ شام یہ تنہائی یوں چپ تو نہ رہیے۔ ☆ ہائے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی۔ دل تو کسی سے لگاؤ گے۔ ہم حاضر حضور۔ ☆ تم بھی حسین دل بھی جواں۔ ہائے یہ رنگین سماں۔ اس پر سہانی یہ رات ہے (ہمراہ انجمن آراء)۔

بشیر احمد کی یہ فلم ''تلاش'' 1963ء میں عیدالاضحی کے موقع پر ریلیز ہوئی اور اس نے گولڈن جوبلی بزنس کر کے سپرہٹ کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بشیر احمد بھی بطور گلوکار ہٹ ہوگیا۔

''تلاش'' میں شبنم، رحمٰن، سبھاش دتہ، شوکت اکبر، رانی سرکار، جلیل افغانی، محفوظ، مٹی محسن نے نمایاں کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے ابتدائی دو نغمے سبھاش دتہ جب کہ بقیہ گیت رحمٰن پر پکچرائز ہوئے تھے۔ بشیر احمد کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے گائے ہوئے تمام گیتوں کو پسند کیا گیا۔ سراہا گیا۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں بشیر احمد کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اب وہ شوقیہ فنکار نہیں تھا۔ فلموں کا مستند گلوکار بن گیا تھا۔ ''تلاش'' میں جہاں سرور بارہ بنکوی نے کئی گیت تحریر کیے تھے وہاں عشرت کلکتوی نے بھی کچھ گانوں کی نغمہ نگاری کی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عشرت کلکتوی بشیر احمد کے برادر نسبتی ہیں۔ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ عشرت کلکتوی کو بشیر احمد کی سفارش پر نغمہ نگاری کا موقع دیا گیا یا کوئی اور بات تھی۔ ویسے عشرت کلکتوی مستند شاعر تھے۔ روشن علی عشرت کے نام سے کراچی میں بھی صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

اخلاق احمد کے وہ گیت

جو ابتداء میں مقبول ہوئے

☆ دیکھو یہ کون آگیا۔ بن کے نشہ چھا گیا۔ (فلم دوساتھی، نغمہ نگار تسلیم فاضلی، موسیقار روبن گھوش)۔

☆ اے دل اپنا درد چھپا کر گیت خوشی کے گائے جا (فلم پہچان۔ موسیقار نثار بزمی)۔

☆ کبھی خواہشوں نے لوٹا کبھی بے بسی نے مارا (فلم مہربانی۔ موسیقار ایم اشرف)۔

☆ میں ہوں راستے کا پتھر میرا نصیب ٹھوکر (فلم راستے کا پتھر۔ موسیقار ناشاد)۔

☆ ساتھی میرے، بن تیرے، کیسے بیتے گی عمریا بن تیرے (فلم زبیدہ۔ موسیقار کمال احمد)۔

☆ ساون آئے ساون جائے (فلم چاہت۔ موسیقار روبن گھوش)۔

☆ سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا (فلم بندش)۔

1964ء میں بشیر احمد کی تین فلمیں، پیاسا، کارواں اور ملن بطور گلوکار منظر عام پر آئیں مگر اس اضافی خوبی کے ساتھ کہ ان فلموں کے کچھ گیتوں کی نغمہ نگاری کا سہرا بھی اس کے سر بندھا۔ بی اے دیپ کے نام سے اس نے فلمی شاعری بھی شروع کردی۔ پتا نہیں اس نے اپنے برادر نسبتی عشرت کلکتوی کی نغمہ نگاری سے متاثر ہو کر اس فیلڈ میں قدم رکھا یا کوئی اور وجہ تھی مگر اس کی گلوکاری کی طرح نغمہ نگاری میں بھی اسے پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس کے لکھے ہوئے گیت پسند کیے گئے۔ شاید اس بات سے اسے مزید حوصلہ ملا اور اس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر موسیقی کی کمپوزیشن بھی شروع کردی۔ جس کے آغاز کا موقع اسے رحمان کی اوّلین فلم ''ملن'' سے ملا۔

رحمٰن جب لندن سے اپنی مصنوعی ٹانگ بنوا کر واپس ڈھاکے پہنچا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود فلمیں بنا کر اپنے آپ کو زندہ رکھے گا تو پورے پاکستان نے اس کی مدد کرنے کا عزم و ارادہ کیا۔ جوش ملیح آبادی، سیف الدین سیف، قتیل شفائی، مسرور انور، حمایت علی شاعر وغیرہ نے کہا

کہ ہم تمہاری فلم کے لیے مفت میں بلا کوئی معاوضہ لیے گیت لکھیں گے۔ موسیقاروں نے موسیقی ترتیب دینے، عکاسوں نے عکاسی کرنے اور اداکاروں نے اداکاری کرنے کی آفر کی لیکن اللہ جانے بشیر احمد نے رحمان کو کیا پٹی پڑھائی کہ ایک گلوکار اور نغمہ نگار کو جو ابھی ابھر کر منظر عام پر آیا ہے۔ اپنی فلم ''ملن'' کی موسیقی کی ساری ذمہ داری سونپ دی۔ بس یہیں سے بشیر احمد کی خودنمائی اور خودغرضی کا جن اس کے سر پر سوار ہوگیا۔ اسے کسی مستند شاعر سے گیت لکھوانے ہی نہ پڑے۔ گلوکاروں سے ملن کے لیے گیت گوائے۔ سوئے ایک گیت کے جو سرور بارہ بنکوی لکھ چکے تھے۔ تم سلامت رہو، مسکراؤ ہنسو۔ میں تمہارے لیے گیت گاتا رہوں۔ سارے گیت خود لکھے۔ خود گائے اور مادام نور جہاں کے ساتھ گانے کا شوق پورا کرنے کے لیے صرف انہیں شریک کیا۔

یہ بات بہت سے لوگوں کو بری لگی۔ ان میں بطور صحافی میں بھی شامل تھا۔ میں نے رحمان سے کہا۔ ''بشیر احمد یہ کیا ہاتھ دکھا گیا۔ اس پر تم نے اس سے کوئی جواب طلب نہیں کیا؟''

''یار! میں کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ اسے میں نے کوئی معاوضہ تو نہیں دیا ہے کہ اس سے اس کی اس حرکت پر باز پرس کروں۔''

''مگر اس طرح تو تمہاری فلم کی ساکھ کو نقصان پہنچاناں۔''

''چھوڑو یار! جو ہونا تھا ہوگیا۔ شاید یہی میرا نصیب تھا۔''

میں نے محسوس کیا کہ رحمٰن نے یونہی یہ کڑوا گھونٹ نہیں پی لیا ہے۔ اس کا کچھ اور ہی مقصد ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رحمان بڑا گہرا شخص تھا۔ وہ آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی بھی بہت پہلے کر لیتا ہے اور میری یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ وہ بشیر احمد سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مختلف طرح کے فائدے اٹھاتا رہا۔

''ملن'' جس طرح بھی اور جن حالات میں بھی بنی ایک عام سی فلم ہونے کے باوجود ہر حلقے سے اسے پذیرائی ملی۔ کاروباری طور پر اس نے رحمٰن کو اتنا فائدہ پہنچایا کہ اس نے مستقل فلمسازی کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اب وہ اپنے محدود سرمایے سے فلمیں بنانے لگا اور ان کے لیے ایسے ہی لوگوں کا تعاون حاصل کرنے لگا جو اس سے معاوضے کے سلسلے میں کوئی کاروباری رویہ اختیار نہ کریں۔ ایسے میں بشیر احمد جیسوں سے اس نے ہر ممکن طریقے پر فائدہ اٹھایا۔ اس کی ابتدائی فلمیں ایندھن، کنگن، جہاں باجے شہنائی اور ایسی ہی کئی کمزور اور کاروباری اعتبار سے ناکارہ فلمیں الیاس رشیدی کے نگار پکچرز کے بینر تلے ریلیز کروائیں اور الیاس رشیدی اور اس کے تقسیم کار ادارے کو نقصان پہنچایا۔ الیاس رشیدی محض اس کی ہمدردی اور اس کو سہارا دینے کے جذبے سے نقصان پر نقصان برداشت کرتے رہے لیکن جب اس نے بھارتی فلم ''جب جب پھول کھلے'' کا بے حد کامیاب چربہ بنایا تو بڑی خاموشی کے ساتھ یہ فلم غفار دانے والا کو اس کے حقوق نمائش دے دیے۔ یہ فلم ''درشن'' کے نام سے بنی اور اس کا بڑا کریڈیٹ بشیر احمد کو حاصل ہے۔ جس نے کلکتہ میں یہ فلم دیکھ کر ہو بہو اس کا چربہ بنایا اور اس کے لیے اپنی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں اس کے سارے نغمے خود گائے۔

اردو چترالی ڈھاکے کے دفتر میں جب ''درشن'' کے کچھ فوٹو گرافس آئے تو وہاں موجود ایک بھارتی نوجوان نے کہا۔

''ارے یہ تو انڈین فلم ''جب جب پھول کھلے'' کی کاربن کاپی لگتی ہے۔''

''کیا واقعی؟''

''ہاں بھئی۔ ''جب جب پھول کھلے'' میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ یقین نہ آئے تو فلم منگوا کر دیکھ لو۔''

یہ اطلاع، یہ خبر، بطور نگار کے نمائندہ خصوصی میں نے نگار کے دفتر تک پہنچائی۔ الیاس رشیدی نے اسے نمایاں طور پر نگار میں چھاپ دی۔ وہ پہلے ہی اس بات پر تپے ہوئے تھے کہ اس کے حقوق رحمٰن نے مجھے دینے کی بجائے غفار دانے والا کو دے دیے تھے۔ ''درشن'' نے مشرقی اور مغربی دونوں سرکٹ میں توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی۔ اس فلم کی کامیابی سے بشیر احمد کی کامیابی کے سارے دروازے کھل گئے۔ اس فلم میں سات گانے تھے جنہیں نہ صرف بشیر احمد نے گایا تھا بلکہ اس کی نغمہ نگاری بھی کی تھی اور ان کی دھنیں بھی اسی نے تیار کی تھیں۔ یعنی بیک وقت گلوکار، نغمہ نگار اور موسیقار کے روپ میں سامنے آیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب اس نے اپنے بارے میں جھوٹا پروپیگنڈہ شروع کردیا تھا۔ مثلاً اس کے آباؤ اجداد کا تعلق لکھنؤ سے تھا لیکن نواب واجد علی شاہ کی اسیری کے بعد ان کا

گھرانا کلکتہ جاکر آباد ہوگیا۔ بشیر احمد کلکتہ ہی میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ دادا شیشہ سازی کے ہنر و تجارت سے وابستہ تھے۔ اس نے اپنے بارے میں یہ ہوائی بھی اڑائی کہ اس نے صرف پندرہ سال کی عمر میں استاد ولایت علی خان کی شاگردی اختیار کر کے ان سے موسیقی کی ابتدائی تربیت حاصل کی۔ پھر اپنے شوق اور فنی لگن کے لیے بمبئی جاکر استاد بڑے غلام علی خان سے کماحقہ موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی۔ یہی نہیں، اس نے یہاں تک کہا کہ بمبئی میں موسیقار محمد شفیع نے اسے ایک دو فلموں میں گانے کا موقع بھی دیا، جن میں سب سے پہلا نغمہ ایک ڈوئیٹ تھا جسے گیتا دت نے اس کے ہمراہ گایا تھا۔ جس کے بول تھے ”یہ تیرے گورے گورے گال“ اس نے یہ پھلجھڑی بھی چھوڑی کہ طلعت محمود سے اس کی دوستی تھی اور وہ طلعت محمود کے ساتھ ہی 1960ء میں ڈھاکے آیا تھا۔ روبن گھوش نے طلعت محمود کو بنگالی زبان کی فلم ”راج دھانیر بوکے“ کے ایک دو گیتوں کی نغمہ سرائی کے لیے بلایا تھا۔ اس موقع پر اس نے بھی ایک بنگالی گیت اس فلم کے لیے ریکارڈ کرایا تھا۔ طلعت محمود تو اس فلم کی ریکارڈنگ کروا کر واپس چلے گئے مگر وہ ڈھاکے ہی میں رہ گیا۔

اس وقت بھی سنجیدہ لوگوں کو اس کی ایسی باتوں پر ہنسی آئی تھی۔ بعد میں بھی ایسی مضحکہ خیز باتوں پر ہنس کر مسکرا کر اور تبصرہ کر کے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

1971ء میں سقوطِ ڈھاکا کے بعد بشیر احمد اپنی اہلیہ مینا کے ساتھ کراچی آگیا تھا۔ اسے شاید اس بات کا بھی گمان تھا کہ ڈھاکے میں اس نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں کچھ اسی طرح کی دھوم وہ کراچی میں بھی مچائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس نے چند سال کراچی میں گزارے۔ اس دوران کراچی کی کچھ فلموں ”حالات، ہل اسٹیشن، اڑتے پنچھی، سنگ تراش“ ”شہر اور سائے“ کے لیے کچھ گیت گائے۔ جب کہ ریڈیو پاکستان کے لیے بھی کچھ غزلیں اور گیت ریکارڈ کرائے مگر اسے وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی خوش فہمی میں وہ مبتلا تھا۔ اس لیے چند برسوں کے بعد جیسے ہی بنگلہ دیش کے حالات کسی قدر سنبھلے وہ اپنی بیوی مینا کے ساتھ ڈھاکا واپس چلا گیا۔

انھی دنوں کی بات ہے ایک دن ”نگار“ کے دفتر میں اے آر سلوٹ نے مجھ سے کہا۔ ”انور بھائی! یہ آپ کا بشیر احمد جو اتنی لمبی لمبی ہانکتا ہے یہاں کراچی میں اس کی دال

جب اخلاق احمد فلمی دنیا میں معروف ہو گئے تب بھی ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے گاتے رہے۔ ٹیلی وژن پر ان کی آواز میں
”وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی“ کو کافی پسند کیا گیا۔ موسیقار نیاز احمد نے اس کی آواز میں یہ گانے بھی ریکارڈ کیے۔

☆ میں کہاں تیرا انتظار کہاں۔

☆ کیا خبر تھی خون کے آنسو رلائے گا مجھے۔ میرا ہو کر بھی کبھی وہ بھول جائے گا مجھے۔

☆ آپ سے ملنے کی تھی ہم کو آرزو۔ جانِ آرزو، جانِ آرزو۔

☆ وہ تیرے کہاں گردشِ دوراں میں ہی رہے۔

موسیقار خلیل احمد نے اخلاق احمد کی آواز میں یہ خوب صورت نغمہ کمپوز کیا۔

☆ خودی کی لے میں جب میں گنگناؤں۔ ستارے آسماں سے نوچ لاؤں۔

اخلاق احمد کے دیگر غیر فلمی نغمات درج ذیل ہیں۔

☆ سپنوں میں کروں میں باتیں۔ اب رات کو میں۔

☆ در پہ شمع، چشم و لب و گوش کو سراہتے رہتے ہیں۔

☆ مجھے پیارا اپنے وطن سے ہے۔ میں نثار اپنے وطن پہ ہوں۔

☆ خدا نے دی ہے روشنی ترانے کو۔

☆ پرچم توحید کے نگہبان۔ ہم ہیں مسلمان (ہمراہ نیرہ نور)۔

☆ ملت کے پاسبانو اے قوم کے جوانو۔ شیروں کا یہ وطن ہے دشمن کو یہ بتادو۔

یوں تو پاکستان کی فلمی صنعت میں مختلف گانے والوں نے ہائی پچ (اونچے سروں) پر گلوکاری کی ہے لیکن اس سلسلے میں گلوکار مسعود رانا اور اخلاق احمد کو خاص طور پر شہرت ملی جنھوں نے اونچے سروں پر لمبی تان کے ساتھ اپنی آواز کا خوب جادو جگایا۔

کیوں نہیں گئی؟“

”پہلی بات تو یہ ہے سلوٹ بھائی! کہ بشیر احمد میرا کب سے ہو گیا۔ ہاں وہ ہمارے سابق مشرقی پاکستان کا ایک ابھرتا ہوا گلوکار، نغمہ نگار اور موسیقار تھا۔“

آج کی نئی نسل کو یہ بتانا ضروری ہے کہ اے آر سلوٹ اس دور کے بہت بڑے فلم جرنلسٹ تھے جب ہماری فلم انڈسٹری عروج پر تھی۔ وہ میمن گجراتی مسلمان تھے۔ حاجی تھے۔ پنج وقتہ نمازی تھے۔ انگریزی زبان کے اخبار میں لکھا کرتے تھے اور ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ سلوٹ بولے۔ ”اس نے ڈھاکے میں اپنی گلوکاری، نغمہ نگاری اور موسیقی میں کچھ نام کمالیا تھا، کچھ شہرت حاصل کرلی تھی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اتنی لمبی لمبی ہوائیاں چھوڑنے لگے کہ اس نے صرف پندرہ سال کی عمر میں استاد ولایت علی خان کی شاگردی حاصل کرلی اور پھر بمبئی جاکر استاد بڑے غلام علی خان سے موسیقی کے اسرار و رموز حاصل کیے۔ استاد بڑے غلام علی خان تو اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے چہ جائے کہ ایک پندرہ سولہ سال کے لونڈے کو اپنی شاگردی میں لے کر موسیقی کے اسرار و رموز سمجھائیں گے۔“

”سلوٹ بھائی! اس کی چھوڑی ہوئی یہ پھلجھڑی بھی دلچسپ ہے کہ بمبئی کے ایک موسیقار محمد شفیع نے وہاں کی ایک دو فلموں میں اسے گانے کا موقع بھی دیا۔ جن میں اس کا سب سے پہلا گیت گیتا دت کے ساتھ ڈوئیٹ تھا۔“

”اور یہ بھی کہ......“ سلوٹ نے بات آگے بڑھائی۔ ”طلعت محمود سے اس کی دوستی تھی اور اسی کے ساتھ وہ ڈھاکے آیا تھا۔ طلعت محمود تو بنگالی فلم میں اپنا گانا ریکارڈ کرا کے واپس چلا گیا مگر وہ (بشیر احمد) وہیں رہ گیا۔ یار! انور بھائی آپ لوگوں نے اس اُلو کی دم فاختہ سے یہ نہیں پوچھا کہ جب بمبئی کی فلموں میں تمہیں گانے کا موقع مل رہا تھا تو تم وہاں کیوں نہیں رکے، کلکتے کیوں واپس آگئے اور اب ڈھاکے جیسی محدود فلمی صنعت میں کیا سوچ کر قسمت آزمائی کر رہے ہو؟“

”سلوٹ بھائی! اس کی ایسی مضحکہ خیز باتوں پر سلجھے ہوئے لوگ اس کی عقل پر ماتم کرتے تھے۔ اسے اس کے اس پاگل پن پر ٹوک کر کیا حاصل ہوتا؟“

”حد ہے یار!“ سلوٹ بولے۔ ”اس نے یہی بے تکی باتیں اس وقت بھی کیں جب وہ کراچی آیا تھا اور اس کی باتوں کو اخبار والوں نے شائع بھی کیا تھا۔“

”بات دراصل یہ ہے سلوٹ بھائی کہ آج کل کے نوجوان اور چھوٹ بھیّے قسم کے فلمی صحافیوں کو کیا خبر کہ استاد بڑے غلام علی خان کون تھے۔ طلعت محمود کی کیا حیثیت تھی وغیرہ۔ بشیر احمد نے جو ہرزہ سرائی کی اس کو انہوں نے چھاپ دیا۔“

”اس نے اپنی بیوی مینا کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام لیا۔ ایک طرف تو اس نے یہ کہا۔ مینا وہ لڑکی ہے جس نے نیپال کے میوزیکل کالج سے ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ دوسری طرف یہ کہتا ہے جن دنوں میں ”درشن“ کی موسیقی ترتیب دے رہا تھا۔ مینا مجھ سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے میری شاگرد بن گئی۔ ذرا سوچیے ایک ایسی لڑکی جو نیپال کے میوزیکل کالج کی ڈپلومہ ہولڈر ہے وہ اس کی شاگردی کیوں حاصل کرے گی جسے خود رہنمائی کی ضرورت ہے۔“

”جھوٹ بولنے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ پہلے وہ کیا غلط بیانی کر چکے ہیں۔“

”ہاں یہ بھی آپ ٹھیک کہتے ہیں انور بھائی۔“

بشیر احمد ایک اچھا گلوکار تھا۔ ہر طرح کے گانے گا لیتا تھا۔ نغمہ نگاری شروع کی تو وہ بھی بُری نہیں تھی۔ موسیقی کی اچھی دھنیں بھی بنا لیتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کافی تھا۔ اسے خوامخواہ بھی بے تکی چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بشیر احمد نے کراچی کے قیام کے دوران کراچی کی فلموں میں بھی اچھے گانے ریکارڈ کیے تھے جن میں چند یہ ہیں۔

☆ مکھڑے میں چاند بالوں میں ساون ہنسا کرے (فلم سنگ تراش۔ نغمہ نگار صہبا اختر)۔

☆ تم نے محبوب کہا ہے میرے محبوب مجھے (فلم حالات۔ جو مکمل نہ ہو سکی)۔

☆ سو غم کے دیپ جلائے۔ میت نہ آئے (فلم اڑتے پنچھی۔ یہ فلم بھی مکمل نہ ہو سکی۔ اس فلم کی موسیقی بھی بشیر احمد نے ترتیب دی تھی)۔

بشیر احمد کے کراچی کے قیام کے دوران EMI ریکارڈنگ کمپنی نے ”یادوں کے دیپ“ کے نام سے ایک LP ریکارڈ ریلیز کیا تھا جس میں اس کی آواز میں غزلیں اور گیت شامل تھے۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمایئے۔

☆ میرے ہم نفس میرے ہمنوا مجھے دوست بن کے

دعا نہ دے (شاعر شکیل بدایونی)۔
☆ تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا (شاعر داغ دہلوی)۔
☆ تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ (شاعر عبیداللہ علیم)۔
☆ تم پیاری ہو متوالی ہو میرے من کی تم ہریالی ہو (شاعر احمد ہمیش، ملی نغمہ)۔
☆ ہمت کے پتوار سنبھالو۔ اے میری ملت کے جیالو (ملی نغمہ)۔
☆ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو (شاعر مرزا غالب)۔
☆ پربت کے اس پار وادی میٹھی آس لگائے (شاعر احمد ہمیش)۔

بشیر احمد نے کراچی میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرنے کے باوجود بہت کچھ کیا مگر اس سے اس کا وہ مقصد پورا نہ ہوا جس کی آس لگائے وہ آیا تھا تو واپس ڈھاکے لوٹ گیا۔ اب وہاں کے حالات مختلف تھے۔ اردو فلموں کا باب بند ہو چکا تھا۔ صرف بنگالی زبان کی فلمیں بن رہی تھیں۔ اس لیے اس کے لیے صرف گلوکاری کا میدان رہ گیا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بشیر احمد اپنی بیوی مینا بشیر اور اپنے بچوں کے ہمراہ ایک بار پھر کراچی آیا تھا۔ یہ اپریل 1988ء کی بات ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے اسے خصوصی طور پر دعوت دے کر بلایا تھا تاکہ وہ معین اختر کے پروگرام ”یس سر نو سر“ میں فلم ”درشن“ کا یہ مقبول نغمہ سنائے۔ ”یہ موسم یہ مست نظارے پیار کرو تو ان سے کرو۔ کرتے ہیں یہ تم کو اشارے پیار کرو تو ان سے کرو“۔

”درشن“ انڈین فلم ”جب جب پھول کھلے“ کا چربہ تھی مگر بشیر احمد نے اس کے لیے جو محنت کی تھی اس کا خوشگوار صلہ اس کے فلمساز اور تقسیم کار ہی کو نہیں ملا بلکہ خود اسے بھی زبردست فائدہ ہوا۔ اس کی موسیقی اور گیتوں نے بشیر احمد کو فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔ اس کی مارکیٹ ویلیو بہت بڑھ گئی۔ اس فلم میں رحمان اور شبنم نے اداکاری بھی غضب کی کی تھی۔ اس کے تمام سولو گیت بشیر احمد نے خود گائے تھے۔ کراچی میں یہ فلم 65 ہفتے تک مسلسل چلی اور گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ بعد میں جب بھی اس فلم کی نمائش ہوئی تقسیم کار اور سینما مالکان کو بھرپور فائدہ ہوا۔

محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کی اس فلم کے لیے کی ہوئی کاوشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ بشیر احمد نے درشن کے نغمات کو دل نشین دھنوں سے مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ فلم میں کہانی کی سچوایشنز کے عین مطابق بیک گراؤنڈ میوزک تشکیل دیا۔ جب کہ اس فلم کے ٹائٹل میوزک کے انتخاب میں بھی لاجواب دھن پیش کی۔ رحمان نے فلم کی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کی غرض سے میڈم نور جہاں کا ایک ڈوئیٹ سانگ ”چن لیا اک پھول کو جو تھا۔ انوکھا سب سے نرالا“۔ بشیر احمد کی ہمراہی میں شامل کروایا لیکن ایک اور گیت گلوکارہ مالا کی سریلی آواز میں بھی پیش کیا جس پر اداکارہ شبنم کی خوب صورت پکچرائزیشن سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ ”یہ سماں پیارا پیارا یہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی۔ جی چاہتا ہے میرا کھو جائیں ہم یہاں“ فلم کے بیک گراؤنڈ میں سچویشن کے مطابق بشیر احمد نے دو جے مینا کی آواز میں صدا بند کیے۔ ”راہ تمہاری، پیا نہ آئے بے کل بے کل“۔

”درشن“ ایک ایسی فلم تھی جس نے اس کے فلم ساز رحمان کے موڈ مزاج میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ جو پہلے بہترین کہانیوں پر بنی آرٹ فلمیں بنایا کرتا تھا اب مکمل تفریحی فلمیں بنانے لگا۔ ”چاہت“ بھی اس کی اسی نوعیت کی فلم تھی جس کی موسیقی روبن گھوش نے مرتب کی تھی۔ جب وہ بنگلہ دیش بننے کے وقت لاہور میں تھا اس نے وہاں ”دو ساتھی“ کے علاوہ جو فلمیں بنائیں ان میں تفریح اور گلیمر کو خاص طور پر اہمیت دی۔ بشیر احمد سے اس کا ناتا برقرار نہیں رہا۔ اگرچہ اس دوران بشیر احمد کراچی میں تھا۔ رحمان نے اسے کراچی سے نہیں بلایا اور وہ خود لاہور نہیں گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لاہور میں گلوکار، نغمہ نگار اور موسیقار بہت بڑے بڑے تھے جہاں وہ سروائیو نہیں کر سکتا تھا۔

کراچی سے ڈھاکا واپس آنے کے بعد اس کے سارے سابقہ فتوحات ایک سندر سپنا بن کر رہ گئے۔ اب وہ محض گلوکار کی حیثیت سے بنگالی فلموں کے لیے بنگالی گیت ہی گا سکتا تھا۔ جب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا اس دور میں بھی وہ وہاں کی بنگلہ فلموں کے لیے نغمہ سرائی کرتا تھا مگر اب تو اسے

خود کو زندہ رکھنے کے لیے بنگالی فلموں کے لیے گلوکاری پر ہی انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ بنگالی زبان بول لیتا تھا۔ گا لیتا تھا مگر بنگالی زبان پر اس قدر دسترس نہیں رکھتا تھا کہ اس میں نغمہ نگاری بھی کرتا۔

مجھے اس دور کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جب بشیر احمد نے فلمی شاعری کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔ ایک دن میں نے اسے ایک کتاب کی دکان سے ایک نامور شاعر کی شاعری کی کتاب خرید کر باہر آتے دیکھا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔

"لگتا ہے۔ تمہیں شعر و شاعری سے بہت محبت ہے۔"

اس لمحے اس کا یہ تاثر تھا، جیسے وہ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔ "انور بھائی! آپ تو جانتے ہیں میں نے فلموں کے لیے نغمہ نگاری بھی شروع کی ہے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ بی اے دیپ کے نام سے تم نے گیت نگاری بھی شروع کردی ہے۔"

"اب میں عشرت بھائی (عشرت کلکتوی) کی طرح جنوئن شاعر تو نہیں۔ اس لیے شاعری کی کتابوں سے کچھ شاعرانہ خیالات اکتساب کرنے کی......"

"یہ کوشش...... بلکہ کاوش بری نہیں ہے۔"

اس واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آگے بڑھنے اور ترقی کی منزل کی طرف قدم بڑھانے کے سلسلے میں وہ کس قدر عملی اقدام کا قائل تھا۔ اسی طرح اس نے اگلا قدم موسیقی کی کمپوزیشن کے لیے اٹھایا اور اس میں بھی اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے کامیاب رہا۔ اس کی ان تین خوبیوں کی وجہ سے اسے "تھری اِن وَن" کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

بشیر احمد کے اچھے دور میں جب وہ اردو فلموں کے تینوں فارمیٹ میں دھوم مچا رہا تھا، بنگالی فلموں میں بھی وقتاً فوقتاً گلوکاری کا موقع ملتا تو انکار نہ کرتا۔ اس دور کی کچھ بنگالی فلمیں تھیں جن میں وہ نغمہ سرا ہوا۔ آئینہ، ادبوشیشہ، ایک دوئی تین، موینا موتی، سوئمر سہاگ، بجو بائی سونارن، بیلو بندھو، راج سنگھاسن، ابر بھاب، مونیر موتو بو، بام گینال، لوکو پوری، شیریں فرہاد۔

ان فلموں میں اسے... گلوکاری کا یہ فائدہ ہوا کہ جب وہ کراچی سے اپنی توقعات کی ساری کشتیاں جلا کر واپس ڈھاکے گیا تو اسے بنگالی فلموں کی گلوکاری کے لیے راستہ ہموار ملا مگر اب وقت ٹف تھا۔ اس کے مقابلے میں بنگالی گلوکار ایک سے بڑھ کر ایک تھے مگر اس ٹف ٹائم میں بھی بشیر احمد اپنی گاڑی چلاتا رہا۔ اپنے ساتھ اپنی نیپالی نژاد بیوی مینا سے بھی بنگالی گیت گواتا رہا جب کہ اپنے بیٹے رضا بشیر اور بیٹی حمیرا کو بھی بنگالی میڈیم اسکول میں تعلیم دلوائی اور انہیں بھی گلوکاری کی تربیت دیتا رہا اور یہ اس کا بہت اچھا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد اس کے دونوں بچے بنگلہ دیش کی بنگالی فلموں میں بڑی کامیابی کے ساتھ گلوکاری کررہے ہیں۔

بشیر احمد 19 نومبر 1939ء کو نصیر احمد کے گھر کلکتے میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے شوق، لگن اور محنت کے نتیجے میں گلوکاری سے اپنا کیریئر شروع کرنے کے بعد گلوکاری میں جہاں ملک گیر شہرت حاصل کی وہاں نغمہ نگاری اور موسیقاری کے میدان میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اس کی شہرت، عزت اور مقبولیت کا سورج ڈوب گیا اور پھر ایک دن اس کی زندگی کا چاند بھی موت کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ یہ 19 اپریل 2014ء کا دن تھا۔

کہتے ہیں کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتو نہیں جاتا لیکن کچھ لوگ مرنے والوں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ انہیں زندہ رہنا دشوار ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں مینا بشیر بھی تھی جو اپنے محبوب شوہر کی جدائی برداشت نہ کرسکی اور تین ماہ بعد 17 اگست 2014ء کو سانسوں کی ڈوری توڑ کر موت کی نیند سوگئی۔

دونوں میاں بیوی کی محبت اور رفاقت مثالی تھی۔ فلم "درشن" کا بشیر احمد ہی کا گایا ہوا ایک نغمہ ان کی محبت کی عکاسی کرتا ہے۔

تمہارے لیے اس دل میں جتنی محبت ہے
اتنی محبت کون کرے گا
کہاں پاؤ گے
کس دل میں ہوگی اتنی محبت

بشیر احمد کیسا بھی تھا، اس نے چند نامناسب باتوں کو اپنا کر اپنے آپ کو تھوڑا بدنام بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک ورسٹائل فنکار تھا۔ اس کی فنی کارکردگی اس کی عدم موجودگی میں بھی یاد رکھی جائے گی۔ خاص طور پر اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس کے گائے ہوئے بے شمار گیت ہمیشہ اسے زندہ رکھیں گے۔

دلِ آوارہ

شکیل صدیقی

راولپنڈی کے اس نوجوان کو کسی کل چین نہ تھا۔ وہ ولایت پلٹ تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر شوق فلم بینی نے اسے فلمی دنیا کا اسیر بنا دیا تھا۔ وہ کسی اور نوکری میں جانا ہی نہیں چاہتا تھا جب کہ اعلیٰ عہدے اس کی راہ دیکھ رہے تھے لیکن جب اس نے اداکاری کے میدان میں قدم رکھا تو خود کو منوا ہی لیا۔ گو کہ راہ میں بے حساب پیچ و خم آئے مگر اس نے حوصلہ نہ ہارا۔

اپنے دور کے ایک نامور اداکار کی خودنوشت

میرا فلموں میں آنا ایک طرح سے جوانی سے بڑھاپے کا سفر ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس نمائشی دنیا کو چھوڑ کر اب پڑھنے لکھنے کا کوئی کام کروں۔ میں نے لوگوں کو بہت دھوکا دیا اب خود کو سنوار لینا چاہیے۔ سیدھی سچی راہ پر چلنا چاہیے۔

جب میں نے اسکول کی تعلیم ختم کی تو کالج میں داخلہ لے لیا۔ چوڑی دار پاجامہ اور کرتہ ایک طرف چلا گیا اور اس کی جگہ پتلون، قمیض اور ہیٹ نے لے لی۔ گھر

والوں نے میٹرک پاس کرنے پر انعام کے طور پر سائیکل دی تھی۔ اس پر سوار ہونے کے بعد میں خود کو آسمان کی سیر کرتا محسوس کرتا۔ پھر فلم؟ اس کے لیے والدین سے اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی؟

ان دنوں راولپنڈی شہر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہاں انگریزوں کی ایک چھاؤنی تھی اور جہاں چھاؤنی ہوتی ہے وہ علاقہ صفائی ستھرائی میں نمبر ایک پر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہاں کے صاف ستھرے اور منظم ماحول کو دیکھ کر لوگ کوشش کرتے کہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں۔ اپنا سب کچھ اتار پھینکیں اور ان کا سب کچھ اپنا لیں۔ صدر کا علاقہ بے حد صاف ستھرا تھا اور سنیما ہال بھی ایسے کہ واپس آنے کو دل نہ چاہے۔ فلم دیکھنے والوں کی زیادہ تعداد انگریزوں کی ہوتی تھی۔ میں بہ صد شوق وہاں جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار قسمت یاوری کرتی تو کوئی انگریز حسینہ آکر پہلو میں بیٹھ جاتی۔ انگریزی فلمیں طلسماتی ہوتی تھیں اور ان کا خمار ہفتوں تک نہیں اترتا تھا، پھر اگر پہلو میں کوئی حور شمائل بیٹھی ہو تو فلم یادگار بن جاتی تھی۔

والدین کے سامنے بھی میں انگریزی فلموں کے اعلا معیار کی تعریفیں کرتا۔ انہیں بتاتا کہ فلموں کی کہانیاں بڑے بڑے انگریزی مصنفوں کے شہپر تخیل کا کارنامہ ہوتی ہیں۔ پھر مکالمے انگریزی میں لکھے ہوئے اسکرین پر آتے ہیں۔ جس کو پڑھنے کے بعد انگریزی بہتر ہو جاتی ہے، بلکہ نکھر جاتی ہے۔ چنانچہ تفریح کے ساتھ انگریزی آجاتی ہے اور امتحان میں انگریزی کے مضمون میں نمبر بھی اچھے ملتے ہیں۔

میری یہ دلیلیں سن کر والدین تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتے تھے، لیکن انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی تفریحی چیز اتنی بے عیب ہو سکتی ہے۔

انگریزی فلموں میں رومانس کے مناظر دیکھ کر طبیعت مچل جاتی تھی، اس کے علاوہ ہیرو کا ایکشن اور تھرل دیکھ کر خون کی روانی بھی بڑھ جاتی تھی۔ طبق روشن ہو جایا کرتے تھے۔ ہم سب طلبہ بھی یہ ایکشن اپنانے کی کوشش کرتے، لیکن ناکام رہتے۔ میرے پاس تو سائیکل بھی تھی، جسے میں تیز رفتاری سے چلاتا، گھماتا تھا۔ کرتب دکھا کر لوگوں پر دھاک بٹھاتا ہے۔

یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ فلموں میں آندھی، طوفان، گھڑ بازی اور ایکشن کچھ بھی اصلی نہیں ہوتا۔ صرف ہیرو کے کلوز اپس لیے جاتے ہیں، جو اسٹوڈیوز کے اندر رہ کر فلمائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایکسٹرا یہ کام کرتا ہے کہ گھوڑا دوڑاتا ہے وہ بھی آندھی کی رفتار سے۔ اس وقت کیمرے کی رفتار دھیمی کر دی جاتی ہے جس سے اسکرین پر دکھایا جانے والا منظر تیز تر ہو جاتا ہے۔ ان مصنوعی چیزوں کا پتا چلنے کے بعد سب کچھ پھیکا اور بے جان لگنے لگا تھا۔

بہرحال سچائی جب تک علم میں نہ تھی، میں فلموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ جب بھی کوئی انگریزی فلم دیکھ کر گھر لوٹتا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پوز بناتا اور تصور کرتا۔۔۔ کہ میں گریگری پیک یا رابرٹ ٹیلر بن گیا ہوں۔ پھر حیران ہوتا کہ ہالی ووڈ کے سارے بڑے اداکاروں سے میری شکل اتنی ملتی جلتی کیوں ہے؟ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ جاتا جب میرے والدین کی کڑکتی آواز سنائی دیتی۔ خاص طور پر والدہ گھر دیر سے آنے کی وجہ پوچھ رہی ہوتی تھیں۔ میں جلدی سے کوئی کچا پکا سا جھوٹ بول کر معاملے کو دبانے کی کوشش کرتا۔

1930ء میں میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا جب میں پنڈی چھوڑ کر لاہور منتقل ہوا اور گورنمنٹ کالج میں بی اے طالب علم بنا۔ اسی زمانے میں بولتی فلم کا آغاز ہوا۔ فلم کا نام تھا ”عالم آرا۔“ اس میں پرتھوی راج اور جگدیش سیٹھی نے کام کیا تھا۔ وہ ایک گھٹیا فلم تھی، لیکن اس کے بنانے والے دولت میں کھیلنے لگے۔

انڈسٹری میں یہ باتیں عام ہیں کہ اچھی اور محنت سے بنائی ہوئی فلمیں ناکام ہو جاتی ہیں، لیکن جس فلم کے بارے میں سب وثوق سے کہتے ہیں کہ ایک ہفتہ بھی نہیں چلے گی وہ خوب چلتی ہے اور پروڈیوسر سر بلند کر کے کہتا ہے کہ اب تو پولیس آکر ہی اس فلم کو اتارے گی ورنہ اس سے پہلے یہ فلم اترنے کی نہیں ہے۔

لاہور آکر میں گھر والوں کی پوچھ گچھ سے آزاد ہو گیا۔ اب مجھے فلمیں دیکھنے سے کون روک سکتا تھا؟ میں نے ہفتے میں تین تین انگریزی فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ البتہ اداکار بننے کا خبط ابھی نہیں ہوا تھا۔ خیال آتا تھا کہ اگر اداکار بننا ہوگا تب ہالی ووڈ جا کر قسمت آزماؤں گا۔ یہاں کیا رکھا ہے؟

بی اے کے بعد میں نے ایم اے بھی کر لیا۔ جس

سے میری سوچ کسی حد تک نکھر گئی۔ پھر میں نے کالج کی ڈراما سوسائٹی میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں میرے استاد ذوالفقار علی بخاری تھے۔ ان کے علاوہ ڈی جی سوندھی، ایشور چند نندہ اور امتیاز علی تاج تھے۔ مجھے حقیقت پسند ڈرامے اور اداکاری کی ابتدائی قدروں سے متعارف کرانے میں انگریزی ادب کے مطالعے سے کافی مدد ملی۔ عملی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ جب منزل دکھائی دینے لگے تو پھر بات محنت اور لگن کی رہ جاتی ہے۔ ٹھوکریں کھاتا ہوا شخص کبھی نہ کبھی منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ میں ان بزرگوں کو جن کی وجہ سے میں نے زندگی میں کوئی مقام حاصل کر لیا تھا ان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

زندگی میں ایک اور انقلاب اس وقت آیا جب نیو تھیٹر کلکتہ سے ایک فلم ''پورن بھگت'' بن کر آئی اور لاہور کے ایک سینما گھر میں ریلیز ہوئی جو میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ ہندوستانی فلموں کے بارے میں، میں نے اور میرے ساتھیوں نے جو نظریہ قائم کیا تھا وہ باطل ثابت ہونے لگا۔ اس لیے کہ یہ فلم عام ڈگر سے ہٹ کر بنی تھی اس لیے اس فلم کو میں نے چھ بار دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو کھینچ کھینچ کر سینما گھر لے گیا۔ کل تک ہم ہندوستانی تہذیب کے مخالف تھے، اس فلم کی وجہ سے ہم کٹر قوم پرست بن گئے۔ پھر پے در پے کئی اور فلمیں آئیں اور میرا رجحان ہندوستانی فلموں کی طرف چلا گیا۔ حالانکہ وہ اب بھی میرے معیار کے مطابق نہ تھیں۔

کالج کی پڑھائی ختم ہوئی تو ہاتھ میں ڈگری لے کر میدان میں آ گیا۔ میدان میں اترتے ہی پتا چل گیا کہ کاغذ کے اس ردی ٹکڑے کی کاروباری دنیا میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ گھر کا بنا ہوا کپڑا بازار میں جا کر فروخت کرو۔ میں نے ایسا کیا، لیکن گاڑی زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اس لیے کہ کپڑا فروخت کرنے والوں کی دنیا علیحدہ تھی جو ایک ایم اے پاس نوجوان کے خوابوں سے میل نہیں کھاتی تھی۔

میں 1936ء میں گھر سے بھاگ کر کلکتہ پہنچ گیا۔ وہاں میں نے پنڈت سدرشن کے گھر پناہ لی۔ وہ اس زمانے میں نیو تھیٹر کے لیے کہانیاں لکھا کرتے تھے اور میرے والد کے گہرے دوستوں میں شامل تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں فلمی دنیا میں آنا چاہوں تو؟

انہوں نے سوچا کہ گھر سے آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر آیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فلموں کے خلاف ایک خوفناک لیکچر دے ڈالا، جو میرے خیال میں انہوں نے پہلے ہی تیار کیا ہوا تھا۔ ان کے پیش نظر یقیناً یہی ہوگا کہ اگر میں نے فلمی دنیا میں ٹھوکریں کھانا شروع کر دیں اور اپنی زندگی برباد کر لی تو میرے والد صاحب سے ان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ نتیجتاً میں واپس آ گیا۔

ایک سال اسی تگ و دو میں گزر گیا اور میری شادی بھی ہو گئی۔ لیکن پنڈی میں میرا دل نہ لگا۔ میں پھر کلکتہ پہنچ گیا لیکن اس بار میرے ساتھ بیوی بھی تھی۔ کلکتہ پہنچ کر میں نے پنڈت جی سے ملاقات کی۔ انہوں نے بہت دعائیں دیں۔ اپنے بیوی سے ملوایا۔ انہوں نے بھی سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پنڈت جی نے بتایا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو فلمی ہیرو بننے کے چکر میں آیا تھا مگر میرے نصیحت کے سبب اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں نے اپنا ارادہ قطعی نہیں بدلا ہے۔

''اب تم کیا کرتے ہو بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بزنس۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ وہ دعائیں دیتے گھر کے اندر چلے گئے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ واپس آ گیا۔ والد صاحب کے دوستوں میں سے ایک شخص نے مجھے شانتی نکیتن میں استاد کی حیثیت سے لگوا دیا۔ میری تنخواہ بھی پچاس روپے۔ اس زمانے میں رابندر ناتھ ٹیگور زندہ تھے۔ ایک سال بعد ہم چھٹیاں گزارنے پنڈی پہنچے تو ہمارا استقبال اسٹیشن پر بڑی دھوم سے کیا گیا۔ شانتی نکیتن میں تعلیم دینا میرے لیے باعث فخر ثابت ہوا تھا۔ میرے بیوی ومنتی (دمو) کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوا تھا جو پنڈی میں رہتے ہوئے ممکن نہ تھا۔ ہم بہر حال مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

چھٹیاں گزار کر جب ہم کلکتہ گئے تو ہم نے ارادہ کر لیا کہ ہم فلمی دنیا کے لوگوں سے بھی ملاقات کریں گے۔ پرتھوی راج دمو کے بڑے بھائی کے گہرے دوستوں میں شامل تھے۔ انہوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ راج کپور کی عمر اس وقت بارہ برس تھی۔

پرتھوی راج مجھے نیو تھیٹر میں فلم کی شوٹنگ دکھانے کے لیے لے گئے۔ سہگل اور لیلا ڈیسائی کی شوٹنگ چل

رہی تھی۔ نکتین بوس ہدایت کار تھے اور فلم کا نام ”پریسیڈنٹ“ تھا۔ سہگل کو جب سگریٹ کی طلب محسوس ہوتی تو وہ دیوار کی دوسری طرف جا کر سگریٹ کے کش لگا آتے۔ سیٹ پر سگریٹ پینے کی ممانعت تھی۔ انہیں بھلا سگریٹ پینے سے کون روک سکتا تھا؟ لیکن وہ احتراماً سیٹ سے باہر نکل جاتے تھے۔ لیکن ان کی چالاکی نکتین بوس کو پتا چلا جاتا تھا، اس لیے کہ دھواں دیوار کے اوپر سے نظر آجاتا تھا۔

مستقبل میں کون جھانک سکتا تھا کہ ایک روز ونتو فلم ”دیوار“ میں پرتھوی راج کے ساتھ اہم کردار ادا کرے گی، میں لیلا دیسائی کی فلم ”کابلی والا“ میں پٹھان کا کردار ادا کروں گا۔

اگلے دن ونتو نے کہا کہ برواجی بڑے ہدایت کار ہیں ہمیں ان سے ملاقات کرنا چاہیے۔ دوسرے دن ہم ان کے گھر جا پہنچے۔ ان کے سیکرٹری کو ہم نے صرف اتنا بتایا کہ ہم شانتی نکیتن میں پڑھاتے ہیں۔ اس نے اوپر جا کر برواجی کو ہمارے بارے میں بتایا۔ ان کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکے ہوں گے۔ نیچے آکر وہ ہمارے مقابل کرسی پر بیٹھ گئے اور استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میری سمجھ خاک نہ آیا کہ اس موقع پر کیا کہنا چاہیے۔

میں نے ان کی بنائی فلموں پر تنقید شروع کر دی۔ آپ نے فلاں کردار فلاں سے کرایا، جو درست نہیں تھا۔ آپ نے فلاں فلم میں کلائمکس شاٹ اچھی طرح سے فلمبند نہیں کیا۔ برواجی خاموشی سے سنتے رہے پھر انہوں نے اچانک کہا۔ ”کیا آپ لوگ فلموں میں کام کرنا چاہتے ہیں؟“

اب پھر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس پیشکش پر کیا کہنا چاہیے۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“ ونتو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ انہوں نے دوسرے دن اسٹوڈیو آنے کی ہدایت کی۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہدایت کار یا فلمساز لوگوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے ایسا کہتے رہتے ہیں، لہٰذا ہم دوسرے دن اسٹوڈیو نہیں گئے۔

شانتی نکیتن سے ہم سیوا گرام پہنچ گئے۔ فلموں کا خیال ہم نے ذہن سے بالکل جھٹک دیا تھا۔ وہاں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں، جو ہندی رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ ایک کالج میں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ دنیا کے نقشے میں ایک عظیم تبدیلی آرہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ میسولنی اور ہٹلر کی فوجیں یورپ میں تباہی مچا رہی تھیں۔ سبھاش چندر بوس کو گاندھی جی نے کانگریس سے استعفا دینے کو کہا۔ وہ مستعفی ہو گئے تو سارے ملک میں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑنے لگی۔

سیوا گرام میں ہم روزانہ بڑے لیڈروں کا دیدار کرتے تھے، مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا آزاد۔ ونتو نے تو کالج میں منعقد ہونے والی ایک سیاسی تقریب میں پنڈت جی کو اپنے ہاتھ کی چائے بھی پلائی تھی۔ میں جس کالج میں پڑھاتا تھا اس کے صدر ذاکر حسین تھے۔ ہم شب و روز سیاست میں اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ ایسے میں فلم میں کام کرنے کا خیال کیسے دماغ میں آتا؟

دوسری جنگ عظیم میں شدت پیدا ہو گئی۔ زندگی میں ایک اور انقلاب آیا کہ ہماری تعلیمی کارکردگی دیکھ کر بی بی سی ریڈیو نے ہمیں ملازمت کی پیشکش کی۔ جسے ہم نے قبول کر لیا۔ ہم اور ونتو لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر سکوت چھا گیا تھا۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ ہٹلر کو جو کچھ چاہیے تھا وہ اسے مل گیا، چنانچہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چمبرلین کی حکومت خواب غفلت میں سو رہی تھی۔ لندن میں ابتدائی پانچ مہینے ہم نے خوب عیش کیے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ بہر حال میں اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ دولت کی جو فراوانی دیکھنے میں آرہی ہے، وہ ہمارے ملک سے چھینی گئی ہے اور ہمارا ہی خون چوسا گیا ہے۔ لیکن تحت الشعور میں دبی ہوئی حسرتیں بیدار تمناؤں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں سنہری بالوں والی پریاں دور سے ہی نظر آتی تھیں، یہاں جتنی چاہو جھپٹ لو۔ لندن میں بے پروائی، آزادی اور سہولتوں کی بھرمار تھی، جب کہ ہندوستان میں زندگی فکر و کشمکش اور تردد سے بھری ہوئی۔ ہر طرف مشقتوں کا دور دورہ تھا۔

لندن میں رہتے ہوئے میں چاہتا تو انگریزی

فلمیں اور اسٹیج ڈرامے دیکھ سکتا، لیکن ایسا کرنے سے میری تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔ چنانچہ میں اس تماشے سے باز رہا۔

ہٹلر نے جب از سرِ نو جنگ کا آغاز کیا تو بے چینی اور اضطراب پھیلنے لگا۔ ساری بے فکری اور عیش غارت ہو کر رہ گیا۔ موت کا خوف ہمیں دہلائے دے رہا تھا۔ میں اور میرا ملک اس جنگ میں شریک نہ تھا پھر ہمیں کیوں پریشانی لاحق تھی؟ ہمارا کیا قصور تھا؟

ہم نے فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ مگر جتنی دیر ہم ہال میں بیٹھے رہتے سکون سے گزار دیتے، لیکن باہر آ کر جب دھماکے سنائی دیتے ہمارے حوصلے جواب دے جاتے۔ کبھی فلمیں میری نظر میں ایک فن تھیں، مگر اب وہ میرے معیار سے گر چکی تھیں۔ مجھے صراحت سے پتا چل گیا کہ وہ زندگی کی خشک حقیقتوں سے نجات دلانے کا محض ایک وقتی ذریعہ تھیں۔ شراب، سگرٹ یا عورت کی طرح کا ایک نشہ۔

زندگی میں ایک اور انقلاب اس وقت آ گیا جب روس اس جنگ میں برطانیہ کا حمایتی بن کر کود پڑا۔ چند سینما گھروں میں روسی فلمیں دکھائی جانے لگیں۔ پہلی فلم جو میں نے دیکھی وہ "سرکس" تھی۔ معیاری فلم تھی۔ مجھے بہت مزہ آیا۔ وہ اور اس جیسی دوسری روسی فلموں کو دیکھ کر انسانیت پر میرا یقین پختہ ہو گیا۔ میں خود میں ایک نئی طاقت حلول کرتی محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح سویت یونین، مارکسزم اور لینن ازم سے میرا پہلا تعارف فلموں کے ذریعے سے ہوا۔ میں نے کتابیں پڑھیں تو پتا چلا کہ سوشلزم اور مارکسزم کے نظریات کس طرح انسانی ترقی کے لیے ایک نیا راستہ ہیں۔

ہمارے ملک کی خبریں بھی کچھ کم پریشان کن نہ تھیں۔ بنگال میں قحط، گاندھی جی اور نہرو کے قید کیے جانے کی خبریں وغیرہ نے دل کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ساری ناانصافیوں کے باوجود ہماری تحریک کی امیدیں اشتراکیت اور جمہوریت کی فتح کے ساتھ منسلک ہیں۔ ہم ہٹلر کی فاشی بربریت کے ساتھ نہیں ہیں۔

اس اثنا میں، میں نے اپنی اردو اور ہندی سدھارنے کی کوشش کی اور بہت سے انگریزی مصنفوں کو دوست بنا لیا۔ کئی فنکاروں سے بھی تعلقات قائم کر لیے۔ بی بی سی آنے والے فنکاروں میں، میں نے ایک بات دیکھی کہ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ وہ براڈ کاسٹنگ کے وقت آدھا منٹ بھی لیٹ نہیں ہوتے تھے۔ کام اس طرح کرتے تھے کہ چھوٹے بڑے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک۔

مجھ سے زیادہ میری بیوی دمتو نے ریڈیو سے سیکھا۔ وہ فوجی بھائیوں کے لیے پروگرام نشر کیا کرتی تھی۔ اس کے پاس دور و نزدیک سے ڈاک آیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تحفے تحائف۔

اداکار بننے کا تو ابھی ہمارے دل میں کوئی خیال نہیں آیا تھا البتہ وطن واپس جانے کی خواہش شدید ہو چکی تھی اس لیے کہ میرے بیٹے کو میری ماں نے روک لیا تھا کہ جنگ کے زمانے میں وہ اسے ہمارے ساتھ نہیں بھیج سکتیں۔ اب اس کی یاد ہمارے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔

1944ء میں جرمنی کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ بحری راستے کھلنے لگے۔ ہم وطن جانے کی تیاری کرنے لگے۔ وطن جا کر کیا کریں گے؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہی خیال آتا تھا کہ شانتی نکیتن چلیں۔ لیکن کیا وہ ہمیں قبول کر لیں گے؟

بحری جہاز بمبئی پر جا کر رکا۔ میں دمتو کے ساتھ اترا۔ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اجنبیت سی تھی۔ اس کے باوجود وطن لوٹ آنے کی خوشی تھی۔ میں نے دھوتی باندھ لی اور کلے میں پان دبا لیا۔ جب میں پیک تھوکنے کے لیے بجلی کے کھمبے کے قریب گیا تو میں نے وہاں وی شانتا رام کی فلم "شکنتلا" کا پوسٹر لگا دیکھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ شانتا رام کی فلم "آدمی" دیکھے ہوئے مجھے چار برس ہو چکے تھے۔

"شکنتلا" دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ ساری فلم پونا میں فلمائی گئی تھی۔ حقیقت سے قریب مناظر تھے۔ یہاں تک کہ باورچی خانہ اور کمرے تک ویسے ہی تھے جو میں استعمال کر چکا تھا۔ میں نے شانتا رام کو تعریفی خط لکھا، جواب کی توقع نہیں تھی۔ مگر خلافِ توقع جواب آ گیا۔ انہوں نے مجھے اسٹوڈیو آنے کی دعوت دی تھی۔ میں وقت مقررہ پر... بھات اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ گیٹ پر میرا استقبال ایک شخص نے کیا۔ پھر وہ مجھے اوپر لے گیا اور مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ وہاں ایک شخص پہلے

سے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے گھورتا رہا پھر اس نے مجھے انگریزی میں پوچھا۔ ”کیا آپ ہی مسٹر ساحنی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔ ”میں شانتا رام ہوں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ اتنا سادہ شخص ہدایت کار کیسے ہو سکتا ہے؟ سادگی تو میں نے بروا جی میں بھی دیکھی تھی، لیکن وہ جدید قسم کے آدمی تھے جب کہ یہ شخص تو کسی پرائمری اسکول کا استاد لگتا تھا۔ میں ان کے قریب گیا اور میں نے کہا کہ میں ان کی فلم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

انہوں نے جواب میں کہا کہ وہ بھی مجھ سے واقف ہیں۔ میری کہانیاں انہوں نے ہندی رسالوں میں پڑھی ہیں۔ مجھ سے کچھ بن نہ پڑا تو ہکلانے لگا۔ انہوں نے کہا۔ ”اگر آپ کے پاس اپنی کوئی کہانی ہو یا کسی دوست نے لکھی ہو اور وہ فلم بنانے کے لیے مناسب ہو تو مجھے بھیج دیجیے گا۔ مگر وہ پہلے کہیں شائع ہو چکی ہو۔ تاکہ بعد میں کوئی اور دعوے دار نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میں دنیا کا اعلا ادب فلمانا چاہتا ہوں۔“

میں نے سوچا کہ وہ مصروف آدمی ہیں۔ ان کا زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے مجھے اسٹوڈیو دکھانے کی پیشکش کی لیکن میں نے معذرت کر لی کہ میں کلکتہ میں نیو تھیٹر کا اسٹوڈیو دیکھ چکا ہوں۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ مگر جب میں نے ان کی اگلی فلم دیکھی تو مجھے یقین نہ آیا کہ اسے وی شانتا رام نے فلمبند کیا ہے۔ میں ایک روز نیشنل بینک سے رقم نکلوا رہا تھا تو میں نے قریب ہی ایک شخص کو کھڑا دیکھا۔ وہ چیتن آنند تھے۔ لاہور کالج میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے دو سال پیچھے تھے اس کے باوجود ہم اچھے دوست تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے انہوں نے ایک کالج میں پڑھایا تھا، لیکن اب فلم میں آگئے ہیں۔ اس وقت تین فلموں کے ہیرو ہیں۔ لائن میں کھڑے زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے گھر آنے کو کہا۔ ان کا گھر باندرہ پالی ہل پر تھا۔

میں ونتو کے ساتھ وہاں پہنچا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ سان و گمان میں بھی نہ تھا بمبئی میں اتنی خوب صورت پہاڑیاں ہو سکتی ہیں۔ اس کا مکان ڈھلان پر تھا۔ اوپری منزل پر اس کا مالک رہتا تھا۔ چیتن کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ جنگ کے بعد فلمی دنیا میں بڑی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اب صرف اسٹوڈیو کے مالک ہی فلمیں نہیں بناتے اور نہ ہی اداکار اور ہدایت کار تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ فلموں کی مانگ بڑھ گئی ہے، اس لیے مالکان اسٹوڈیو کو کرائے پر دے کر زیادہ پیسے کما لیتے ہیں۔ اب ایک ہی اسٹوڈیو میں آٹھ دس فلموں کے سیٹ لگ جاتے ہیں۔ پروڈیوسر سیٹھوں سے روپیا لیتا ہے اور ہدایت کار، کہانی نویس، اداکاروں اور تکنیکی عملے سے ٹھیکا لے لیتا ہے۔ ہر کسی کو آزادی ہے کہ وہ چاہے تو بیک وقت تین چار پروڈیوسروں کی فلموں میں کام کر سکتا ہے۔ اس طرح اداکار تیس چالیس ہزار روپے کما سکتا ہے۔ سہگل کی آمدنی اس وقت سب سے زیادہ ہے جبکہ پہلے انہیں پانچ ہزار روپے ملتے تھے۔ اداکاروں کی پتنگ آسمان کو چھونے لگی ہے۔ اس لیے کہ فنانسر ان کے نام کو دیکھ کر ہی پروڈیوسر کو روپیا دیتا ہے۔ اسے اسٹار سسٹم کہتے ہیں۔

ان کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی تھیں، مگر اتنا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مہذب معاشرے میں فلموں کو اب برا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اچھے خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں فلموں میں آرہے ہیں۔ بڑے لکھنے والے جیسے کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور جوش اب بمبئی آکر آباد ہو رہے ہیں اور ہزاروں روپے کما رہے ہیں۔ کرشن چندر سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ میری کہانیاں ہندی میں پڑھنے کے بعد انہوں نے بھی کہانی نویس بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ چیتن نے بتایا کہ انہوں نے بنگال پر اچھے افسانے لکھے ہیں اور ان کے ناولٹ ”ان داتا“ نے تو قیامت مچا کر رکھ دی ہے۔

جب میں لندن میں تھا تو میرا افسانے اور کہانیوں سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ بہرحال اب یہ سوچ کر اطمینان تھا کہ اگر میں کچھ نہ کر سکا تو کم از کم کہانی نویس بن کر دو چار پیسے کما لوں گا۔ فلمی اداکار بننے کا خیال بھی دور تھا۔ میں نے چیتن سے کہا۔ ”یار تم تو کہتے تھے کہ ہندوستانی فلموں کا معیار بلند ہو گیا ہے۔ یہ شانتا رام نے کالی داس کے ناول کو کیا سے کیا بنا دیا؟“

چیتن ہنسا اور اس نے جواب دیا۔ ”شانتا رام نے باکس آفس فلم بنائی ہے۔ اس لیے تمہیں عجیب سی لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ تم نے ناول کو ڈوب کر پڑھا

ہے۔ فلم تمہیں اس کے مطابق نہیں لگی ہوگی۔"

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس لیے کہ لفظ باکس آفس میرے لیے بالکل نیا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہی میرے مستقبل کے لیے ایک عذاب بن جائے گا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اب فلم فنی اعتبار سے نہیں دیکھی جاتی۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے بزنس کتنا کیا۔ شانتا رام کی فلم باکس آفس کے ریکارڈ توڑ رہی ہے۔"

"لیکن شانتا رام کی فلمیں پہلے بھی چلتی تھیں۔" میں نے کہا۔

"مگر اب سنجیدہ فلمیں پسند نہیں کی جاتیں۔ لوگ تفریح چاہتے ہیں۔ ناچ، گانا اور تھوڑی سی فائٹ، عریانی فحاشی۔ دراصل پہلے کی سنجیدہ اور یکساں فلمیں دیکھ دیکھ کر انہیں اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔"

"تو پھر پربھات اور نیو تھیٹر اب کیا کرتے ہیں؟"

"یہ فارمولا سب سے پہلے پنچولی صاحب نے اپنایا اور "خزانچی" بنا ڈالی۔ فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگئی۔ اس قسم کی اور فلمیں بھی بننے لگیں۔ نیو تھیٹر اور پربھات دونوں کی بھینس پانی میں ڈوب گئی۔ شانتا رام نے بھی ان لوگوں سے رابطہ ختم کرلیا اور بمبئی آگئے۔"

خزانچی کے حوالے سے میں نے اور ونتو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جب ہم بی بی سی میں تھے تو اس فلم کے گیت سامعین کو سنانے کے لیے انڈیا سے ہمارے پاس آئے تھے۔ ان گیتوں میں انگریزی اور اردو لفظوں کا میلاپ کیا گیا تھا، جسے سن کر ریڈیو کا عملہ خوب ہنسا تھا۔ جبکہ ہمارے لیے اس میں ہنسی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہمیں بلکہ برا لگا تھا۔ اس لیے کہ ہم تو سہگل کے دیوانے تھے۔ مگر فوجی بھائیوں کی فرمائش ایسے ہی گیتوں کے لیے ہوتی جو خزانچی میں تھے۔ انڈیا سے ایسے گانے اور آگئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وقتی بات ہے۔ آگے جاکر ختم ہوجائے گی۔

"تم کیا ارادے لے کر فلم لائن میں آئے ہو؟" میں نے چیتن آنند سے پوچھا۔

"میں ایک حقیقت پسندانہ فلم بنانا چاہتا ہوں۔ باکس آفس کے فارمولوں کی مجھے بالکل پروا نہیں ہوگی۔ اس فلم کا نام ہوگا "نیچا نگر"۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔

چھٹیاں ہوئیں تو میں گھر والوں سے ملنے کے لیے پنڈی چلا گیا۔ ماں ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ تھوڑے دن وہاں گزار کر ہم کشمیر کی طرف چلے گئے۔ کشمیر میں چیتن سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے پاس آکر ٹھہر گئے۔ فلم "نیچا نگر" کے لیے لوکیشن دیکھنے آئے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ تیاریاں مکمل ہوچکی ہیں۔ ہیرو کے لیے وہ مجھے اور ہیروئن کے لیے ونتو کو لینا چاہتے ہیں۔ معاوضہ بیس ہزار روپے ہوگا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہمیں شیخ چلی کے خواب تو نہیں دکھلا رہے تھے؟

سری نگر سے میں شانتی نکیتن کو خط لکھ چکا تھا کہ مجھے وہاں سیٹ ہونے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ انہوں نے جواب میں ہاں کر دی تھی۔ والد صاحب میرے شانتی نکیتن جانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ مجھے چاہیے کہ میں بی بی سی کے تجربے کا فائدہ اٹھا کر ریڈیو میں ملازمت کرلوں۔ اب زندگی ایک نیا تماشا دکھا رہی تھی۔ ہمیں کس راہ پر چلنا تھا، اس کا فیصلہ کون کرتا؟ اگر انہیں معلوم ہوجاتا کہ میں فلمی دنیا میں جانے کے خواب دیکھ رہا ہوں تو گھر میں قیامت ڈھا دیتے۔

ہم میاں بیوی نے سوچا کہ بیس ہزار کی رقم کا فائدہ تو اٹھا لینا چاہیے۔ زندگی میں ہزاروں اول جلول کام کیے تھے۔ ایک اور سہی۔

ایک شام دریائے جہلم کے کنارے ٹہلتے ہوئے چیتن آنند نے مجھے فلم کی کہانی سنائی۔ میں کہانی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ روسی مصنفوں سے متاثر ہوکر لکھی گئی تھی۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ اس فلم کی حد تک ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

فلم پونا میں بننا تھی۔ ہمیں بیس ستمبر تک ہر حال میں وہاں پہنچنا تھا۔ ڈبلیو زیڈ احمد اس کے فلمساز تھے جب کہ ہدایت کاری چیتن خود کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جولائی کے آخر میں چیتن بمبئی چلے گئے۔ ہم نے فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرلی۔ گھر والوں سے اب بھی یہ بات پوشیدہ رکھی تھی۔

اس عرصے میں میں نے بہت سی ادبی کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ خاص طور پر کرشن چندر کا ناول "ان داتا" پڑھا۔ وہ حقیقت میں ایک شہکار تھا۔

لکھنے کا پھر شوق پیدا ہوا تو میں نے ایک کہانی لکھ ڈالی۔ میری کہانیاں ”ہنس“ نامی میگزین میں شائع ہوتی تھیں۔ کہانیاں ان کے معیار پر پوری اترتی تھیں، اس لیے وہ کوئی کہانی واپس نہیں کرتے تھے۔ اب جو میں نے کہانی لکھ کر بھیجی تو انہوں نے معذرتی خط کے ساتھ واپس کر دی۔ یہ میری خودداری پر ایک تازیانہ تھا۔ اتنا گہرا تازیانہ کہ میں نے اس کے بعد کوئی کہانی نہیں لکھی۔

شاید اسی تازیانے کا اثر تھا کہ میں نے فلم میں کام کرنا منظور کر لیا تھا۔ نہ جانے میں نے کیسے اس کا اظہار ایک دوست پر کر دیا۔ بات جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ میرے والد صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے بیس ہزار والی بات بتائی تو وہ خاموش ہو گئے۔

بیس ستمبر نزدیک آنے لگا تو میری بے قراری بڑھ گئی۔ چیتن کی طرف سے ایک گول مول سا خط آیا مگر پیسے نہیں آئے۔ میرے چھوٹے بھائی بھیشم نے وہ خط پڑھا تو اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے مجھے منع کیا کہ بچوں اور ونتو کو نہ لے جاؤں۔ پہلے خود اکیلے تیل کی دھار دیکھوں۔ میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ پونا پہنچا تو بارش ہو رہی تھی۔ یاد آیا کہ انگریز اس جگہ سے بڑی محبت کرتے تھے۔

اسٹیشن پر کرشن چندر مجھے لینے آئے تھے۔ رات میں ان کے گھر ٹھہرا۔ صبح چیتن لینے آ گئے۔ ہم اسٹوڈیو کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسٹوڈیو میں شوٹنگ کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ مختلف ٹولیوں میں لوگ گھوم رہے تھے۔ جیسے کسی جنازے کو کاندھا دیا جانے والا ہو۔ نہ کہیں کیمرا تھا نہ لائٹیں۔ بہت سے شناسا لوگ مل گئے ان سے گپ شپ ہوتی رہی۔ میں اکتا سا گیا۔ اچانک ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ میں میک اپ کر لوں تاکہ کلوز اپ لیے جاسکیں۔ ڈبلیو زیڈ احمد دو بجے مجھ سے ملیں گے۔

جب میک اپ ہو چکا تو میرے فوٹو لیے گئے۔ اس کے بعد میں نے احمد صاحب کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا اور میں انتظار کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ کئی بار میں نے چیتن کا بازو تھام کر کہا کہ اب یہاں سے چلو، مگر وہ کہتے کہ انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ انہیں اس لائن کی واقفیت تھی اور وہ جانتے تھے کہ کب کیا کرنا چاہیے۔

پھر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جاؤں کہاں؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ اب تو واپسی کا ٹکٹ ہی کٹانا پڑے گا۔ وہاں سب مذاق اڑائیں گے کہ بغیر کسی پکی لکھت پڑھت کے میں اندھا دھند کیوں پونا بھاگ آیا؟

چھ بجے احمد صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کی میز پر میرے فوٹو پڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا۔ ایک فوٹو تو مجھے بھی اچھا لگا۔ انہوں نے اپنا سگار ہونٹوں سے لگا کر کہا۔ ”آپ کی اسکرین بیوٹی اچھی ہے۔ بہرحال میں اب معاملے کی بات کرتا ہوں کہ چیتن کی فلم نیچا نگر بنانے کا ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں ”مہابھارت“ بنانا چاہتا ہوں۔ چیتن اس میں کرشن کا کردار ادا کریں گے۔ انہیں میں ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار دوں گا۔ ارجن کا کردار آپ ادا کریں گے۔ آپ کو ایک ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔ اگر منظور ہو تو اس ... کانٹریکٹ پر دستخط کر دیجیے۔“ انہوں نے میرے سامنے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ”بات شروع کرنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ آپ چار گھنٹے تاخیر کی معافی مانگیں گے۔ بہرحال مجھے روپے کی پروا نہیں ہے۔ اس سے تین گنا تو میں بی بی سی میں کما لیا کرتا تھا۔ میں تو چیتن کی فلم میں کام کرنے آیا تھا۔ وہ ترقی پسندانہ رجحان کی کہانی ہے۔ میرا ارجن بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں انہیں سلام کر کے باہر نکل آیا۔ چیتن وہاں نہیں تھا۔ غالباً انہوں نے اسے کسی اور راستے سے اندر بلا لیا تھا۔

کچھ اور واقف کار وہاں بیٹھے تھے میں نے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد چیتن باہر آ گئے۔ انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو کانٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے تو آپ کی وجہ سے دستخط نہیں کیے تھے اور آپ نے کانٹریکٹ منظور کر لیا۔“ یہ سن کر وہ دوبارہ احمد کے کمرے میں گئے اور انہوں نے کہا کہ کانٹریکٹ پھاڑ دیا جائے۔ احمد صاحب نے کانٹریکٹ تو نہیں پھاڑا۔ لیکن یہ کہا کہ وہ کام نہیں کرنا چاہتے تو نہ کریں، وہ اس کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔

چیتن باہر آئے اور ہم بمبئی کے لیے چل

پڑے۔ بعد میں ڈبلیو زیڈ احمد پاکستان چلے گئے۔ کافی عرصے بعد جب میں پاکستان گیا تھا تو ان سے امتیاز علی تاج کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے تپاک سے ملے تھے۔ اس وقت میں نے سوچا کہ ایک نئے اداکار کو وہ ایک ہزار روپے ماہانہ دے رہے تھے تو کیا برائی کر رہے تھے؟ بلاشبہ میں نے اس وقت ایک جذباتی فیصلہ کیا تھا۔

چیتن نے بھی میرے ساتھ دوستی نبھائی۔ ورنہ مجھے مشورہ دیتا کہ میں اپنے دماغ کا علاج کراؤں۔ میں نے ایک بار پھر اس کے مکان پر ڈیرہ ڈال دیا۔ ونتو بھی پنڈی سے آگئی۔ میرا بیٹا چار برس کا تھا اور بیٹی پانچ ماہ کی۔ دراصل یہ بات پھیل گئی تھی کہ ونتو بھی فلموں میں کام کرے گی۔ والد صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ونتو کو وہاں سے آتے ہی بنی۔ مگر وہ اس کے حق میں نہیں تھی کہ چیتن پر اتنا بوجھ ڈالا جائے۔ بہرحال عمر ایسی تھی کہ ہم پریشانیوں میں بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔

آج میرا اپنا مکان ہے۔ پانچ افراد کے لیے دس کمرے ہیں۔ بیٹا اور بیٹی ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔ پانچ گاڑیاں ہیں۔ سب ہی عیش اڑا رہے ہیں۔ چیتن، دیو اور وجے۔ بہرحال انہیں بھی اعتراف ہوگا کہ زندگی اتنی پُرلطف نہیں ہے جتنی کہ اس وقت تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد میں اور چیتن انڈیا کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے۔ وہاں سوشلسٹ، کمیونسٹ اور کانگریسی زبردست بحث مباحثہ کرتے نظر آتے۔ اس کے علاوہ اخبار نویس، اداکار بننے کے امیدوار بھی ہوتے تھے اور ان پر مر مٹنے والی تتلیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس ماحول میں خیالات اور نظریات کی حرکت ہوتی تھی۔ اب جنگ آخری سانس لے رہی تھی۔ یو این او کے دستور بنا رہے تھے اور کچھ ہی دنوں میں گاندھی اور جناح کی ملاقات ہونے والی تھی۔

چیتن کی میز مرکزی بن جاتی۔ سب اپنی اپنی کرسیاں اس کے گرد گھسیٹ لیتے۔ بات ''نیچا نگر'' کی تیاری سے شروع ہوتی اور مایوسی پر ختم ہو جاتی۔ ایسی فلم پر کون رقم لگانا پسند کرتا جس میں بڑی کاسٹ نہیں تھی اور نہ پبلک کے لیے کوئی مسالا تھا۔ نہ کوئی ناچ گانا اور نہ طوفان بدتمیزی تھی۔ میرا خیال تھا کہ چیتن اگر ہم میاں بیوی کا خیال چھوڑ کر کسی معروف اداکار کو لے لیتے تو مسئلہ حل ہو جاتا، لیکن وہ دوست کو زبان دے چکے تھے۔ اس لیے کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ وقت کیسے اور کہاں گزارا جائے؟ پھر بے روزگاری۔

فنی داچیتن کے گھر کے قریب رہتے تھے اور ان کا شمار بڑے ہدایت کاروں میں ہوتا تھا۔ وہ ان سے میرے لیے سفارش کر کے آگئے۔ انہوں نے مجھے اپنے دفتر بلا لیا۔ ان کا دفتر دادر مین روڈ پر تھا جو بمبئی کا ہالی ووڈ تھا۔ بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ سیکڑوں کے حساب سے فلمی دفاتر ہوا کرتے تھے۔

میں فنی دا کے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہ اپنی بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے تھے۔ کچھ افراد اور بھی تھے۔ انہوں نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھا تو دوسرے افراد سے باتیں کرتے رہے اور مجھے گھورتے رہے۔ عمر میں وہ مجھ سے چھوٹے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔ بہرحال میں نے کوشش کی کہ میرے دل کے تار ان کے دل کے تاروں سے مل جائیں۔

دوسرے افراد ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جب ہم تنہا رہ گئے تو انہوں نے کہا وہ ایک فلم بنا رہے ہیں ''جسٹس''، جس میں ہیرو کے دوست کا چھوٹا سا کردار ہے۔ اس کے بعد کی فلم میں درمیانے درجے کا کردار ہوگا۔ پھر تیسری فلم میں وہ مجھے ہیرو کا رول دیں گے۔ میں ان سے ہاتھ ملا کر چلا آیا۔ میرا سینہ پھولا جا رہا تھا کہ میں فلمی اداکار بن چکا تھا۔ گھر آیا تو چیتن نے پوچھا کہ پیسے کی کوئی بات ہوئی؟ میں نے بتایا کہ نہیں۔

''کی ہوتی۔'' انہوں نے زور دے کر کہا۔

''انہوں نے میرے سامنے تین فلموں کا پروگرام رکھا تھا۔ میں کس کی بات کرتا؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

میرا خیال تھا کہ جب کانٹریکٹ ہو گیا ہے تو فلم کی شوٹنگ دوسرے دن سے شروع ہو جائے گی، لیکن دن پہ دن گزرتے گئے اور شوٹنگ کے لیے کوئی کال نہیں آئی۔ دل بے زار ہونے لگا۔

ایک شام میں نے اخبار میں پڑھا کہ ''پیپلز تھیٹر'' اپنا ڈراما پیش کرنے والی ہے۔ میں نے ایک اخباری صحافی سے پوچھا کہ کیا اس نام کی کسی ڈراما کمپنی سے وہ واقف ہے۔ ساتھی نے جواب دیا کہ وہ اس کا ممبر ہے اور

آج شام وہاں خواجہ احمد عباس اپنا ڈراما پڑھیں گے۔ اگر میں چاہوں تو چل سکتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی اور چیتن سے کہا کہ وہ بھی چلے۔ وہ بھی تیار ہوگیا۔

اوپیرا ہاؤس کے نزدیک ایک ہال تھا جہاں سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ ایک طرف اسٹیج تھا۔ شام کو وہ اسٹیج ''اپٹا'' کی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا تھا (انڈین پیپلز تھیٹر) ہال میں تقریباً بیس لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ عباس صاحب کو میں ان کی کہانیوں کی بنا پر جانتا تھا۔ ویسے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہاتھ ملالیا۔ پھر اسٹیج پر جا کر ڈراما پڑھا اور اعلان کیا کہ بلراج ساہنی اسے ڈائرکٹ کریں گے۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ انکار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ بیکار بیٹھ کر کیا کرتا؟ اچانک اس طرح کی پیشکش ملنے پر مجھے قسمت کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ اب میں اپٹا میں ایک اہم مقام بنانے والا ہوں۔ ڈرامے کا نام ''زبیدہ'' تھا۔ وہاں ایک ڈراما رات کو بھی پیش کیا گیا۔ میں نے اسے دیکھا۔ اداکاروں کی زبان اور تلفظ درست نہیں تھا۔ جب میں بی بی سی میں تھا تو میں نے اس کے لیے بہت محنت کی تھی۔ اگر ''زبیدہ'' میں انہی اداکاروں سے کام لینا پڑا تو میرا بھٹا بیٹھ سکتا تھا۔ میں گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔

دوسرے دن میں نے جا کر عباس صاحب سے کہا کہ کرداروں کے انتخاب کے لیے میں آزاد ہوں گا۔ کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اپٹا کے سیکریٹری جسونت نے اس کی اجازت دے دی۔ میں وہاں سے آگیا۔ ہیرو کے کردار کے لیے میں نے چیتن کو راضی کر لیا۔ اس کے بھائی کے کردار کے لیے دیو آنند راضی ہوگیا۔ اس کے علاوہ تین کردار اور تھے۔ ان کے مطابق اداکار کہاں سے لاتا؟

اس کے علاوہ مجھے ہدایت کاری کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شانتی نکیتن میں میں نے چند ڈرامے کیے تھے لیکن اسے تجربہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں عباس صاحب نے یہ ڈراما میرے سپرد کردیا تھا۔ بہرحال جتنے اداکار ملتے گئے۔ میں ریہرسل کراتا چلا گیا۔ جسونت نے میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ بہترین مشورے بھی دیے۔ اس دوران میں نے بمبئی کو خوب گھوم کر دیکھا اور خوب ڈرامے دیکھے۔ عباس صاحب نے کہا۔ ''اب یہ بھی کمیونسٹ ہوتا جارہا ہے۔''

مجھے اپنے کمیونسٹ بننے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری دل چسپی کا مرکز زبیدہ ڈراما تھا جسے مجھے پیش کرنا تھا۔ ڈرامے میں ایک سین دولہا کے بارات لانے کا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر باہر سے بارات لائی جائے اور تماشائیوں کے درمیان سے گزر کر پچھلے دروازے سے نکل جائے پھر دولہا اسٹیج پر آجائے تو کیسی رہے گی؟ میں نے یہ آئیڈیا جسونت کو سنایا تو اچھل پڑا۔ میں نے کہا کہ یوں ہی پھٹیچر سا خیال آگیا تھا، ضروری نہیں کہ اس پر عمل بھی کیا جائے۔ مگر وہ بضد ہوگیا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ڈراما پیش کیا گیا اور اس منظر پر کہ دولہا ناظرین کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے، اتنی تالیاں پیٹی گئیں کہ ہال کی دیواریں لرزنے لگیں۔ ہیرو کا کردار میں نے خود ادا کیا اس لیے کہ چیتن کو ڈرامے کے پہلے ہی دن دمے کا دورہ پڑ گیا تھا۔

میں ایک دن اپٹا کے آفس میں بیٹھا تھا کہ اچانک بلاوا آیا کہ شوٹنگ کرنا ہے، جلدی سے آجایئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی اور وہاں سے چل پڑا۔ میں نے واضح محسوس کیا کہ لوگوں کے چہروں کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ ان کا ردِعمل ایسا تھا جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں پیار کے بجائے ان کے حسد کا شکار ہوگیا تھا۔ زندگی میں آگے چل کر بھی یہی کچھ دیکھنا پڑا۔

شوٹنگ کے لیے سات بجے بلا لیا گیا تھا، حالانکہ شوٹنگ نو بجے شروع ہوتی تھی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اتنا پہلے کیوں بلا لیا۔ بہرحال پہلی شوٹنگ تھی، اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔ نو بجے فنی دا آئے اور دس بجے تک دوسرے بڑے اداکار، وہ ہوٹل تاج سے ڈنر میں شرکت کر کے آئے تھے۔ ان کے لیے ایک میز لگائی گئی اور چائے وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ وہ چائے پی کر چلے گئے کہ آج کام کا موڈ نہیں ہے۔ فنی دا نے کچھ نہ کہا۔ سب کچھ خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ اس لیے کہ وہ اس سسٹم کے عادی ہوچکے تھے۔

میرے علاوہ ہیرو بھی تھا اور فنی دا سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی شوٹنگ کرلیں۔ کیمرا اور لائٹیں درست کردی گئیں۔ اداکاری کے جوہر دکھانے کے لیے بہت جگہ تھی۔ آسانی سے ہاتھ پاؤں ہلائے جاسکتے تھے۔ کیمرا

لانگ شاٹ پر تھا۔ منظر کچھ یوں تھا کہ میں لہراتا ہوا ہیرو کے کمرے میں داخل ہوتا ہوں اور اپنا ہیٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکا دیتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ سلگا لیتا ہوں۔ میں چونکہ فیشن پرست ہوں اس لیے ہیرو کے دقیانوسی خیالات پر طنز کرتا ہوں۔ چند مکالموں کے بعد سین کٹ ہو جاتا تھا۔

نئے جواری کا پہلا داؤ سیدھا پڑتا ہے۔ اس لیے جب میں نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سے دھوئیں کے چھلے بنانا شروع کر دیے تو بڑی داد ملی۔ دو چار اور شاٹ لیے گئے۔ صبح کے قریب میں گھر پہنچا۔ تین دن کے بعد پھر شوٹنگ کے لیے بلایا گیا۔ میں گیا تو مردوں کا میک اپ کیا جا رہا تھا۔ وہاں ایکسٹرا لوگوں نے مجھے یہ سن کر تعظیم دی کہ میں لندن پلٹ ہوں۔ وہ سب شائستہ مزاج تھے اور گھروں سے اچھے کپڑے پہن کر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس کی فرنیچر کی دکان ہے اور وہ خود بھی فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مجھے اس میں ویلن کا کردار دے گا۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

پہلے تو میرا کوئی شاٹ نہیں تھا، البتہ ایک گھنٹے کے بعد لائٹیں مجھ پر پڑنے لگیں اور کیمرا اسیٹ کر دیا گیا۔ میں حواس باختہ سا ہو گیا کہ کرنا کیا ہے، یہ تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔ پھر فنی دا نے کہا میرے سامنے ایک پلیٹ رکھی جائے گی اور اس میں ایک بھنا مرغ ہو گا۔ اسسٹنٹ کہے گا۔ ”ولینن“ میں اس مرغ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کہوں گا۔ ”جانور۔“ اس عظیم لیڈر کے ساتھ جانور کا لفظ جوڑتے ہوئے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اب دو ہی راستے تھے کہ میں کام کرنے سے انکار کر دوں اور گھر چلا جاؤں یا وہی کچھ کروں جو کہا جا رہا ہے۔

پہلے تو میری آواز درست طریقے سے نہ نکلی، لہٰذا سین کٹ ہو گیا۔ فنی دا نے کہا۔ جانور مسکرا کر کہنا ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ چہرہ پھر اکڑ گیا۔ سین پھر کٹ ہوا۔ تیسری بار سین او کے ہوا اور فنی دا نے مجھے شاباش دی۔ ”گڈ شاٹ، او کے۔“

لوگوں نے سیٹیاں بجائیں اور پھر فنی دا کے کہنے پر مٹھائی تقسیم کی گئی۔

اگلا شاٹ سورن لتا کے ساتھ تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ ریہرسل کرنے سے انکار کر دیا۔ شاٹ میں وہ بولتی مجھ سے تھیں، لیکن دیکھتی کیمرے کی طرف تھیں۔ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے میں کوئی تیسرے درجے کی مخلوق ہوں۔ لائق نفرت۔ گندی نالی کا کیڑا۔

دلیپ کمار ان دنوں انڈسٹری میں نئے نئے آئے تھے اور فلم ”جوار بھاٹا“ میں ہیرو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی ایوب تھے جو انجمن ترقی پسند میں تھے اور پابندی سے اپٹا آتے تھے۔ شام کو وہاں تقریباً سب ہی ترقی پسند وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ ان کی وجہ سے ترقی پسندانہ نظریات کو کیا فائدہ پہنچا، میں اس کا حساب لگانے سے قاصر رہا ہوں۔

ایک دن عباس صاحب کے کہنے پر فلمستان والوں نے ڈراما زبیدہ کے فن کاروں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ وہاں نیتن بوس بھی تھے جو فلم ”مزدور“ شروع کرنے والے تھے۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہندوستان میں جتنی حقیقت پسند فلمیں بنی ہیں ان میں ”مزدور“ پہلے نمبر پر آتی ہے۔ طبقاتی جنگ کو اس میں نہایت شدت سے پیش کیا گیا ہے۔ نیتن بوس غالباً یہ چاہتے تھے کہ مزدور جیسی فلم کے فنکار بھی ترقی پسند ہونا چاہئیں، اسی لیے زبیدہ کے فنکاروں کو پارٹی پر بلایا گیا تھا۔ اس کھانے پر مدعو کیے گئے فنکاروں میں نیتن بوس کو کوئی ترقی پسند نہ لگا۔ البتہ ناصر خان (دلیپ کے چھوٹے بھائی) جو خواہ مخواہ ساتھ آ گئے تھے۔ انہیں فلم کا ہیرو چن لیا گیا۔ حالانکہ انہیں اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس سے نیتن بوس کے اعلا ہدایت کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لیے کہ ناصر خان نے وہ رول نہایت عمدگی سے ادا کیا تھا۔

ناصر خان کے لیے ہم سب نے دل میں حسد کا جذبہ جاگتا محسوس کیا۔ بہر حال کچھ عرصے بعد ہماری قسمت نے بھی یاوری کی اور پرتھوی راج نے ”پرتھوی تھیٹر“ کھولا۔ جس میں عذرا ممتاز اور ونیتی کو کام مل گیا۔ ونیتی (ونتو) کو پانچ سو روپے ماہوار ملنے لگے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بڑی رقم کہی جا سکتی ہے۔ ہم نے جلدی سے جوہو کی تھوسوفیکل سوسائٹی میں ایک بنگلا کرائے پر لے لیا۔

ہماری اپٹا کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہر روز شام کو ریہرسل ہوا کرتی تھیں۔ ہم بھاگ دوڑ کرتے ہوئے گرانٹ روڈ سے گاڑی پکڑتے اور دس بجے سانتا کروز پہنچتے۔ اگر ایک منٹ کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہاں کی

گاڑی چل پڑتی، جو لاکھ آوازیں دینے پر بھی نہ رکتی۔ مجبوراً ہم وہاں سے پیدل گھر پہنچتے۔ بھوک اتنی لگ رہی ہوتی کہ ہم بلبلا رہے ہوتے۔ وہاں ایک چنے والا کھڑا ہوتا تھا، اس سے بھنے چنے یا مونگ پھلی لے لیتے۔ اسے کھاتے ہوئے ہم اپنا سفر طے کرتے۔ انہیں چباتے ہوئے سفر کی اکتاہٹ کم ہو جاتی تھی۔ کرشن چندر کو چنے چبانے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ ان کے منہ میں چھالے نکل آئے تھے۔ ہمارے جوہو پر رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا گھر سمندر کے کنارے تھا۔ چنانچہ وہ گھر کیا تھا، صحت گاہ تھی۔ ہمارے بچے صبح سے سمندر کے کنارے کھیلنے لگتے۔ وہاں اور بھی مشہور ہستیاں رہتی تھیں۔ لیکن دل چاہنے کے باوجود ہم ان سے دور رہتے۔ کیا پتا وہ برا مان جائیں۔ ہماری ابھی حیثیت ہی کیا تھی؟

اس دوران میں نے مارکسزم کا بھرپور مطالعہ کیا۔ ''سرمایہ'' نامی کتاب میں لکھا ہے۔ ''جنس باہری چیز ہوتی ہے۔ وہ ذہنی صلاحیتوں سے کسی نہ کسی طرح انسانی ضرورتوں کو پورا کراتی ہے۔ اس بات کا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ضرورتیں جسمانی ہیں یا دماغی۔''

جن لوگوں کو مارکسزم کا علم نہیں، وہ اسے صرف ایک سیاسی نظریہ سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ مارکسزم حقیقت میں ایک فلسفہ ہے، جو قدرتی اور دنیاوی زندگی کے ہر پہلو کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر فنکار کو یہ بھی جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن کی معاشرے میں کیا حیثیت ہے۔ کیا اس اہمیت کے مطابق اسے وہ درجہ حاصل ہے جس کا وہ حقدار ہے؟ اس سلسلے میں مارکسزم کئی قسم کی غلطیوں سے پردہ اٹھا کر صحیح راستہ بتاتا ہے۔

زبیدہ کی کامیابی نے میرے لیے عظمت کا راستہ کھول دیا۔ اپٹا کا نچلا عملہ مجھ سے اس طرح پیش آتا جیسے میں کوئی اوتار ہوں۔ وہ میری جنبش نظر کے منتظر رہتے تھے۔ اپٹا کی تنظیم صرف بمبئی میں نہیں پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ ہر صوبے کے مشہور مصنفین اور فنکار اس میں شامل ہو رہے تھے۔ اپٹا کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی صحیح تھی۔ ان پالیسیوں کا لوگوں کے دلوں پر فوری اثر ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم جہاں بھی پریم دھون کا گیت گاتے لوگ کھڑے ہو کر سننے لگتے۔ پھر ان کے چہروں پر کئی گہری فکر کے آثار ابھر آتے۔

ایک دن پرتھوی تھیٹر کے ڈرامے ''دیوار'' کا پردہ اٹھا، پہلے شو میں ونتی نے پرتھوی راج کے ساتھ قدرے جھجکتے ہوئے کام کیا۔ اس کا میک اپ بھی اچھا نہیں تھا۔ شو ختم ہوا تو میں نے میک اپ روم میں جا کر ونتو کو حوصلہ دیا۔ اس کا میک اپ درست کرایا۔ دوسرے شو کے لیے پردہ اٹھا تو ونتو بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔ اس شو کے بعد ونتو کے نام کا ڈنکا پورے بمبئی میں بجنے لگا۔ ہر طرف ونتو اور ''دیوار'' کا چرچا تھا۔ اس سے پیشتر کسی ڈرامے کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ٹکٹ سینما گھروں سے زیادہ فروخت ہوئے۔ دو روز کے بعد ہمارے گھر پر فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی کاروں کی قطار سی لگ گئی۔ ہمارے لیے یہ تجربہ انوکھا اور عجیب تھا۔

اپٹا کو فلم بنانے کا لائسنس ملا تو خواجہ احمد عباس نے ''دھرتی کے لال'' نامی فلم کا اسکرپٹ لکھا۔ ہیرو کے طور پر انہوں نے مجھے کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسکرپٹ مجھے پسند نہ آیا۔ خوب بحث مباحثے ہوئے۔ کیمرا مین منہ لٹکائے انتظار کرتے رہتے۔ عباس صاحب ناراض ہو کر بھاگ جاتے تو ہم انہیں بلا کر لاتے۔ جب فلم تقریباً نصف بن گئی تو اس کے رش پرنٹس دیکھے گئے۔ مہیش کول بھی وہاں آ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ اختتام پر انہوں نے کہا۔ ''فلموں پر سے میرا یقین اٹھتا جا رہا تھا، لیکن آپ نوجوانوں نے اسے پھر سے قائم کر دیا۔''

راج کپور ان کے پاس کھڑے تھے اور اداکار کی حیثیت سے انہیں ابھی کوئی نہیں جانتا تھا، انہوں نے بھی اس کی خوب تعریف کی۔

میری زندگی کے دن پھر گئے تھے۔ اس لیے کہ دن میں کام کرنے کے لیے مجھے ایک اور فلم ''دور چلے'' مل گئی۔ اب میں دن رات شوٹنگ کر رہا تھا۔ اور شہرت کما رہا تھا۔

غالباً ''دھرتی کے لال'' سے متاثر ہو کر مہیش کول نے ایک فلم شروع کی جس کا نام ''کاشی ناتھ'' رکھا۔ ہیروئین تھی ترپتی بھاوڑی اور ہیرو کے طور پر انہوں نے راج کپور کو لیا تھا۔ وہ ایک ناقابلِ فراموش فلم بنی۔

ہم میں سے ابھی کسی کے حالات نے اتنی کروٹ

نہیں بدلی تھی کہ وہ گاڑی میں سوار ہوکر اسٹوڈیو آتا، اس کے باوجود چھوٹے اسٹاف ہماری عزت کرتے تھے۔ فلمی ماحول میں ہماری اشتراکیت نے ایک صحت مند حسن پیدا کردیا تھا۔ بہت سے معمولی واقعات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم فلم کے اہم کردار پردھان منڈل کے کلکتہ کی سڑکوں پر بھوک سے سسک کر جان دینے کی شوٹنگ کررہے تھے۔ بوڑھے کسان کا بدن بخار سے تپ رہا تھا اور اس کے گرد اس کے خاندان والے کھڑے تھے۔ بوڑھا بے ہوشی کے عالم میں اپنی فصل کو کٹتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو درانتیاں لے کر جانے کو کہتا ہے۔ پھر وہ اسی عالم میں کھیت کی منڈیر پر بیٹھا بڑبڑانے والے انداز میں کہتا ہے۔ ”اتنا اناج۔۔۔ اتنا اناج۔۔“ پھر دم توڑ دیتا ہے۔

فٹ پاتھ اور سڑک کا سیٹ اسٹوڈیو کے اندر ہی لگا ہوا تھا۔ پہلے کیمرا دور رکھ کر لانگ شاٹ میں شوٹنگ کی گئی۔ اس کے لیے لائٹ ٹھیک کرنے میں چار گھنٹے لگے۔ مگر شوٹنگ کے وقت معاون ہدایت کاروں کی بے پروائی کی بنا پر بجلی کے کھمبوں کی لائٹیں نہیں جلائی گئیں۔ اس غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب کیمرے سے بوڑھے کے چہرے کے کلوز اپ لینے لگے۔ اسٹوڈیو کی ساری بتیاں بجھائی جا چکی تھیں۔ اندھیری رات میں کسان کے چہرے پر روشنی ڈالنے کا بہانہ صرف بجلی کے کھمبے کی روشنی تھی۔ جو لانگ شاٹ کے وقت بھی نہیں جلائی گئی تھی۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا؟

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے اور ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ پہلا شاٹ اگر دوبارہ لیا جاتا تو لائٹ ٹھیک کرنے میں چار گھنٹے لگ جاتے اور ساری شفٹ برباد ہوجاتی۔ ہم پریشانی کی حالت میں تھے کہ لائٹنگ کے ڈیپارٹمنٹ کے ایک مزدور نے اجازت لے کر اس مسئلے کا حل بتایا کہ ابتدا میں کسان کے چہرے کے کلوز اپ کو تاریکی میں رکھا جائے۔ پھر جب وہ بول رہا ہو تو کسی کار کی ہیڈ لائٹس جو دور سے آرہی ہے اس کے چہرے پر ڈالی جائے۔ جب وہ مرنے لگے تو کار نزدیک آجائے اور چہرے پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔ اس کے بعد کا منظر کسی اور زاویے سے لیا جائے۔ اس مزدور کا یہ حل سن کر ہم بہت حیران ہوئے۔ اس نے بہت دانشوری کی بات کی تھی۔ حالانکہ وہ ان پڑھ تھا۔

ایک وہی کیا، شوٹنگ کے لیے مزدور اور کسان آجاتے تھے اور مفت شوٹنگ میں حصہ لیتے تھے، اس لیے انہیں معلوم تھا کہ فلم ان کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ گاؤں دیہات کے مناظر میں سیکڑوں کسانوں نے حصہ لیا۔

افسوس کہ اپٹا کے عام ممبروں نے امیدیں اس فلم سے لگائی ہوئی تھیں وہ اپٹا کے رہنماؤں کے جھگڑوں کی وجہ سے خاک میں مل گئیں۔ اختلافات اندر ہی اندر بڑھتے چلے گئے۔ خواجہ احمد عباس نے فلم کی ایڈیٹنگ کی اور لاہور چلے گئے۔ جہاں انہیں ایک اور فلم مل گئی۔ ”دھرتی کے لال“ مکمل ہوکر ڈبوں میں بند پڑی ہوئی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب ریلیز ہوگی۔

جوڑ توڑ کے بعد اس فلم کو ریلیز کیا گیا تو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے۔ ایسے میں فلم دیکھنے کون جاتا؟ فسادات پر قابو پالیا گیا، لیکن لوگوں کے دلوں میں اب بھی خوف بیٹھا ہوا تھا۔ فلم کیا تھی تیار شدہ فصل تھی، جس میں کیڑا لگ گیا تھا۔ فلم کو باہر کے ممالک میں ریلیز کیا گیا تو پنگوئن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ فلمی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کئی ملکوں نے فلم کو اپنی لائبریریوں میں محفوظ کرلیا۔ ایک انڈین ہدایت کار نے مجھ سے کہا۔ ”کتنی اچھی فلم بنا ڈالی ہے آپ لوگوں نے۔ یہ تو روسیوں کی فلموں سے بھی اعلا ہے۔“

اس کے بعد بمل رائے نے ”دو بیگھہ زمین“ اور ستیہ جیت رے نے ”پاتھیر پنچالی“ بنائی۔ دونوں کو کامیابی ملی۔ لیکن افسوس کہ عباس صاحب نے اس کے بعد یہ تجربہ نہیں کیا۔ انہوں نے دو چار فلمیں بنائیں، لیکن اپنی راہ چھوڑ دی۔ وہ کہتے تھے کہ اب میں مارکسزم کا تجربہ نہیں کروں گا۔

”دھرتی کے لال“ کی نمائش کے بعد ہمارے حالات تبدیل ہوچکے تھے۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ ہم دس کے نوٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے، اب یہ حال تھا کہ سو کے نوٹوں کی گڈی ہمیں متاثر نہ کرتی۔ کمائی کا بڑا حصہ وہ نتو لاتی تھی۔ مگر اس نے نہ تو کار خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا اور نہ اپنی حالت میں تبدیلی لائی۔ وہ سوتی ساڑی پہنتی تھی اور بسوں اور ٹرینوں کا سفر کیا کرتی تھی۔ حالانکہ اس کی شناسائی نور جہاں، بیگم پارہ اور بے بی نسیم

سے تھی۔ وہ گھر چلانے کے لیے کچھ رقم رکھ لیا کرتی تھی باقی ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا کرتی۔

"دھرتی کے لال" کے بعد ایک اور فلم "گڑیا" شروع ہوئی جس میں مجھے اور وِنتو کو اہم کردار دیے گئے۔ فلم کامیاب ہوئی، لیکن وِنتو اس دنیا میں نہ رہی۔ وہ 27 اپریل 1947ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ پنجاب تقسیم ہوگیا۔ سارا خاندان راولپنڈی سے بکھر کر اجڑ گیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میرا اگتے کا گھر تباہ و برباد ہوگیا۔

ڈاکٹروں کے مشورے پر میں کشمیر اور سری نگر میں رہ کر گلمرگ چلا گیا۔ وہاں ہندی کے مشہور و معروف ناول نگار امرت لال ناگر کا خط ملا کہ فلمساز دیریندر ڈیسائی ان کی لکھی ہوئی ایک کہانی پر فلم بنا رہے ہیں۔ آپ کو ہیرو کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ مجھے اجرت دس ہزار روپے دی جائے گی۔ اگر منظور ہو تو میں جوابی تار دوں۔

چیتن آنند مجھے فلموں میں کام دلانے کے لیے یہاں سے بمبئی لے گئے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا مجھے راس نہ آئی، لیکن ایک ہی خط نے میرے پروں میں پھر طاقت پرواز بھردی۔ جولائی 1947ء کو سارے خاندان کو کشمیر میں چھوڑ کر میں بمبئی چلا گیا۔

اس فلم کا نام تھا "نجن" اس میں ہیروئن کا کردار نلنی جیونت کر رہی تھی۔ اس فلم میں دو ہیرو تھے۔ دوسرے ہیرو ترلوک کپور تھے۔ وہ بھی عجیب مسخرا تھا۔ سیٹ پر اعلان کرنا اس کی عادت تھی کہ فلم کا اصلی ہیرو وہ ہے۔ میرا دل جل بھن کر کباب ہوجاتا کہ میں اصلی ہیرو کب بنوں گا۔ شوٹنگ کے دوران وہ سب مجھ سے بہترین انداز سے نہ ہوسکا، جس کی توقع ناگر کر رہے تھے۔ وہ مجھے سمجھاتے بجھاتے، لیکن میرے چہرے کی اکڑن دور ہی نہ ہوتی۔

میری خود اعتمادی کو گھن لگ گیا۔ حلق خشک ہونے لگا۔ لمبے لمبے مکالمے مجھے یاد ہی نہ ہوتے۔ اگر کہیں سے تلوار مل جاتی تو میں ناگر صاحب کی گردن اڑا دیتا۔ بہرحال انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور سیٹ سے باہر چلے گئے۔

شوٹنگ کے دوران میں مکالمے... بھول جاتا تھا۔ میرے مقابل ڈیوڈ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "مکالمے یاد کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ آپ کے ری ٹیک نہیں ہوتے؟"

انہوں نے سمجھایا۔ "فقرے کے ہر لفظ کے پیچھے ایک تصویر ہوتی ہے۔ یعنی اگر اس فقرے کو اپنے تصور میں دیکھ لو تو وہ تصویر کی ایک کڑی کی شکل میں نظر آئے گا۔ بولتے وقت تصویروں کی اس کڑی کی طرف دیکھو تو الفاظ نہیں بھولیں گے۔"

میں نے ان کا مشورہ آزمایا تو بات درست نکلی۔ میں آج تک اس سبق پر عمل پیرا ہوں۔

"نجن" نے ناکامی کا منہ دیکھا۔ امرت لال ناگر نے میرا کاندھا تھپتھپا کر کہا۔ "میں تمہاری اداکاری پر تبصرہ نہیں کروں گا۔ پھر کبھی سہی۔" یہ ان کا بڑا پن تھا۔ اگر وہ کوئی اول فول بات کہہ دیتے تو میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا اور کبھی اداکار نہ بن پاتا۔

ان دنوں کوئی فلمساز مجھے کام دینے پر تیار نہ تھا۔ کسی دوست کی سفارش پر مہیش کول نے مجھے بلایا اور کیمرے کے سامنے کھڑا کر کے اسکرین ٹیسٹ لیا۔ کیمرے کے سامنے آتے ہی میں گویا لکڑی کا بن گیا۔ میرے ہوش و حواس اڑ گئے جیسے "نجن" کے دنوں میں اڑ جایا کرتے تھے۔ کیمرے کی دہشت اندر تک چلی گئی تھی۔

بمبئی کی فلمی دنیا چھوٹی سی ہے۔ بات پھیلتی ہے تو پھیلتی چلی جاتی ہے۔ شاہد لطیف مجھے اپنی فلم "بزدل" میں ایک بڑا رول دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ ان کے کانوں تک جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے رول میں ایڈجسٹ کردیا، جو میرے لیے قابل قبول نہ ہوا۔ میں نے وہ فلم چھوڑ دی۔

ایوب نے البتہ کے۔ آصف سے کہہ سن کر "ہلچل" میں مجھے بڑا رول دلوادیا۔ میرے مقابل دلیپ کمار تھے۔ وہ ہیرو تھے جب کہ میں ہیروئن کا شوہر۔ ویسے میں اس میں ایک جیلر تھا۔ کے۔ آصف مجھے جیل لے گئے تاکہ وہاں کے ماحول سے روشناس کرا سکیں۔ جیلر خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ اس نے وردی دکھائی، درزی ساتھ آیا ہوا تھا، اس نے میرا ناپ لے کر وردی کا اسٹائل دیکھ لیا۔

یہ 1949ء کا زمانہ تھا۔ میں نے خاندان کی ایک لڑکی سنتوش سے شادی کرلی تھی۔ اسے بھی اداکاری کا شوق تھا۔ وہ ڈراموں میں آتی رہتی تھی۔ اس سے شادی

کیے ہوئے کوئی پندرہ روز ہوئے تھے کہ ہم ایک ڈرامے "ڈولی" کی ریہرسل کر رہے تھے کہ اطلاع دی گئی کہ پریل سے کمیونسٹ پارٹی کا جلوس نکلنے والا ہے اور ہمیں اس میں شریک ہونا ہے۔ ہم میاں بیوی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر پریل پہنچ گئے۔

میٹنگ ہو رہی تھی۔ پولیس کی بڑی تعداد وہاں متعین تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ بہرحال میں نے انہیں کوئی اہمیت نہ دی۔ جب جلوس نکلا تو سنتوش عورتوں کی طرف چلی گئی اور میں مردوں میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ بھگدڑ مچ گئی، پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی اس لیے کہ حکومت کمیونسٹوں کے خلاف تھی۔ مجھے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ سنتوش کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ دو ماہ پریل جیل میں سزا کاٹنے کے بعد مجھے اے کلاس دی گئی اور آرتھر روڈ جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں جیلر مجھے دیکھ کر چونکا اور اس نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر کہا۔ "میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا کہ اسے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پہلی بار جیل نہیں آیا ہوں، اس لیے مجھے خاص نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ایک دن جیلر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ میں گیا تو وہاں کے آصف اور جیلر صاحب بیٹھے تھے۔ دونوں مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اب جیلر کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ کے آصف کے کمشنر سے تعلقات تھے۔ وہ اس سے عجیب سا حکم نامہ لکھوا لائے تھے کہ جب شوٹنگ میں میری ضرورت پڑے گی تو مجھے اتنی دیر کے لیے جیل سے باہر لے جانے کی اجازت ہوگی۔

ایک دوبار میں جیل سے باہر گیا تو قیدیوں کو معلوم ہو گیا کہ میں فلمی اداکار ہوں۔ میرے لیے ان کا احترام بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی فرمائشیں بھی شروع ہو گئیں۔ کوئی دلیپ کمار کا فوٹو منگواتا، کسی کو ناریل کا تیل چاہیے ہوتا، کسی کو کچھ، کسی کو کچھ۔ میں اس کی فہرست بنا کر لے جاتا اور اسے کے آصف کے حوالے کر دیتا۔ وہ اس فہرست کو اپنے معاون کی طرف بڑھا دیتے۔ جب شام کو میں چلنے لگتا تو سارا سامان میرے ساتھ کر دیا جاتا۔

ساحر لدھیانوی ان دنوں کمیونسٹ پارٹی میں تھے۔ میرے بارے میں معلوم ہوا کہ جیل سے شوٹنگ کرنے آ رہا ہوں تو ملنے کے لیے آ گئے۔ برآمدے میں انہوں نے ایک پولیس والے کو دیکھا تو ڈر گئے۔ واپس چلے گئے۔ بعد میں انہیں پتا چلا کہ جس پولیس والے کو دیکھ کر وہ ڈر گئے تھے، وہ میں ہی تو تھا (اس زمانے میں پولیس اور جیلر کی وردیاں ایک جیسی ہوتی تھیں)

فلمی دنیا میں میرے ساتھی مجھے مشورہ دیا کرتے تھے کہ میں چاہے کام ہو یا نہ ہو اسٹوڈیو کے چکر لگایا کروں۔ ممکن ہے کسی فلمساز یا ہدایت کار کی نظر مجھ مرغیے پر بھی پڑ جائے۔

کیمرے کا خوف ابھی تک دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر دلیپ اور نرگس سامنے ہوتے تو مجھ سے اداکاری نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ مجھے گھور رہے ہوں۔ میرے ری ٹیک ہونے لگتے۔ ایک دن میں نے تقریباً بھکاریوں کے انداز سے دلیپ سے پوچھا۔ "آپ کیمرے کے سامنے اتنی آسانی سے کیسے کام کر لیتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "کچھ دوسروں کو دیکھ کر سیکھا ہے، کچھ دوستوں نے مدد کی ہے۔"

میں متمنی تھا کہ غالباً وہ میری اس سلسلے میں مدد کریں گے، لیکن انہوں نے کوئی رہنمائی نہیں کی اور میری گاڑی کا پہیا دلدل میں پھنسا رہنے دیا۔

چھ ماہ کی جیل یاترا کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ اس میں کے آصف کی کوششوں کا بھی دخل تھا۔ میں نے رہائی ملتے ہی اپٹا کو چھوڑ دیا۔ اپٹا کی طرف سے مجھے غدار کا خطاب دیا گیا۔ میرا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔

ہلچل کی شوٹنگ جاری رہی۔ کھانے کے بعد اسٹوڈیو کے برآمدے میں کے آصف، دلیپ اور اوجھا کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ جاتے اور ایک ایکسٹرا بدرالدین کو کامیڈی کرنے کو کہتے۔ وہ شرابی، جواری اور مجمع لگا کر دوائیں فروخت کرنے والوں کی اچھی نقلیں اتارتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کتنے پیسے ملتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ پانچ روپے، جس میں سے ایک روپیا سپلائر لے لیتا ہے۔

"چار روپوں میں نقلیں اتارنے کی اجرت علیحدہ ہوتی ہوگی؟"

”جی نہیں۔“ اس نے کہا اور میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

”تو پھر ان لوگوں کے سامنے بندروں جیسی حرکتیں کیوں کرتے ہو؟“ میں نے ناک چڑھا کر کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بڑے لوگوں کو ناراض بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ بولا۔

”میں تمہاری قابلیت کے قابل کام دلواؤں گا۔“ میں نے گپ ہانک دی۔ ”اپنا مقام پہچانو اور اپنی عزت دوسروں سے کراؤ۔“

وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ بعد میں وہی ایکسٹرا بدر الدین، جانی واکر کے نام سے مشہور ہوا۔

انہی دنوں چیتن نے ایک فلم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے اسکرپٹ اور مکالمے لکھنے کو کہا۔ ہدایت کار تھے گرودت۔ مجھے انہوں نے چار ہزار روپے دینے کو کہا، جسے میں نے فوراً منظور کرلیا۔ جب وقت آیا تو میں گرودت کے ساتھ بحث مباحثہ کرتا۔ فلم کا نام ”بازی“ تھا جس میں دیو ہیرو کے طور پر لیا گیا تھا۔

جب فلم کا کلائمکس آیا تو ہم بری طرح سے الجھ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اونٹ کو کس کروٹ بٹھائیں۔ نزدیک ہی ضیا سرحدی رہتے تھے۔ ہم ان کے گھر چلے گئے۔ انہوں نے کہانی پڑھی پھر کلائمکس بنا دیا۔ ہم خوشی سے اچھلنے لگے۔ وہ کسی انگریزی فلم سے اخذ کیا گیا تھا۔ خوشی میں دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے وھسکی کا انتظام کیا جائے، لیکن سب کی جیبیں خالی تھیں۔ سب سے زیادہ ضیا سرحدی کی حالت خراب تھی۔

ضیا سرحدی نے مجھے اپنا ایک ڈراما ”سڑک کے کنارے“ میں دیکھا تھا اور کافی متاثر تھے۔ ان کے پاس ایک کہانی تھی جس کا نام ”ہم لوگ“ تھا۔ وہ انہوں نے کے آصف کو بیچی ہوئی تھی۔ جب سیٹھ چندولال کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے بہلا پھسلا کر کے آصف سے وہ کہانی خرید لی۔ مگر جب انہیں کاسٹ کا پتا چلا تو ان کا دل بیٹھ گیا۔ پہلے اس میں دلیپ کمار کو لینے کی تجویز تھی، لیکن جب ضیا نے بتایا کہ ہیرو کے طور پر اس میں بلراج ساہنی کام کریں گے تو وہ ان کا منہ دیکھنے لگے۔

میں جب بھی ماہم کے علاقے سے گزرتا تو مجھے بدر الدین کہیں نہ کہیں نظر آجاتا۔ وہ فوراً یاد دلاتا کہ میں نے اس سے کیا وعدہ کیا تھا۔ میں نے ”بازی“ کے اسکرپٹ میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا کردار شرابی کا رکھا تھا۔ اب دشواری یہ تھی کہ ہدایت کار کو کیسے یقین دلایا جائے کہ اس کردار کے لیے بدر الدین مناسب رہے گا۔ یعنی اس کی اداکاری کیسے ان لوگوں کو دکھائی جاتی؟

ایک روز میں نے اسے ترکیب سمجھا دی۔ اگلے دن صبح جب گرودت، دیو آنند، چیتن اور میں اسکرپٹ پر گفتگو کر رہے تھے تو ایک شرابی اندر آگیا اور آفس کے عملے کو تنگ کرنے لگا۔ پھر وہ آفس میں آگیا اور انٹ شنٹ بکواس کرنے لگا۔ خاص طور پر دیو کو اس نے اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ جب خاموش ہوتے تو وہ شرابی کوئی اور چٹکلا چھوڑ دیتا۔ ہم پھر قہقہے لگانے لگتے۔

گرودت نے آخر کار اسے ڈانٹا اور عملے میں سے کسی کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیں۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ سب کو سلام کرے۔ بدر الدین نے جسم کو کڑا کیا اور سلام کر کے کھڑا ہوگیا۔ وہ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ کہاں تو وہ نشے میں گرا پڑ رہا تھا اور اب مہذب بنا کھڑا تھا۔ چیتن نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس کو میں نے شرابی کے رول کے لیے پسند کیا ہے۔ چیتن نے ہامی بھر لی کہ کام دے دیا جائے۔ جن لوگوں کو ”بازی“ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہوں نے شرابی کے چھوٹے سے کردار کے لیے جانی واکر کو بہت پسند کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بیچارے نے اپنی ساری زندگی میں بھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

اس فلم سے ان کی شہرت آسمان کو چھونے لگی۔ ایک سال میں انہیں بہت سے رول مل گئے اور وہ مجھے پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا۔

”ہم لوگ“ کی شوٹنگ شروع ہوئی تو میری حالت بہت خراب تھی۔ میرا ایک بھی شاٹ اوکے نہیں ہوا۔ انور حسین اس میں ایک مرغی چور کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری ساری خود اعتمادی رخصت ہوجاتی اور میں ازحد نروس ہوجاتا۔ ایک بار جب میں ٹھنڈی ہوا کھانے باہر گیا تو پتلون میں میرا پیشاب نکل گیا۔ کیمرے کا خوف جو دل میں بیٹھا ہوا تھا اب سینہ تان کر کسی عفریت کی طرح سامنے آکھڑا ہوا۔

دو چار شاٹ اور ہوئے انہیں ہدایت کار نے بے دلی سے اوکے کر دیا۔ انور حسین خوب چہک رہا تھا۔ اس لیے کہ گزشتہ دو برس میں اسے کوئی اتنا اچھا رول نہیں ملا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خاص طور پر اسی کے لیے لکھا گیا ہے، بعد میں بھی اسے اپنی زندگی میں اتنا اچھا رول نہیں ملا۔ وہ اس فلم کی جان تھا۔

ضیا اور ہم ٹیکسی میں آتے جاتے تھے۔ میں نے تیسرے دن واپس آتے ہوئے کہا۔ ”ضیا تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔ اس کا شکریہ، لیکن میری جگہ تم کسی اور کو کاسٹ کر لو تو بات بن جائے گی۔ میں اس رول کے لائق نہیں ہوں۔ پتا نہیں شوٹنگ کے وقت مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“

ضیا نے اپنائیت سے کہا۔ ”بلراج! اکٹھے تیریں گے یا اکٹھے ڈوبیں گے۔“

ان کا جواب تسلی بخش تھا، مگر مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اگلے دن کی شوٹنگ کر کے میں جیسے تیسے گھر پہنچا اور دل شکستہ ہو کر دیوار سے سر ٹکرانے لگا۔ میں نے سنتوش سے کہا۔ ”میں کبھی فلمی اداکار نہیں بن سکتا۔ مجھ میں ایسی صلاحیت نہیں ہے۔“

اس وقت ضیا کا معاون ناگرت وہاں آ گیا۔ اس نے مجھے اتنا دل گیر دیکھا تو تسلی و تشفی دینے کی بجائے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ”بے ہمت، بے حوصلہ، کمیونسٹ بنے پھرتے ہیں اور امیروں کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔ شرم سے ڈوب مرنا چاہیے اب آپ کو۔“

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ ایسے لب و لہجے میں آج تک مجھ سے کسی نے بات نہیں کی تھی۔ مگر اسے جیسے کسی کی پروا نہیں تھی، وہ بولتا چلا گیا۔ ”یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ اداکاری نہیں کر سکتے؟ آپ دوسروں سے لاکھ درجے اچھی اداکاری کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک آپ ان کی امارت سے مرعوب رہیں گے، آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ انور، نرگس کا بھائی ہے اور اس کے پاس گاڑی بھی ہے۔ اس لیے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے آپ کی جان نکلی جا رہی ہے۔ دراصل آپ کی نگاہ فن پر نہیں دھن پر ہے۔ وہی آپ کی نظر میں سب سے عظیم شے ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں۔“

اپٹا کا ڈراما ”سڑک کے کنارے“ ناگرت نے بھی دیکھا تھا۔ میں نے ایک بے روزگار اور بیمار نوجوان کا کردار ادا کیا تھا اور سرمایہ داروں کے خلاف گرما گرم مکالمے بولے تھے، جو دیکھنے والوں کے دلوں میں اترتے چلے جاتے تھے۔ جب وہ ہال سے نکلنے لگتے تو تالیاں بجاتے ہوئے آتے۔ ”ہم لوگ“ میں بھی تقریباً وہی کردار تھا، تو پھر دیوار سے سر ٹکرانا کہاں کی عقل مندی تھی؟ ناگرت صحیح تو کہہ رہا تھا۔ مجھے ہر چیز سے نفرت کرنا تھی۔ ان گاڑی والوں سے نفرت کرنا تھی۔

میرے مردہ جسم میں جان آ گئی۔ میں حیران رہ گیا کہ بائیس برس کے ایک نوجوان نے مجھے کیسا سبق دے دیا؟ مجھے ناگرت یاد آتا ہے تو آج بھی حیرت ہوتی ہے۔

رات میں نے بے صبری میں کاٹی۔ مجھے ان متمول لوگوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ دوسرے دن میں ضیا کے ساتھ ٹیکسی میں نہیں گیا بلکہ میں نے اپنی موٹر سائیکل استعمال کی۔ پھر جب میک اپ مین میرا میک اپ کرنے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے حسین و جمیل بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وگ بھی نہیں لگاؤں گا۔ ایسے ہی چلنے دو۔ بس ذرا کریم پھیر دو، چہرے پر۔“

”ضیا صاحب نے کہا ہے ایسا کرنے کو۔“ اس نے کم زور آواز میں کہا۔

”آپ اس کی پروا نہ کیجیے۔ ضیا ہدایت کار ہیں اور فلم کا ہیرو۔ اگر کوئی قابلِ اعتراض بات ہوئی تو ہم آپس میں طے کر لیں گے۔ اس وقت آپ سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہی کیجیے۔“

اس نے وہی کچھ کیا۔ سیٹ کے احاطے تک دو چار چمکتی کاریں کھڑی تھیں، میں نے نفرت سے ان کی طرف دیکھا اور تھوک دیا۔ جب سیٹ پر پہنچا تو میں نے انور حسین پر ایک تحقیرانہ نگاہ ڈالی۔ جیسے وہ اپنی بہن کے ٹکڑوں پر پلتا ہو۔ (آج یہ سب سوچتا ہوں تو شرم آتی ہے) انور حسین نے اپنی نگاہ نیچی کر لی تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ ایک طرح سے فتح کا احساس بھی ہوا تھا۔

انسان، دوسرے انسان کا دشمن ہے، اسی لیے انڈسٹری میں کہتے ہیں ”وہ اسے کھا گیا۔“ میں نے سوچا دیکھتا ہوں کون کسے کھاتا ہے؟ اس روز ایک شاٹ کے نہیں بلکہ سارے منظر کے مکالمے مجھے یاد ہو گئے۔ ریہرسل کے دوران میں مکالمے اس طرح سے بول رہا تھا جیسے باز چڑیا پر جھپٹتا ہے۔ ضیا نے مجھے گلے لگا لیا۔ ناگرت مجھے اپنی چمکیلی نگاہ سے گھور رہا تھا۔ اسٹوڈیو

میں جیسے ایک نئی حرارت اور نیا خون دوڑ گیا۔ ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں نے اپنا چولا بدل لیا ہو۔
شام کو سیٹھ چندو لال تک بات پہنچ گئی۔ وہ ساٹھ کے لپیٹے میں تھے اور انہیں ریس کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ ان کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے ضیا اور مجھے بلالیا۔ مجھ سے کہا۔ ”تم اس رول کے لیے مجھے پسند نہیں تھے۔ بہر حال ہدایت کار تمہیں چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ بولو معاوضہ کیا لوگے؟“
”میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سیٹھ صاحب!“ میں نے کہا۔ ”آپ جو کچھ دیں گے وہی لے لوں گا۔“
”نہیں تم بتاؤ۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس لیے کہ اب تو تمہارا انتخاب کرلیا گیا ہے۔“
”دس ہزار دے دیجیے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔
”دس! میں نے تو پانچ کا سوچا تھا۔ خیر پانچ اور دس میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔“
”آپ کچھ بھی دیجیے۔ مگر پابندی سے قسط دے دیجیے گا۔ اس لیے کہ مجھ پر قرض چڑھا ہوا ہے۔“
”ٹھیک ہے، تمہیں ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں ڈیڑھ ہزار روپے مل جایا کریں گے۔“ سیٹھ نے کہا۔ پھر اپنے منیجر کو بلا کر ہدایت دی۔
سیٹھ ان دنوں مالی مشکلات کا شکار تھے اسی لیے چھوٹے بجٹ کی فلم بنا رہے تھے۔ ”ہم لوگ“ میں کام کرنے والوں کا پیسا بہت دنوں تک ڈوبا رہا، لیکن مجھے انہوں نے حسب وعدہ ڈیڑھ ہزار روپے ہر ماہ ادا کیے۔
ایک دن سیٹ پر اداکاری کے دوران درگا کھوٹے نے میرے کان میں کہا۔ ”تمہارے مکالمے فلیٹ ہوتے جارہے ہیں۔ بالکل ایک جیسے۔“
میں چونک گیا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھیں۔ میں نے اب مکالموں پر محنت کرنا شروع کردی۔ میں پنجابی تھا۔ اس لیے سوچتا تھا کہ اگر ان مکالموں کو پنجابی میں ادا کرنا پڑے گا تو میں کیا کروں گا؟ لے، اتار، چڑھاؤ۔ کچھ تو ہونا چاہیے۔ عام زندگی میں انسان ہر وقت ایک طرح سے تو نہیں بولتا۔
ضیا کی مہربانیوں اور دوستوں کی کرم فرمائیوں سے میرا کام نکھرتا چلا گیا۔ فلم کے بارے میں اچھی رپورٹیں کان میں پڑنے لگیں۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ ہاں کوئی فلم بن رہی ہے۔
”ہم لوگ“ تقریباً چھ مہینے میں مکمل ہوگئی۔ اس کا ٹرائل شو ہوا۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ سر پیر سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس لیے کہ میں اپنا کام دیکھنے میں مصروف تھا۔ فلم کے اختتام پر کوئی کچھ نہ بولا۔ وحشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کنہیا لال کپور نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”کمال کردیا تم نے تو۔“
”ہم لوگ“ لبرٹی سینما میں لگی تھی۔ ابتدا میں چند ہفتے نرم گئی۔ اس لیے کہ اس میں بڑے اداکار نہیں تھے۔ اس کے بعد اس نے زور پکڑ لیا۔ سینما کے ملازمین اس کے ٹکٹ گلی کوچوں میں جا کر فروخت کرنے لگے۔ شہر میں لوگ مجھے کمیونسٹ اداکار اور ”ہم لوگ“ کو کمیونسٹ فلم کہا جانے لگا۔
فلم کے کامیاب ہونے کے بعد سیٹھ چندو لال نے ایک دن مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کہا۔ ”بلراج! تم اس فلم میں کیرکٹر ہیرو کے طور پر کامیاب ہوئے ہو۔ اس لیے تمہیں ساری زندگی فلموں میں کام ملتا رہے گا۔ ہیرو کی زندگی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔“
ہندی فلموں میں سیکڑوں خانے بنے ہوتے ہیں سماجی فلم، رومانی فلم، ایکشن فلم۔ اسی طرح سے ہیرو بھی لگے بندھے ہوتے ہیں۔ رومانی ہیرو، کیرکٹر ہیرو، سائڈ ہیرو وغیرہ۔
میں بھی کیرکٹر ہیرو کہا جانے لگا۔ لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ کسی فلم کا پریمیئر شو ہو رہا تھا۔ میں بھی وہاں تھا۔ لڑکیاں آٹو گراف بک لے کر آگئیں۔ ”آٹو گراف پلیز۔“
میں نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور بکس پر دستخط کرنا شروع کردیے۔ اچانک انہیں راج کپور کی جھلک دکھائی دی۔ باقی ماندہ نے آٹو گراف بک میرے ہاتھ سے چھین لیں اور اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ کیونکہ میں کیرکٹر تھا اور وہ رومانی اور سماجی ہیرو۔ دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے یہ اس واقعے سے معلوم ہوگیا۔
”ہم لوگ“ کی کامیابی کے بعد سیٹھ چندو لال نے ضیا سرحدی کو ایک کار تحفے میں دی اور اس کا ڈرائیور بھی۔ وہ ہمارا پڑوس چھوڑ کر ایک ہوٹل میں جا بسے۔ میں ایک دو بار ان کے پاس گیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ

انہیں اچھا نہیں لگا۔ میں نے جانا چھوڑ دیا۔ اب میں ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔

سیٹھ چندولال سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی نے ضیا کو اچھالا۔ جیسے ضیا کوئی اشتراکی مسیحا بن کر ابھر آیا ہو۔ اس کے اعزاز میں ناگپاڑہ میں ایک جلسہ کیا گیا۔ اسٹیج بنا ہوا تھا اور پنڈال میں کرسیاں بچھی تھیں۔ اسٹیج کی پچھلی دیوار پر ضیا اور اسٹالن کی تصاویر لگی تھیں۔ میں نے تحقیق کی تو پتا لگا کہ اس تقریب کا سارا خرچا ضیا نے خود اٹھایا تھا۔

خوب تقریریں ہوئیں اور ضیا کو اسٹالن کے ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ اسٹیج پر کچھ کمیونسٹ رہنما تھے اور ان کے بعد فلم کی کاسٹ۔ مجھ پر چھینٹے مارے گئے کہ کبھی میں جذبے سے پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا اب میں نے ہاتھ روک لیا ہے۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ضیا کو اگلی فلم "فٹ پاتھ" ملی۔ دلیپ اور مینا کماری اس کی کاسٹ میں تھے۔ اس کے علاوہ بے تحاشا پیسا اور نظریاتی مشوروں کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سردار علی جعفری اور رمیش پرتھا گوانکر وغیرہ۔ مگر افسوس ان ساری سہولتوں کے باوجود "فٹ پاتھ" ناکام ہوگئی۔ اشتراکی حقیقت نگاری کا قلعہ مضبوط نہ ہوسکا۔ سیٹھ چندولال نے فلموں سے علیحدگی اختیار کرلی اور ان کا اسٹوڈیو بند ہوگیا۔ چنانچہ عملہ مصائب میں مبتلا ہوگیا۔

"بازی" کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ دیو آنند کا شمار اداکاروں میں ہونے لگا۔ ساحر لدھیانوی کو سب نغمہ نگار کی حیثیت سے جاننے لگے۔ ویسے وہ اپنی جگہ ایک اچھے شاعر تھے۔ اگر فلموں میں ناکام ہوتے تب بھی ان کی حیثیت ختم نہیں ہوتی۔ بازی پر اخباروں میں اچھے تبصرے شائع ہوئے، مگر اس کا کہانی نویس کون تھا اس کے بارے میں کسی نے نہ پوچھا۔ میں آج بھی لوگوں سے کہتا پھرتا ہوں کہ میں نے اس کا اسکرپٹ اور مکالمے لکھے تھے تو لوگ حیرت سے منہ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

چیتن آنند نے اپنی آیندہ فلم کا اسکرپٹ اور مکالمے لکھنے کے لیے مجھے چھ ہزار کی پیشکش کی۔ جو میں نے بے دلی سے منظور کرلی۔ اس لیے کہ "ہم لوگ" کی کامیابی کے بعد فلمساز مجھے بیس ہزار تک کی پیشکش کرنے لگے تھے۔ بہرحال چیتن کا مقام سب سے علیحدہ اور بلند تھا۔ اگر وہ مجھے بغیر پیسے دیے کام کرنے کو کہتے تب بھی میں انکار نہ کرتا۔

چیتن کا معاملہ انفرادی تھا اس لیے کہ وہ فلم کی ہدایتکاری بھی مجھے سونپ رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں ہدایت کار کی حیثیت سے کامیاب ہوگیا تو وارے نیارے ہوجائیں گے۔ میں اپنے نظریات کے مطابق فلمیں بنا سکوں گا۔ کہانی نویس، مکالمہ نویس اور اداکار کی حیثیت سے میں نے کامیابی حاصل کر ہی لی تھی۔ مشہور ہدایتکار بننے میں کیا حرج تھا۔

میں نے چیتن کی فلم کی کاغذی کارروائی شروع کر دی۔ فلموں میں رول کرنے کے لیے برابر پیشکش ہو رہی تھیں۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ اور الجھنیں بھی تھیں جن کی بنا پر فلم کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ میں ایک بار پھر آزاد ہوگیا۔

آپ کو ایک دل چسپ بات بتاؤں کہ "ہم لوگ" کی کامیابی کا قصہ پرانا ہونے لگا تو لوگ مجھے فراموش کرنے لگے۔ کہیں سے کوئی پیشکش نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار ڈی کیشپ نے فلم "بدنام" بنانا شروع کی تو مجھے ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا۔ شیاما ہیروئن تھی۔ شیلا رمانی اور ہیلن اس فلم میں نیا ستارہ تھیں۔

ہیلن اس زمانے میں سولہ سال کی گڑیا لگتی تھی۔ اسے نہ تو اداکاری آتی تھی اور نہ رقص۔ وہ مکالمے بھی صحیح طریقے سے ادا نہیں کر پاتی تھی، اس لیے کہ اس کا تعلق برما سے تھا۔ اس فلم انڈسٹری میں جگہ جگہ بھیڑیے دکھائی دیے۔ اس کی ماں کو اپنا دمکتا مستقبل ہیلن کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔

مگر ہیلن کو معلوم تھا کہ اگر اس نے ماں کے کہنے پر عمل کیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اس لیے اس نے فلمساز پی۔ این اروڑا سے شادی کرلی، حالانکہ وہ اس کی باپ کی عمر کا تھا، لیکن ہیلن کو تحفظ مل گیا تھا۔ رقص اور اداکاری اس نے بعد میں سیکھ لی۔ میں نے اسے ہمیشہ عقیدت سے دیکھا۔

"بدنام" کی شوٹنگ کے لیے ہدایتکار عملے کو گھوڑ بندر لے گئے۔ وہ بمبئی سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ مناظر تو بے حد حسین ہوتے تھے، لیکن وہاں چیونٹیاں، مکھیاں، سانپ اور بچھو وغیرہ بھی بہت

تھے۔ ایک دن پیڑوں سے گھرے ہوئے ایک تالاب کے کنارے ہیرو اور ہیروئن کا عشقیہ منظر فلمایا جا رہا تھا کہ اچانک خوفناک چیخیں آنے لگیں۔ ہوا یہ کہ ایک سانپ کے حلق میں مینڈک پھنس گیا تھا۔ شوٹنگ روک دی گئی۔ دو گھنٹے کے لیے سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔

دوسرے دن کیشپ یونٹ کو لے کر ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ بڑی خطرناک جگہ تھی۔ کیشپ نے وہاں کیمرا رکھا تو ویلن مراد نے پوچھا۔ "کیمرا یہاں کیوں رکھ دیا کیشپ صاحب؟"

"ہیرو اور ویلن کی تھوڑی سے لڑائی ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں اور بلراج صاحب یہاں لڑیں گے؟" مراد نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔" وہ بولے۔ مراد سر ہلاتا ہوا وہاں سے دوسرے اداکار الہاس کے پاس جا بیٹھا۔ پھر ان دونوں نے بوتل کھول لی اور پینے لگے۔

اس جگہ کھڑے ہو کر مکے بازی کرنے کا سوچ کر ہی میرا دل کانپ رہا تھا اس لیے کہ وہاں گنجائش ہی نہیں تھی۔ مگر مراد بے پروا تھا اور اطمینان سے پی رہا تھا۔ اس لیے میں میک اپ کرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کیشپ نے آواز لگائی کہ شاٹ تیار ہے آ جائیں۔ مراد جھومتا ہوا وہاں آ گیا اور آنکھیں نچا کر بولا۔ "یہاں کیا کرنا ہے کیشپ صاحب؟"

"لڑائی۔"

"کیسی لڑائی؟"

"جیسی فلموں میں ہوتی ہے۔ بس دو چار مکے چلانا ہیں۔" کیشپ کا جواب تھا۔

"مگر مجھے مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ مجھ سے یہاں کھڑا نہیں ہوا جا رہا ہے۔ مکے بازی کیسے کروں گا؟" اس نے کہا اور دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

جب میرا میک اپ مکمل ہو گیا تو میں مراد کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ جب ہم یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو پھر شوٹنگ بھی کر لینا چاہیے۔ اگر کیمرا تھوڑا سا پیچھے ہٹا لیا جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس نے اس درخواست کا جو جواب دیا اس کا مطلب میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ اس نے کہا تھا۔ "بلراج صاحب! انڈسٹری میں کام کرتے ہوئے دس برس ہو گئے ہیں لیکن جب بھی دم اٹھا کر دیکھا ہے، گھوڑی ہی نظر آئی، گھوڑا آج تک نظر نہیں آیا۔"

"بدنام" ریلیز ہو کر ناکام رہی۔ میں جو اوپر کا سفر کر رہا تھا دھڑام سے نیچے آ گرا۔ بس چند ایک دوستوں نے میری تعریف کی۔ میں اندر سے بجھ سا گیا۔ فلم انڈسٹری میں کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

ایک روز میں اپنے گھر کے پاس بیٹھا بچوں کے ساتھ سمندر کی لہروں سے کھیل رہا تھا کہ بمل رائے کے ایک معاون نے آ کر کہا کہ بمل رائے مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس لیے کہ وہ بڑے ہدایت کار تھے۔ انہوں نے "ہم لوگ" کا ٹرائل شو بہر حال دیکھا تھا اور وہ مجھے اسی حد تک جانتے ہوں گے۔ ملاقات کرنے کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ مجھے فلم میں کام دینا چاہتے ہیں۔

میں نے تیاری کی اور پاؤڈر چہرے پر مل کر لنڈن کا سوٹ استری کر کے پہن لیا۔ جب میں ان کے آفس میں پہنچا تو وہ میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو ان کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر بنگالی میں کہا۔ "ارے! یہ کس عجیب انسان کو پکڑ لائے ہو؟ تم لوگ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟" میں بنگالی جانتا تھا۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ "مسٹر بلراج! میرے آدمیوں سے غلطی ہوئی ہے۔ میں جس قسم کا رول آپ سے کرانا چاہتا تھا وہ آپ کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔"

"آپ مجھ سے کس قسم کا رول کرانا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان پڑھ دیہاتی کا۔" وہ طنزیہ بولے۔

جی تو چاہا کہ وہاں سے بھاگ آؤں اور انڈسٹری کا کبھی رخ نہ کروں۔ مگر میرے پاؤں جیسے کسی نے پکڑ لیے۔ میں نے کہا۔ "اس قسم کا رول میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔"

"کس فلم میں؟"

"پیپلز تھیٹر کی فلم "دھرتی کے لال" میں۔" میں نے جواب دیا۔

"کس کردار کا رول تھا؟"

"پردھان کے بیٹے کا۔" میں نے جواب دیا۔ "شمبھو مترا فلم کے معاون ہدایت کار تھے۔"

یہ نام بمل رائے پر اثر انداز کر گیا۔ انہوں نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔ پھر رشی مکرجی سے کہا کہ وہ مجھے کہانی سنائے۔ وہ مجھے اسٹوڈیو کے ایک باغیچے میں لے گئے۔ پھر انہوں نے کہانی سناتے ہوئے مجھے رلایا اور خود بھی روئے۔ فلم کا نام ''دوبیگھہ زمین'' تھا۔

بمبئی سے کچھ فاصلے پر بہار اور اتر پردیش کے لوگ رہتے تھے جو بھینس پالتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پاس جا کر بیٹھنے لگا۔ ان کا رہن سہن، چال چلن اور گفتگو کا انداز دیکھ کر میں نے سب کچھ دماغ میں اتار لیا۔ وہ ''گم چھا'' سر پر باندھتے تھے۔ اپنے اپنے انداز سے۔ میں نے اس کی بھی پریکٹس کی۔

جب شوٹنگ کا دن آیا تو میں اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے بمل رائے سے کہا مجھے اپنی پسند کا لباس پہننے دیا جائے اور میک اپ بھی میں اپنی مرضی کا کروں گا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ میں نے ''گم چھا'' باندھا اور ردی سے کپڑے پہن کر معمولی سا میک اپ کیا۔ جب میں بمل رائے کے سامنے پہنچا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس لیے کہ میں اب لندن سے پلٹ کر آنے والا کوئی بابو نہیں لگ رہا تھا۔

پہلا شاٹ زمین دار کے گھر کا سیٹ تھا جہاں مجھے داخل ہو کر اور اس کے پاؤں پکڑ کر یہ کہنا تھا کہ میں اس کی زمین نہ چھینوں۔ پھر بمل رائے نے ہدایت دی کہ میں کمرے میں داخل ہوتے وقت پائیدان پر پاؤں پونچھ کر اندر جاؤں۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق کیا۔ اور اس طرح سے زمین دار کے کمرے میں داخل ہوا جیسے میری ہوا خراب ہو رہی ہو۔ بمل رائے نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

زمین دار کا کردار مراد ادا کر رہا تھا۔ اسٹوڈیو کا ماحول پُرسکون تھا، اس لیے مجھے کام کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ بمل رائے نے مراد کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے پاؤں جھٹک کر کھڑا ہو جائے اور کیمرے کے دائرے سے نکل جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کی لات میرے منہ پر پڑ گئی۔ میں اپنی بے عزتی محسوس کر کے رونے لگا۔

شاٹ بہت اچھا فلمبند ہوا تھا۔ مراد نے آ کر مجھے گلے لگایا اور پھر ساری بات بتا دی۔ میں بمل رائے کی ماہرانہ ہدایت کاری کا قائل ہو گیا۔

میک اپ مین جگت بابو سے معلوم ہوا کہ میں جو کردار کر رہا ہوں۔ اس کے لیے اشوک کمار، بھارت بھوشن اور جے راج نے بہت کوششیں کی ہیں۔ اس لیے اگر میں نے اچھی پرفارمنس نہیں دکھائی تو ممکن ہے مجھے کاسٹ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ پہلا شاٹ اوکے ہونے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کسی بڑے اداکار کی فکر نہ تھی کہ وہ مجھے کھانے آ جائے گا۔

دوسرے شاٹ میں نروپا رائے اس فلم میں ہیروئن تھی۔ نئی نئی آئی تھی۔ میں نے دیہاتی بننے کے لیے مشق کی تھی، لیکن وہ پیدائشی دیہاتی تھی۔ اس لیے فلم میں اس نے حقیقت کا رنگ بھر دیا اور ہماری جوڑی اتنی مقبول ہوئی کہ بعد میں بھی ہم نے متعدد فلموں میں کام کیا۔ دو ماہ کے کام کے بعد میں نے بمل رائے سے اپنی پرفارمنس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

دو تین مہینے تک شوٹنگ ہوتی رہی اس کے بعد کلکتہ میں شوٹنگ کرنے کا پروگرام بنا۔ وہاں مجھے رکشا چلانا تھا۔ میری بیوی اور دوسرا یونٹ چلا گیا تھا، مگر میں نے ریل کے ذریعے جانا مناسب سمجھا۔ دراصل میں کسانوں کو گاڑی میں اترتے چڑھتے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک اداکار کے لیے مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔

کلکتہ پہنچ کر میں رکشا یونٹ چلا گیا۔ یاد رہے کہ کلکتہ کا رکشا سب سے الگ ہے۔ اسے آدمی کھینچتے ہیں کسی سواری کو بٹھا کر دوڑتے ہوئے منزل تک پہنچنا آسان نہیں۔ اس عجیب انداز کی ڈرائیوری مجھے مشکل لگی لیکن میرے ایک عقیدت مند نے مجھے چند گھنٹوں میں رکشا چلانا سکھا دیا۔ رکشا چلانا تو آسان تھا، مگر اس کے بعد جسم کے سارے اعضا درد کرنے لگتے تھے۔ پھر کلکتہ کی سڑکیں، ٹریفک میں رکشا چلانا کوئی مذاق نہیں تھا۔

دو روز بعد وکٹوریا میموریل کے آس پاس شوٹنگ ہونا تھی۔ جب کیمرا سامنے آیا تو میری حالت پھر غیر ہو گئی۔ یہ کیفیت ''ہم لوگ'' کی ابتدائی شوٹنگ کے دوران بھی ہوئی تھی۔ میں اپنے مکالمے بھول رہا تھا، اس لیے ٹیک ہو رہے تھے۔ میں دلیپ کمار کی طرح مکالمے بولنے لگا۔ بمل رائے بار یک بین تھے۔ انہوں نے

میرے قریب آکر پوچھا۔ ”کیا بات ہے، کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے؟“

”ہاں، رات میں اچھی طرح سے نیند نہیں لے سکا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے وہاں چھوڑ کر شہر کے دوسرے حصے کی طرف چلے گئے۔ تاکہ کلکتہ کے مناظر کو فلمبند کرسکیں۔ میں ذہنی طور پر اتنا درماندہ اور شکستہ تھا کہ اسی رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں ایک رکشا والا میرے قریب آیا۔ اس کے کپڑے ملگجے، شیو بڑھا اور جسم سے کم زوری عیاں تھی۔ وہ اپنے سفید بالوں کی وجہ سے بوڑھا لگ رہا تھا۔

”آپ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں بابو؟“ اس نے پوچھا۔

”فلم بنارہے ہیں۔“

”تم اس میں کام کررہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔

”کیا کام کررہے ہو؟“

میں نے سوچا کہ وقت گزر جائے گا، لہٰذا اسے فلم کی کہانی سنانے لگا۔ کہانی سنتے وقت جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تھی، وہی اس پر بھی طاری ہوگئی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں دکھائی دیں۔ اس نے اپنی کہانی سنائی کہ کسی گاؤں میں اس کی زمین ہوا کرتی تھی جس پر زمین دار نے قبضہ جمالیا۔ اب وہ اسے چھڑانے کے لیے کلکتہ چلا آیا اور رکشا چلاتا ہے، تاکہ کچھ رقم جمع ہوجائے تو وہ گاؤں جاکر زمین چھڑالے۔ مگر رقم تھی کہ پس انداز ہی نہیں ہوپاتی تھی۔ وہ سسکیاں لے کر کہنے لگا۔ ”یہ تو میری ہی کہانی ہے۔ بالکل میری کہانی۔“

وہ چلا گیا تو میرے اندر سوئے ہوئے انسان کو جگا گیا۔ میں کسان طبقے کی نمائندگی کررہا تھا اور کیمرے کی طرف سے فکرمند ہوا جارہا تھا۔ مجھے کسی کی فکر نہیں کرنا چاہیے تھی۔ بس اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے تھا۔ میں ان بے کس اور مجبور انسانوں کے مصائب کو ساری دنیا کے سامنے کس طرح پیش کروں گا؟

اس کے بعد جو شوٹنگ ہوئی تو میرا کوئی ری ٹیک نہیں ہوا۔

ٹائمز آف انڈیا کے مبصر نے بعد میں فلم کی ریلیز پر لکھا تھا کہ بلراج ساہنی کی اداکاری میں ذہانت کی چمک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چمک اسی کسان نے عطا کی تھی جو کلکتہ میں رکشا گھسیٹتا پھرتا تھا۔

آپ کو میں شوٹنگ کے چند دلچسپ واقعات اور سنانا چاہتا ہوں۔

ہاوڑہ پل پار کرکے ایک بڑا چوراہا پڑتا ہے جہاں سے بہت سی سڑکیں نکلتی ہیں۔ اس چوراہے پر مزدور اور کسان بیٹھتے ہیں۔ گویا وہ سیمنٹ کا بڑا جزیرہ تھا جہاں معاشرے کے دھتکارے ہوئے انسان بسیرا کرتے تھے۔

بمل رائے نے کیمرا ایک اونچی سی جگہ پر لگوایا تھا جہاں سے وہ گول چبوترا صاف نظر آتا تھا۔ مجھے پل کی طرف سے بوکھلائے ہوئے انداز سے اس چبوترے کے بیچ سے گزرنا تھا۔ یہ نہایت اہم شاٹ تھا۔ مجھے بوکھلاہٹ کی اداکاری کرنا تھی۔ جب میں پل پار کرکے وہاں پہنچا تو ٹرام آگئی۔ میں اس سے بچا اور چبوترے کی طرف بڑھا تو میری لاٹھی اس سے ٹکرا گئی۔ چنانچہ میں گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میرا بیٹا بھی گر پڑا، جس کی انگلی میں نے تھام رکھی تھی۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھری تھی جو ٹرام کے راستے پر گر پڑی۔ لہٰذا ٹرام چلانے والا مجھے گالیاں بکنے لگا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ کیمرا آن ہوگا اور شاٹ نہایت عمدگی سے فلمبند ہوگیا ہوگا۔ چنانچہ بچے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اپنی گٹھری اور لاٹھی اٹھانا ہی بھول گیا۔ میری بوکھلاہٹ کا اثر ان مفلسوں اور ناداروں پر یہ پڑا کہ انھوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھے دم دلاسا دینے لگے۔ ”گھبراؤ ناہیں، ماتھا ٹھنڈا رکھو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ کسی کا پھکر ناہیں کرو۔ شروع میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم تمہاری مدد کرے گا۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کام ہے۔ جانے دو۔“ میں نے کہا۔

انہیں یقین ہوگیا تھا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں اور اب کچھ ایسی حرکت کر بیٹھوں گا کہ خود اپنی اور اپنے بچے کی جان گنوا بیٹھوں گا۔

”کیا ٹھیک ہے؟“ ایک نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔ ”تیری گٹھری اور لاٹھی کہاں ہے؟“

”کیا اپنے بچے کو مارے گا؟“ ایک عورت نے ناک سکیڑ کر پوچھا۔

میں مصیبت میں گرفتار ہوچکا تھا۔ مجھے معلوم نہیں

تھا کہ شاٹ ”کٹ“ ہوگیا ہے۔ بمل رائے اور اس کے معاون دور کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آخر کار ان کا ایک معاون آگے بڑھا اور اس نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ اصل غریب نہیں ہے۔ فلم میں کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ شوٹنگ چل رہی ہے۔ وہ دیکھو کیمرا۔

اچانک وہ مجھ سے دور ہٹنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ہمدردی کا جو پرتو نظر آرہا تھا وہ یکا یک غائب ہوگیا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔

دن بھر شوٹنگ چلتی رہی۔ بمل رائے ضروری شاٹ لیتے رہے۔ دوسرے دن صبح سے کام ہونا تھا۔ اس لیے کلکتہ کی سڑکوں کی دھلائی ہوئی تھی۔ بمل اس منظر کو فلمانا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ میں تیاری کرلوں۔ چنانچہ صبح تین بجے مجھے رکشا چلانا پڑا۔ ناشتا تو کیا نہیں کیا گیا تھا، اس لیے تھوڑی دیر کے بعد بھوک لگنے لگی۔ کمزوری بھی غالب آرہی تھی۔

بستی کے باہر میں نے ایک حلوائی کو دودھ اچھالتے دیکھا۔ میں نے رکشا وہاں روکا اور اس سے کہا کہ وہ آدھا سیر دودھ دے دے۔

”جاؤ یہاں سے دودھ نہیں ہے۔“

”یہ کڑھائی میں کیا چیز ہے؟ میں مفت تو نہیں مانگ رہا۔ پیسے دے رہا ہوں۔“

”جاؤ کہہ تو دیا کہ تم جیسوں کے لیے دودھ نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

گویا وہ رکشے والوں کو اتنی نیچی ذات کا سمجھتا تھا کہ پیسے ہونے کے باوجود دودھ دینا گوارا نہیں کر رہا تھا۔

دوپہر کو کیمرا ایک ٹرک پر رکھ دیا گیا اور اسے چھپا دیا گیا تاکہ عام افراد اسے نہ دیکھ سکیں۔ میں اشارہ پا کر رکشا چلا رہا تھا۔ کبھی سواری اتارتا اور کبھی بٹھا لیتا۔ ٹرک ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ پیاس کے مارے میرا برا حال تھا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آخر کار ٹرک ایک جگہ رکا تو میں رکشے سے اتر کر ایک لسی والے کے ہاں گیا اور ٹھیٹ پنجابی میں ایک گلاس لسی مانگی۔ دکان دار نے موٹی سی گالی بکی اور کہا۔ ”چل یہاں سے۔“

غالباً اسے برا لگا تھا کہ میں پنجابی ہوتے ہوئے رکشا چلا رہا ہوں۔ میں اپنی صفائی پیش کرسکتا تھا اور اسے اصل بات بتا سکتا تھا، لیکن اس کا وقت نہیں تھا۔

شوٹنگ کے دوران رکشا چلاتے ہوئے عجیب عجیب واقعات ہوئے۔ ایک پان والے کی دکان پر جا کر میں نے گولڈ فلیک کا پیکٹ مانگا اور اس کے طلب کرنے سے پیشتر ہی پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر روشنی میں دیکھا کہ وہ جعلی تو نہیں ہے۔ پھر جب اسے اطمینان ہوگیا کہ نوٹ اصلی ہے تو اس نے سگریٹ کی ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔ اگر وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا کہ میں نے جعلی نوٹ دیا ہے تو میں اس کا کیا کر لیتا؟ ان سب واقعات سے ایک ہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ رکشا والا ان کے نزدیک ایک حقیر مخلوق ہے اسے عزت نہیں دینا چاہیے۔

چورنگی پر شوٹنگ ہو رہی تھی تو لڑکوں کی بھیڑ ہونے لگی۔ ان سب کو اشتیاق تھا کہ کسی طرح سے ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ لیں۔ بمل رائے نے ہم سے سرگوشی میں کہا کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے کسی ریستوران میں چلے جائیں۔ یوں بچت ہوجائے گی۔ ہم ”فرپو“ ریستوران کی طرف چلے گئے، جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ مگر ریستوران میں داخل ہونے کا موقع ہی نہ ملا اس لیے کہ بیروں نے ہمیں دیہاتی لباس میں دیکھ کر دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ ان کے نزدیک دیہاتی شخص کو ریستوران میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہم ہندوستانی تہذیب اور اس کی انسان دوست قدروں کی قصیدہ خوانی کرتے نہیں تھکتے، لیکن ہمارے ملک میں صرف اور صرف پیسے کی قدر ہے، انسان کی قدر نہیں ہے۔ ہماری تہذیب کی خاصیت یہ ہے کہ اگر غریب کی جیب میں پیسا ہو تب بھی اسے وہ چیز نہیں ملے گی جو امیر استعمال کرتے ہیں۔

ایک گھوڑا گاڑی سے میری ریس کا منظر فلمایا گیا۔ تارکول کی تپتی سڑک پر دوڑنے کی وجہ سے میرے پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ میں جب بھی کہتا کہ اب بس کریں تو بمل رائے چمکار کر کہتے۔ ”بس دو شاٹ اور رہ گئے ہیں۔“ میں جانتا تھا کہ میرے چہرے پر چھایا ہوا کرب اور اذیت دیکھ کر انہیں اشتیاق ہو رہا ہوگا کہ اس اذیت کو بھی فلمبند کرلیں اور فلم میں حقیقی رنگ بھر دیں۔

تقریباً دو فرلانگ دوڑنے کے بعد میری حالت غیر ہوگئی۔ وہ تو مزے سے ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھے تھے

اور میں دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اب آپ میرے سامنے دو بوتلیں بیئر کی لگائیں گے تب ہی میں دوڑ سکوں گا۔“

انہوں نے وعدہ کیا کہ جب شوٹنگ پیک اپ ہوجائے گی تو ان کا معاون مجھے فریو لے جا کر بیئر کی دو بوتلیں پلائے گا۔ شوٹنگ ختم ہوئی تو ہم فریو کی طرف گئے۔ معلوم ہوا کہ آج ڈرائی ڈے ہے یعنی ہفتے میں ایک روز شراب کا ناغہ ہوتا ہے اس لیے کچھ نہیں ملے گا۔ اسیت سین مجھے وہاں بٹھا کر چلا گیا۔ اس دوران میں نے اپنی ٹانگیں دھو کر خود کو نارمل کیا۔ اسیت سین بیئر لے آیا، مگر اب جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا، لہٰذا میں نے وھسکی کا مطالبہ کردیا۔ اسیت اس پر تیار نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بمل رائے نے جس چیز کی منظوری دی ہے وہی ملے گی۔ میں بجٹ سے آؤٹ نہیں ہوسکتا۔ مجبوراً میں نے بیئر زہر مار کی۔

اپنے مرنے کے بعد میں کم از کم اس پر فخر کرسکتا تھا کہ میں نے ”دو بیگھہ زمین“ میں کام کیا ہے۔ پڑھے لکھے طبقے میں فلم کامیاب ہوئی، مگر عوام نے اسے پسندیدگی کی سند عطا نہیں کی۔ اس لیے کہ کہانی نویس کی کمزوری کے باعث ہیرو سب سے الگ تھلگ رہتا ہے اور کسی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھاتا، چنانچہ وہ اسے اپنے جیسا انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لازم ہے کہ ہیرو ایسا ہو کہ ان کی ساری ہمدردیاں عوام کے ساتھ ہوں۔

فلم جب روس میں چلی تو ہماری بہت تعریف ہوئی۔ مگر دل چسپ بات یہ کہ راج کپور نے اسی زمانے میں اپنی فلم ”آوارہ“ بھی ریلیز کردی۔ وہ عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ بچہ بچہ ”آوارہ ہوں۔۔۔“ گاتا پھرتا تھا۔ راج کپور روسی فنکاروں سے زیادہ مشہور ہوگئے۔ اس لیے کہ وہ خالص ہندوستانی فلم تھی۔ ہماری تہذیب کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس سے عوامی رنگ بھی جھلکتا تھا۔

اگر زبردست پبلسٹی نہ کی گئی ہوتی اور دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار نہ لگائے ہوتے تو ”دو بیگھہ زمین“ انڈیا میں فلاپ ہوجاتی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے ”دھرتی کے لال“ اور ”نیچا نگر“ بھی فلاپ ہوچکی تھیں۔ خود بمل رائے نے اس کے بعد ایسی فلم بنانے کی ہمت نہ کی۔

”دو بیگھہ زمین“ کی بیرونِ ملک ریلیز کے حقوق راج کھنہ، گرمکھ سنگھ اور راجندر سنگھ کے پاس تھے جو اپنے زمانۂ طالب علمی میں ترقی پسند تحریک کے رہنما تھے۔ انہوں نے بمبئی کے میٹرو سنیما میں اسے دھوم دھام سے ریلیز کرایا۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک میں اسے جو شہرت حاصل ہوئی وہ انہی لوگوں کی کوششوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔

دو بیگھہ زمین کے بعد میں پکا کمیونسٹ اداکار مشہور ہوگیا۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس ایسی کوئی کہانی ہوتی تو وہ مجھے ضرور بلاتا، لیکن سناٹا ہوگیا۔ میں اسٹوڈیوز کے چکر لگاتا تو لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے۔ میری صحت بھی گر چکی تھی۔ جیل میں رہنے سے پیچش ہوچکی تھی اور ہاتھوں میں ایگزیما ہوچکا تھا۔ ایک فلم مل گئی ”بازو بند“ اس سے گزارہ ہونے لگا۔ میں ایک دن سیٹ پر جعلی نشے میں طوائف کا مجرا دیکھ رہا تھا کہ بمل رائے آگئے۔ جیسے ”ہم لوگ“ کے زمانے میں آگئے تھے۔

وہ میرے نزدیک آئے اور انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ”دو بیگھہ زمین“ کے بعد تم ایسی فلموں میں کام کر رہے ہو؟ ذرا کچھ تو سوچا ہوتا؟“

میں انہیں کیا بتاتا کہ بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میں نے ترقی پسندی لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ ”بازو بند“ میں میرا کام پسند کیا گیا اور اس کی واہ وا ہوگئی۔ چنانچہ چار پانچ فلمیں اور مل گئیں جن میں اولاد، ٹکسال، آکاش اور راہی وغیرہ شامل تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب کم از کم دو تین برس تک گزارا ہوجائے گا۔ دل چسپ بات یہ ہوئی کہ دس برس میں، میں نے دس فلموں میں کام کیا، لیکن جب باکس آفس پر میری فلمیں کامیاب ہونے لگیں تو آئندہ بیس برسوں میں، میں نے تقریباً سو فلموں میں کام کیا۔

فنکار کی زندگی تضاد اور کڑواہٹوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے کردار کی کمزوریاں اور حدود بھی کئی مرتبہ اس کے فنی ارتقا کا سبب بن جاتی ہیں۔

MY FILM BIOGRAPHY
BALRAJ SAHANI
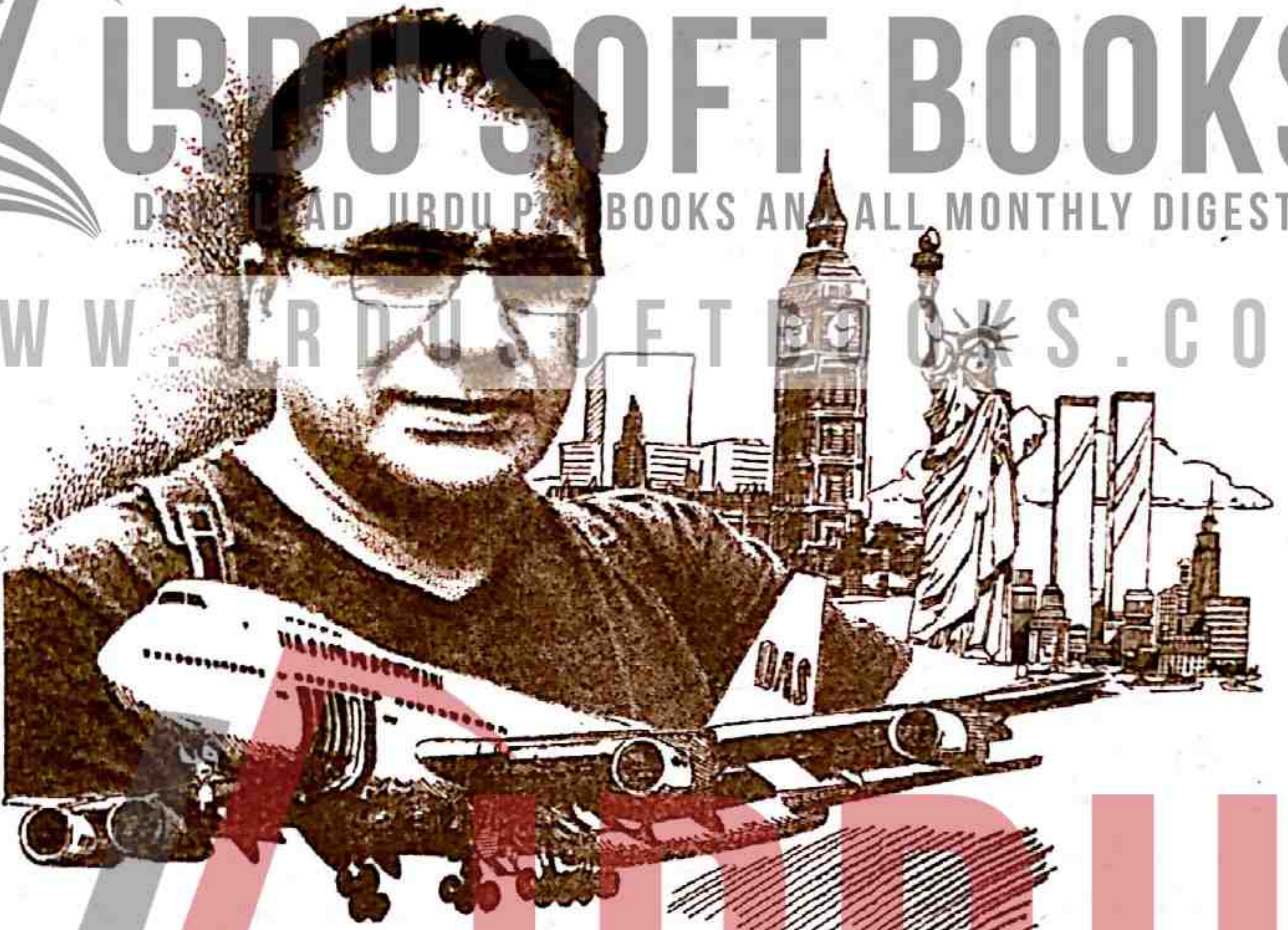
شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا نواں حصہ

سر جی نے اس پرفیوم کا گویا ٹرک خود پر الٹ لیا تھا۔ پورا کمرا ”مہک“ اٹھا تھا۔ انہوں نے مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی پھر کہا۔ ”ہم تو ریڈی ہیں۔ آج دیکھنا یونیورسٹی کی گوریاں بے ہوش ہو ہو کر گریں گی۔“

مجھے ان کی اس بات سے اختلاف تھا بلکہ یقین یہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا گوریاں کیا کالیاں بلکہ کالے بھی اس خوشبو سے بے ہوش ہوکر گر پڑیں گے۔ میں نے ان پر صرف اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور پھر باہر نکل آیا تھا مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں

کچھ بول نہ دوں۔ سرجی خوشی سے نہال تھے ان کی خوشی پر میں لکیر کھینچنا نہیں چاہ رہا تھا۔

شہباز بھی جب بیدار ہوا تو ناک سکیڑ کر فضا میں کچھ سونگھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ پیٹرول کی بو کہاں سے آرہی ہے؟“ میں نے کہا سرجی نے کوئی نایاب پرفیوم لگایا ہے اور بضد ہیں کہ ”مین“ کھنچی چلی آئے گی۔

وہ مایوس ہو کر بولا۔ ”مین کا تو پتا نہیں مگر ”مایا“ تو اب ہاتھ سے گئی۔“

”جب اس کا نشہ ٹوٹے گا تو وہ بھوکی شیرنی کی طرح بپھر جائے گی۔“ بات اس کی بھی ٹھیک تھی مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ عمارت سے باہر نکلے۔ اسٹاپ پر پہنچے۔ بس آئی اور سوار ہوگئے۔ بس چلی اور فوراً رک گئی۔ ڈرائیور کے پاس ایک محترمہ کھڑی سرگوشی کررہی تھیں پھر اس نے ہوا میں کچھ سونگھا اور اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ”کسی کے پاس سے ایسی خوشبو آرہی ہے جس سے مسافروں کو تکلیف ہورہی ہے۔ پلیز وہ صاحب اتر جائیں۔“

انداز شریفانہ تھا۔ میں ٹھہرا شریف شہری میں نے سرجی کا ہاتھ پکڑا اور بس اسٹاپ پر اتر گیا۔ سرجی ناراض تھے کہ یہ ہمارے حقوق میں مداخلت ہے۔ ہمیں احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہ پاکستان نہیں ہے۔ زیادہ اڑی کی تو ڈرائیور پولیس بلا کر جرمانہ اڑا دے گا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ منزل پر پہنچوں کیسے۔ تبھی دوسری بس آگئی۔ اللہ کا نام لے کر ہم چڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اس بس کے مسافر بھی متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوا میں سونگھتے نظر آئے۔ خدا کا شکر تھا کہ منزل آگئی اور راز فاش ہونے سے پہلے ہم بس سے اتر گئے۔ بس سے اتر کر ہم اس عمارت میں داخل ہوئے جہاں سینٹر تھا۔ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوئے کوریڈور میں موجود ہر تیسرے شخص کو دیکھا کہ وہ یکا یک ناک سکیڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ میں تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھا۔ اس وقت سرجی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا جسے میں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ انہیں تقریباً کھینچتا ہوا میں لفٹ میں داخل ہوا۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا ایک نوعمر سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ کہیں کی اسٹوڈنٹ نہ تھی۔ اس کے جسم پر جینز اور ٹی شرٹ منڈھا ہوا تھا۔ اس پر غضب یہ کہ ٹی شرٹ لمبائی میں بہت زیادہ چھوٹی تھی۔ سرجی کھلے پڑ رہے تھے کہ میں نے سرگوشی کی کہ ہوش میں رہیں ورنہ یہ پولیس بلوا لے گی۔ دھمکی کام کر گئی اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے کی اداکاری کرنے لگے تاکہ ہر بار نگاہیں قتالہ عالم پر پڑ سکیں۔ ادھر وہ قتالہ عالم خوف کے عالم میں ہمیں دیکھ دیکھ کر بار بار سینے پر کراس بنا رہی تھی۔ جیسے ہی لفٹ رکی وہ اتنی تیزی سے باہر نکلی کہ سامنے کھڑے جوڑے سے ٹکرا گئی۔ جوڑے کے کچھ کہنے سے پہلے اس قتالہ نے ڈچ زبان یا کسی اور زبان میں کچھ کہا جسے سنتے ہی لڑکے نے ہماری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے دبی دبی سی چیخ ماری اور دوڑ لگا دی۔ میں حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سینٹر کی جانب چلا۔ جیسے ہی ہم ہال میں پہنچے وہ قتالہ عالم ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ہمیں اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخ جو اس نے اب تک ماری نہیں تھی صرف اپنے سینے پر کراس بنا بنا کر بدبداتے ہوئے چیخ روکے رکھی تھی۔ وہ چیخ اس نے ہال میں ماری اور ایسی زبردست ماری کہ وہاں بیٹھے تمام لوگ دہل اٹھے۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی اور ہم ہونق بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ تبھی الزبتھ آگے بڑھی اس نے اسے سہارا دے کر ڈھیرے سے کچھ کہا اور ایک شخص سے پانی لانے کو کہا۔ وہاں بیٹھے اکثر لوگ بار بار ناک سکیڑ رہے تھے۔ پانی پی کر قتالہ عالم نے جو کچھ کہا وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں تھا مگر مفہوم سمجھ کر میرے دل میں آیا کہ میں یہیں سرجی کی مرمت شروع کردوں لیکن شرافت آڑے آگئی تھی۔ اس لڑکی نے جو کچھ کہا وہ کچھ یوں تھا۔ ”میڈم یہ آدمی مردوں کو سروس دیتا ہے۔ مسلم اپنے مُردوں کو پانی سے دھو کر پرفیوم کرتے۔ وہی خوشبو اس آدمی کے جسم سے آرہی ہے۔ یا تو یہ زندہ ہے یا پھر مردے کو سروس دینے والا۔“ سرجی اب خاموش کھڑے تھے۔

الزبتھ نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا پھر بولی۔ ”یہاں کا قانون کہتا ہے کہ آپ کسی کو خوفزدہ نہیں کرسکتے۔ اس لیے گزارش ہے کہ آپ باہر چلے جائیں۔

پیچ و تاب کھاتا ہوا میں بھی سرجی کے ساتھ باہر آیا اور ڈانٹ کر بولا۔ ”آپ سیدھا اپارٹمنٹ جائیں اور نہا کر اس خوشبو سے جان چھڑائیں۔“

سرجی سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔ خود میں بھی واپس سینٹر نہیں گیا۔ شہباز سے کہا کہ وہ رکا رہے میں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوگیا تاکہ قصہ کم ہو جائے۔ بہت دیر اِدھر اُدھر بلاوجہ گھومتا رہا۔ پھر شام تک

مائیکروا سکل سنٹر میں بیٹھا رہا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی مجھے دیکھ کر کمبل میں دبک گئے تھے۔ میں نے بھی کچھ زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے صرف یہ کہا کہ وہ مٹی کے تیل کی بوتل میرے حوالے کر دیں۔ انہوں نے خاموشی سے اسے میرے حوالے کر دیا اور میں محلول کو باہر ڈسٹ بن میں ڈال آیا۔ سرجی سے کہا۔ ''اس قسم کی خوشبو پاکستان میں چل جاتی ہے کیونکہ وہاں موسم سخت ہوتا ہے اور یہ جلد اڑ جاتی ہے مگر یہاں کے درجۂ حرارت میں یہ محلول ہمیشہ کے لیے آپ سے چپک کر رہ جاتا ہے۔'' میں ان کا دل رکھ رہا تھا۔ مجھے افسوس بھی تھا کہ جو کچھ بھی آج ہوا، اچھا نہیں ہوا۔ پورا دن بدمزہ گزرا تھا۔ میں بھی جاتے ہی بستر پر بغیر کھائے پیے گر گیا۔ شہباز ماموں کے گھر جا چکا تھا۔ کیونکہ کل پھر صبح سویرے کین سنٹر پہنچنا تھا۔

دوسرے دن ہم باقاعدہ شریف بن کر سنٹر پہنچے۔ آج حقیقی طور پر کین سنٹر میں ہمارا دوسرا دن تھا۔ کل کا دن رائیگاں چلا گیا تھا۔

وہاں میں نے جتنا سیکھا وہ میں مہینوں میں نہ جان سکتا تھا۔ آج بھی کینیڈا کے نظام، اخبارات اور ان کے سیاسی رجحان، سیاسی جماعتوں، ان کے منشور، فاسٹ فوڈ اور ان کا معیار، کریڈٹ کارڈ اور اس کے فوائد اور نقصانات پر بات ہوتی رہی۔ آگے کے دنوں میں جاب کی تلاش، Resume بنانا، انٹرویو دینا، کمپنی کا کارپوریٹ کلچر اور ان کا معیار جانچنا، یہاں کی لائبریریوں میں کتابوں کی سرچ، یہاں کے شہریوں کے حقوق اور فرائض پر بات ہونا بھی۔ نسلی یا جنسی تعصب کے بارے میں قوانین سے آگاہی کروانا تھی۔ اس ایک مہینے کی سخت جان لیوا محنت نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا مگر اتنا کچھ سیکھا جو آگے چل کر میرے کیا، میرے جاننے والوں کے بھی بہت کام آیا تھا۔ کیونکہ میں اسے جوں کا توں آگے بڑھاتا رہا۔ میرے لیے جان لیوا کام ایسے تھا کہ یہاں سے دو بجے میں چھٹی کرتا۔ اپارٹمنٹ آدھے گھنٹے کے لیے رک کر کوئی کھانا تیار کرتا یا آلو ابال لیتا۔ پھر چائے پی کر ہولڈنگ سنٹر جاب پر سوا تین بجے نکل جاتا۔ وہاں سے رات ایک بجے کے قریب واپس آتا اور کچھ نہ کچھ کھا کر سو جاتا تھا اور پھر سرجی کی پکار پر سات بجے اٹھ کھڑا ہوتا۔ درمیان میں کہیں ہولڈنگ سنٹر میں جاب کی شفٹ نہ ملتی تو دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔ آرام کرتا اور سوچتا رہتا۔

آج کین سنٹر میں کافی کا وقفہ ہوا تو سب کافی مشین کے گرد کھڑے تھے۔ مارک ساتھ آ کھڑا ہوا۔ پھر سے گرم جوشی کے ساتھ اپنا تعارف کروایا۔ ساتھ ایرانی نسرین اپنے کل والے لباس میں کھڑی تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں کے ساتھ وہ سب سے نمایاں تھی۔ اس نے مصافحے کے لیے اپنا دودھ کی طرح سفید ہاتھ بڑھایا تو میں نے جھجکتے ہوئے تھام لیا۔ بات ہوئی تو بتانے لگی کہ وہ یہاں اپنے چھ سالہ بیٹے کے ہمراہ رہتی ہے۔ شوہر ایران میں ہے اور اس سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح جاب کی تلاش میں یہاں کا کورس کر رہی تھی۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ مارک آ گیا۔ مارک نے مجھے دیکھ کر اپنی بائیں آنکھ دبائی اور نسرین سے کہا۔

''ندیم تم کو پسند کرنے لگا ہے اور ابھی وہ مجھ سے تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔'' میں یہ سن کر بوکھلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ الزبتھ سے میری شکایت نہ کر دے مگر دیکھا تو وہ شرما کر مسکرا بھی رہی ہے۔ مارک کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ تھی اور وہ پھر اسی حالت میں کھسک گیا۔

جب سے میری جاب ہوئی تھی اور معروفیت بڑھی تھی تو میں اپنے ذہنی دباؤ سے بھی نکل آیا تھا۔ نسرین کو مسکراتے، شرماتے دیکھا تو ذرا سا شیر ہو گیا۔ سرجی ہمیں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر لپکے مگر میں نے اشارے سے انہیں واپس کر دیا۔ وہ دور منہ بسورے کھڑے تھے اور ارد گرد کوئی شکار تلاش کرنے لگے۔ میں دوبارہ سے نسرین کی جانب متوجہ ہوا اور پوچھا۔ ''نسرین کا مطلب کیا ہے۔''

مارک جو یہیں کہیں منڈلا رہا تھا، بیچ میں کودا اور بولا۔ ''ناموں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ نام تو صرف پہچان کے لیے ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اب کی بار دائیں آنکھ دبائی اور رفو چکر ہو گیا۔ نسرین ابھی تک مسکرا رہی تھی اور بولی۔ ''مارک جھوٹ بولتا ہے۔

''نسرین ایک پھول کا نام ہے۔'' میں ذرا قریب ہوا اور بولا۔ ''لگتی بھی ہو۔'' وہ اب کی بار بہت زیادہ شرما گئی اور ساتھ میں سرخی کی لہر بھی چہرے پر چھا گئی۔ میں بھی سُر میں آ گیا۔ مجھ سے پوچھا۔ ''ندیم کا کیا مطلب ہوتا ہے۔'' میں اور قریب ہوا اور بولا۔ ''اس کا مطلب دوست ہوتا ہے۔''

اس نے اپنی گہری آنکھیں مجھ پر گاڑیں اور بولی۔ ''لگتے بھی ہو۔'' میں لگتا تھا کہ نہیں مگر میں بے خودی

میں مست ہو گیا۔

اس سے پہلے میں کچھ اور پوچھتا کہ شہباز آدھمکا۔ ”بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں، یہ کیا سیاپا ہو رہا ہے؟“

میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ نسرین پنجابی یا اردو تو نہیں سمجھتی تھی مگر شہباز کے انداز سے بھانپ گئی کہ شہباز دخل در معقولات کر رہا ہے۔ وہ وہاں سے چلی گئی اور شہباز میرے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں اسے کوئی جواب دیتا کہ سر جی، جو ابھی تک فارغ کھڑے تھے، وہ آ پہنچے اور بولے۔ ”سب اسٹوڈنٹس کلاس میں چلے گئے ہیں اور آپ یہاں قیمتی وقت کا زیاں کر رہے ہیں۔“ میں شہباز کو گھورتا ہوا کلاس میں نسرین کے ساتھ ایک خالی کرسی پر آ بیٹھا اور وہ دونوں مجھے ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر کسی شدید صدمے کی کیفیت میں تھے۔

کلاس ختم ہوئی تو میں جلدی سے باہر نکلا۔ مجھے جلد از جلد بس پکڑنی تھی کیونکہ اپارٹمنٹ سے ہوتے ہوئے مجھے ہولڈنگ سینٹر جاب پر آنا تھا۔ میں بس میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں نسرین میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی۔ میا مبو آگے بیٹھا، اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بلند کر کے یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ”لگے رہو۔“

وہ بتا رہی تھی کہ مجھے حکومت کی جانب سے سوشل سیکیورٹی ملتی ہے۔ کبھی کبھی کیش پر بھی جاب کر لیتی ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ”کہاں رہتی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کیل اسٹیشن کے باہر ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں۔“ میں کیل سے کچھ آگے کپلنگ پر اترتا تھا۔ میں نے کہا کہ وہیں ہائی پارک بھی ہے اور مجھے اسے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ دراصل علی سفیان آفاقی نے اپنے سفرنامے میں اس کا تذکرہ کیا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔ ”جب موسم بہتر ہو گا تو تمہیں دکھلانے لے جاؤں گی۔“

کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی۔ ”تمہاری تعلیم اور تجربہ بہت اچھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنی فیلڈ کی جاب جلد پا لو گے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اتنا یقین ہے؟“

یہ سن کر ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ ”میری اندرونی حس کہہ رہی ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔“

یہ سن کر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا مگر جب میا مبو کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو خجالت سے چھوڑ دیا۔ پہلی بار اس نے پوچھا۔ ”کیا تمہاری فیملی ہے؟“

میں نے سب بتا دیا کہ بیوی ہے، دو بیٹیاں ہیں اور آج کل انہیں اسپانسر کرنے کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔

وہ کچھ دیر بے تاثر بیٹھی رہی۔ پھر بولی۔ ”کیا ہم دوست تو ہو سکتے ہیں؟“ مجھے ہاں کرنے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر اس لیے ہچکچا رہا تھا کہ میا مبو کے کان ادھر ہی لگے تھے۔ میں نے سر کے اشارے سے دو تین بار ہاں ہاں کہا تو نسرین کے ساتھ ساتھ کمبخت میا مبو بھی مسکرا پڑا۔ وہ کیل پر اتر گئی اور میں اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

آج شام سے برف باری ہو رہی تھی اور ساتھ ہی برفانی ہوا تندہی سے مسلسل چل رہی تھی، جس سے درجہ حرارت انتہائی نیچے گر کر خود بھی منجمد ہو چکا تھا۔ برف کے ذرات ہر جگہ اڑتے پھر رہے تھے۔ فضا دھندلی دھندلی تھی اور دیکھنے کی قوت دو تین فٹ بعد زائل ہو جاتی تھی۔ میں جاب سے رات میں گھر آ رہا تھا۔ آج ہولڈنگ سینٹر میں سب قیدی لنچ روم میں دل شکستگی میں بیٹھے باہر کا دل افسردہ موسم دیکھتے رہے تھے۔ جب کمروں میں جاتے تو بستر پر لیٹے کمرے کی چھت کو اداسی سے تکتے تھے۔ میں اس موسم سے اتنا بیزار نہ تھا جتنے باقی سب تھے۔ میرے لیے یہ سب نئے مناظر تخلیق کر رہے تھے۔ میں واپس پر اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹے، اپارٹمنٹ کی طرف یہ سوچ کر چل رہا تھا کہ آج اس موسم میں سر جی نے پھر سنو مین بنانے کی حماقت نہ کر دی ہو۔ وہ برف باری کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور جب ایسا طوفان ہوتا جیسے آج اٹھ رہا تھا تو دودھ گرم کر کے جلیبیاں اس میں ڈالتے۔ یہ ان کے لیے ساون کی جھڑی کی طرح کا موسم ہوتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس موسم میں کسی درخت پر پینگیں ڈالے جھولا جھول رہے ہوتے۔ سر جی دل پھینک نہ تھے مگر وہ بہت سی توقعات لیے پاکستان سے آ کر یہاں لینڈ کر گئے تھے۔ ان میں ایک برف باری میں سنو مین بنانا تھا اور دوسری یہ توقع جو انتہائی درجے پر تھی، وہ یہ کہ یہاں ہر لڑکی اشارے سے پھنس جاتی ہے اور وہ کسی سے دوستی کر کے اپنے اندر لکھی کہانی کو انجام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ حالات اور ماحول ان کی اس معصوم اور جان لیوا توقعات کو کم کرنے کی بجائے زیادہ اکسا رہے تھے۔

میں اس خیال سے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا کہ آج پھر وہ اپنے پُرجوش چہرے کے ساتھ کوئی نہ کوئی افسانہ لے کر بیٹھے ہوں گے مگر جب اندر کے گرم اور آسودہ ماحول میں

داخل ہوا تو دیکھا کہ شہباز اور سرجی اپنے چہرے پر پریشانیاں بکھیرے خاموش بیٹھے میرے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

سرجی نے رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھا اور دوبارہ سے کسی غم کے سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ میں نے پہلے گرم پانی سے غسل کیا تو تھکاوٹ اور سردی ایک دم سے غائب ہوگئی اور میں پھر سے تروتازہ ہوگیا۔ لیونگ روم میں آیا تو وہ دونوں کھسر پسر کرتے پائے گئے۔ نہ آج گرم دودھ تھا اور نہ اس میں کوئی جلیبیاں تھیں۔ جو بنا تھا وہ میں نے پلیٹ میں ڈالا اور ان کے پاس بیٹھ کر اپنا ڈنر کرنے لگا۔ میرے کچھ نہ پوچھنے پر شہباز بول پڑا۔ ”مفتی پہنچ چکا ہے۔ آج بہن کے گھر میں ٹھہرا ہے اور کل دوپہر تک وارد ہو جائے گا۔“

میرا ہاتھ کھانا کھاتے وہیں رک گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا اس کا فون آیا تھا۔“

جواب میں سرجی نے ہاں میں سر ہلایا۔

ہماری تشویش یہ تھی کہ وہ سرجی کو دیکھ کر کیا ردِعمل دے گا۔ مجھے یقین کی حد تک یہ گمان تھا کہ وہ کوئی دنگا فساد ضرور کرے گا۔ شہباز نے فون اٹھایا تھا اور اب اس ”بھیانک“ خبر پر دونوں بیٹھے کوئی حل سوچتے تھے۔ حقیقت میں سوچنا مجھے تھا اور پریشان سرجی کو ہونا تھا مگر چہرہ زرد شہباز کا ہو رہا تھا۔ شہباز نے کمزور لہجے میں پوچھا۔ ”یہ سیاپا اب کیسے ٹلے گا۔“

میں نے جو سوچا تھا وہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ میں بولا کہ آپ دونوں کل کین سینٹر جائیں اور پانچ بجے سے پہلے یہاں نہ پہنچیں۔ کہیں بھی مجل ہوتے رہیں مگر یہاں... پانچ بجے سے پہلے نہ آئیں۔ وہ دونوں اب پوری توجہ سے مجھے سن رہے تھے۔ میں نے بات کو آگے بڑھایا۔ ”میں مفتی کے سامنے پوری صورت حال رکھوں گا کہ کس طرح سرجی نے ایئرپورٹ سے ہمیں فون کیا تھا۔ اس کے ساتھ فیض صاحب نے کیسے دھوکا کیا اور کس طرح وہ یہاں پہنچے۔ میں کچھ باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کروں گا تاکہ سرجی مکمل ایک مظلوم ہستی کا درجہ پا جائیں۔ پھر مفتی کو اس طرح راضی کروں گا کہ کچھ عرصہ یہاں ٹھہر کر پھر انہیں کہیں شفٹ کر دیں گے۔“ سرجی منمنائے۔ ”اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو؟“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”پھر ایک ہی راستہ رہ جائے گا کہ ہم تینوں اپنا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیں۔“ مگر مجھے امید تھی کہ مفتی بھلا مانس انسان ہے اور وہ وقتی صدمے سے دوچار ہو کر ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ سن کر وہ دونوں خوش ہوگئے۔

خوش تو میں بھی تھا کہ کل صبح جلدی اٹھ کر کین سینٹر جانے سے نجات مل جائے گی مگر جب سرجی کے مہلک پرفیوم کا خیال آیا تو واش روم میں کھڑے سرجی کو آواز لگائی۔ ”سرجی کل صبح جاتے وقت مہربانی کرکے اپنا وہ پرفیوم نہ لگانا۔“

اداس ہو کر کہنے لگے۔ ”میری وہ بوتل تو آپ کل ہی ڈسٹ بن میں ڈال آئے تھے۔ مگر......“ میں گھبرا گیا۔ ”مگر کیا......؟“ سر جھکا کر بولے۔ ”ماشاء اللہ ایک اور بھی ہے۔“ اب میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کہنے لگے۔ ”تم کہو تو ابھی توڑ دیتا ہوں۔“

میں بوکھلا گیا کہ کہیں توڑ نہ بیٹھے۔ ورنہ اس کی زہریلی بو تاحیات اس اپارٹمنٹ سے نہیں جائے گی پھر شہباز نے بڑھ کر وہ بوتل اپنے قبضے میں لے لی اور کہا۔ ”یہ زہریلی چیزیں یہاں ممنوع ہے اور اسے کیمیکل ڈسپوزل والوں کے حوالے کرنا پڑے گا۔“

وہ دونوں سوگئے تو میں نے پہلے پاکستان فون کیا اور پھر بیٹھ کر اسپانسر کے فارمز اور باقی کاغذات کو مکمل کرنے لگا۔ اب صرف بینک سے ڈرافٹ بنوا کر انہیں پوسٹ کرنا تھا۔

وہ دونوں میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی کھسک چکے تھے۔ میں نے اسی دوران اسپانسر کے کاغذات کو ایک بار پھر چیک کیا تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ مجھے اب اللہ کی ذات پر اور اس کی مدد کا ایک یقین ہو چلا تھا کہ میری فیملی جب آئے گی تو اپنا رزق ساتھ لائے گی اور ساتھ اللہ میرا رزق بھی کھول دے گا اور میں کسی اچھی جاب کو حاصل کر لوں گا۔ خان قیصر نے میرے اندر یقین کی طاقت بھر دی تھی، جب اس نے میرا ایک طرح سے تمسخر اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا۔ ”تو رزق دینے والا ہے، بچے جب آئیں گے تو اپنا کیا تمہارا رزق بھی لے آئیں گے۔“ میں جو بچوں کو سال دو سال بعد بلانے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا، ان باتوں سے فوراً اس بات پر تیار ہو گیا کہ بچوں کو جلد از جلد بلانا ہے، کیونکہ جب تک انہیں اسپانسر نہیں کرتا، مجھے کوئی جاب نہیں ملنے والی ہے۔

ایک بجے...... مفتی پاکستان سے آ پہنچا۔ اس کا

بہنوئی چھوڑنے آیا تھا۔ میں نے گاڑی سے سامان نکالا اور اسے اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ سخت سردی میں اس کے بہنوئی کی زیادہ منت نہ کرسکا کہ چائے پیتے جائیں۔ میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں۔ ہم سامان سمیت اپارٹمنٹ میں آ گئے۔ مفتی بہت خوش و خرم نظر آرہا تھا۔ بہت اچھے موڈ میں تھا ایسے کہ کسی سزا سے چھوٹ کر بخیریت نکل آیا ہو۔ میرے لیے اسے سرجی کو ٹھہرانے پر راضی کرنے کے لیے یہ موڈ خاصا کارآمد ہوسکتا تھا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو پہلے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کل ہم نے مل کر اسے چمکا دیا تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہورہا تھا۔ میں چائے بنا کر لایا تو کہنے لگا۔ ''لگتا ہے کہ تم نے اپارٹمنٹ کو بہت سنبھال کرر کھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ میرا کمال نہیں۔''

وہ بولا۔ ''شہباز سے تو امید نہیں کہ وہ کسی کام کو ہاتھ لگائے، پھر کس نے اتنے سلیقے سے اپارٹمنٹ کو رکھا؟''

میں نے بات بدلی۔ ''اور سناؤ! پاکستان کا کیا حال ہے۔ خوب انجوائے کیا ہوگا؟'' میرا یہ کہنا ہی تھا کہ وہ پھٹ پڑا۔

''وہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ہر طرف دھواں، آلودگی، گرد اور شور...... معلوم نہیں میں نے اتنے دن وہاں کیسے گزار لیے۔'' پھر میری جانب دیکھ کر اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ یہاں آگئے۔ ورنہ تم بھی اسی گرد زدہ ماحول میں رہ رہے ہوتے۔''

میں چپ رہا مگر حیران تھا کہ جانے سے پہلے تو کہہ رہا تھا پاکستان سے بڑھ کر کوئی ملک نہیں۔ آج آیا تو شکایتوں کا انبار بھی کندھے پر اٹھا لایا حالانکہ اس کے بچے بھی پاکستان میں تھے اور دو سال بعد ان سے ملنے گیا تھا۔ ہر ایک کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ مفتی آدم بیزار اور تنہائی پسند تھا۔ اپنی دنیا اپنے اندر بسائی ہوئی تھی۔ جس میں نہ جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ ٹی وی کے سامنے گھنٹوں گزار لے مگر کسی انسان کے ساتھ ایک گھنٹا بمشکل گزار سکتا تھا۔ میرے ساتھ بہت مخلص رہا۔ میری رہنمائی بھی کی اور بہت زیادہ مدد بھی۔ مجھے اپنے ساتھ رکھا، یہاں کے نظام اور اطوار سے آگاہ کیا۔ آگے بھی پڑھنے والوں کو معلوم پڑے گا کہ کس طرح سے میرا خیال رکھتا رہا تھا۔

آج وہ بھرا بیٹھا تھا۔ میرے پاس اس کے لیے دلائل بہت تھے مگر میں نے انہیں آگے کے لیے سنبھال رکھے تھے کیونکہ آج مجھے سرجی کی بات کرنی تھی۔ کھانا وہ کھا کر آیا تھا اور اب میرے ہاتھوں سے بنی چائے پی کر اپنا سوٹ کیس کھولے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے باس اور پھر اس کے باس کے لیے سوئیٹر اور بہت سا سامان لایا تھا۔ انہیں نکال کر نہایت ہی احترام سے پیک کرنے لگا۔ ان تحائف کو کبھی الماری میں چھپاتا اور کبھی دوبارہ سوٹ کیس میں رکھ دیتا۔ آخر میں نے پوچھ لیا۔ ''انہیں چھپا کیوں رہے ہو؟''

جواب دیا۔ ''کہیں چمن کے مسالوں کی بو ان میں نہ گھس جائے؟''

''تمہارے کپڑوں سے آتی ہے کیا؟''

''تمہیں نہیں آتی مگر گوروں کو آتی ہے۔''

''اور جوان سے آتی ہے، کیا تم نے کبھی برا منایا ہے؟ اور حالانکہ وہ اتنا پرفیوم بھی لگاتے ہیں۔''

میرے اس تبصرے سے پہلے ہی وہ سب تحائف دو تین پلاسٹک کے بیگ میں کس کے باندھ کر سوٹ کیس میں رکھ چکا تھا اور میری اس بات کا کوئی جواب اس کی طرف سے نہیں آیا۔ میں نے بھی بات کو نہیں بڑھایا۔

جب سب سامان کو سنبھال کر اپنا سوٹ کیس دوبارہ الماری میں رکھنے گیا تو وہیں اس کی نظر سرجی کے سوٹ کیس پر پڑی۔ وہ بری طرح چونکا اور پلٹ کر پوچھا۔ ''یہ کس کا ہے؟''

سوال یکا یک ہوا تھا۔ میں ایک دم بوکھلا گیا کہ کیا جواب دوں۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ بات میرے اندازے سے پہلے کھل چکی تھی۔ پھر سوچا یہ اچھا ہوا کہ بات کرنے کی کوئی راہ تو نکلی۔ میں نے کہا۔ ''یہ شاہد صاحب کا ہے۔''

اس کے تیور بدلے اور بگڑ کر بولا۔ ''کون شاہد صاحب؟''

''ان کو پیار سے سرجی کہتے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''سرجی۔''

''کہتے ہوں گے مگر یہ سوٹ کیس یہاں کیسے آیا؟''

میں نے پھر مفتی کو آرام سے بمشکل بٹھایا اور اسے ساری کتھا سنائی۔ آخر میں کہا کہ کچھ دن ٹھہر کر اس کے رہنے کا انتظام ہو جائے گا۔ وہ ساکت سا مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ مجھے رش پسند نہیں۔ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ ہے اور تم دو پہلے ہی اس کمرے میں فٹ ہو۔ اب یہ...... سرجی کہاں رہیں گے؟''

میں نے کہا۔ ”ان کو ہم اپنے کمرے میں تیسرا میٹرس بچھا کر رکھ لیں گے اور تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ وہ خاموش رہا تو میں نے لوہا گرم سمجھا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ انسانیت کا تقاضا تھا کہ کسی دکھی کی مدد کی جائے۔ تم تو پہلے سے ہی نہایت نرم دل ہو۔ تم کو بھی اس صلہ رحمی کا بدلا ملے گا۔“

میرے نرم دل کہنے پر اس نے کچھ بے یقینی سے مجھے دیکھا کہ کہیں میں طنز تو نہیں کر رہا۔ میں نے بہت زیادہ سنجیدہ چہرہ بنالیا اور باتوں میں اسے فرشتوں کے مقام پر جا بٹھایا اور اب اس مقام سے اترنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ تذبذب کی حالت میں بیٹھا رہا اور آخر میں بولا۔ ”اس کے کسی ٹھکانے کا انتظام جلدی کر لینا۔“

میں نے اسے رام پایا تو مسکرا کر مذاق پر اتر آیا۔ ”دیکھو مفتی!“

”کیا دیکھو؟“

”یہ کہ دنیا عارضی ٹھکانا ہے۔ یہ تمہارا میٹرس، ٹی وی، یہ تمہارے الماری میں لٹکے سوٹ سب سب فانی ہیں۔ تم چلے جاؤ گے تو صرف تمہارے اعمال ہی کام آئیں گے۔ سب کا سب دھرے کا دھرارہ جائے گا۔“

”ایک تو چوتھا بندہ گھر میں گھسا لیا اور اوپر میرے مرنے کی خبر بڑے مزے سے مجھے ہی سنا رہے ہو۔ بڑے خبیث ہو۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”مگر اپنے سرجی کا انتظام جلدی کرنا ہے۔“ وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

سر دست تو یہ مرحلہ احسن طریقے سے سر انجام پا چکا تھا۔ اب مجھے ان دونوں کا انتظار تھا۔ وہ دونوں کہیں آس پاس بھٹک رہے تھے۔ مجھے مفتی کو راضی کرنے کے لیے وقت دے رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ معرکہ آدھے گھنٹے میں نمٹ چکا ہے۔

شام سے پہلے وہ دونوں ڈرے ڈرے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ سرجی نے ہاتھ میں ایک لفافہ تھاما ہوا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مفتی کو خوش کرنے کے لیے جلیبیاں بھی لائے ہیں۔ وہ اندر آئے تو ہم دونوں لیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ مفتی پاکستان کے قصے سنا رہا تھا۔ جیسے سرجی کو دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سرجی بھی ششدر رہ گئے۔ میں اور شہباز یہ منظر دیکھ کر خود بھی حیران تھے کہ یہ کیوں حیرت اور خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھے چلے جا رہے ہیں۔

مفتی اچانک اٹھا اور بولا۔ ”شاہد بھائی آپ یہاں کیسے؟“

سرجی نے لفافہ پھینکا اور مفتی سے لپٹ گیا۔ ”سہیل بھائی...... آپ یہاں کیسے؟“ وہ دونوں ہنس کر جپھیاں ڈال رہے تھے۔

ہم سمجھ تو گئے تھے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔ میں ایک خوشگوار کیفیت میں گھرا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ شہباز کا منہ کھلا اور چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کون لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا حال نہایت ہی جوش و خروش سے پوچھ رہے ہیں۔ ایک سوال پوچھتا تو دوسرا اسے دہراتا۔

تم یہاں کہاں......؟ تم کیسے ہو......؟ کہاں غائب ہو گئے تھے......؟ کتنے بچے ہیں......؟ بال بھی گر گئے ہیں...... تم بھی تو گنجے ہو رہے ہو...... بہت بدل گئے ہو اور سب کیسے ہیں......؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات دونوں نے متعدد بار پوچھے اور آخر میں تھک سے گئے۔

میں اور شہباز بدلتے حالات میں اجنبیوں کی مانند حیران بیٹھے تھے۔

جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے دونوں سے پوچھا۔ ”کیا آپ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہو؟“

ان کے جوابات سے یہ معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ ایک ہی کالج سے پڑھا۔ سرجی انجینئرنگ کرنے لگے اور مفتی فارمیسٹ بن بیٹھا۔

سرجی کہنے لگے۔ ”میں گلی کی نکڑ پر فریزر میں ٹھنڈی بوتلیں لگایا کرتا تھا اور مفتی جو عموماً فارغ ہوتا۔ میرے پاس بیٹھا رہتا تھا۔“

مفتی ہنس کر بولا۔ ”کیا اچھے دن تھے۔“

سرجی بولے۔ ”تمہارے اچھے تھے پر میرے اتنے اچھے نہ تھے۔“ پھر دونوں ہنسنے لگے۔

اب مجھے لگ رہا تھا کہ ان دونوں کی اتنی جان پہچان نکل آئی ہے تو سرجی کے رہنے کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔ اب تو مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ مفتی ہم دونوں میں سے کسی ایک کو نکال دے گا لیکن سرجی کو کہیں جانے نہ دے گا۔

میرے سر سے سرجی کا بوجھ اترا تو میں کمرے میں سونے چلا گیا۔ شہباز باہر لیٹ گیا تھا اور ان دونوں کے

بولنے کی آوازیں مجھے متواتر آتی رہیں۔

شام کو سو کر اٹھا تو باہر برف باری ہو رہی تھی۔ سرجی پردہ کھسکائے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے مفتی سے محو گفتگو تھے۔ سرجی اور مفتی نے مل کر کھانا بنایا۔ میں لیونگ روم میں آیا تو شہباز میرے کان کے قریب ان دونوں کی شکایتیں کرنے لگا۔ ”مجھے الگ بٹھا کر خود باتیں کر رہے ہیں جیسے میرا وجود ہی یہاں نہ ہو۔ مجھے نظر انداز کر رکھا ہے۔ کیا یہ سراسر زیادتی نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”تم بھی ان سے باتیں کرو، کیا تمہیں انہوں نے روکا ہے؟“

کہنے لگا۔ ”نہیں ندیم بھائی! یہاں گروپ بندی ہو رہی ہے اگر انہوں نے اپنا گروپ بنایا تو ہم بھی اپنا گروپ بنا کر بھرپور مقابلہ کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں ہوتا، دوست ہیں اور سالوں بعد ملے ہیں تو انہیں موقع دو تا کہ باتیں کر سکیں اور پچھلی یادوں کو لے کر اپنے آپ کو خوش کر سکیں۔“ پھر میں نے شہباز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اپنی جاب پر زیادہ توجہ دے اور کل ہمیں کین سینٹر بھی جانا ہے۔“

میں آج کین سینٹر نہیں گیا تھا۔ کل جانا ضروری تھا۔ مجھے وہاں سیکھنے کو بہت ملتا تھا۔ کل مجھے کین سے سیدھا ہولڈنگ سینٹر جاب پر جانا تھا اور اس طرح میرا دن صبح سات بجے سے رات بارہ بجے تک کا تھا۔

”دوسرے دن گرتی برف میں ہم تینوں وہاں پہنچے تو اشوک کے پاس نسرین کو کھڑے پایا۔ اشوک نے ہمیں دیکھا تو نسرین سے بولا۔ ”لو وہ آ گئے ہیں۔“ پھر مجھ سے کہا یہ تمہارا پوچھ رہی تھی کہ کل کیوں نہیں آیا۔“ یہ سن کر وہ جھینپ سی گئی۔

شہباز نے مجھے وہیں روک لیا اور کہنے لگا۔ ”سچ بتا یہ سب کیا چل رہا ہے؟“

میں نے اپنا بازو چھڑایا اور کہا۔ ”ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

میں اشوک سے ملا اور پھر نسرین کی طرف قدرے جھک کر شہباز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پوچھتا ہے کہ ہمارے درمیان کیا چل رہا ہے۔“

شہباز گھبرا گیا مگر سرگوشی میں سرجی کہے بغیر نہ رہ سکے۔ ”اکیلے اکیلے پھنسالی اور ہمیں پوچھا بھی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا کوئی بریانی کی پلیٹ تھی جو تمہیں بھی پیش کرتا۔“

اسی دوران نسرین ایک ہاتھ اشوک کے کاؤنٹر پر اور دوسرا کمر پر رکھے ہماری باتوں کو نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔ جب ہم کلاس کی طرف جا رہے تھے تو سرجی میرے کان کے قریب آ کر بولے۔ ”ماشاء اللہ بہت حسین ہے۔ مجھے تو گھائل کر رہی ہے۔“

سرجی کی عادت کو میں سمجھ گیا تھا کہ ہر لڑکی بلکہ ہر وہ ہستی جس پر لڑکی ہونے کا شبہ ہو وہ اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ ضرور لگاتے ہیں۔

سرجی امریکا یا کینیڈا شاید اس لیے آئے تھے کہ وہ دیکھ سکیں، جو یہاں کے بارے میں زبان زد عام تھا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ مغالطہ ہے باقی غلط فہمی ہے لیکن پھر بھی لوگ یقین کرتے ہیں کیونکہ گھڑی ہوئی باتیں زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ جو سچ تھا وہ تو سرجی کے سامنے تھا اور جو سامنے نہ تھا وہ اس کی کھوج میں رہتے تھے۔ شہباز کو جاب چاہیے تھی اور دیگی کھانا چاہیے تھا جہاں سے یہ سب ملتا رہے وہی اس کی جنت تھی۔ میرا خواب دنیا دیکھنا تھا، میں چاہتا تھا کہ باعزت اور آسان روزگار ہو، بچے میرے پاس ہوں اور میں اس دنیا کے وہ گوشے دیکھوں جو اب تک میری نظروں سے پوشیدہ تھے۔

آج کینیڈا کی فوڈ پر الزبتھ کا لیکچر تھا۔ ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ کے بارے میں بتانا تھا۔ فوڈ کے ذکر پر شہباز تھوک نگلنے لگا۔ سرجی ”ین“ سے جڑ کر بیٹھے تھے اور کبھی کبھار کوئی سرگوشی کر لیتے اور وہ حیرانگی سے پلکیں جھپکا دیتی۔

الزبتھ نے بتایا۔ ”اگر کوئی چیز گھٹیا، غیر معیاری اور سستی ہو تو یہاں کہتے ہیں کہ یہ ValueMac ہے۔“

”Mac کیا ہے۔“

تو اس نے بتایا۔ ”میکڈونلڈ۔“

ہم حیران ہوئے کہ پاکستان میں یہ اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے کہ بھاری رقم کوڑے میں ڈال کر ایک مہنگا برگر حلق میں ٹھونسا جائے۔ یہاں میکڈونلڈ ویسے بھی سب سے سستی فاسٹ فوڈ ہے۔ میرا ایک جاننے والا یہاں اس کا منیجر ہے۔ اس نے بتایا کہ کہاں سے اور کیسے یہ منجمد خوراک ان تک پہنچتی ہے اور کس طرح ہم اسے تیار کرتے ہیں، تو میں دم بخود رہ گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ خود بھی کھاتے ہیں؟“ تو جواب میں اس نے کہا تھا۔ ”کبھی نہیں۔ میرا کیا

دماغ خراب ہے۔"
الزبتھ پھر بتانے لگی۔ "یہاں جنیاتی خوراک مہلک ہوتی ہے، جیسے دسیوں رنگوں کی سبزیاں اور پھل۔"
کہنے لگی۔ "گو کہ نامیاتی (Organic) فوڈ مہنگی ہے مگر اس کے برے اثرات نہیں ہوتے۔"
شہباز نے اپنا ہاتھ کھڑا کیا۔ مقصد یہ تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اجازت ملنے پر اس نے بتایا۔ "پاکستان میں ہر قسم کی فوڈ نامیاتی ہوتی ہے۔ وہاں جنیاتی فوڈ کا تصور بھی نہیں ہے۔"
الزبتھ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں خود بھی حیران تھا۔
سرجی کسی طرح سے ین کو شہباز کی بات سمجھا رہے تھے۔ الزبتھ نے پوچھا۔ "کیا ہر فوڈ Organic ہوتی ہے۔"
شہباز نے اب فخریہ انداز میں صرف سر ہلایا۔
"کیا کوئی کھاد یا اسپرے استعمال نہیں کرتے؟"
اب شہباز پریشان ہوگیا۔ سرجی بھی ڈھلک گئے۔ جب بات کھلی تو الزبتھ بتانے لگی۔ "Organic فوڈ وہ ہوتی ہے جس میں کیمیائی کھاد اور اسپرے کا بھی استعمال نہ ہو۔"
ین، سرجی سے کھسر پھسر کر کے پوچھنے لگی۔ "کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟"
مگر سرجی بہرے بن بیٹھے تھے۔
نامیاتی فوڈ کا یہاں خاصا رجحان ہے۔ بہت دلچسپ چیزیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ پاکستان میں جیسے دیسی انڈے ہوں یا مرغی یہ نامیاتی فوڈ ہے اور اسی لیے مہنگی اور نایاب ہیں۔ نامیاتی فوڈ کے اپنے اسٹور ہوتے ہیں یا دوسرے اسٹوروں میں نامیاتی فوڈ کا علیحدہ سیکشن ہوتا ہے۔ یہ عام سبزیوں یا پھلوں سے ڈھائی تین گنا مہنگے ہوتے ہیں۔ آپ کسی کمپنی سے بات کرلیں تو وہ آپ کو کم قیمت پر ایسی چیزیں گھروں تک پہنچا دیتی ہے۔ آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ زمین کا چھوٹا ٹکڑا کرائے پر لے لیں۔ وہ وہاں آپ کے لیے مختلف سبزیاں اگائیں گے۔ آپ گاہے بگاہے وہاں جا کر دیکھتے بھی رہیں اور وہاں سے تازی سبزی بھی لے آئیں۔ ہماری ایک پڑوسن کی نانی جو جرمن ہے اور عمر نوّے سال ہے۔ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ لانڈری، کچن سے لے کر گھر کی صفائی بھی خود کرتی ہے۔ وہ آس پاس سے سبزیوں اور پھلوں کے چھلکے جمع کرتی ہے۔ انہیں زمین میں دبا کر کھاد میں تبدیل کر دیتی ہے اور اپنے گھر کے لان میں گرمیوں کے سیزن میں نامیاتی سبزیاں اگاتی ہے۔ وہی اس کی خوراک ہے اور اس کا اثر جو ہوتا ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔ ذائقے میں وہی فرق ہے جو دیسی انڈے اور ولایتی انڈے میں ہوتا ہے۔ ویسے مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم اسے ولایتی انڈا یا ولایتی مرغی کیوں کہتے ہیں؟ یہ کوئی انگلستان سے تو نہیں آتے؟
کافی کا بریک ہوا تو ہم سب مل کر کافی مشین کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ دیکھا تو ساتھ ڈونٹس بھی پڑے ہیں۔ شہباز ہاتھ میں دو تین سنبھالے کھڑا تھا۔ سرجی اسے کھاتے ہوئے فرمانے لگے۔ "ماشاء اللہ بہت مزے کا ہے مگر جلیبیوں کی بات ہی اور ہے۔"
مارک بھی وہیں کھڑا تھا، پاس آکر بولا۔ "بات کچھ آگے بڑھی؟"
نسرین کافی کا گلاس تھامے دور کونے میں کھڑی تھی۔ میا مبوا اپنی نیلی شرٹ پر کافی گرا چکا تھا۔ ین نے کافی مشین کو غور سے دیکھا اور پھر چلی گئی۔ ایرانی رضا اپنی پھولوں والی شرٹ پہنے بیزار سا لگ رہا تھا۔
اشوک پاس سے گزرا تو میں نے پوچھ لیا۔ "یہ ڈونٹس کہاں سے آئے ہیں؟"
اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "غریب تارکین وطن کے لیے مختلف ادارے امداد بھیجتے رہتے ہیں۔"
سرجی پاس کھڑے تھے۔ یہ سنا تو سٹپٹا گئے۔ ان کے چہرے پر تاریکی سی چھا گئی جیسے سارے جہاں کی پریشانی نے ایک ساتھ ان پر ہلہ بول دیا ہے۔ وہ گھبرائی نظروں سے شہباز کو دیکھتے ہوئے چلا کر بولے۔ "تھوک دے تھوک دے، صدقے کے ہیں۔"
شہباز نے بھی سرجی کی بات سن لی تھی۔ "صدقے کے نہیں، خیرات کے ہیں اور ہم پر حلال ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور اٹھا لیا۔
میں نے ایک ڈونٹ اٹھایا اور آدھا نسرین کو دیتے ہوئے بولا۔ یہ ناجائز نہیں، لے لو۔" اس نے لے کر پھر سے کافی پینی شروع کر دی۔ میں نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟ اور خفا بھی لگ رہی ہو۔"
"میں ایسے ہی رہتی ہوں۔"
"دو دن پہلے تو ایسی نہ تھیں۔"

”ہر دن ایک جیسا نہیں ہوتا۔“

مارک ہمیشہ کی طرح نہیں تھا، بولا۔ ”دن ایک جیسے ہوتے ہیں مگر دل بدلتا رہتا ہے۔“

وہ خاموش رہی مگر آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں کچھ گھبرا گیا، پوچھا۔ ”کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔“

کہنے لگی۔ ”نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔“ پھر خود ہی رواں ہو گئی۔ ”اکیلی عورت ایک بچے کے ساتھ کیسے زندگی کاٹتی ہے، کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بیٹے کو اسکول چھوڑ کر یہاں آتی ہوں۔ یہاں سے سیدھا اسکول جا کر اسے گھر چھوڑوں گی۔ پھر شام کو ایک اسٹور پر جاب کر کے گھر جاؤں گی تو وہ میرا انتظار کرتے کرتے اکثر سو جاتا ہے۔ پھر اگلی صبح میرے لیے ویسا ہی ایک دن شروع ہو جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں کے کونے نم تھے۔ میں خاموش سر جھکائے کھڑا تھا جیسے گناہ گار میں ہوں۔ میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”دن تو ایک کورے کاغذ کی طرح سب کے لیے ایک جیسا ہی نکلتا ہے۔ پھر ہر کوئی اپنے اپنے مطلب کے اس میں رنگ بھرتا ہے۔ تم بھی کوئی شوخ رنگ تلاش کر لو۔“

اس نے افسردہ نظروں سے خلا میں دیکھا۔

میں سمجھ رہا تھا جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف کھوکھلے ڈائیلاگ ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ میں جانتا تھا کہ کسی کے پاس رنگ نہیں تو کسی کے پاس رنگ بھرنے کا ہنر نہیں۔ ان دنوں ہم دونوں کے پاس کوئی رنگ نہ تھے، ایسے ہی جیسے آج آسمان برف سے اٹا اور بے رنگ تھا۔

یہاں سے میں جب نکلا تو موسم غضب ڈھانے پر تلا ہوا تھا۔ برف باری جیسے اپنا ہی کوئی ریکارڈ توڑنا چاہتی تھی۔ مسلسل برس رہی تھی۔ بے لگام گر رہی تھی۔ درخت، گھروں کی چھتیں، سڑکیں، پارک سب سفیدی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اِکّا دُکّا لوگ سڑکوں پر تھے۔ گاڑیاں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ میں بس کے انتظار میں کھڑا چند لمحوں ہی میں برف سے لد چکا تھا۔ اب تو میں اپنے اوپر سے برف جھٹکنے کی زحمت بھی نہ کر رہا تھا۔

میں جب اپارٹمنٹ سے ہوتا ہوا ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے پہنچا تو سفر سے نہیں، برفوں سے تھک چکا تھا۔ ہیڈ گارڈ آج بیدی تھا۔ سب لنچ روم میں بیٹھے قیدیوں کو انتہائی بے زاری سے دیکھ رہے تھے اور قیدی ان سے زیادہ بیزاری سے ایک دوسرے کی جانب تک رہے تھے۔ یہ چائے کا وقفہ تھا جس کو یہاں کافی بریک بھی کہا جاتا ہے۔

ہفتہ اور اتوار کو جاب دوپہر بارہ سے رات بارہ بجے تک ہوتی تھی۔ پھر رات کی شفٹ بارہ سے اگلے دن دوپہر تک چلتی۔ دوسرے دنوں میں تین شفٹیں ہوتیں۔ صبح آٹھ سے شام چار، دوسری چار سے رات بارہ اور پھر آخری رات بارہ سے صبح آٹھ تک۔ آٹھ گھنٹے کی شفٹ کے گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا تھا۔

بیدی نے مجھے دیکھا تو بولا۔ ”اندر جا کر قیدیوں کے کمروں کی تلاشی لو۔“

جمیل مسکرا دیا۔ میں غصے سے کھول کر رہ گیا مگر ضبط برقرار رکھا۔ میرے ساتھ ایک اور گارڈ لگا دیا گیا۔ ہم دونوں نے پلاسٹک کے گلوز ہاتھوں پر چڑھائے۔ لابی کے بند دروازے کو کھٹکھٹایا تو اندر بیٹھے گرنام سنگھ نے دروازہ کھولا جس کے ہاتھ میں ٹورنٹو اسٹار اخبار تھا۔

یہاں دن میں دو بار سب کمروں کی تلاشی ہوتی ہے جب قیدی لنچ روم میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہر کمرے میں جا کر ایک ایک چیز کو باریک بینی سے دیکھا جاتا ہے۔ واش روم اور اس کی ٹنکی بھی چیک ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں نے کسی کمرے میں کوئی سیب، کیلا یا سنگترہ ہی پایا اور اس کے علاوہ مجھے کچھ بھی نہ ملا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ وہ بھی کبھی کبھی کسی کمرے میں کوئی سیب، کیلا یا سنگترہ پایا۔ ان کو ہم ایک پلاسٹک کے بیگ میں ڈالتے جاتے۔ ہم نے کھنگال کر تلاشی لی مگر کوئی مشتبہ چیز نظر نہ آئی تھی۔ یہ کام ختم ہوا۔ گرنام سے علیک سلیک کر کے اس بیگ کو پکڑے باہر آیا جس میں یہ پھل تھے۔ تو بیدی نے کہا کہ سب فروٹ ڈسٹ بن میں ڈال دو۔ میں جب اتنے سارے پھلوں کو ڈسٹ بن میں ڈال رہا تھا تو دل رنجیدہ تھا۔ کتنے لوگ اس پھل کو ترستے ہوں گے اور آج اتنا سارا فروٹ میں ڈسٹ بن میں ڈال رہا تھا۔

بریک کے بعد اندر گئے۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ بیدی نے مجھے قیدیوں کی حاضری پر لگا دیا۔ میں نے خاموشی سے حاضری لگا کر رجسٹر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ باقی سب گارڈ اپنی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایک گھنٹا گزرا تھا کہ بیدی نے پھر میری پوسٹ پر مجھے کال کر کے کہا کہ حاضری لگائی ہے۔ دوسری پوسٹوں پر بیٹھے گارڈز کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں ضبط کے بندھن توڑ بیٹھا اگر سب کو باری باری کوئی ڈیوٹی دیتا یا مجھے تحقیر کا نشانہ نہ بناتا تو

میں پی بھی جاتا مگر اس موٹے سکھ نے مجھے اب مشتعل کر دیا تھا۔

میں نے اپنے چہرے کو پرسکون رکھا اور رجسٹر لینے اس کی سیٹ پر گیا۔ وہ بے پروا ہو کر بیٹھا تھا اور اسی حالت میں اشارے سے کہا کہ میز پر سے رجسٹر اٹھا لوں۔ الرٹ بتھ ہمیں کینیڈا کا چارٹر پڑھا چکی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں نسلی، مذہبی یا جنسی تعصب بہت بڑا جرم ہے۔ پہلے میں نے سب قیدیوں کی حاضری لگائی۔ رجسٹر پر اپنے دستخط کیے اور واپس اس کی سیٹ پر آ گیا۔ مجھے دیکھا تو نخوت سے آنکھ کا اشارہ کر کے کہنے لگا کہ رجسٹر کو میز پر رکھ دوں۔ میں نے تمیز سے اسے میز پر رکھا اور بیدی سے کہا۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے؟'' وہ بولا۔

اس کی سیٹ کے ساتھ والا کمرا خالی تھا۔ میں نے کہا۔ ''سب کے سامنے نہیں، تم ایک منٹ کے لیے کمرے میں آؤ کیونکہ راز کی بات ہے۔''

اس کی آنکھیں چمکیں۔ وہ چھ فٹ کا پتلی جسامت والا سکھ کمرے میں آ گیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور مضبوط لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ذرا سا گڑبڑایا مگر پھر سنبھل گیا۔ میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں گویا ٹھونک لی تھیں۔

وہ بولا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''کیا میرے سے کوئی شکایت ہے؟ یا کسی اور کی وجہ سے مجھے تنگ کر رہے ہو؟ یا کوئی تعصب رکھتے ہو جو مجھے دوڑائے رکھتے ہو اور باقی سب بیٹھے تمہاری طرح کرسی پر اونگھتے رہتے ہیں۔ میں نے یہاں کا چارٹر پڑھا ہے جس میں سب سے پہلے کسی بھی قسم کے تعصب کو جرم کہا گیا ہے۔''

میری اس بات پر وہ لڑکھڑا گیا۔

وہ بولا۔ ''نہیں، میں تو سب کو باری باری کام دیتا ہوں اور یہاں سب ہی کام کرتے ہیں۔''

میں نے ذرا سختی سے کہا۔ ''پچھلے کئی دن کا رجسٹر دیکھ لو اور آج کا بھی، سب پر صرف میرے دستخط ہیں اور اب مجھے بتاؤ یہ کیا ہے۔''

اب تو وہ ڈھلک گیا۔ ثبوت موجود تھے۔ کمپنی کے مرکزی دفتر میں ایک دن مجھے پیٹرولنگ سپروائزر جان ملا تھا جس سے میں نے کہا تھا کہ مجھے ہولڈنگ سینٹر کی جاب چاہیے کیونکہ وہ میرے گھر سے قریب ہے۔ اب میں بیدی پر آخری وار بھرپور کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''میں جان کو فون کرتا ہوں کہ بیدی متعصب ہے اور وہ آ کر حاضری کا ریکارڈ چیک کر لے گا۔''

یہ کہہ کر میں باہر جانے لگا تو بیدی نے مجھے کہنی سے پکڑ کر روک لیا۔ ''یار! ہم دونوں دیسی ہیں، ہمیں ایک دوسرے کا خیال کرنا چاہیے۔ آپ میرے بھائی کی مانند ہیں اور دوست بھی۔ میں تو سب کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتا ہوں، پھر بھی اگر تمہیں شکایت ہے تو میرا وعدہ ہے کہ آئندہ نہیں ہو گی۔''

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے اگر تم دوست کہتے ہو تو میں بھی دوست کہتا ہوں اور آئندہ سے اُمید ہے کہ کسی سے تعصب نہ ہو گا۔''

اس نے ہاں میں سر ہلا کر ہامی بھر لی مگر تشویش اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔

میں باہر آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، جمیل طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا، پہلے دل میں آیا کہ نظر انداز کر دوں مگر پھر اندر کی چبھن باہر آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''بڑے آرام ہو رہے ہیں، تمہارے تو مزے لگے ہیں۔''

وہ جواب میں بولا۔ ''ہم یہاں کے بادشاہ ہیں جو ہم سے بنا کر نہیں رکھے گا، وہ خسارے میں رہے گا۔'' یہ کہہ کر پھر سے مسکرایا اور اپنا منہ مجھ سے پھیر لیا۔ مگر یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا۔ کچھ ہی دیر میں جمیل کی پوسٹ پر بیدی کی بیل ہوئی اور حکم ہوا حاضری لگا دو تو جمیل حیرت سے گنگ ہو گیا اور اس کا رنگ فق پڑ چکا تھا۔

ڈنر کا وقت تھا۔ سب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں سیڑھیوں کے ساتھ دروازے کے ساتھ کھڑا تھا کہ اتفاق سے آج پیٹرولنگ سپروائزر جان آ گیا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ حال احوال پوچھا اور بولا۔ ''سب ٹھیک چل رہا ہے۔''

دور بیٹھے بیدی کا رنگ فق تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ہم دونوں کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے جان سے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے۔''

اس نے ہنس کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''جب یہاں زیادہ شفٹیں چاہیں تو مجھے فون کر دینا۔''

میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ بیدی کی طرف بڑھ گیا۔ بیدی کا چہرہ زرد تھا مگر میں نے دور سے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اسے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔ اس دن کے

بعد بیدی واقعی ایک دوست کی طرح برتاؤ کرنے لگا تھا اور جمیل ہمیشہ ہی کڑھتا رہتا تھا۔

یہاں کا قانون بہت سخت ہے۔ خاص کر جاب پر کوئی آپ سے بدتمیزی کرے تو اس کے ہوش ٹھکانے لانے کے لیے کینیڈا چارٹر میں اپنے حقوق رٹ لیں اور یہ نہ بھولیں کہ آپ کے اپنے فرائض کیا ہیں اور ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں اور وہ بھی بہت زیادہ۔

جاب ختم ہوئی تو گرنام نے وہی اخبار مجھے تھما دیا جس کو وہ پورا دن چاٹتا رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”اس میں کسی پاکستانی فیملی کی ایک اہم خبر ہے۔“

میں اپارٹمنٹ پہنچا تو مفتی جو شو چھوڑ کر گیا تھا اب دوبارہ اس میں غرق تھا۔ سرجی دور بیٹھے بغیر پلکیں جھپکائے ٹی وی میں کھوئے ہوئے تھے اور شہباز اندر کمرے میں سونے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے آیا۔ اخبار کھولا تو سرورق پر ایک بھیانک خبر جلی سرخیوں میں لگی تھی۔

ایک پاکستانی کی آٹھ سالہ بیٹی تھی۔ بچی کی ماں کا انتقال ہوا تو باپ نے دوسری شادی کر لی اور ایک قہر بچی پر اتر آیا۔ وہ ماں کے ظلم کا نشانہ بنی تو باپ بھی اپنی سگی بیٹی سے بے پروا رہنے لگا۔ ایک دن بیٹی کی کسی حرکت پر اسے پہلے باپ نے پیٹا اور پھر وہ سوتیلی ماں کے ہتھے چڑھ گئی۔ باتھ روم میں اسے اتنا زدوکوب کیا کہ اس کا سر ٹب سے ٹکرایا اور وہ وہیں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ان درندوں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے؟ ایک اور مکروہ منصوبہ ان کے کریہہ ذہنوں میں آیا۔ پہلے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور پھر ایک تھیلے میں بند کر کے، اونٹاریو لیک کے کنارے رات کے اندھیرے میں دفن کر آئے۔

لڑکی اسکول سے غیر حاضر ہوئی تو ٹیچر نے گھر فون کیا۔ عورت نے کہا۔ ”بچی بیمار ہے۔“

ٹیچر نے دو دن بعد پھر فون کیا تو یہی جواب ملا۔ کچھ دن بعد اس نے خوف کے مارے فون ہی نہ اٹھایا تو ٹیچر کو شک پڑا اور اس نے پولیس میں اطلاع کر دی۔ پولیس نے اسی دن اصل کہانی اگلوالی۔ بات پولیس سے پھیل کر میڈیا پر آ گئی۔ ایک تو بچی بہیمانہ طریقے سے قتل ہوئی اور ساتھ پاکستان بھی اس خبر کی وجہ سے شہ سرخیوں کی زینت بن گیا۔ اس سے پہلے لاہور کا ایک بھیڑیا جاوید اقبال بھی خبروں میں رہا تھا، جس نے سو بچوں کو قتل کیا تھا اور اعتراف بھی کر لیا تھا۔ پاکستان کا نام بدنام ہو رہا تھا اور ہم منہ چھپائے پھر رہے تھے۔

وطن عزیز میں رہنے والے پردیس میں دن کاٹنے والے لوگوں کا دکھ سمجھ نہیں سکتے۔ جن باتوں کو وطن میں معمولی کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ وہی باتیں وطن سے باہر طعنہ بن کر پھروں رلاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے انہی دنوں پاکستان میں دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوا تھا کئی مہینے تک مقامی لوگ یہ سنتے ہی کہ میں پاکستانی ہوں وہ تمسخر اڑانے والے لہجے میں کہتے۔ ”تمہارے ملک کے لوگ اتنے ظالم ہیں۔“ میں ان سے کہتا کہ سب مسلمان تو دہشت گرد نہیں ہوتے تو جواب ملتا مگر سب دہشت گرد تو مسلمان ہیں۔ اس بات کی وضاحت بھی مہنگی پڑتی ہے۔

میں نے اخبار دوستوں کی طرف بڑھا دیا۔ مفتی نے ٹی وی بند کر دیا اور اخبار پر جھک گیا۔ سرجی بھی کھسک کر ساتھ آ بیٹھے تھے اور ہم افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمرات پر کافی دیر بات کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح کین پہنچا تو پہلے اشوک نے کاؤنٹر پر پکڑ لیا۔ ”ندیم بھائی اخبار پڑھا؟ یہ کیا ماجرا ہے؟“

”مجھے بھی اخبار سے معلوم ہوا۔ اشوک بھائی، یہ دیسی بھی بہت خراب حرکتیں کرتے ہیں۔“

”ان دیسیوں کے چکر میں انڈیا کو تو بیچ میں مت لاؤ۔“ وہ منت کر کے بولا حالانکہ اس نے کس کے مجھ کو لگائی تھی۔

میں یہاں سے فرار ہوا تو ین نے مجھے پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔ ”آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں؟“

میں نے سوچا کہ یہ کام کی بات کبھی نہیں سمجھتی مگر اب فرفر بولتی ہوئی اپنی بات مجھ تک پہنچا رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ اس کی ناک کو پکڑ کر سیدھا کر دوں مگر میں نے انتہائی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دنوں میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں جانتا اور کبھی کبھی تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں۔“

آگے بڑھ کر دیکھا تو کسی نے سرجی کو گھیرا ہوا تھا اور کسی سے شہباز تو تڑاخ کر رہا تھا۔

سرجی کسی سے کہہ رہے تھے۔ ”میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ ابھی ایک ماہ پہلے آیا ہوں۔ میرا تو ابھی کسی پاکستانی سے تعارف بھی نہیں ہوا۔“

شہباز کے نتھنوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور وہ

ایرانی رضا سے پنجابی میں کہہ رہا تھا۔ ”میرے مامے دے پتر لگدے ئیں۔“

مجھے خدشہ تھا کہ الزبتھ اس پر کوئی بات نہ شروع کر دے مگر خدا کا کرم ہوا کہ اس نے وہی کہنا شروع کیا جو آج وہ کہنے آئی تھی۔ نسرین میرے ساتھ آبیٹھی تو میں بدک رہا تھا کہ کہیں یہ بھی میری ان مجرموں سے رشتے داری نہ پوچھنا شروع کر دے مگر وہ ملائمت سے بولی۔ ”کیا آج بھی یہاں سے جاب پر جانا ہے؟“ میری آج جاب نہیں تھی۔ میں نے نہیں میں سر ہلایا تو کہنے لگی۔ ”کیا ہم آج اکٹھے کافی پی سکتے ہیں؟“

میں نے پوچھا۔ ”یہاں یا کہیں باہر کا کہہ رہی ہو؟“ ہنسنے لگی اور کہا۔ ”باہر کہیں بیٹھ کر پئیں گے کیونکہ آج بیٹے کی اسکول سے چھٹی ہے اور مجھے اسے لینے اسکول بھی نہیں جانا۔“

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر اسی دوران شہباز کسی مست بھینسے کی مانند مجھے گھور رہا تھا اور سرجی بھی ہمیں دیکھ کر شرمارہے تھے۔ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ اب مجھے ان دونوں سے جان چھڑانی تھی۔ جو ان دنوں میری ٹوہ میں رہتے تھے۔

آج ہمارے Resume بنوائے گئے۔ سب سے کہا گیا کہ آپ اپنے طور پر خود ڈرافٹ کریں اور پھر باری باری الزبتھ ان کی تصحیح کرے گی۔ اس نے کہا تھا کہ جو آپ کی تعلیم و تجربہ ہے، کوئی اور قابلیت ہے وہ اس میں شامل کریں اور اگر آپ کسی ایسوسی ایشن کے ساتھ جڑے ہیں وہ آپ کا قابل توجہ نقطہ ہوگا اگر آپ نے کوئی کام رضاکارانہ طور پر کیا ہے تو اس کو ضرور بیان کریں۔

مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہاں پر Skills Soft زیادہ ناپے جاتے ہیں اور Skills Hard جیسے تعلیم اور تجربہ، وہ بعد میں دیکھتے ہیں۔ نہ باپ کا نام اور نہ تاریخ پیدائش پوچھی جاتی ہے اور نہ یہ لکھنا ہوتا ہے کہ صنف کون سی ہے۔ اگر ماسٹر کی ڈگری لی ہے تو صرف وہی لکھیں گے۔ یہ نہیں کہ کہاں سے حاصل کی اور کب؟ یہ بھی نہیں کہ میٹرک کے بعد کی ڈگریاں گنوانا شروع کر دیں۔ ہاں اپنے تجربے کو ذرا کھل کر بیان کریں پر ایسا نہیں کہ صفحے ہی بھر دیں۔

کچھ Words Stress ہوتے ہیں جن کو بولڈ فانٹ میں لکھا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والے کی نظر اس پر پڑے اور وہ وہیں رک جائے۔ مثال کے طور پر کوئی کیپسول بنانے والی فیکٹری ہے تو آپ اپنے Resume میں Making Capsule کو بولڈ کر دیں گے اور ساتھ بولڈ فانٹ میں ان مشینوں کے نام لکھ دیں گے جن پر آپ نے کام کیا ہوا ہے۔ پڑھنے والے سمجھ جائیں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

ہم مختلف کمپیوٹر پر بیٹھے اپنے اپنے Resume کا ڈرافٹ تیار کر رہے تھے۔ ہر ایک دوسرے کی کاپی کرنا چاہ رہا تھا اور دوسرا اس بات کا برا مناتا اور کچھ دیر بعد دوسرا ابھی پہلے کے کمپیوٹر میں جھانکنے لگتا۔ سرجی کورے کورے سے پھر رہے تھے۔ مجھے پکڑ کر اپنے کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا۔ اوپر اپنا نام اور فون نمبر تھا پھر تعلیم اور نیچے ایکسن واپڈا لکھا تھا اور آگے کہانی ختم۔ میں نے کہا۔ ”کچھ تو اور لکھیں کہ آپ کہاں اور کیا کیا کرتے رہے؟“

ذرا سے شرمندہ ہوئے اور بولے۔ ”واپڈا میں ایک ایکسیئن کیا کرتا ہے؟ کچھ نہیں بس جھک ہی مارتا ہے یہ کیسے لکھوں؟“

میں نے ان سے پوچھا۔ ”کچھ ڈیم وغیرہ تو بنوایا ہوگا؟“

”نہیں، ایک آدھ نہر کھدوائی تھی اور وہ بھی مزدوروں نے مشینوں سے کھودی تھیں۔“

”نگرانی تو کی ہوگی؟“

”قسم سے بہت گرمی ہوتی تھی، میں تو گھر آکر اے سی میں سو جاتا تھا۔“

”تو اٹھ کر کیا کرتے تھے؟“

”تمہاری بھابی کو جگاتا نہیں تھا اور خود ہی کھانا بنانے لگتا تھا۔“

تو پھر یہی لکھ دو کہ میں اچھا کھانا بنا لیتا ہوں۔ میں کچھ جھنجلا سا گیا تھا۔ وہ تذبذب میں پہلے کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مایوسی میں گرتے چلے گئے کہ اب وہ اس میں کیا لکھیں۔

میں نے فارما انڈسٹری میں بھی کام کیا ہوا تھا اور پھر کلاس کے پریکٹیکل بھی کرواتا تھا۔ اسی طرح جو مشینیں اور انسٹرومنٹ میں نے استعمال کیے تھے وہ لکھ ڈالے۔ اس کے علاوہ باہر کے جریدوں میں میرے کچھ مضامین بھی چھپے تھے، ان کے حوالے بھی دیے اور باقی بہت سا سچ جھوٹ بھی اس میں ڈال دیا۔

شہباز فرط انبساط سے اپنے Resume کو دیکھ

دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ نسرین ابھی ابھی سی بیٹھی رہی۔ رضا کو کوئی پروا نہ تھی کہ آس پاس کیا چل رہا ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح کھسکنے کے چکر میں تھا۔ ین نے اس کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ مارک اپنے کام میں کھویا ہوا تھا اور آنکھیں کمپیوٹر کی اسکرین پر لگی ہوئی تھیں۔

دراصل میں نے یہ نوٹ کرلیا تھا چند ایک کے علاوہ بہت سے ایسے تھے جن کے پاس کوئی بڑی بڑی ڈگریاں اور تجربہ ہو۔ بیشتر تو سیاسی یا کسی اور وجہ سے یہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ بہت کم اپنے پیشے اور تجربے کی بنیاد پر یہاں آئے تھے۔ وہ سب یہ کورس اس لیے کر رہے تھے کہ حکومت کا دباؤ تھا کہ آپ کوئی جاب ڈھونڈیں یا ایسا کوئی کورس کریں جس سے آپ کو باآسانی جاب مل جائے اور اسی لیے وہ اس کورس میں ہمارے کلاس فیلو بن گئے۔ رضا ان میں نمایاں تھا اگر وہ اس کورس میں شامل نہ ہوتے تو ان کی حکومتی امداد رک سکتی تھی۔

ہم سب نے اپنے Resume کے ڈرافٹ الزبتھ کے دربار میں جمع کروائے۔ وہ بغور ان کا جائزہ لینے لگی اور ہم کافی بریک کے بہانے وہاں سے کھسک لیے۔ ہمارے کھسکنے سے پہلے اس نے اعلان کردیا کہ آدھ گھنٹے میں کسی لا فرم کا کوئی بڑا وکیل آج اور اگلے دو دن ہمیں ہمارے حقوق اور فرائض پر لیکچر دے گا۔

شہباز سر جھٹک کر بولا۔ ”ایک اور سیاپا۔“ پھر سر جھٹک کر بولا۔ ”ہم نے یہاں کوئی الیکشن تو نہیں لڑنا کہ سارا سیاسی نظام، اخبارات اور ان کا رجحان پڑھتے پھریں اور پھر یہاں کا آئین بھی رٹیں۔“

اتنے میں سرجی بھی گھومتے گھماتے ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا نقطۂ پیش کیا۔ ”کیا ہمارے سیاست دان پاکستان کے آئین کو جانتے ہیں؟ تو ہم کیوں یہاں کے آئین کی شقیں یاد کریں۔“

دراصل ہم سب یہاں کینیڈا اس چکر میں آتے تھے کہ یہاں کوئی کمپنی ہمیں اپنی گاڑی میں لے کر سیدھا اپنے کسی دفتر میں بٹھا دے گی مگر جب یہاں کینیڈا کا سسٹم بتایا جانے لگا تو چند حضرات مایوس ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہاں انہیں اپنے وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہو رہا تھا مگر میں اسے ایسا نہیں لے رہا تھا۔ کینیڈا میں مستقل رہنے کے لیے یہاں کی ہر خبر پر نظر رکھنا ضروری تھا اور میں اس کی افادیت سمجھتا تھا۔

ہم کافی بنا رہے تھے کہ سرجی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”آج ڈونٹ نہیں ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”آج کی امداد نہیں آئی مگر آج ملبوسات آئے ہیں۔“

فوراً چونک پڑے۔ ”کہاں ہیں؟“

اشوک کے آس پاس کچھ ہینگر تھے جن پر کچھ ملبوسات لٹک رہے تھے۔ یہ کسی ادارے نے تارکین وطن کے لیے امداد کے طور پر بھیجے تھے۔

ہم دونوں وہاں پہنچے۔ شہباز پہلے سے موجود تھا۔ شہباز کیا سب ہی موجود تھے۔ نئے ٹیگ لگے ملبوسات کچھ ہینگروں پر اور بہت سے سب کے ہاتھوں میں تھے۔ سرجی دور سے کف افسوس مل رہے تھے۔ ”ہم لیٹ ہو گئے۔ نیا اسٹاک تھا، ختم بھی ہو گیا۔“

قریب پہنچے، جانچا، الٹا پلٹا تو سب ہی زنانہ ملبوسات تھے۔ اسکرٹس، شرٹیں، جیکٹس اور بھی بہت کچھ تھا۔ سرجی نے اسکرٹ اٹھائی، ہر زاویے سے پرکھا، پھر کچھ دیر سوچتے رہے، نفی میں ایک دو بار سر ہلایا اور واپس لٹکا دیا۔ شہباز کسی زنانہ لباس کو مردانہ لباس میں بدلنے کا سوچ رہا تھا۔ سرجی اب فارغ ہو کر شہباز پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

”یہ زنانہ کوٹ ہے، تم جیسے ضخیم کو تو مردانہ بھی نہیں آئے گا۔“ سرجی نے چوٹ کی۔

شہباز کے اندر کا حیوان جاگ اٹھا۔ تیوری چڑھا کر بولا۔ ”اگر مردانہ لباس ہوتا تو یہیں پہن کر دکھلا دیتا۔“

”مذاق میں کہہ رہا ہوں، برا نہیں منانا مگر تمہیں کسی سانڈ کا کوٹ ہی چڑھانا پڑے گا۔“

شہباز کہاں چپ رہنے والا تھا۔ ”مجھے سانڈ کا تو چھوٹا پڑے گا مگر آپ کو یہ زنانہ اسکرٹ بھی بڑا پڑ جائے گا۔“

سرجی شکایت کرنے لگے۔ ”دیکھا ندیم بھائی! یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔“

میں ان کی نوک جھوک سے محظوظ ہو رہا تھا کہ نسرین آگئی۔ میں نے کہا۔ ”یہ سب عورتوں کے لباس ہیں۔ تم بھی کچھ لے لو۔“

وہ کہنے لگی۔ ”میں نے کون سا کسی کے ساتھ اسکرٹس پہن کر ڈیٹ پر جانا ہے؟“

میں نے اس پر نہایت ہی دانش مندی سے سر ہلایا۔ پھر اس نے کنفرم کیا۔ ”آج کافی پینے تو جا رہے ہیں؟“ میں نے آس پاس دیکھا کہ کہیں وہ دونوں سن تو نہیں

رہے اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ دونوں یہ سن لیتے تو ہزار معنی نکالتے اور مجھ سے ہزار وضاحتیں مانگتے۔

ہم سب ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ ایک لا فرم کا وکیل اندر گھستا چلا آیا۔ الزبتھ نے جب بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو شہباز نے میرے کان کے قریب چیخ کر کہا۔ ”یہ بہت بڑا اسیا پا لگتا ہے، وکیل کیا ایسے ہوتے ہیں؟“

اس نے نہ کالا کوٹ پہنا تھا اور نہ کوئی رسمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ نیلی جین کے اوپر ایک بوسیدہ سی جرسی چڑھائی تھی۔ بقول سرجی اس کی شکل جیمز بانڈ کے مشہور کردار شان کونری سے ملتی ہے۔ میں نے غور کیا تو وہی جسامت، مضبوط جسم اور وہی چہرے کا نقشہ تھا۔ سر بھی ویسے ہی تھا جہاں اسی کی طرح کم کم بال تھے مگر خاصا خوش گفتار لگ رہا تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ الزبتھ سے بہت بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر اس کا قہقہہ ہمیں دہکا دیتا۔

شہباز کہنے لگا۔ ”سو فیصد، یہ الزبتھ پر ٹھرک جھاڑ رہا ہے۔ یہ قانون دان نہیں کوئی کار چور ہے۔“

دراصل شہباز نسرین کے آنے سے پہلے میرے ساتھ والی کرسی سنبھال چکا تھا۔ جس کو ہم کار چور کہہ رہے تھے، اس نے جب ہم سے بات شروع کی تو کم از کم میں اپنا کہہ سکتا ہوں کہ جتنا میری سمجھ میں آیا تھا تو ایک ایک لفظ میرے دل و دماغ میں بیٹھتا چلا گیا۔ ہمارے اتنے حقوق بھی ہو سکتے ہیں؟ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہاں قانون ہے اور اس پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے ہمارے حقوق بتانا شروع کیے اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا تا گیا کہ کہیں بھی آپ کے ان حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو اس اس نمبر پر صرف کال کر دیں۔ آپ جاب پر ہیں یا کسی اسٹور پر شاپنگ کر رہے ہیں یا کہیں سفر کر رہے ہیں تو آپ کے حقوق کوئی غصب نہیں کر سکتا اور کرتا ہے تو آپ نے کس سے رابطہ کرنا ہے۔ ہم سب بیٹھے اس کی ایک ایک بات کو دماغ میں بٹھا رہے تھے۔

جب میں نے پہلا موبائل فون لیا تو کمپنی کا پیکیج مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے فون سمیت اپنا پیکیج ختم کروانے کا کہا تو انہوں نے فون واپس لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے ترلے کیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ووڈ بائین مال میں ان کا دفتر تھا۔ میں نے کئی چکر لگائے مگر وہ کہتے تھے کہ ہم دو سو ڈالر ری پیک فیس لیں گے۔ میں نے گھر آ کر ڈائری نکالی اور اس میں درج کین کے اسی لیکچر کا دیا ہوا ایک نمبر نکالا اور فون کر کے اپنی شکایت درج کروادی۔ ٹھیک دو دن بعد اسی کمپنی والوں کا گھر فون آیا کہ ہم آپ کو دو سو ڈالر کا چیک بھیج رہے ہیں اور ساتھ ایک پری اسٹیمپ باکس بھی بھیج رہے ہیں۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں اور آپ اپنا فون اس میں ڈال کر کسی نزدیکی ڈاک خانے میں دے دیں۔

ایک بار حلال اسٹور سے گوشت لایا۔ گھر آ کر بیوی نے کہا کہ اس میں سے بُو آرہی ہے۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ بھی پاکستانی تھا اور کھری کھری سنانے لگا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ فوڈ انسپکٹر کو میں ابھی فون کرتا ہوں، یہ سن کر ایک لمحے کو وہ سکتے میں آیا۔ پھر اس کا لہجہ کسی منجھے ہوئے اداکار کی طرح تبدیل ہو گیا۔ کہنے لگا کہ آپ اس گوشت کو ابھی پھینک دیں اور میں تازہ گوشت کسی لڑکے کے ہاتھ آپ کے گھر بھجواتا ہوں۔ لڑکا آیا تو میں نے پہلے والا گوشت اس کے حوالے کر کے تازہ گوشت پکڑ لیا۔

پیدل چلنے والے کے جتنے حقوق ہیں کہ کبھی دل کرتا ہے کہ میرا بس چلے تو گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دوں۔ ایک پیدل انسان پوری سڑک کی ٹریفک روک کر ٹہلتا ہوا روڈ کراس کر رہا ہوتا ہے۔ اگر پیدل غلطی سے بھی فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر اتر آئے تو چلتی ٹریفک رک جاتی ہے۔ کئی ایک تو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوتے ہیں اور اچانک اپنا پاؤں سڑک پر رکھ دیتے ہیں۔ بریکیں چرچراتی ہیں اور وہ دوبارہ فٹ پاتھ پر آ جاتے ہیں۔

لوگ پھر اپنے حقوق کے نام پر ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ کسی فارمیسی میں جا کر شیلفوں کی تلاشی لیتے ہیں۔ اگر کوئی ڈرگ زائد میعاد کی انہیں مل جائے اور وہ کاؤنٹر سے بھی نکال لیں تو وہ اسے بھاری قیمت میں کیش کرواتے ہیں۔ ایک جاننے والے یہ کام کرتے تھے۔ زاید میعاد کی ڈرگ اٹھائی۔ دعا کرتے رہتے کہ کیشیئر اس کو چیک نہ کر لے۔ اگر نکال لائے تو اگلے دن فارمیسی پر شور کر دیا۔ ان سے وہیں گفٹ کارڈ لیے اور واپس چلتے بنے۔

بات ہو رہی تھی آج کین کے لیکچر کی جس نے مجھے بہت آگاہی دی۔ میں شکر گزار تھا کین کا کہ انہوں نے مجھے کیا، سب کو چیتا بنا دیا تھا۔ کسی قسم کی زیادتی محسوس کی تو جھپٹ پڑے۔ اپنے حقوق سے آگاہی نے دوسروں کا جینا حرام کر دیا۔ دیسی دکاندار گوروں کے آگے مؤدب ہو جاتے

ہیں مگر جب کہیں کسی دیسی گاہک سے پالا پڑا تو اپنے مزاج کو کھول کر سامنے رکھ لیتے ہیں مگر جب کسی نے قانون کی دھمکی دے دی تو بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔

آج کا لیکچر ختم ہوا تو میری یہ پریشانی شروع ہو گئی کہ نسرین کے ساتھ کافی پینے تو چلا جاؤں گا مگر بات کیا کروں گا یا تو میں بور ہوں گا یا پھر وہ۔ مگر لگتا تھا کہیں دونوں اکتا نہ جائیں۔

ہمارے شان کونری کا لیکچر ختم ہوا تو سب ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ میں اشوک کے پاس کھڑا شیشوں کے پار مسلسل گرتی برف کو دیکھ رہا تھا۔ ہر چیز نے ایک سفید چادر سی اوڑھ لی تھی۔ دھندلا اور پُرکیف منظر دل و دماغ پر حاوی تھا مگر صرف اس وقت تک اچھا لگتا ہے جب تک آپ شیشوں کے پیچھے اسے دیکھتے چلے جائیں۔ اس منظر میں گھسنا ایسے ہی ہے کہ جیسے بحر اوقیانوس کے گہرے نیلے پانی دور سے شاندار نظارہ تخلیق کرتے ہیں مگر آپ ان کے اندر ٹھہرنے کا سوچ ہی نہیں سکتے کیونکہ شارک مچھلیاں آپ کی تکہ بوٹی کے لیے بیتاب ہو رہی ہوتی ہیں۔

سرجی اور شہباز بھی ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ یہ منظر اور فضا میں برف کے تیرتے ذرات اور ساتھ چلتی ہواؤں کے جھکڑ، ان سب نے مل کر ایک جادوئی نظارہ ہمارے سامنے پھیلا دیا تھا۔ سرجی مدہوش تھے اور شہباز اپنے آپ کو اور ساتھ ساتھ کینیڈا کو کوس رہا تھا۔ اس پر کبھی کوئی منظر اثر نہ کر سکا تھا۔ نہ وہ آسمان کو دیکھتا اور نہ افق پر کوئی نظر ڈالتا۔ وہ ہمیشہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا چلتا، دیکھتا ہوا نہیں بلکہ سوچتا ہوا چلتا تھا۔ سرجی بس برف کو چھپیاں ڈالنے کے لیے بے تاب رہتے تھے، بھلے وہ برف گر رہی ہو یا زمین بوس ہو رہی ہو۔ میں نے ان لوگوں پر سے توجہ ہٹا کر نسرین کی طرف دیکھا۔

نسرین کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ ”آپ لوگ اپارٹمنٹ جائیں، مجھے کچھ چیزیں لینی ہیں۔ میں پرائس چاپر سے گروسری کر کے پہنچ جاؤں گا۔“

سرجی پہلے متعجب ہوئے اور پھر جھگڑے پر آمادہ ہو گئے۔ تیز لہجے میں بولے۔ ”ہم بھی جائیں گے۔ اس دل لبھا دینے والے موسم کا صرف آپ ہی مزے لیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟“

شہباز بیچ میں بولا۔ ”میں تو اپارٹمنٹ جا رہا ہوں۔ یہ موسم اور منظر آپ دونوں کو مبارک ہوں۔“ پھر سرجی سے کہا۔ ”آج بہت برف پڑی ہے، چل کر سنو مین بناتے ہیں۔“

سرجی کچھ غور و فکر کرنے لگے اور جلد ہی حتمی فیصلے تک پہنچ گئے۔ میرے ساتھ گروسری سے زیادہ ان کی رغبت سنو مین بنانے میں تھی۔ وہ دونوں سیڑھیوں پر ایک دوسرے کو پھسلن سے بچاتے اور بحث کرتے ہوئے چلے گئے۔

وہ گئے تو نسرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں کچھ نروس ہو رہا تھا مگر اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ ہم باہر نکلے تو سرد ہواؤں نے مجھے ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اٹھا کر ڈیپ فریزر میں ڈال دیا ہو۔ نسرین نے نیلے رنگ کی سنو جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی گرم ٹوپی میں اپنا سر چھپایا ہوا تھا۔ وہ میرا پیار نہ تھی مگر اس کی نیلگوں آنکھوں کے آگے جیکٹ کا نیلا رنگ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ سیڑھیوں پر پڑی برف میں میرے سیفٹی شوز چھپ گئے تھے۔ ہم اندازے سے اتر رہے تھے کہ کہیں میرا پاؤں ذرا سا لڑکھڑایا تو اس نے میرے بائیں بازو کو پکڑ لیا۔ اس لمس نے جادو کی چھڑی گھما دی۔ میرے اندر جو ٹھنڈک در آئی تھی۔ اسے تیز حدت نے بانہوں میں بھر لیا۔ ہر موئے تن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ میں نے خود پر قابو پانے کے لیے اس کے ہاتھ کو نرمی سے ہٹا دیا اور سر جھکائے نیچے اترنے لگا۔

ہم بس میں بیٹھے تو دونوں خاموش تھے، جیسے کوئی ڈاکا ڈالنے جا رہے ہوں۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی اور میں نسوانی لمس سے بھٹکنے لگا تھا۔ ہم ایک اسٹاپ پر اترے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کافی ہاؤس کے اندر لے گئی۔

دونوں برف سے ڈھک چکے تھے۔ دروازے کے ساتھ ہم نے اپنی اپنی برف جھاڑیں اور اندر ایک آسودہ ماحول میں داخل ہوئے۔ ایک درمیانے سائز کا ہال تھا، جس میں دیواروں کے ساتھ میز کرسیاں لگی تھیں۔ کاؤنٹر ہال کے آخر میں تھا، جس کے پیچھے دو لڑکیاں کافی بنا رہی تھیں۔ تین چار میزیں پُر تھیں۔ باقی خالی تھیں۔ ہم شروع کی میز کے ساتھ رکھی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

میں کسی مسحور کیفیت میں آ چکا تھا۔ پہلے اپنے آپ کو اندر سے واعظ و نصیحت کرنے کی کوشش کی مگر پھر اس عمل لا حاصل کو ترک کر دیا۔ کافی مجھے اچھی نہ لگتی تھی مگر آج میں ونیلا کافی کا آرڈر بخوشی دے رہا تھا۔ اس نے بھی اسی کا آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ خود بول

پڑی۔ ”میں نے تمہارا Resume دیکھا ہے اور میں آج پختہ یقین سے کہہ رہی ہوں کہ سب سے پہلے تمہیں جاب ملے گی۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اگر یہ تجربہ اور تعلیم اور ساتھ یہ خود اعتمادی میرے پاس ہوتی تو میں آج حکومت کے وظیفے پر نہ پڑی ہوتی۔“

خود اعتمادی کے لفظ پر میں چونک پڑا۔ ”کیا تم مجھ میں خود اعتمادی دیکھتی ہو؟“

میں نے سوال کیا تو کہنے لگی۔ ”ہاں، بہت ہے۔“

میں نے سوچا کہ شکر ہے یہ مجھے ایک ماہ پہلے نہیں ملی تھی۔ ان دنوں میری حالت جو تھی وہ میں جانتا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کی جاب اور فراغت سے نجات پانے کے بعد میں کچھ بہتر اور سوچنے کے قابل ہوا تھا۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے اپنے ابتدائی دنوں کی حالت زار بیان کروں۔

میں اس کے بارے میں پوچھتا رہا اور وہ میرے بارے میں۔ اتنے میں ایک لڑکی نے کافی کے دو مگ ہماری میز پر رکھ دیے اور پھر ہم بھاپ اڑاتی کافی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وہ پوچھنے لگی۔ ”تمہاری فیملی آجائے گی تو کیا پھر بھی تم مجھ سے ملنا چاہو گے؟“

میں مگ پر نظریں جمائے کچھ دیر سوچتا رہا اور وہ میری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے بہت سے سوالات کیے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اس سے چھپ کر ملوں اور یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے کہ بیوی کی اجازت سے اس سے ملوں۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا اور پھر سوچ وبچار کے بعد کہا۔ ”تم بتاؤ کیا یہ ممکن ہوگا؟“

وہ ذرا سا مسکرائی اور بولی۔ ”میرے خیال میں تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا اور مجھے تمہارا جواب بھی اچھا لگا۔“ پھر کہنے لگی۔ ”ایسا نہیں ہے کہ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بھی نہیں کرتے اگر تمہیں پیار ہو جاتا تو پھر اپنی فیملی کو کبھی بیچ میں نہ لاتے اور یہ پیار محبت سب فضول سی چیزیں ہیں، خاص کر جب آپ ایک نہایت کرب کے دور سے گزر رہے ہوتے ہیں اور مجھے یقین تھا کہ تم فلرٹ کرنے والے نہیں ہو، اس لیے کہ میں ایک جوان عورت ہوں، خوبصورت بھی ہوں شاید۔ اور فلرٹ کرنے والے مردوں کی آنکھ سے انہیں پہچان لیتی ہوں۔ مجھے اگر کوئی وقتی رشتہ بنانا ہوتا تو تم سے بہت بہتر اور خرچ کرنے والے بہت ہیں۔ میں اس لیے ملنا چاہتی تھی کہ تم مجھے کچھ گائیڈ کر سکو کہ اب میں زندگی کے اس موڑ پر کیا کروں؟ ایک اکیلی لڑکی جس کا ایک بیٹا بھی ہو، وہ کس طرح اپنی زندگی کسی راستے پر لگائے۔ میں اگر کہیں شادی کرتی ہوں تو بیٹے کو کھو دوں گی اور اگر کوئی ساتھی تلاش نہیں کرتی تو کہیں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے کسی مرد کی تلاش ہے۔ مجھے تو کسی سہارے اور رہنما کی ضرورت ہے جو مجھے بتا سکے کہ میں اب کیا کروں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم پر مرمٹی ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے اور یہ میری بھی خطا ہوگی کہ میں نے تمہارے بارے میں جو اندازے لگائے وہ غلط تھے۔ میں یہاں تنہا ہوں۔ مجھے کسی ایسے دوست کی ضرورت ہے جو مجھے کبھی کبھار دلاسہ دے سکے۔ کم از کم یہ تو کہہ سکے کہ فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں ناں۔“ یہ کہتے کہتے وہ روہانسی ہوگئی۔

میں دم بخود بیٹھا اس کی باتیں، باتوں میں پنہاں دکھ سن رہا تھا۔ اپنے آپ کو اندر سے کوس رہا تھا کہ میں نے کیوں اس کے بارے میں غلط یا صحیح اندازے لگائے تھے۔ اسے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی نہ کہ مرد کی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ غلطی سے بھی کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے ایک دوست سمجھو اور اگر تم چاہو تو میری فیملی سے بھی ملنا اور ابھی اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دو۔ یہ کہیں نہ کہیں تمہیں راستہ بھی بتا دے گا۔ میرا اعتبار کرنا اور کہیں بھی اور کبھی بھی میری ضرورت پڑے تو ضرور بتانا۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کروں گا، بس صرف یہ کہوں گا کہ ہمت نہ ہارنا۔ یہ دنیا صرف مصائب سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ خوشیاں بھی ہیں، پر انہیں بھی کبھی آنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔“

میں نصیحت آمیز انداز میں سب کہہ رہا تھا کہ میری نظر پڑی۔ کچھ آنسو اس کی نیلی آنکھوں سے نکل کر بہنے لگے تھے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ جو اب میز پر پڑے تھے، ان کو تھام لیا تو اس کی ایک ہچکی سی نکلی اور میں بھی اندر سے آبدیدہ ہو گیا۔ دکھ کی ایک تیز لہر مجھے جھنجوڑنے لگی۔ مجھ سے بیٹھا نہ گیا اور میں واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

جب ہم کافی ہاؤس سے نکل رہے تھے تو اس کے چہرے کا کرب ختم ہو چکا تھا۔

واپسی پر میں گروسری کے لیے نہیں رکا اور سیدھا اپارٹمنٹ چلا آیا۔ اس ذہنی کیفیت میں سودا سلف کا بوجھ اٹھانا بھی بہت بڑا بوجھ لگتا۔

واپس اپارٹمنٹ آیا تو مجھے کوئی ہوش نہ تھا کہ سفید

برف نے پھیل کر کیا کیا مناظر تخلیق کیے ہیں اور نہ میں کہیں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے اندر جھانک رہا تھا اور اللہ کا شکر گزار تھا کہ میری زبان سے کوئی غلط الفاظ نہیں نکلے جو میری ہتک کا سبب بنتے۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس سے بے نیاز رکھا تھا ورنہ کافی بے عزتی ہوئی تھی۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو مفتی اپنے میٹرس پر لیٹا سرجی کو گھور رہا تھا اور سرجی چہرے پر خفگی سجائے سر جھکائے بیٹھے تھے اور شہباز کچن میں کھانا تیار کر رہا تھا۔ باہر کڑاکے دار سردی پڑ رہی تھی اور اس نے صرف ایک بنیان پہنی تھی شلوار کے پائنچے اوپر چڑھا لیے تھے اور اس کا چہرہ پسینے میں تر بتر تھا۔ سرجی خفا اس لیے تھے کہ ان دونوں نے مل کر انہیں سختی سے باہر نکلنے کسی سنو مین یا سنو وائٹ بنانے سے منع کر دیا تھا۔ انہیں یہ گلہ تھا کہ شہباز اسے سنو مین بنانے کے لالچ میں اپارٹمنٹ جلدی لے آیا ہے۔

مفتی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''اتنی دیر کر دی آنے میں؟'' پھر بولا۔ ''گروسری نہیں لائے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو سرجی شکوہ آمیز لہجے میں بولے۔ ''نسرین کے ساتھ ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب یہ ہمیں زبردستی کھینچ رہا تھا تو وہ دور کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی۔'' پھر ذرا ناراض ہوئے۔ ''خود تو موج کرتے ہیں اور مجھے باندھ کر بٹھا رکھا ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سرجی! آج گھر میں جلیبیاں نہیں ہیں۔ کل لے آئیں گے تو سنو مین بنا لینا۔''

مفتی کہنے لگا۔ ''سنو مین اور جلیبی کا آپس میں کیا تعلق؟''

سرجی نے بیچ میں تصحیح کی۔ ''جلیبی نہیں جلیبیاں۔''

میں نے مفتی کو پچھلی بار ان کے سنو مین بنانے اور بیمار پڑنے کی داستان سنائی اور یہ بھی بتایا کہ ''ان کو کوئی بھی بیماری لگ جائے مگر علاج ایک ہی ہے کہ گرم دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھلا دو تو یہ پھر سے تازہ دم گھوڑا بن جاتے ہیں۔''

اسی دوران ڈور وال کے شیشوں پر جھکڑوں نے بہت ساری برف کو پٹخا تو شہباز جو دور کچن میں کھڑا تھا، وہ بھی دہل گیا مگر سرجی شیشے سے لپٹ گئے۔ مفتی حیران و پریشان یہ منظر دیکھتا رہا۔

میں واپس شاور لے کر لیونگ روم میں پہنچا تو سرجی نے چائے بنا کر مگوں میں ڈالی ہوئی تھی۔ سنو مین کے قصے نے انہیں گروسری بھلا دی تھی اور میں ان کے متوقع سوالوں پر جھوٹ بولنے سے بچ گیا۔

مفتی نے مجھ سے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک خبر ہے؟''

میں کھسک کر قریب ہو گیا اور سرجی تو بہت ہی قریب ہو گئے۔ میرے پوچھنے پر بتانے لگا۔ اس کی کمپنی ہیموسال (Haemosal) میں ٹیکنالوجسٹ کی جاب آئی ہے اور کام بھی وہی ہے جو تم پڑھاتے رہے ہو اور تمہیں اس کا تجربہ بھی ہے۔

کرومیٹوگرافی کا کام تھا اور نصابی اور عملی مجھے اس کا تجربہ تھا۔ باہر کے سائنسی اداروں میں اس پر میرے پیپرز بھی چھپ چکے تھے مگر میرا کام لیب کا تھا اور یہاں پر بڑی مشینوں پر یہ کام ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ سب کچھ Sterile یعنی جراثیموں سے پاک جگہ پر یہ سارا پروسیس ہوتا تھا جہاں انجکشن بنتے ہیں۔ مجھے اس میں کام کا تجربہ نہ تھا ایسی جگہ پر کام کے لیے آپ کو خلا بازوں کی طرز کا لباس پہن کر اندر جانا پڑتا ہے۔ ان کمروں سے باہر آتے ہیں تو اس لباس کو اتار کر پھینک دیتے ہیں اور واپسی پر ایک نیا نکال کر پہنتے ہیں۔ اندر آپ کسی دیوار کو یا کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس ایریا کو جراثیموں سے مکمل پاک رکھا جاتا ہے۔

مفتی کہنے لگا۔ ''پہلے تو تم اپنا Resume بناؤ۔ میں اسے چیک کروں گا۔''

میرے پاس ایک ہفتہ تھا۔ اسی دوران مفتی نے اپنی فیکٹری کے اندر کا سارا منظر نامہ کھینچ کر مجھے بتانا تھا اور ہر قسم کی مشین کے متعلق مجھے آگاہی دینی تھی اور وہ خصوصی لباس بھی اپارٹمنٹ میں لے آنا تھا کہ کس طرح انہیں پہنا جاتا ہے۔ شہباز سے بھی کہا۔ ''تم بھی اپنا Resume تیار کرو مگر ایک لفظ بھی ایک دوسرے کی کاپی نہ ہو۔''

الزبتھ کی اب تک کی ٹریننگ کے حساب سے سب سے پہلے مجھے ہیموسال کی ویب سائٹ پر جا کر اس کمپنی کے بارے میں مکمل معلومات اکٹھی کرنی تھیں۔ وہ کیا بناتے ہیں، وہاں کام کرنے والے کہاں کہاں سے ہیں۔ ان کا کارپوریٹ کلچر کیا ہے اور وہ اپنے ورکروں میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر مجھے یہ سب خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنی تھیں یا بیان کرنی تھیں جو وہ بنا رہے تھے ان

کے تمام مراحل کو سمجھتا تھا اور انہیں یقین دلاتا تھا کہ میں ہی یہ کام کرسکتا ہوں اور وہ جو کچھ بنانا چاہ رہے تھے، اس کے بارے میں آپ پڑھنے والے سن کر حیران رہ جائیں گے۔ وہ مصنوعی خون بنانے پر ریسرچ کر رہے تھے اور خون بھی ایسا کہ ہر گروپ کو لگ جائے۔ یہ کام دنیا میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ ایک چینی سائنسدان نے اس کی تھیوری پیش کی تھی اور وہ بھی وہیں کام کرتا تھا۔ میرے لیے جاب کے علاوہ یہ کشش بھی تھی کہ ایک نئی ٹیکنالوجی پر کام کرنے کا تجربہ مل سکتا ہے۔

اب میں اللہ کی مدد سے کینیڈا کی زندگی سے ہم آہنگ ہوکر آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے قول اور فعل کے موثر ہونے کا یقین سا ہو چلا تھا۔ میں اس خود اعتمادی کا استعمال کرنا چاہتا تھا جس کا ذکر آج نسرین نے مجھ سے کیا تھا۔ اس کے قابل بھروسا الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ”ندیم! ہم سب سے پہلے جاب تمہیں ملے گی۔“ میں اسے قدرت کی ندا سمجھ رہا تھا کہ یہ پیغام اس کی زبان سے میرے لیے میرے رب نے بھیجا ہے۔ میں اطمینان کی حالت میں تھا۔ مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ میں فیملی کو چند دنوں میں اسپانسر کرنے والا تھا اور مجھے یہ بھروسا تھا کہ یہ در میرے لیے رزق کے دروازے کھولے گا۔ میں آج بھی اپنے اس یقین پر بیٹھا حیران ہو رہا ہوں کہ کس طرح سے میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ جاب مجھے ہی ملے گی۔

دوسرے دن میں کین گیا تو اپنے ڈرافٹ Resume میں کچھ تبدیلیاں کیں جو ہیمو سال کمپنی کے حساب سے مجھے کرنی ہی تھیں۔ الزبتھ سے اس جاب کی بات کی تو وہ بولی۔ ”اگر یہ جاب مجھے مل جاتی ہے تو یہ کین کی بھی کامیابی ہوگی اور ہم حکومت کو بتا سکیں گے کہ ہم جو محنت کرواتے ہیں وہ رائیگاں نہیں جاتی۔“ اس نے ایک تو یہ کہا کہ اس Resume کو ہم نے زیادہ سے زیادہ متاثر کن بنانا ہے اور ساتھ تمہارے انٹرویو کی تیاری بھی خاص اہتمام سے کریں گے۔ یہ خاص اہتمام کیا تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کا تو بعد میں پتا چلا کہ جیسے سب اسٹوڈنٹس اور ادارے کا جیسے ایک ہی مطمع نظر ہو کہ ندیم کو یہ جاب ملنا ضروری ہے۔

میں الزبتھ سے فارغ ہوا تو نسرین کھڑی انتظار کر رہی تھی کہ کیا معاملہ ہے جو الزبتھ سے اتنی لمبی میٹنگ چل رہی ہے۔ اس کو بتایا تو وہ بہت پرجوش ہوگئی اور کہنے

1581ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں شاہ دولہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالرحیم خان لودھی تھا اور آپ کا شجرہ نسب دہلی کے سلطان بہلول لودھی سے جا ملتا ہے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو آپ قوم کے پٹھان تھے مگر گجرات کے علاقے کے گوجر شاہ دولہ کو گوجر قوم کا فرد بتاتے ہیں مگر یہ بات صحیح نہیں۔ آپ کی والدہ کا نام نعمت خاتون تھا جو گکھڑوں کے سردار سلطان سارنگ کی پوتی تھی۔ شیر شاہ سوری کے بیٹے سلطان سلیم کے زمانے میں سارنگ نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کردی تھی، چنانچہ شاہی فوج نے سارنگ کو شکست دی اور وہ رہتاس کے مقام پر مارا گیا۔ سارنگ کے کنبے کے لوگ گرفتار کرلیے گئے۔ ان قیدیوں میں نعمت خاتون بھی تھی جو بعد میں شاہ دولہ کی والدہ بنیں۔ ہمایوں بادشاہ کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹے اکبر کو بادشاہ بنے کچھ ہفتے ہی گزرے ہوں گے تو نعمت خاتون کی شادی اکبر بادشاہ کے ایک منصب دار عبدالرحیم لودھی سے ہوگئی۔ عبدالرحیم اس وقت بادشاہ کے محل میں کسی کام پر مامور تھا۔ پچیس سال بعد یعنی 1581ء میں ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام غالباً دولت خاں رکھا گیا۔ یہی لڑکا بڑا ہو کر شاہ دولہ کے لقب سے مشہور ہوا۔

......

اسکردو اور اس کے اردگرد کے علاقے کو بلتستان کہا جاتا ہے۔ یہاں کی زبان بلتی ہے۔ بلتان تبتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”خوبانی“۔ اس طرح بلتستان کا مفہوم ہے ”خوبانی کا دیس“۔ اس علاقے میں خوبانی کے درختوں کی اسی طرح بہتات ہے جس طرح پنجاب میں شیشم کے درختوں کی۔ خوبانی سے لدے ہوئے درخت ہر طرف نظر آتے ہیں۔ 1800ء تک خوبانی کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ زیادہ تر درختوں کی خوبانی گر کر گل سڑ جاتی تھی لیکن اس کی گٹھلی کو مقامی لوگ بڑی چاہت سے اکٹھا کرتے تھے۔ خوبانی کی گری کے تیل سے مقامی لوگ سالن تیار کرتے ہیں یا جمع کی ہوئی گری فروخت کرکے کچھ رقم کما لیتے تھے۔ پچھلے وقتوں میں جب علاقے کی چھوٹی ریاستوں کے راجے بڑی ریاستوں کے حاکموں کو خراج دیا کرتے تھے، اس خراج کی اشیاء میں بالعموم خوبانی کی گری کے تیل کی کچھ مقدار بھی مقرر ہوتی تھی۔

مرسلہ: علی شاہ نگر ہو پر۔ گلگت

لگی۔ ''پہلے یہ بتاؤ تم خود کیا محسوس کرتے ہو کہ یہ جاب تمہیں مل جائے گی؟''

میں نے کہا۔ ''میں غائب کا علم تو نہیں رکھتا مگر میرا وجدان کہتا کہ میں یہ جاب لے لوں گا۔''

وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور میرا یقین تم سے کم نہیں۔ یہ جاب انشاءاللہ تمہاری ہے۔''

آج بھی شان کوزی کا قانون پر آگاہی کا لیکچر ہوا۔ میں شان کوزی اس لیے کہتا ہوں کہ اس کا اصلی نام یاد نہیں آرہا۔ وقفے پر نسرین نے مجھے کہا کہ میں اپنے Resume کی جزئیات ٹھیک کروں اور مارک کے ساتھ اب اپنا وقت ضائع نہ کروں۔ میں ایک ایک نقطے کو دیکھتا رہا اور وہ ساتھ بیٹھی میری مدد کرتی جارہی تھی۔ کچھ تو آپ کی تعلیم اور تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ انسانی خوبیاں بھی ہوتی ہیں، جن کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ ان کو یہاں سافٹ اسکلز (Skills Soft) کہا جاتا ہے۔ یہ آپ کے ہارڈ اسکلز (Skills Hard) سے زیادہ جانچی جاتی ہیں۔ روز محشر میں جس طرح ہمارے اعمال پرکھے جائیں گے نہ کہ ہماری تعلیم اور تجربہ، ویسے ہی یہاں بھی ایک طرح سے آپ کے اعمال زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر Resume میں زیادہ ہوتا ہے۔ نسرین نے بہت سا کچھ اس میں ڈلوا دیا جس کا میں حقدار نہ تھا۔ میں روکتا تو کہتی اچھائیاں اور برائیاں دوسرے زیادہ دیکھ سکتے ہیں۔

سرجی اور شہباز پچھلے ایک دو دن سے بہت زیادہ ایک ساتھ دیکھے جارہے تھے۔ میں ساتھ آ کھڑا ہوتا تو شہباز بہانے سے انہیں کھینچ کر کسی اور طرف لے جاتا۔ میں نے ایک دو بار شہباز سے کہا۔ ''تم ہیموسال کے لیے اپنا Resume تیار کیوں نہیں کررہے؟''

''سب بکواس اور سیاپا ہے۔ کوئی جاب ہوتی تو ان کی ویب سائٹ پر تو ہوتی۔ مفتی ہمیں پاگل بنارہا ہے۔'' شہباز نے بے پروائی سے کہا۔

''مگر بہت سی جاب اندرونی طور پر پہلے آفس میں لگائی جاتی ہیں تاکہ کوئی اپنے جاننے والے کو پہلے بتا سکے۔ کمپنی والوں کو بھی آسانی ہوجاتی ہے۔ یہ بات الزبتھ نے بھی بتائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں مانتا کہ اتنی اچھی جاب صرف کمپنی کے بیچ روم میں ایک نوٹس بورڈ پر لگا دی جائے؟ یہ سب سیاپا مفتی کا ہے تاکہ ہم اس کے آگے پیچھے پھرتے رہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر سے سرجی کو بازو سے پکڑا اور دھکیلتا ہوا دور لے گیا اور سرجی اس سے سرگوشی میں باتیں کرنے لگے۔ میں جب بھی ان کے نزدیک جاتا تو شہباز انہیں بازو سے پکڑ کر دور لے جاتا۔ میں کوئی بات کرتا تو مجھے کسی اور طرح کا جواب ملتا اور پھر وہ دونوں کہیں اور جا کھڑے ہوتے۔ پھر سرگوشیاں ہوتیں اور ساتھ ہی ساتھ کن انکھیوں سے ارد گرد بھی دیکھتے رہتے۔

میں یہ سب ڈراما سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ سرجی نے ایسا کون سا جادو کیا ہے۔ شہباز جیسا گھاگ بندہ ان کی مٹھی میں آگیا؟

شہباز جب کافی مشین پر دھینگا مشتی کررہا تھا تو میں نے سرجی کو پکڑا اور دور لے جا کر تنبیہی انداز میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا چل رہا ہے؟ کیا کھچڑی بنا رہے ہو تم؟''

''قسم سے رات کے لیے قیمہ آلو بناؤں گا، کھچڑی کیوں بناؤں؟ آج کل تو طبیعت بھی ساز گار جارہی ہے۔'' سرجی نے کہا۔

''سرجی آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں کس کھچڑی کی بات کررہا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ شہباز کے کان میں ہروقت کیا کھسر پھسر کرتے رہتے ہو؟ مجھے دیکھ کر کھسک جاتے ہو اور پھر کسی کونے میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔''

''آپ بھی تو نسرین کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔''

''اس کے ساتھ کرتا ہوں تو کوئی بات تو بنتی ہے مگر اس شہباز کے ساتھ کیا بات ہوسکتی ہے؟''

بڑی مشکل سے جب راز سے پردہ اٹھایا تو میرا قہقہہ ساتھ کھڑے اشوک کو بھی ہلا گیا۔ دراصل سرجی شہباز کو یہ باور کروانا چاہ رہے تھے کہ ''مایا'' اس کی دیوانی ہے۔ سرجی سے اکثر شہباز کا پوچھتی رہتی ہے کہ کیا وہ شادی شدہ تو نہیں؟ کیا اس کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟ شہباز جیسا اسمارٹ اس کلاس میں کوئی بھی نہیں اور وہ اس پر مرمٹی ہے۔''

سرجی تو شہباز کا بتا رہے تھے کہ میں نے ایک دفعہ خود مایا کو سسکاری لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے سرجی پوچھا۔ ''یہ سسکاری کیوں مار رہی تھی۔'' میں سسکی کہنا چاہتا تھا مگر سسکاری منہ سے نکل گیا۔ تو سرجی نے وضاحت کی۔

''شہباز تو خود کہتا تھا کہ حیا اور مایا ہر وقت سوئی رہتی ہیں اور لگتا ہے کہ نشہ بھی کرتی ہیں وہ خود کس طرح تمہاری باتوں میں آگیا؟'' میں نے سوال کیا۔

سرجی نے بھی خوب جواب دیا۔ ''آج بھی اسے سمجھا رہا تھا کہ یہ پیار کا نشہ ہے، عشق کا جادو ہے جو اس کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔'' پھر ادھر اُدھر دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ''شہباز کو یقین آتا جارہا ہے اور اب وہ زیادہ وقت اس کے قریب رہنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سرجی اب شہباز کو واقعی کسی سیاپے میں ہی نہ ڈال دینا؟''

سرجی نے خشوع سے کہا۔ ''انشاء اللہ سیاپا تو نہیں ہو گا پر مزہ بھی بہت آئے گا۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ یہ سب سرجی کی ذہنی اختراع ہے کہ اتنا بڑا ڈراما سوچ لیا۔ میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''کیا مایا نے یہ سب کچھ واقعی اپنے ہوش و حواس میں کہا ہے؟''

وہ بولے۔ ''ایک تو وہ باقاعدہ نشہ میں کہیں کھوئی یا سوئی رہتی ہے۔'' پھر قسم کھا کر بولے۔ ''اس نے یہ باتیں کسی مدہوشی میں بھی نہیں کیں۔''

میں نے پوچھا کہ پھر تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تو جواب میں فرمایا۔ ''شہباز ہر وقت کہتا ہے کہ ندیم کا نسرین سے کوئی چکر چل رہا ہے تو میں نے سوچا کہ اسے اپنے کسی چکر میں لگا کر تمہاری فکر سے آزاد کردوں۔''

میں نے اب جانا کہ سرجی کو جتنا معصوم میں سمجھ رہا تھا، اتنے ہیں نہیں اور مجھے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ شہباز کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ شہباز کیوں سرجی کی کمان سے نکل کر مایا میں سیدھا پیوست ہو جاتا ہے۔ میں ایک دو بار دیکھ چکا تھا کہ شہباز اس کے پاس کھڑا شرم سے پیلا زرد پڑا جارہا ہے اور چہرے پر پسینا پانی کی طرح بہہ رہا ہے اور مایا حیران و پریشان کھڑی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھے جارہی ہے۔ ایک بار تو شہباز پیار میں مست ہو کر اس کے بیگ سے سینڈوچ بھی نکال کر نگل چکا تھا اور مایا بھوکی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئی تھی اور شہباز اس گھورنے کو معشوقانہ ناز و ادا سمجھ کر واری جارہا تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بم ایک دن چل ہی نہ پڑے۔ میں نے سرجی کو ہلکی پھلکی تاکید کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اب اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ہم کو جب بھی پاکستان بات کرنی ہوتی تو جاز کے اسٹور سے دس ڈالر کا کالنگ کارڈ لے کر نو دس منٹ کی بات کر لیتے۔ فون کرنے سے پہلے کارڈ کا نمبر کھرچ کر سوچوں میں مسرور بیٹھے رہتے۔ فون کرنے کے دوران آس پاس کا ہوش نہ ہوتا۔ اتنا مہنگا کارڈ اور کتنے کم منٹ! ہمارے لیے کسی گوہر نایاب کی مانند ہوتے۔ جب کین سینٹر سے گھر جاتے تو راستے میں ایک اسٹیشن پر شہزاد اپنا کھوکا لگاتا تھا۔

پاکستانی تھا تو ہماری دعا وسلام ہوئی اور یہ گپ شپ میں تبدیل ہوتی گئی۔ ہم اس کے پاس ذرا دیر کو رکتے۔ یہ ہمیں کالنگ کارڈ نو ڈالر میں دیتا تھا۔ ہمیں بھی ایک ڈالر کی بچت ہو جاتی اور وہ بھی اتنا ہی بچا لیتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا کہ اپارٹمنٹ میں بیٹھے ہمیں کالنگ کارڈ کی ضرورت پڑتی تو اس کو فون کر لیتے۔ وہ فون پر ہی کارڈ کا نمبر لکھوا دیتا اور اگلے دن ہم اسے نو ڈالر تھما دیتے۔ اس کا اسٹور انٹری پوائنٹ سے باہر تھا، ہم باہر آجاتے۔ اس سے کارڈ لے کر واپس سب وے میں گھس جاتے۔ ہمیں ٹکٹ کی کوئی پرابلم نہ تھی کیونکہ ہمارے پاس ایک ماہ تک کے لامحدود سفر کا پاس تھا۔

ہم ایک دن واپس جاتے ہوئے اس کے پاس کھڑے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام آیا۔ کچھ خریدا تو اس کے پاس پچاس سینٹ کم تھے۔ اب شہزاد اس سے پوری رقم مانگ رہا تھا اور جواب میں وہ گالیاں دے رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک تو وہ شہزاد کو پوری ادائیگی نہیں کر رہا اور بدتمیزی الگ کر رہا تھا۔ پھر مجھ سے کہا۔ ”پچاس سینٹ اسے دے دوں؟“

میں اس کی بدتمیزی پر پہلے بھی تپا ہوا تھا تو انکار کر دیا۔ اس پر وہ مجھ سے بھی جھگڑنے لگا۔ اس زور زبردستی پر میں حیران تھا۔ اس سے پہلے بات بڑھتی، وہ جنگلا پھلانگتا بغیر ٹکٹ کے اسٹیشن میں گھس گیا۔ میں اس دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ شہزاد نے کہا۔ ”ان سیاہ فاموں کے منہ کبھی نہ لگنا۔ یہ اپنے آپ کو کہیں بھی جواب دہ نہیں سمجھتے۔“

میں نے یہاں یہ دیکھا کہ سیاہ فاموں کو گورے کیا ہم دیسی بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ اس چھبتی نفرتوں کو دل میں لیے اکثر کسی کی تاک میں رہتے ہیں۔

مجھے آج ہولڈنگ سینٹر شام چار سے رات بارہ بجے تک جاب پر بھی جانا تھا۔ اپارٹمنٹ میں اپنی یونیفارم زیب تن کی اور ہولڈنگ سینٹر کی گاڑی میں چار بجے سے پہلے جاب پر آپہنچا۔ آج شہباز کو بھی لائبریری کی جاب پر جانا تھا اور کل سے سرجی کو بھی اسی لائبریری میں سیکیورٹی گارڈ کی اپنی پہلی جاب پر پہنچنا تھا۔ سرجی کی جاب پر ہم سب خوش تھے سوائے سرجی کے۔ وہ ابھی تک نیویارک کا نام لے لے کر ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔

آج میں ہولڈنگ سینٹر جاب پر پہنچا تو ہیڈ گارڈ بڈی کی جگہ باجوہ تھا۔ یہ سکھ تھا۔ بڈی دوبارہ سے گارڈ بنا ہمارے ساتھ انتہائی مغموم بیٹھا، خلاؤں میں گھورے چلا جا رہا تھا۔ باجوہ ایک دو ماہ پہلے ڈیوٹی کے دوران اپنی سیٹ پر سوتا پکڑا گیا تھا اور جاب سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہاں کی یونین سکھوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ پھر اسے لے آئے تھے۔ اب باجوہ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا اور بڈی ایک معمولی درباری تھا۔

باجوہ نہایت ہی چرب زبان اور احمق ثابت ہوا تھا۔ جیسے جیسے اس کے ساتھ کام کرتا گیا، ویسے ہی وہ ظاہر ہوتا گیا۔ ہر وقت سپروائزر کی خوشامد کرنا اور ان کو خوش رکھنا اس کا نصب العین تھا۔ لنچ بریک میں ایک ٹرے چکن روسٹ، چاول اور جو کچھ بھی قیدیوں کے لیے آتا۔ وہ بھر بھر کر پہلے سپروائزر کو بھیجتا۔ سپروائزر کا جب بھی نیچے سے فون آتا تو یہ ایک لمحے میں اپنی کرسی چھوڑ دیتا۔ وہ بیدی کی طرح خطرناک نہ تھا مگر اسے حماقتوں کے انبار لگانے کے لیے کسی بارہ بجنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر وقت گھبرایا سا یا چونکتا رہتا تھا۔ گرنام سنگھ نے آتے ہی میرے کان میں کہا۔ ”یہ اپنا بندہ ہے، عیش کرنا۔ بس اسے یہ محسوس ہوتا رہے کہ وہ افسر ہے۔“

ستر سالہ باجوہ اپنی سفید داڑھی، سر پر سکھوں کا روایتی کیس رکھے میرا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”سر! آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔“

پہلے وہ سر کہنے پر چونکا، پھر حیران ہوا اور پھر واری نیاری جانے لگا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں راز داری سے بولا۔ ”پتر اقبال! تمہیں یہاں جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو باجوے کو ہی بتانا۔“ پھر آس پاس دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کسی اور کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں اور یہاں کی بات نیچے سپروائزر تک نہ جائے۔“ پھر ذرا سا اپنے قریب کھینچ کر کان میں بولا۔ ”دوسرے گارڈوں پر نظر بھی رکھنی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے خلاف سازش ضرور کرے گا۔“

میں اس کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔ ہر نااہل یہی سمجھتا

رہتا کہ کوئی اس کے خلاف سازش کا جال بن رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنی کیا، باقی لوگوں کی زندگی بھی دشوار کر دیتا ہے۔

میں نے کہا۔ "باجوہ صاحب اگر میں گارڈز پر نظر رکھوں گا تو قیدیوں پر کون نظر رکھے گا۔"

وہ ناراض ہو گیا۔ "یہاں یہ لوگ کہاں جانے والے ہیں۔ یہ تو سوتے رہتے ہیں یا کھاتے رہتے ہیں۔ ان پر دوسرے گارڈ نظر رکھ لیں گے اور تم قیدیوں کی فکر نہ کرو۔"

میں نے دل میں کہا کہ یہ باجوہ واقعی احمق انسان ہے اسے بندوں کی پرکھ ہی نہیں اگر ہوتی تو چچہ گیری کے لیے مجھے نہ چنتا۔ پھر میں نے سوچا کیوں نہ اسے ہمیشہ خوف زدہ ہی رکھوں مگر اگلے لمحے خیال آیا کہ اس کے لیے مجھے کسی بے گناہ کو داؤ پر لگانا پڑے گا تو یہ بات ذہن سے جھٹک دی۔

آج ایک پاکستانی لڑکے کو پکڑ کر لائے تھے۔ وہ اپنا نام اشرف بتا رہا تھا حالانکہ اصل نام کچھ اور تھا۔ مجھے باجوہ نے کہا۔ "کاکا اقبال! اس کو ملاقات کے لیے نیچے لے جا۔"

سکھوں کی عادت ہے کہ جس سے انس ہوتا ہے یا پیدا کرنا چاہتے ہیں تو نام سے پہلے کاکا لگانا نہیں بھولتے۔

میں اشرف کو نیچے لے گیا جہاں ملاقاتی قیدیوں سے ملنے آتے تھے۔ اشرف کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سوکھی ٹہنی کی مانند کانپ رہا تھا۔ ایسے مناظر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر پاکستان سے تھا تو اس کو تسلی دی اور کچھ حوصلہ بھی دیا۔ ملاقات میں اس کے ماموں، ممانی اور ان کے تین بچے تھے۔ وہ ان کے سامنے گڑگڑا رہا تھا کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکالیں۔ بھلے واپس پاکستان بھیج دیں مگر مجھے امریکا نہ بھیجیں۔ میں حیران اس لیے تھا کہ سب لوگ امریکا میں داخل ہونے کے لیے کینیڈا کا رخ کرتے ہیں مگر یہ الٹی گنگا کیوں بہانا چاہتا ہے۔

اس کے ماموں تسلیاں دے رہے تھے اور بچیاں بھائی جان بھائی جان کہہ رہی تھیں مگر اس کے کانوں میں کوئی آواز نہ پڑ رہی تھی اور مسلسل روئے چلا جا رہا تھا۔ ملاقات ختم ہوئی تو میں اسے اوپر لے آیا۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا اور میرا تجسس بڑھتا گیا کہ اللہ جانے کیا ماجرا ہے۔

لنچ روم میں منظر وہی تھا جو میں کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ پژمردہ چہرے، جو شیشوں سے باہر گرتی برف دیکھ کر زیادہ اداس ہو رہے تھے۔ اشرف اکیلا بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ باجوہ نے مونا رجسٹر بغل میں سنبھال کر دبایا ہوا تھا اور اس کو ذرا سا بھی کھسکنے نہ دیتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے ساتھ بیٹھے جمیل کو اٹھا کر بولا۔ "کاکا اقبال، ادھر آ کر بیٹھو۔"

میں سمجھا کہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ جمیل برا سا منہ بنا کر اٹھ گیا اور میں وہیں براجمان ہوا۔ میں نے پوچھا۔ "باجوہ صاحب! بولیے کیا بات ہے؟"

تو کہنے لگا۔ "بات کوئی نہیں، بس بیٹھ جاؤ۔"

میں پریشان ہو گیا کہ مجھے دوسری کرسی سے اٹھا کر اپنے سامنے بٹھا دیا اور کہتا ہے کہ بات بھی کوئی نہیں۔ میں شش و پنج میں بیٹھا تھا کہ اپنا چہرہ ذرا قریب لا کر بولا۔

"ایک سیکرٹ مشن ہے اور بات کسی سے نہیں کرنی۔"

مجھے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کیا خفیہ مشن ہے جس کے لیے مجھے چنا گیا ہے؟ میں الجھتا گیا۔ مجھے تو یہ جاب وقتی طور پر کرنی تھی اور یہ لوگ یہاں چپکے ہوئے تھے۔ مجھے کیا لینا دینا تھا کہ اپنے آپ کو خطروں میں ڈالوں۔ میں اس کے چہرے سے ذرا فاصلے پر ہوا۔ "کیا کوئی فرار ہونا چاہتا ہے؟"

وہ بولا۔ "گولی مارو ان قیدیوں کو، یہ کوئی اور مشن ہے۔" یہ سب باتیں پنجابی میں ہو رہی تھیں اور میری پنجابی بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "باجوہ صاحب میں ذرا الجھ رہا ہوں، ذرا کھل کر بات کرو۔"

یہ سن کر وہ اپنا چہرہ پھر سے میرے قریب لایا اور کہا۔ "کسی کو معلوم نہ پڑے کہ یہ خفیہ مشن کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں پڑے گا مگر بتاؤ تو سہی۔"

جواب میں وہ بولا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نیچے جو اسٹور ہے، وہاں سے اس کے لیے دو ڈالر کی لاٹری کی ٹکٹ لانی ہے۔"

وہ یہ بات کر کے میرا ردِعمل جانچ رہا تھا۔ میں نے سمجھ داری سے کچھ نہ سوجھتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور پھر رازداری سے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ کسی کو بھنک بھی نہ لگے گی۔"

وہ بہت زیادہ خوش ہوا اور ریلیکس ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر خیالوں میں مسکرانے لگا۔ اور میں اس "خفیہ" مشن کو سرانجام دینے کے لیے اپنے ذہن میں مسکراتے ہوئے خیالی نقشہ بنانے لگا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ باجوہ کو لاٹری سے ارب پتی

بننے کا جنون ہے۔ باجوہ ہی کیا یہ جنون تو یہاں سبھی کو ہے۔ کئی اقسام کی لاٹری یہاں کھیلی جاتی ہے۔ آٹھ ہندسے ہوتے ہیں اگر سب کے سب مل جائیں تو کئی ملین کا انعام ملتا ہے۔ چار مل جائیں تو کچھ نہ کچھ دس بیس ڈالر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح سے پانچ، چھ یا سات ہندسے مل جائیں تو انعامی رقم بڑھتی جاتی ہے۔ جو رجسٹر اس نے بغل میں دبایا ہوا تھا وہ سالوں کا حساب کتاب تھا کہ سال یا دو سال پہلے اسی تاریخ کو کون سا نمبر لگا تھا۔ وہ پانچ سال پہلے نمبر کو آج کھیلتا تھا اور کوئی نہ کوئی تکہ لگا لیا کرتا تھا۔ اپنی زندگی کو اس نے لاٹری ٹکٹ کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسی انعام کے چکر میں ہمیشہ اٹکا رہتا تھا۔ اپنے کام سے اس لیے غیر حاضر رہتا اور غلطیاں کرتا رہتا اور پھر یہ سوچتا کہ کوئی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے اگر وہ سازشی کو پکڑنا چاہتا تو ایک لمحے میں پکڑ سکتا تھا مگر اس کی نظر اس پر نہ پڑتی تھی کیونکہ اس کا ہاتھ اپنے ہی گریبان پر پڑتا۔ اب یہ انوکھا کردار میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ چاہتا تو اس کو اسی میں چکر دیتا رہتا مگر بات وہی تھی کہ مجھے کیا ملتا۔ اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے وقت کی مناسبت سے ہی ڈیل کروں گا۔ وہ بے ضرر تھا اور میں اس کے ساتھ بیدی والا کوئی سلوک نہ کرنا چاہتا تھا کہ اسے ڈرایا دھمکا دیتا۔ میں نے دو ڈالر کا ٹکٹ لیا اور چپکے سے اس کو تھما دیا۔ اس نے میز کے نیچے سے ہاتھ کر کے مجھے دو ڈالر تھما دیے۔ اس طرح میں نے بخوبی یہ خفیہ مشن سر انجام دے دیا۔

بریک ختم ہوا تو میں اپنی پوسٹ پر آ بیٹھا اور اتفاق سے ساتھ والے کمرے میں اشرف تھا۔ سوچا اس کی روئیداد ہی سن لوں۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کارپٹ پر آ بیٹھا۔ میں نے کریدا تو وہ بولتا چلا گیا۔ وہ دس سال پہلے امریکا میں داخل ہونے کے لیے ساؤتھ افریقا میں آ بیٹھا تھا۔ ایک سال وہاں رکا رہا اور پھر ایک بحری شپ میں سوار ہوا اور امریکا آ گیا۔ وہیں سے سلپ ہو کر اندر داخل ہو گیا۔ پہلے جو بھی ایک بار امریکا میں آ گیا وہ وہیں رہ گیا۔ کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی تھی۔ آپ کام کرتے رہیں مگر کوئی آپ کو روکتا نہ تھا جب تک آپ کوئی جرم نہ کریں، آپ آزاد ہوتے تھے۔ اشرف بھی کام میں لگ گیا۔ کچھ پیسے بنائے تو گرین کارڈ کے لیے کسی سے پیپر میرج کر لی۔ گرین کارڈ ملا تو پھر اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا۔ وہ امریکا سے بھاگا تو پاکستان واپس آ پہنچا۔ گرین کارڈ تو اس کے پاس تھا۔ اس کو پھر سے امریکا کی یاد ستائی تو دوبارہ یہاں آنے کے ذریعے سوچنے لگا اگر سیدھا امریکا آتا تو دھر لیا جاتا۔ اسی لیے کینیڈا آ گیا اور سوچا کہ بارڈر کسی طرح کراس کر کے دوبارہ امریکا میں داخل ہو جائے گا۔ شومیٔ قسمت کہ کینیڈا میں ہی دھر لیا گیا۔ انہوں نے معلوم کر لیا کہ امریکا میں اس کا کیا اسٹیٹس تھا اور کیا جرم کر کے پاکستان فرار ہوا تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر مجھے انہوں نے امریکا کے حوالے کر دیا تو بری طرح پھنس جائے گا۔ اب اسی پریشانی میں نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ سو سکتا تھا۔ اب کینیڈا والوں سے کہتا کہ اسے پاکستان ڈی پورٹ کر دیں۔ اب معاملہ یہاں کی امیگریشن کے پاس تھا اور وہ اس کی قسمت کا کیا فیصلے کرتے ہیں، یہ غم اسے دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

اس نے اپنی کہانی ختم کی تو فضا میں سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”ایسا کیا ہے امریکا میں کہ تم اتنے سالوں سے خوار ہو رہے ہو؟“

کہنے لگا۔ ”پاکستان میں لوگ ہاتھوں میں لاکھوں روپے لیے پھر رہے ہیں کہ کسی طرح سے امریکا میں ایک بار داخل ہو جائیں جو ایک بار امریکا آ گیا وہ ساری عمر کسی اور ملک میں نہیں ٹک سکا۔“

میں نے کہا۔ ”اگر واپس چلے جاؤ تو ان لوگوں کو اصل حقیقت ضرور بتانا اور ان سے کہنا کہ ان پیسوں سے اپنے ملک ہی میں کوئی کاروبار کر کے عزت کی زندگی گزار لیں مگر غیر قانونی طور پر امریکا آنے کا کبھی نہ سوچیں۔“

میری تقریر ختم ہوئی تو کہنے لگا۔ ”وہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ اگر میں واپس پاکستان پہنچ گیا تو پھر امریکا آنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لوں گا۔“ میں اب حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اب اس غم میں غلطاں ہے کہ کہیں یہ مجھے امریکا نہ بھیج دیں مگر مستقبل کے ارادے یہ ہیں کہ آنا امریکا ہی میں ہے۔ واہ رے انسان...... تو کیسا کھیل اپنے ساتھ کھیل رہا ہے؟

بعد میں کینیڈا نے اسے واپس پاکستان بھیج دیا۔ اب اللہ جانے وہ کہاں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا۔

باجوہ کا دوسرے دن دو سو ڈالر کا انعام نکل آیا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنا مرشد سمجھنے لگا۔ میری ایسے تعظیم کرتا کہ جیسے میں اس کا خلیفہ ہوں۔ یہ تعظیم تب ختم ہوئی جب چند ماہ بعد وہ متواتر ہارنے لگا مگر میرے سامنے گستاخی کرتے ہوئے گھبراتا تھا ایسے کہ جب کسی مرید کا کام اپنے پیر سے

پورانہ ہو تو پھر بھی اس کی عزت کرتا ہے کیونکہ وہ ذہنی طور پر غلام بن چکا ہوتا ہے۔

آج اپارٹمنٹ رات ساڑھے بارہ بجے پہنچا تو سب جاگ رہے تھے اور معلوم نہیں کیوں خوش تھے۔ لیونگ روم میں بیٹھ کر قہقہے بکھیر رہے تھے۔ میں نے اپنا کھانا گرم کیا اور اس محفل میں آ بیٹھا۔ باہر کا موسم کڑک دار تھا۔ برف باری تھم چکی تھی اور اس کے آثار چاروں جانب نظر آ رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کا موسم خوش گوار تھا۔ مفتی مجھ سے کہنے لگا۔ ”اپنا Resume ایک دو دن میں تیار کر کے پہلے مجھے دکھاؤ اور پھر تم اسے فیکس کر لینا اور میں خود وہاں کے سپروائزر کو بھی دے دوں گا۔“

شہباز کہنے لگا۔ ”اللہ کرے اس کی جاب ہو تو ہمارے بھی راستے کھلیں۔“

میں اپنے ساتھ واک مین لایا تھا۔ آج اسے نکالنے کا خیال آیا تو کھانا کھا کر اس میں اپنی پسندیدہ کیسٹ لگالی۔ گانا لگا تو سارے مست ہو گئے۔ گانے کے بول سب کو مدہوش کر رہے تھے۔ سب جھوم رہے تھے۔ مجھے مہدی حسن کی آواز نے مجھے وطن کی یاد دلا دی جہاں میں یہ کیسٹ اونچی آواز میں لگا کر اس کی دھن میں بہہ جاتا تھا۔ آج وہی کیسٹ ٹورنٹو میں سنی تو وطن کا درد دل میں آ بیٹھا۔ سب اب خاموش ہو کر موسیقی سن رہے تھے۔ سر جی بھی اپنے خیالوں میں کہیں کھوئے کارپٹ پر دراز ہو گئے اور شہباز اپنا سر بازو پر رکھے جانے کن خیالوں میں گم لیٹا تھا۔

دوسرا دن بھی برف میں لپٹا بیدار ہوا۔ نیند پوری کرنے کا وقت ہی نہ تھا۔ صبح سات بجے بیدار ہوئے اور رات بارہ بجے کے بعد گھر پہنچے۔ دو ڈھائی بجے سوئے اور پھر اگلا دن نکلا۔ مصروفیت بڑھی تو ذہنی دباؤ بھی کم ہوتا گیا مگر کم خوراکی کم خوابی نے اپنے رنگ دکھانا شروع کر دیے۔ وزن ایک سو بیس پاؤنڈ پر آ گیا۔ پینٹ کی ویسٹ اٹھائیس ہو گئی۔ پہلے بارہ ڈالر کی خطیر رقم کی وجہ سے بال نہ کٹواتا تھا اور اب ٹائم نہ تھا۔ بال بڑھ کر عجیب و غریب شکل اختیار کر گئے تھے۔ مجھ پر کڑا وقت پہلے بھی کئی بار گزرا تھا مگر اب کی بار کچھ نئے انداز میں آیا تھا۔ پہلے تو وہ میری مرضی سے نہیں بلکہ اچانک آتا تھا۔ اب تو میں اس کڑے وقت کو خود اپنی دعاؤں، منتوں اور مرضی سے گھسیٹ لایا تھا۔

آج بھی کین سینٹر میں آئینی لیکچر چل رہا تھا مگر میں اپنے Resume لے کر البزبتھ کے پاس بیٹھا اس کی باریکیاں سلجھا رہا تھا۔ نسرین بھی کلاس چھوڑ کے میرے پاس بیٹھی کچھ مشورے دے رہی تھی۔ یہ وہ دوست تھی جو یکی تو اچانک مگر ایسا لگتا تھا کہ مدتوں سے میں اسے جانتا ہوں۔ میں اس سے کہتا۔ ”اپنا عادی مجھے مت بناؤ ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔“

وہ ہنس کر کہتی۔ ”مشکل تو ہو گی مگر ایک دوسرے کو یاد تو کرتے رہیں گے۔“

ہم نے دو گھنٹے لگا کر اپنی طرف سے ایک بہتر Resume تیار کر لیا۔ یہاں جاب کے لیے ریفرنس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ریفرنس آپ کسی کا بھی دے سکتے ہیں۔ پچھلی جاب کا حوالہ سب سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہاں میری کوئی جاب ایسی نہ تھی کہ اس کا میں حوالہ دیتا۔ آپ اپنے کلاس فیلو، ٹیچر کا بھی ریفرنس دے سکتے ہیں۔ کمپنی والے ان کو فون کر کے آپ کے بارے میں معلومات لیتے ہیں۔ آپ کی خامیاں اور اچھائیاں پوچھتے ہیں۔ الزبتھ نے کہا کہ ایک میرا ریفرنس دے دو۔ دوسرا ریفرنس میں نے طارق کا دے دیا جو میرا کلاس فیلو بھی تھا۔ اس سے نیویارک میں نے فون کر کے اجازت لے لی۔ ریفرنس کے لیے اجازت بھی ضروری ہوتی ہے۔ آپ بغیر اجازت کسی کا ریفرنس نہیں دے سکتے۔ نسرین نے کہا کہ میرا ریفرنس دے دو مگر الزبتھ نے کہا کہ نہیں، اس لیے کہ نسرین کی انگلش اتنی اچھی نہ تھی۔ مفتی نے کہا کہ کمپنی میں منظر بھی کام کرتا ہے اس کا ریفرنس تو نہیں مگر نام ضرور دے دینا۔ وہ اس سے بھی تمہارے بارے میں پوچھ لیں گے۔ منظر مجھ سے سینئر تھا۔ اس نے اپنی کلاس فیلو تنظیم بھابی سے شادی کی تھی۔ تین بیٹے تھے۔ منظر سے یہاں میری ملاقات تب ہوئی تھی جب وہ ایک بار مفتی سے ملنے آیا تھا۔ میں نے منظر کو فون کر کے اجازت مانگی کہ تمہارا نام دے دوں تو وہ کہنے لگا کہ ضرور دو اور میں تمہارے لیے جو کچھ ہو سکا کروں گا۔ مفتی اپنا نام اس لیے نہیں دینا چاہتا تھا کہ ہم اکٹھے رہتے تھے۔ منظر کے ساتھ بعد میں ہمارے تعلقات اتنے مضبوط ہوئے کہ آج تک قائم ہیں۔ ٹورنٹو میں میرا ٹھکانا اس کا گھر بھی ہوتا ہے۔ وہ اور اس کی فیملی جب بھی امریکا آتی ہے تو ہمارے گھر پر ٹھہرتے ہیں۔

اس سے فارغ ہوئے تو بات کینیڈا اور خاص طور پر اونٹاریو صوبے کی خوبصورت لینڈ اسکیپ کی ہونے لگی۔ کچھ ماہ بعد بہار اور پھر گرمیوں کا موسم شروع ہوتا۔ اس برف زدہ

موسم کو تمام ہونا تھا اور آسمان کو اپنے رنگ دکھانے تھے۔ زمین کو گل و گلزار ہونا تھا۔ پرندوں کو چہچہانا تھا۔ الزبتھ سے کچھ پوچھا تو اس نے صرف یہ بتایا کہ ٹورنٹو کے شمال میں ایک علاقہ بولٹن ہے جہاں ندیاں ہیں، آبشاریں ہیں، سرسبز و شاداب کھیت ہیں، لگتا ہے سبز رنگ آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ نیلا شفاف آسمان، جنگل اور وہاں آزادی سے گھومتے ہرن، کیمپنگ کے بے انتہا خوبصورت مقامات اور دل کو جکڑ لینے والی خاموشی اور سکون ہے۔ یہ سن کر میرے اندر کا آوارہ گرد بیدار ہونے لگا۔ میں زیادہ سے زیادہ معلومات لینا چاہتا تھا اور اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

الزبتھ پوچھنے لگی۔ ”کیا تمہیں کیمپنگ کا شوق ہے؟“

میں اس سے کیا کہتا کہ میرے کینیڈا آنے کی بڑی وجہ ہی یہی تھی۔ میں نے جب کہا کہ میں اپنا خیمہ بھی ساتھ لایا ہوں تو وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس لیے نہیں کہ اس نے پہلے کسی کو کیمپنگ کرتے دیکھا نہ تھا بلکہ اس لیے کہ کوئی کینیڈا میں بھی اپنا خیمہ لا سکتا ہے کیونکہ یہاں ایک سے بہتر ایک خیمہ سستے داموں دستیاب ہیں۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو نسرین کہنے لگی۔ ”ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم بولٹن اکٹھے کیمپنگ کے لیے جا سکیں۔“

میرے لیے اس تصور میں بھی چاشنی تھی کہ وہ میرے ساتھ کیمپنگ پر جائے۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نے مسکرا کر کہا۔ ”وعدہ رہا، اگر گیا تو اکٹھے چلیں گے۔“

بعد میں اسی وعدے کا پاس رکھتے ہوئے نہ میں آج تک بولٹن گیا اور نہ جانے کا ارادہ کیا گو کہ آس پاس کے مقامات پر کیمپنگ کی۔

آج میری ہولڈنگ سینٹر میں جاب بھی نہ تھی اور آج ہی میں اسپانسر کے پیپرز اور یہ سب کچھ فائنل کرنا چاہتا تھا۔ شہباز اور سرجی تو پہلے ہی نکل گئے تھے۔ میں اور نسرین بعد میں نکلے۔ نسرین نے گلے لگ کر نیک خواہشات کا اظہار کیا اور میں نے ذرا جذباتی ہو کر اس کا بھرپور شکریہ ادا کیا۔

میں اپارٹمنٹ میں گروسری کے بیگ اٹھا کر داخل ہوا۔ راستے میں ایک گروسری کی بڑی پرائس چاپر سے میں نے بہت زیادہ سامان خرید لیا تھا۔ اس لیے کہ وہاں گلائی سے آدھی قیمت پر دستیاب تھا۔ سبزیوں، پھلوں کے ڈھیر لگے تھے اور وہ سب کچھ تھا جس کا میں تصور کر سکتا تھا۔ اتنا کچھ خرید لایا کہ اٹھانا مشکل ہو گیا۔ بڑی مشکل سے بس سے اپارٹمنٹ تک آیا۔ مفتی نے سامان دیکھا تو برا سا منہ بنایا کہ اتنا خرچا کر آیا ہوں۔ جب قیمت بتائی تو چہکنے لگا۔ سرجی نے چولہے پر سالن تیار کرنے کے لیے دیگچہ رکھا اور آدھے ٹماٹر شہباز وہیں کھا گیا۔ سرجی نے شور مچانا چاہا مگر شہباز کی ڈپٹ پر خاموش ہو کر پیاز کاٹنے لگے۔

میں نے اپنا Resume مفتی کو دکھایا۔ اس نے ایک ایک لفظ باریک بینی سے دیکھا، ہجے چیک کیے، گرامر کو تولا اور پھر منظوری دے دی۔ ایک کاپی خود رکھ لی اور مجھ کو تاکید کی کہ کل اسے کمپنی کو فیکس بھی کر دوں۔ یہاں سے فارغ ہوا تو اسپانسر کے کاغذات کو ایک بار پھر سے میں نے دیکھا اور جب صحیح پایا تو شہباز کو لے کر گلائی کے ساتھ شاپر ڈرگ مارٹ آیا، جہاں ڈاک خانہ تھا۔ ساتھ بینک سے سترہ سو ڈالر کا ڈرافٹ بنوایا اور بسم اللہ کر کے اسے بھی پوسٹ کر دیا۔ شہباز کہنے لگا۔ ”آج Resume بھی بھیج دیا ہے اور اسپانسر کے کاغذات بھی ڈاک میں بھیجے ہیں۔ لگتا ہے کہ آج کا دن تمہارے لیے بہت اہم ثابت ہوگا۔“ میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ سب تیرے بھروسے پر کر رہا ہوں، بلکہ تو ہی سب کروا رہا ہے اب معاملہ تیرے سپرد کر دیا ہے تو جو بہتر سمجھتا ہے وہی کر۔

دوسرے دن کین سینٹر سے میں نے ہیموسال کو اپنا Resume فیکس کر دیا اور ساتھ ہی دوائیوں کی ایک بڑی کمپنی کو بھی اپنا دوسرا resume ذرا سے رد و بدل کے بعد بھیج دیا۔ ان کی جاب بھی اخبار میں آئی تھی۔

اب میں اس سے فارغ ہوا تو آس پاس کی خبر لی۔ سب میں الزبتھ نے یہ بات پھیلا دی تھی کہ کلاس میں سب سے پہلے ندیم نے اپنا Resume بھیجا ہے اور یہ سینٹر کا بھی ایک قسم کا ٹیسٹ ہے۔ اگر ندیم کو انٹرویو کی کال آتی ہے تو ہم سب مل کر اس کو انٹرویو دینے کی تیاری کروائیں گے۔ اسی طرح سے سب کی اپنی تیاری بھی ہو جائے گی۔ پھر ایک ایک اسٹوڈنٹ میرے پاس آتا اور مجھ سے ہاتھ ملانے کے علاوہ گڈ لک کہتا۔ بقول سرجی کے میں کلاس کا دولہا بن چکا تھا۔ مارک آتے جاتے اپنے بھاری ہاتھ سے مجھے تھپکی دیتا۔ ین پلکیں جھکائے مجھے دیکھتی اور سر جھکا کر تسلی دیتی۔ مائیکو کہتا کہ یہ جاب تمہیں مل جائے گی۔ مایا بند آنکھوں کو بمشکل کھولتی اور نیک تمناؤں کا اظہار کر کے دوبارہ مراقبے میں چلی جاتی۔ نسرین یہ سب دیکھ کر مسکراتی رہتی۔ سرجی ین کے پیچھے پیچھے گھومتے اور اسے کچھ معلوم بھی نہ ہوتا تھا۔ شہباز کو

سرجی نے مایا کے عشق میں گرفتار کرادیا تھا اور بیچ میں سے خود کھسک گئے تھے۔ اب شہباز گاہے بگاہے مایا کے قریب آتا، پھر ہلکا سا شرماتا اور پھر وہیں ڈٹ جاتا۔ مایا اپنی پلکیں اٹھا کر کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی۔ نسرین کو میں نے سرجی کی شرارت بتا دی تھی اور ہم کن انکھیوں سے یہ تماشا دیکھتے اور ہنستے رہتے تھے۔

آج شہباز نے اپنے عشق کی داستان مجھ پر عیاں کردی تھی۔ ”میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کام میں نہ پڑوں مگر مایا کی بے لوث محبت نے مجھے زیر کردیا تھا۔“

اس کے یہ کہنے پر میں نے پوچھا۔ ”کیا اس نے کوئی اظہار بھی کیا ہے۔“

”زبان سے کبھی لڑکی کچھ نہیں کہتی، اس کی آنکھیں سب بول دیتی ہیں۔“

”تم آنکھوں کی زبان کب سے سمجھنے لگے۔“

”میں نہیں سرجی سمجھتے ہیں۔“

”مگر وہ دیکھتی کب ہے، بس سوئی ہی رہتی ہے۔“

”مگر جب بھی آنکھیں کھولتی ہے تو سرجی کہتے ہیں کہ وہ نگاہیں مجھے ہی تلاش کررہی ہوتی ہیں۔“

”اس نے تو عادتاً دیکھا ہوگا اور تم نے بات دل پر لے لی۔“

”نہیں، سرجی جھوٹ نہیں بولتے۔“

”تو آج مایا سے کھل کر پوچھ ہی لو کہ بی بی، بات آگے بڑھائیں یا یہیں ختم کردیں؟“

”لڑکی ذات ہے، کیسے سہہ پائے گی ان باتوں کو اور یہ ویسے ہی نازک مزاج ہوتی ہیں۔“

”اگر نزاکت کا احساس تھا تو پہلے اپنے اس وجود کو دیکھ کر ہی عشق کے سمندر میں کودتے۔“

”یہ عشق لگانے سے نہیں لگتا۔ دیکھیں جی، میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور مایا میرے عشق میں تباہ ہورہی ہے۔“

”وہ تباہ نہیں ہورہی بلکہ تم کو کوئی تباہ کررہا ہے۔“

اس سے پہلے وہ میری بات پر کچھ غور کرتا کہ اتنے میں سرجی مخل ہوئے اور ان کا روئے سخن شہباز تھا۔ ”جلدی آؤ مایا جاگ گئی ہے۔“

یہ سن کر شہباز شرما کر زرد ہوا اور پھر خوشی میں ایک پورا ڈونٹ نگلا اور منہ صاف کرتا سرجی کے ساتھ عشق کی تال پر ڈولتا ہوا نکل گیا۔

میں نے بعد میں سرجی کو پکڑا اور کہا۔ ”آپ نے جو ڈراما یہاں اسٹیج کیا ہے، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

”کچھ نہیں ہوگا، یہاں کی لڑکیاں محبت کے اظہار پر نہیں بدکتیں۔“ سرجی نے کہا۔ پھر کچھ لمحے سوچ کر بولے۔ ”ایک بات کا ڈر ہے! شہباز جو اس کا برگر، اسی کے بیگ سے نکال کر کھائے جارہا ہے یہ بات کہیں گڑبڑ نہ کردے۔“

ہم ٹرین میں بیٹھے واپس جارہے تھے۔ شہباز ذرا پرے ہوکر بیٹھا تھا۔ کچھ سوچتا اور پھر ٹرین کی چھت کو دیکھ کر مسکرانا شروع کردیتا۔ مسکراتے مسکراتے پہلے زرد پڑتا اور پھر شرمانا شروع کردیتا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا تو سرجی بھی کھسکتے ہوئے وہیں آگئے۔ میں نے پوچھا۔ ”شہباز آج ہمیں کوئی لفٹ ہی نہیں دے رہے۔“

وہ شرما کر پھر مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”یہ اتنی بے شرمی سے شرما کیوں رہے ہو؟“

”یار! معلوم نہیں، یہ لڑکی میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟“

سرجی بولے۔ ”اسے ہیرے کی پہچان ہے۔“

وہ بولا۔ ”کسی کسی کو ہوتی ہے، ہر کوئی پہچان کہاں رکھتا ہے۔“

میں بولا۔ ”وہی تو ہے! ورنہ ہر کوئی اپنا برگر روزانہ کہاں دیتا ہے۔“

”نہیں، وہ تو میں خود شرارت سے کھا جاتا ہوں اور وہ اپنے پیار میں اتنی ڈوبی ہے کہ کچھ کہتی بھی نہیں۔“

میں سوچنے لگا کہ انسان کی مت اس چکر میں کیسے ماری جاتی ہے۔ اچھا بھلا انسان تھا۔ سرجی نے اسے دھکا دیا اور وہ اوندھے منہ خوش فہمی کی دلدل میں جا گرا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ڈرامے کا ممکنہ نتیجہ کیا نکل سکتا ہے؟ یا اس کے ہتھے چڑھ جاتی یا پھر ہتھے ہی سے نکل جاتی۔

ہمارے اپارٹمنٹ پہنچتے پہنچتے برف باری شروع ہوگئی تھی۔ ایک سفید چادر آہستگی سے بچھتی چلی گئی۔ سرجی برف کے عشق میں ڈوبے اور میں نے انہیں پکڑ کر باہر نکال لیا۔ وہ برف کے ڈھیر کی جانب محو پرواز تھے کہ آج پھر سے کوئی سنو مین بنائیں۔ میں نے ان کو بازو سے پکڑا اور اپارٹمنٹ پہنچ کر انہیں اپنے شکنجے سے آزاد کیا۔ وہ کہنے لگے۔ ”خود تو نسرین سے چکر چلا رہے ہو اور مجھے سنو مین بھی نہیں بنانے دیتے۔“

میں نے جواباً کہا۔ ”ایک تو کوئی چکر نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو چکر چلانے اور سموسے بنانے میں مماثلت کیا ہے؟“ ...وہ زیر لب بڑبڑائے جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ فرنچ میں میری جلیبیاں تو پڑی ہیں؟ مفتی اپنی سہ پہر کی شفٹ میں جاب پر گیا تھا۔

میں آج فارغ تھا اور اسی لیے کچن میں چنے کی دال بنا رہا تھا۔ کھانا بنانے کی کتاب کھول کر اس پر حرف بحرف عمل کر رہا تھا۔ سرجی نے ڈور وال کے پردے کھولے تھے اور ذرا نم آنکھوں سے باہر گرتی برف پر نظریں جمائیں۔ شہباز اندر کمرے میں کوئی شوخ نغمے سن رہا تھا جس کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی کہ خان قیصر آدھمکا۔

خان نے پچھلے دنوں ایک پرانی گاڑی لی تھی پانچ سو ڈالر میں۔ کسی سے اس نے ہتھیالی تھی یا کسی نے اسے جڑ دی تھی، یہ ابھی تک معما تھا جو کسی سے بھی حل نہیں ہو رہا تھا۔

خان خوش خوش داخل ہوا پہلے تو شہباز کو کالر سے پکڑ کر باہر لایا۔ سرجی ڈر کر ذرا سے سمٹ گئے تھے۔ پھر اس نے کچن میں آکر دیگچے میں جھانکا اور کچھ سونگھا پھر کہنے لگا۔ ”ایک مزے کی بات سناتا ہوں۔ تمہارے بھائی نے گاڑی کی قیمت وصول کرلی ہے۔“

ہمارے پوچھنے سے پہلے خود ہی بول پڑا۔ ”کل مارشن گروو روڈ پر کسی ٹرک نے اسے ٹکر ماردی۔ پھر میں نے بیچ سڑک میں گاڑی روک لی اور ٹرک والے سے الجھ پڑا۔ میں پولیس بلانے کا کہتا تھا اور وہ میرے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔ آخر کار میں نے اس سے کہا کہ پانچ سو ڈالر دے دو تاکہ میں اپنی گاڑی ٹھیک کرا سکوں۔ اس سے... پانچ سو ڈالر لیے۔ پھر بیس ڈالر میں لاہور ورکشاپ والے سکھ سے ڈنٹ ٹھیک کروایا، دو روسٹ چکن لیے ایک میں نے کھایا اور ایک تمہاری بھابی نے۔“ یہ کہہ کر کھی کھی ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اس خیرات میں ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ آج گاڑی پر ہمیں جیرالڈ اسٹریٹ لے جاؤ۔ راستے میں ڈاؤن بھی آج دیکھ لیں گے اور جیرالڈ اسٹریٹ پر کسی دیسی ریسٹورنٹ سے کھانا بھی کھائیں گے۔“

وہ فوراً تیار ہو گیا۔ ”چلو! آج تم لوگوں کو ڈاؤن ٹاؤن کی روشنیاں بھی دکھلاتے ہیں اور کھانا بھی کھلاؤں گا۔“

میں جب سے آیا تھا، ابھی تک ڈاؤن ٹاؤن کو دور سے بھی نہیں دیکھا تھا اور سی این ٹاور جس کو دیکھنے کی تمنا لے کر ٹورنٹو اترا تھا، اسے کو دیکھنے سے بھی ابھی تک محروم تھا۔ گو ڈاؤن ٹاؤن کے اندر ایک بار جا چکا تھا جب راجر ایمپلائمنٹ کے پاس جاب کے لیے گیا تھا۔ جیرالڈ اسٹریٹ یہاں دیسیوں کا بڑا بازار تھا۔ ہر ایک کے منہ سے یہ نام سنا تھا۔ سب کہتے تھے کہ وطن کی یاد آئے تو جیرالڈ اسٹریٹ چلے جاؤ۔ شلوار قمیص میں ملبوس لوگ ملیں گے۔ دیسی کھانوں کی خوشبوئیں اٹھ رہی ہوتی ہیں۔ پان، سگریٹ کے کھوکھے ہیں۔ ایک طرح کا لکشمی چوک ہے۔ آج ہم چاروں یہ لکشمی چوک دیکھنے جارہے تھے۔

شہباز نے باہر نکل کر جب گرتی برف کے سائے میں خان کی گاڑی کو دیکھا تو ڈر سا گیا۔ ”میں اس میں نہیں جاتا۔ اس برف باری میں اس پر بیٹھنا موت کو دعوت دینا ہے۔“

خان بھڑک اٹھا۔ بازاری قسم کی گالیاں دیں، تب بھی شہباز ٹس سے مس نہ ہوا۔ برف باری اتنی زیادہ نہ تھی مگر خان کی کھٹارا گاڑی دیکھ کر میں بھی ڈاما ڈول ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے رنگ کھرچا ہوا تھا۔ حالت اچھی خاصی خستہ حال تھی مگر سرجی راضی تھے۔ ”اس بف باری میں کار پر گھومنے کا بہت مزہ آئے گا۔ گاڑی کی شکل پر نہیں جانا چاہیے۔“

پھر شہباز سے مخاطب ہوئے۔ ”ہم تمہاری مایا کا رشتہ لیموزین میں لینے جائیں گے۔ پر اب تو اس پر ہی چلو۔“

خان اسٹیئرنگ پر بیٹھ چکا تھا، جب سرجی کی بات سنی تو چونکا۔ ایک دو گالیاں دیں اور پھر سوال پر سوال داغنے لگا۔ ”مایا کون ہے؟ یہ قصہ کیا ہے؟ شہباز کیا اس کا رشتہ تلاش کر رہا ہے؟ مسلمان ہے کیا؟“ شہباز بوکھلا گیا تھا سرجی آرام سے خان کے ساتھ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ سوال ایک نیا باب رقم کرے گا۔ شہباز سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ سامنے شیڈ کے نیچے دو پولیس والے کھڑے تھے۔ یہاں کی پولیس اور ہماری پولیس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شہباز نے یکا یک......!

سفر کہانی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ
ماہ ملاحظہ کریں

وقت کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ سلاطین آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ان کے شاندار محلات ان کی شان و شوکت کے قصیدے پڑھتے رہ جاتے ہیں۔ سلاطین کا فرمان سر آنکھوں پر ہوتا ہے۔ وہ جو بھی کہہ دیں اس کو حق سمجھ لیا جاتا ہے۔ چاہے وہ تیر و کمان اور تلوار کے زمانے کے بادشاہ ہوں یا آج کے حکمران۔ جن کے آگے پیچھے ان کے پروٹوکولز کی گاڑیاں چلتی ہیں۔ ان میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ اپنی مخالفت

بڑے لوگ

شیراز خان

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مال و زر کے حامل بلند مقام کے حامل ہوتے ہیں لیکن یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسے بہت سے نام نظر آجائیں گے جن کے پاس نہ زر و مال تھا اور نہ وہ میدانِ جنگ کے شہسوار، پھر بھی وہ فاتح عالم کہلائے۔

چند معروف ہستیوں کا تذکرہ

برداشت نہیں کر پاتے۔ اپنے خلاف جانے والوں کی گردنیں اڑا دیتے ہیں۔
آپ شروع سے دیکھ لیں۔ تاریخ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتاتی کہ لوگ ان کے خوف سے زبانیں نہیں کھولتے۔ خاموش رہتے ہیں۔
اس کے باوجود اس خاموش معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر حال میں حق بات کا اظہار کر جاتے ہیں۔
ان لوگوں کے پاس کوئی فوج نہیں ہوتی ہے۔ یہ خاک نشین لوگ ہوتے ہیں اس کے باوجود حکمران ان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ باجبروت اور بااختیار شہنشاہ بھی ان سے خوف کھائے رہتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں دنیا کے ساز و سامان اور دنیا کی آسائشات کی پروا نہیں ہوتی۔ میں نے سرگزشت میں ہی ایسے کچھ لوگوں کے بارے میں تحریر کیا لیکن یہ سلسلہ بہت طویل ہے۔ آئیں ایسے کچھ اور بڑے لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں۔
صوفیا و مشائخ سلاطین کے ساتھ ربط و تعلق بڑھانے اور ان کے پاس آنے جانے سے پرہیز کرتے ہیں (اس تناظر میں اور آج کی صورتِ حال دیکھیں اگر صدر صاحب یا وزیراعظم کسی کو طلب کریں تو وہ سر کے بل دوڑا ہوا چلا جائے گا)۔
سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ بھی اس اصول پر عمل کرتے ہوئے شاہانِ وقت کے یہاں جانے سے اجتناب فرماتے تھے۔
آپ کا مختصر حال یہ ہے۔ آپ 29 اکتوبر 1238ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ والدہ نے تربیت دی۔
کمسنی ہی میں قرآن مجید ختم کرنے کے علاوہ لغت، حدیث اور فقہ کی تمام ضروری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ پھر دہلی چلے گئے۔
قیام دہلی کے دوران انہوں نے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی ولایت کا تذکرہ سنا اور ایک دن پاک پتن جا کر بابا صاحب سے بیعت کر لی۔
بابا صاحب نے اپنے اس مرید میں آثار کمال دیکھے تو اپنی روحانی نعمت انہیں منتقل کر دی۔ ساتھ ہی دہلی کے علاقے کی روحانی سلطنت کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔
چنانچہ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں خواجہ صاحب ہمیشہ دہلی میں رہے۔
اردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق بابا صاحب نے اپنا جامہ، مصلّی اور عصا ان کو دیے جانے کی وصیت فرمائی تھی گویا انہیں اپنی خلافت سونپ دی تھی۔
حضرت خواجہ، محبوب الٰہی تھے اس لیے خلق کے بھی محبوب ہو گئے۔ عقیدت مندوں کے اژدھام کے ساتھ ساتھ فتوحات، نذرانہ اور شکرانہ کی بھی کثرت ہوتی تھی۔
آپ کے یہاں ہر روز ہزاروں کی نذر نیاز آتی لیکن آپ اسے فوراً خرچ کر دیتے اور کوئی حاجت مند آپ کے دروازے سے مایوس نہیں جاتا۔
تین چار ہزار افراد آپ کے آستانے پر موجود رہتے تھے۔ آپ کو اپنی زندگی میں جو اقتدار اور دبدبہ حاصل ہوا وہ ہند کے شاید ہی کسی اور اہلِ طریقت بزرگ کو نصیب ہوا ہو۔ بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ آپ کے سامنے سر جھکائے رہتے۔
مشائخ کا اصول یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ سرکار دربار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور دوسری طرف وہ دربار کے غلط رجحانات اور وقت کے فتنوں سے بھی بے فکر اور غافل نہیں رہتے اور جہاں کہیں موقع ملتا امر بالمعروف کا حق ادا کر دیتے۔
حضرت شیخ کے زمانۂ حیات میں دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ بیٹھے۔ ان میں علاؤ الدین خلجی جیسا باجبروت بادشاہ اور قطب الدین مبارک شاہ جیسا ظالم اور فاسق حکمران بھی تھا۔
جلال الدین خلجی نے کئی بار حاضری کی اجازت چاہی لیکن منظور نہیں ہوئی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کو لوگوں نے حضرت خواجہ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ حضرت خواجہ کے آستانے پر ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ بدگمان کرنے والوں نے بادشاہ سے کہا کہ کہیں وہ درویش اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر بغاوت نہ کر بیٹھے۔
علاؤ الدین خلجی نے حضرت خواجہ کو ایک خط روانہ کیا جس میں اس اندیشے کا اظہار کیا گیا تھا۔ حضرت خواجہ نے جواب دیا کہ وہ درویش ہیں، انہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں، اگر بادشاہ کو ان کی طرف سے خطرہ ہے تو وہ یہاں سے جانے کو تیار ہیں۔
سلطان نے معذرت کا خط بھیجا اور پھر حاضری کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ نے انکار کر دیا۔ سلطان نے

اصرار کیا کہ وہ خود آرہا ہے۔ اس پر حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کے آستانے کے دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو وہ دوسرے سے باہر چلے جائیں گے۔

ایسے درویش ہوا کرتے تھے۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ غاصبانہ طور پر تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ انتہائی عیاش اور ظالم حکمران تھا۔

تاریخ فرشتہ کی گواہی یہ ہے کہ مبارک شاہ کی بری حرکتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ وہ اکثر عورتوں کی طرح زیور پہن لیتا اور اس عالم میں مجمع میں آکر لوگوں سے بات چیت کرتا تھا۔

اس کے محل میں بازاری اور گھٹیا عورتیں ہر وقت جمع رہتی تھیں۔ مبارک شاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی دشمنی اور مخالفت میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ کہا کرتا کہ جو بھی نظام الدین کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سونے کے ہزار سکے دوں گا۔

مبارک شاہ نے آپ کے پاس شکایت بھیجی کہ چاند رات کو دہلی کے سب مشائخ مجھے سلام کرنے اور نئے چاند کی دعا دینے آتے ہیں۔ آپ کو بھی ہر حال میں حاضری دینی ہے۔

جب چاند رات آن پہنچی تو آپ اطمینان سے اپنی خانقاہ میں بیٹھے رہے اور لوگ دہلتے رہے کہ اب بادشاہ کے سپاہی آئیں کہ اب آئیں۔ لیکن خواجہ کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔ ابھی آدھی رات نہ گزری تھی کہ یہ خبر آگئی کہ مبارک شاہ اپنے چہیتے غلام خسرو خانہ کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔

اس طرح غیاث الدین تغلق نے ایک موقع پر بنگال سے آتے ہوئے غصے میں یہ حکم بھیجا کہ اس کے دہلی پہنچنے سے پہلے خواجہ صاحب دہلی چھوڑ جائیں۔

اس موقع پر خواجہ صاحب نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ نہ صرف تاریخ میں محفوظ ہے بلکہ ایک قول بن گیا ہے۔

''ہنوز دلی دور است۔''

اور دنیا نے دیکھا کہ خود بادشاہ دہلی نہیں پہنچ سکا۔ تغلق آباد کا محل گرنے سے دنیا چھوڑ گیا۔

تو یہ تھی اللہ والوں کی شان۔ ان کا مطلوب و مقصد نہ مال غنیمت ہوتا تھا نہ کشور کشائی۔

اب ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جس نے ایک ایسے فرقے کا ساتھ دیا جو لوگوں کو دین کی پیروی کا سختی سے حکم دیتا تھا۔

اس فرقے کے حوالے سے بہت سی متضاد باتیں سامنے آئی ہیں۔ تاریخ لکھنے والوں نے اس فرقے اور اس کے پیروکاروں کے کردار اور چہروں کو مسخ کر دیا ہے۔

میں اس مضمون میں اس فرقے کی طرفداری نہیں کر رہا بلکہ میاں محمد افضل کی کتاب سے اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

پندرہویں صدی عیسوی کے سید محمد جون پوری کے بارے میں تاریخ اور تذکروں میں متعدد بے سروپا باتیں لکھی ہیں۔

لیکن ان کے دشمن بھی گواہی دیتے ہیں کہ وہ مقناطیسی شخصیت رکھتے تھے اور لوگوں کو خالص شریعت کے اتباع کی دعوت دیتے تھے۔

سید محمد جونپوری نے تجدید دین کی جو تحریک چلائی وہ ''مہدوی'' تحریک کہلاتی ہے۔ یہ بہت مؤثر تحریک تھی۔ لاکھوں افراد اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

اپنی بے مثال کتاب ''تذکرہ'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ ''مہدیت'' کا ادعا محض ایک الزام تھا جو شیخ جونپوری پر چسپاں کر دیا گیا۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ جن جائز اور دین کی سچی اور بے لاگ باتوں کو سب نے چھوڑ رکھا ہو اور ایک جماعت کرنے لگے تو دوسرے علماء اور مشائخ فوراً یہ الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ وہ صرف لوگوں کو صحیح راستہ پر لا رہا ہے۔

سید محمد جونپوری کی وفات (1504ء) کے بعد بھی ان کی تحریک امر بالمعروف کا اثر باقی رہا اور کئی ممتاز علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

اس تحریک سے منسلک اصحاب اس بنا پر مہدوی کہلائے کہ ان سے بغض و عناد رکھنے والے علماء نے طنزیہ پیرائے میں انہیں مہدوی پکارا۔

یہ واقعہ جو درج کیا جا رہا ہے وہ ان ہی پُرجوش مہدویوں میں سے ایک شیخ علائی کا ہے۔ وہ بنگال کے رہنے والے تھے خدا نے ان کی زبان میں بڑی تاثیر دی تھی۔ انہوں نے حج بھی کیا تھا۔

جہاں کوئی بات شرع کے خلاف دیکھتے فوراً روک دیتے اور امر بالمعروف میں حکام وغیرہ کی ذرا پروا نہیں

کرتے تھے۔
شیخ علائی اور ان کے پیر عبداللہ افغان نیازی پر امر بالمعروف کرنے پر شیر شاہ سوری کے جانشین سلیم شاہ کے دربار میں بڑی سختیاں کی گئیں۔ حتیٰ کہ دونوں شہید ہو گئے۔
مولانا آزاد نے شیخ علائی اور عبداللہ افغان کے واقعات حق گوئی پر تذکرہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔
مولانا لکھتے ہیں کہ اس تحریک کی وجہ سے دینداری اور پرہیز گاری کا جوش اس طرح پھیلا کہ شہروں میں نمازوں کے اوقات میں سناٹا چھا جاتا۔
جب سلیم شاہ آگرہ میں مسند نشین ہوا تو مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطان پوری نے اس جماعت کے قتل واذیت پر کمر باندھ لی۔
عوام سے کہا کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں۔ سلیم شاہ سے کہا کہ جب سید محمد مہدی، مہدی ہوئے تو پھر تمہاری حکومت کہاں باقی رہی۔ لہٰذا شیخ علائی کو آگرہ آنے کا حکم دیا گیا اور دربار میں علماء سے مناظر کروایا گیا۔ شیخ علائی نے اپنا مؤقف ثابت کر دیا۔
مخدوم الملک نے کسی بہانے سے شیخ صاحب کو پھر بلایا۔ اس وقت شیخ صاحب بیمار تھے ان کے گلے میں بہت بڑا زخم تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ سفر اختیار کیا۔ بادشاہ نے تمام معاملات مخدوم الملک کے حوالے کر رکھے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ شیخ علائی کو کوڑے لگائے جائیں۔ تیسرے کوڑے پر ان کی وفات ہوگئی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حکم دیا گیا کہ ان کی لاش کو ہاتھی کے پیروں تلے روند دیا جائے۔
یہی ہوا۔ اس طرح ان کی لاش کے پرزے ہو گئے۔
اس کے بعد یہی سلوک ان کے پیر شیخ عبداللہ نیازی کے ساتھ ہوا۔
ان کا واقعہ یہ ہے کہ ان کو سلیم شاہ کے سامنے لایا گیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ سلیم شاہ کی تعظیم میں جھک جائیں۔ اس مردِ درویش نے یہ کہا کہ یہ سر سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ بس اس بات پر سلیم شاہ نے اپنے آدمیوں کو ان پر تشدد کا حکم دیا۔
وہ کر کر تڑپنے لگے لیکن تشدد جاری رہا اور اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا۔
احمد بن ادریس اور محمد ابن علی۔
شمالی افریقا کے دو حق گو درویش۔ جن پر تحریک احیائے دین کے سلسلے میں مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔
جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی یہی کام کر رہے تھے۔ اس زمانے میں شمالی افریقا میں بھی اسلامی تحریک شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں مراکش کے احمد بن ادریس اور الجزائر کے محمد بن علی السنوسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔
احمد بن ادریس صوفی تھے اور انہوں نے تصوف کو ان فضول بدعات اور رسوم سے پاک کرنے کا بیڑہ اٹھایا جن سے مقامِ طریقت پر زوال آنے لگا تھا۔
انہوں نے جاہلانہ رسوم کو شرک قرار دیا۔ اس پر ان کے خلاف علمانے محاذ قائم کر لیا۔
اسی دوران حجاز سے محمد بن عبدالوہاب کے حامیوں کو نکالا گیا تو آپ پر بھی عتاب نازل ہو گیا۔ ان کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا۔ احمد بن ادریس کے لیے حرم مکہ جیسے محفوظ مقام پر بھی رہنا مشکل ہو گیا لیکن آپ نے اعلان حق کا سلسلہ جاری رکھا۔ بالآخر انہیں مکے سے نکال دیا گیا۔ وہ عرب کے صحرا میں ایک دور دراز مقام ایسر میں جا کر مقیم ہو گئے۔ 1837ء تک وہیں رہے۔ انہیں حرم آنے کی اجازت نہیں تھی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔
محمد بن علی (جو جدید لیبیا کی بنیادیں قائم کرنے والے بنے) احمد بن ادریس کے مرید تھے۔ وہ 1783ء میں الجزائر میں پیدا ہوئے۔
اتحاد بین المسلمین کے داعی کی حیثیت سے ان کا شمار جمال الدین افغان، علامہ اقبال وغیرہ کی صف میں ہو سکتا ہے۔
وہ تحصیلِ علم کے لیے مصر کی یونیورسٹی الازہر گئے لیکن انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں کے علماء حکمرانوں کے حاشیہ بردار بنے ہوئے تھے اور کلمۃ الحق کی کوئی روایت باقی نہیں رہی تھی۔
(یہ وہ علماء تھے جن کے نزدیک اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے اور اب اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جب کہ محمد بن علی کا یہ خیال تھا کہ اجتہاد کی اہمیت ہر دور میں ہوتی ہے کیونکہ وقت کے تقاضے رہتے ہیں)
بہرحال انہیں مصر سے نکال دیا گیا۔ 1840ء عیسوی میں انہیں حجاز سے بھی نکال دیا گیا کیونکہ حکمران ان کی اعلانِ حق کی روش سے نالاں تھے۔
بہرحال وہ لیبیا کے صحرا میں رہائش پذیر ہو گئے۔ نہ

جانے کتنے غیر مسلم قبائل نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ 1859ء میں اسی ویران ریگستان میں وفات پائی۔

منشی ذوالفقار الدین، بدایوں شہر کے منشی ذوالفقار الدین دنیاوی رتبے یا علمی فضیلت کی بنا پر کوئی بڑے آدمی نہیں تھے لیکن انہوں نے حق گوئی کی تاریخ میں جو کارنامہ انجام دیا وہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

منشی صاحب 1857ء سے کچھ عرصہ پہلے ایک انگریز مسٹر کارمیلک کے یہاں بطور منشی ملازم تھے۔ کیونکہ ان کی مالی حالت خراب تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے وقت منشی صاحب نے ملازمت چھوڑ دی اور جنگ آزادی میں کھل کر حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے اور اتفاق سے اسی انگریز کے سامنے پیش ہوئے جس کی ملازمت کر چکے تھے۔ منشی صاحب نے صاف صاف کہا کہ میں نے تمہاری نوکری ضرورتاً کی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے جہاد میں حصہ لیا کیونکہ یہ میرا دینی فریضہ تھا۔

انگریز نے اشارہ دیا کہ وہ اگر ذرا سا بھی انکار کر دیں تو وہ ان کو چھوڑ دے گا لیکن آپ نے جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔

اس مضمون کی تیاری میں جہاں اسلامی انسائیکلو پیڈیا، گوگل وغیرہ سے مدد لی گئی ہے۔ وہاں سب سے زیادہ اس کتاب کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو شاید اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

اس کتاب کا نام ہے ''اعلائے حکمۃ الحق کی روایت اسلام میں'' اور یہ تصنیف ہے میاں محمد افضل کی۔

میاں محمد افضل کی یہ تصنیف بانگِ درا کی حیثیت رکھتی ہے ان کا یہ بیش قیمت تحفہ صرف عالمِ اسلام ہی کے لیے وقف نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے۔ (اشفاق احمد)

میاں محمد افضل کی یہ تالیف قلب ان خوش نصیب تالیفات میں سے ہے جن کے پیدا ہونے کا مدتوں انتظار رہتا ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بڑی ہو جاتی ہیں (سید قاسم محمود)

اب پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی ان مردانِ حق گو کی طرف جنہوں نے اپنے عہد سے سچائی کے چراغ روشن کر دیے۔

مولانا کفایت اللہ کافی علاقہ مراد آباد کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمہ جہت شخصیت تھی ان کی۔

چند الفاظ ایسے ہیں جو غلط العام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً برائے مہربانی کی بجائے براہ مہربانی، گرائمر کے بجائے گرامر، طلباء کے بجائے طلبا لکھنا زیادہ بہتر ہے۔ طلبا طلب کی جمع ہے۔ بہ معنی طالب علم اور طلبہ طالب کی جمع ہے بہ معنی طالب علم۔ اس طرح لفظ اعراب سے زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ اسی طرح استاد کی جمع استادان اور استاد کی جمع اساتذہ ہے مگر چونکہ استاد کو مورد بنا کر جمع اساتذہ لکھی جا سکتی ہے۔ اخبارات میں ارباب محکمہ تعلیم کی طرف سے یہ اشتہار بڑے کروفر سے شائع ہوتا ہے۔ مثلاً ''آسامیاں خالی ہیں'' جب کہ آسامی کے بجائے اسامی لکھا جانا چاہیے اس لیے کہ اسامی بہ معنی عہدہ اور نوکری استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ''آسامی'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ دوئم، سوئم کے بجائے دوم سوم، بائی سائیکل کے بجائے (بائیسکل دو پہیوں کی گاڑی) اور ٹرائی سکل تین پہیوں کی گاڑی لکھا جائے۔ کیلشیم کے بجائے کیلسیم، امونیاں کے بجائے ایمونیا۔ اسی طرح وہ لفظ جو انگریزی حرف ''S'' سے شروع ہوتے ہیں، ان سے پہلے (ا) کا اضافہ ہونا زیادہ بہتر ہے مثلاً سٹیشن کے بجائے اسٹیشن، سکول کے بجائے اسکول، سٹائل کے بجائے اسٹائل وغیرہ، ایسے ہی بالوں کی لٹ کے بجائے بالوں کی لٹ استعمال کرنا چاہیے۔ استعفیٰ کے بجائے استعفا، جناب عالیٰ کے بجائے جناب عالی، استوانہ کے بجائے اسطوانہ، پیچ کس کے بجائے پیچ کس، دال چینی کے بجائے دار چینی، ابتداء ارتقاء کے بجائے ابتدا ارتقا لکھنا چاہیے اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جن کی فہرست گنوانا مناسب نہیں۔ اہل علم اور ارباب شعور کو املاء کی درستی کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیے تاکہ ادب برائے اصلاح کا پہلو مدِنظر رہے۔ الفاظ جانچ پڑتال کے بعد ضابطۂ تحریر میں لائے جائیں۔

مرسلہ: زاہد سہیل۔ نوشہرہ

عامل تھے۔ طبیب تھے۔ محدث تھے اور ساتھ ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ حضور پاکؐ کے ساتھ محبت، عشق کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔

آپ کی شاعری اور نعتوں کا دیوان ''دیوانِ کافی'' کہلاتا ہے۔ احادیث مقدس کے موضوعات پر کئی تصانیف آپ سے منسوب ہیں۔ سفرِ حج اور زیارات پر ایک منظوم سفرنامہ بھی لکھا تھا۔ جب 1857ء کی تحریک شروع ہوئی تو آپ مجاہدین کی اگلی صف میں تھے۔ مولانا نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ایک فتویٰ بھی مرتب کیا تھا۔ آپ نے اس فتوے کی حقیقت ملک بھر میں پھیلانے کے ساتھ ساتھ کئی شہروں اور قصبوں کے دورے بھی کیے۔

مولانا نے تحریکِ جہاد میں تن من کی بازی لگا دی تھی اور انگریزوں کی مخالفت اور جہاد کی تائید میں کسی مصلحت کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ اپریل 1853ء میں انگریزوں نے مراد آباد پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ مولانا کفایت اللہ کافی بھی گرفتار ہو گئے۔ مولانا پر سنگین قسم کی فردِ جرم عائد کردی گئی اور پھانسی کا حکم دے دیا گیا۔ مولانا نے یہ حکم سنتے ہی انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت انہیں پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جارہا تھا اس وقت وہ انتہائی کیف کے عالم میں تھے اپنی ایک نعت پڑھتے جارہے تھے۔

کوئی گلِ باقی رہے گا نہ چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ احسن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحب لو لاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا

مولانا کافی کو مراد آباد جیل کے قریب مجمع عام کے سامنے میدان میں سولی پر لٹکا دیا گیا اور وہیں دفن کردیا گیا۔ خدا مغفرت کرے۔

یہ صرف اتنے ہی لوگ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے پوری قطار چلی آرہی ہے۔ بے شمار لوگ ہیں اور سب کے سب ایک سے ایک جید، ایک سے بڑھ کر ایک سرفروش۔

دنیا کا کوئی گوشہ ایسے حق پرستوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ آپ ایران کی طرف آئیں تو ایران بھی ایسے اللہ والے حق پرستوں سے بھرا رہا ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

سنت حسینؓ زندہ کرنے والے ایرانی آیت اللہ شیخ فضل اللہ نوری، مرزا احمد حسن شیرازی و دیگر علمائے حق۔

یہ وہ باعظمت صاحب حق ہیں جنہوں نے بوریا پر بیٹھ کر اپنے عہد کے باجبروت مطلق العنان قاچار اور پہلوی شہنشاہوں کو ان کی اسلام دشمن حرکتوں پر ٹوکا۔ ایک پیغمبرانہ شان سے نہی عن المنکر کا حق ادا کیا۔

انہیں اصحاب حق کی کہکشاں میں ایک کا بڑا نام آیت اللہ شیخ فضل اللہ نوری کا ہے۔ آپ نے قاچاری ملوکیت کے دور میں احیائے اعلانِ حق کیا لیکن تذکروں میں ان کی زندگی کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔

ایڈورڈ موریٹر نے اپنی کتاب Faith and Powar میں انہیں قابلِ احترام اور عالم و فاضل مجتہد لکھا ہے۔

اس زمانے میں وہاں کے پارلیمنٹ میں شریعت کے خلاف کوئی قرارداد منظور ہوئی جس میں مغربی طرزِ جمہوریت کو ترجیح دی گئی تھی۔

شیخ صاحب نے مغربی طرزِ جمہوریت کے خلاف آواز بلند کردی۔ ان کا کہنا تھا۔ ''شریعت اسلام بیسویں صدی میں بھی اتنا ہی قابلِ عمل ہے جتنا کہ یہ ساتویں صدی میں تھا اور اس میں رخنہ اندازی نہیں کی جاسکتی۔''

شیخ صاحب کی اس مہم کے نتیجے میں جمہوریت کا مطالبہ کرنے والے جدت پسند دانشوروں کی کوششوں کو دھچکا پہنچا لیکن دوسری طرف جدت کی آڑ میں ایران میں غیر اسلامی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے کی جانے والی سازشوں کو کچھ وقت کے لیے ناکام بنادیا گیا۔

شیخ نوری کے اس موقف کی حمایت بعض ایسے ایرانی علماء نے بھی کی جو اس سے پہلے غیر جانبدار ہوکر ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔

لیکن اس اثناء میں جدت پسند اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر نے کافی زور پکڑ لیا تھا۔ تنگ آکر شاہ قاچار نے مجلس برطرف کردی۔

اس پر بہائی تحریک کے لوگوں اور دیگر نام نہاد جمہوریت پسند عناصر نے ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کردی۔ قیاس یہ ہے کہ اس بغاوت کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ تھا۔

امن عامہ کی صورتِ حال قابو سے باہر ہوگئی تو شاہ کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔ شیخ نوری کو ان کے مؤقف کی بنا پر گرفتار کرلیا گیا۔

جولائی 1909ء میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ شیخ صاحب کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے مغربی جمہوریت کے مادر پدر آزاد تصور کو عین اسلام قرار دینے کے

فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا۔

ایران ہی کے ایک اور بہت بڑے آدمی کا نام مرزا محمد حسن شیرازی تھا۔

وہ ایران کی جدید روحانی تحریک کے بانی بھی تھے۔ اس تحریک کے معرضِ وجود میں آنے سے نہ صرف روس، امریکا اور برطانیہ خوفزدہ ہو گئے بلکہ اس وقت کے ایران پر مسلط قاچار حکمران نے اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس کرلیا تھا۔ ان طاقتوں کا خیال تھا کہ مرزا محمد حسن شیرازی کی تحریک ایک بار پھر دورِ خلافت کی یاد تازہ کرے گی۔

مرزا محمد حسن شیرازی نے ایران کے بلند پایہ اسلامی مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مجتہد کے درجے پر فائز ہو جانے کے بعد وہ سامرا میں مقیم ہوئے اور وہاں ایک مشترکہ دارالعلوم قائم کیا۔ جس میں سنی اور شیعہ طلبا ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔

تحریک ترک تمباکو کے سلسلے میں مرزا شیرازی کی حق گوئی اور بہادری کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے بہ یک وقت برطانوی استعمار اور ایک مطلق العنان بادشاہ سے ٹکر لی تھی۔ ایک معاہدے کے تحت برطانوی سامراج نے ایران میں تمباکو کی کاشت اور پیداوار پر مکمل اجارہ داری حاصل کرلی تھی۔ برطانوی تجارتی کمپنی ”ماژر ٹالبرٹ“ ایران میں وہی کردار ادا کرنے چلی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں ادا کیا تھا۔

انگریزوں کے اس خطرے کو سب سے پہلے سید جمال الدین افغانی نے محسوس کیا۔ انہوں نے یورپ اور ترکی سے خط کے ذریعہ ایرانی علماء کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ چنانچہ تہران میں مشہور عالم مرزا حسن کی قیادت میں عوام نے برطانوی کمپنی اور بادشاہ ناصر الدین شاہ قاچار کے خلاف مظاہرہ کیا۔ مرزا حسن کو تہران بدر کر دیا گیا۔ اس پر مظاہروں میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ عوام نے سرکاری عمارت پر حملے کیے۔ ولی عہد کے محل پر دھاوا بول دیا۔ محل سے عوام پر گولیاں برسا دی گئیں۔

تمباکو پر برطانوی اجارہ داری تو بہانہ تھی۔ لوگ اس موقع کے مدت سے منتظر تھے اور ایران میں استعمار کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس وقت پورے ایران میں سب سے بڑے آیت اللہ اور مجتہد مرزا محمد حسن تھے جو عراق کے شہر سامرا میں درس و تدریس میں مشغول تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے مناسب سمجھا کہ مرزا حسن کو تحریک کی قیادت سنبھالنے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک انتہائی دلسوز خط تحریر کیا۔

مرزا صاحب نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے انتہائی دلیری اور حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ پورے ایران میں تمباکو نوشی پر پابندی لگا دی جائے۔ اس مطالبے کا مقصد ہی یہی تھا کہ جب ایران میں تمباکو نوشی ختم ہو جائے گی تو برطانوی کمپنی کے رہنے کا جواز ہی ختم ہو جائے گا لیکن بادشاہ نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ برطانویوں نے بادشاہ کو یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ فتویٰ وغیرہ بے کار کی باتیں ہیں۔ عوام تمباکو کے بغیر رہ نہیں سکتے لیکن جو کچھ ہوا وہ بادشاہ کی توقعات کے برعکس تھا۔ عوام نے نہ صرف تمباکو کا بائیکاٹ کیا بلکہ خونریز ہنگامے شروع ہو گئے۔ سینکڑوں من تمباکو میں آگ لگا دی گئی۔ تمباکو نوشوں نے اپنے حقے توڑ ڈالے۔ پورے ملک میں بادشاہ کا اقتدار ہل گیا۔ مرزا صاحب نے انتباہ کیا کہ اگر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر برطانویوں سے مراعات واپس نہ لی گئیں تو جہاد کا اعلان کر دیا جائے گا۔

ہزاروں عورتوں نے کاروانِ جہاد میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ عوام کو مارنے کے لیے توپیں نصب کر دی گئیں لیکن مرزا صاحب کے فتوے کی اثر انگیزی ایسی نہیں تھی جو

ایک گل فروش نے سامنے سے گزرنے والے نوجوان سے کہا۔ ”اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کا ہار لے جایئے جناب!“

”میری کوئی محبوبہ نہیں ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”پھر اپنی بیگم ہی کے لیے پھولوں کا ہار لے جایئے نا۔“

”افسوس! میں شادی شدہ نہیں ہوں۔“ نوجوان بولا۔

یہ سن کر گل فروش نے کہا۔ ”دنیا کے اے خوش قسمت انسان! یہ میری طرف سے تحفے کے طور پر مفت لے جا۔“

مرسلہ: عنایت علی سرگونہ۔ پشاور

توپوں کے سامنے سرینڈر کر جاتی۔ آخر مجبور ہو کر حکومت نے برطانویوں سے معاہدہ منسوخ کر دیا اور ساری مراعات واپس لے لیں۔ اس طرح ایک عالم ایک مجتہد نے اپنے وقت کے سلطان سے ٹکر لے کر ان کی راہ روک دی۔ ورنہ ایران میں دوسری ایسٹ انڈیا کمپنی بننے جا رہی تھی۔

مرزا شیرازی انتہائی نڈر عالم دین تھے۔ وہ شیعہ اور سُنی دونوں میں مقبول تھے۔ ان کے درس میں ہزاروں کی تعداد میں دونوں فرقوں کے لوگ شامل ہوا کرتے۔

آیت اللہ کاشانی ایران کے دورِ جدید میں اسلامی تحریک کے ہراول دستے ہیں۔

آیت اللہ کاشانی 1303 ہجری میں پیدا ہوئے۔ رواج کے مطابق اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نجف اشرف چلے گئے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران انہوں نے مغربی سامراج کے خلاف جنگ میں عملی حصہ بھی لیا۔ 1327 ہجری میں جب تہران یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے رضا شاہ پر حملہ کیا تو آیت اللہ کاشانی کو تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینے پر گرفتار کر لیا گیا یہ ان کی دوسری قید تھی۔

جیل میں ان پر کافی سختیاں کی گئیں۔ عرصہ بعد رہائی ملی تو ملک سے باہر چلے گئے لیکن دوبارہ واپس آ گئے اور مغربی سامراجیت کے خلاف جہاد میں حصہ لینے لگے۔

مشہور قوم پرست ایرانی رہنما اور تیل کی صنعت کو قومیانے کا اعلان کرنے والے وزیراعظم ڈاکٹر مصدق اور آیت اللہ کاشانی کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ اس کی وجہ سامراج دشمنی۔

شاہ ایران نے اس روحانی تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن مکمل کامیابی نہیں مل سکی۔ سینکڑوں علماء گرفتار کر کے جیل بھیج دیے گئے۔

1951ء میں انہوں نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ برطانیہ کی اینگلو ایرانین تیل کمپنی کو قومیا لیا جائے۔ کاشانی کے اس مؤقف کے برعکس دیگر علما نے قومی زندگی کے اس نازک مرحلے پر خاموشی اختیار کر لی۔

آیت اللہ کاشانی کے اس جرأت مندانہ موقف کی حمایت ”فدائن اسلام“ نامی ایک مذہبی اور سیاسی جماعت نے کی۔ اس گروہ کے روابط مصر کے اخوان المسلمین سے تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ ایرانی علماء اور حریت پسندوں کی ایک جماعت کے تعلقات ایران سے باہر عالمِ اسلام کے اتحاد کے لیے قائم ہوئے۔

بقول ایڈورڈ مور مجر یہ دراصل متوسط طبقے کے نوجوان علماء پر مشتمل ایک انقلابی جماعت تھی جو نہ صرف برطانوی استعمار کے خلاف تھی بلکہ بوڑھے روایت پسند علماء سے بھی اختلاف کر رہی تھی۔

اس جماعت نے 1949ء میں رضا شاہ دوم کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان ہی ایام میں بادشاہ ایران نے آیت اللہ کاشانی کو قتل کرنے کے احکامات جاری کر دیے لیکن بے پناہ دباؤ پر اسے اپنا یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔

آگے چل کر آیت اللہ کاشانی کے ڈاکٹر مصدق سے اختلافات ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصدق نے ایرانی پارلیمنٹ سے اپنے لیے بہت زیادہ اختیارات مانگ لیے تھے۔ کاشانی جیسے حق پرست انسان کو یہ بات کہاں گوارا ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک یہ اسلام کے خلاف تھا کہ ایک آدمی سارے اختیارات لے کر بیٹھ جائے۔ انہوں نے انتہائی بے خوفی اور جرأت کے ساتھ ڈاکٹر مصدق کی مخالفت کی۔ حالانکہ مصدق اس وقت وزیراعظم تھا۔

لیکن درویش صفت اور بے نیاز قسم کے لوگ ایسی باتوں کی کب پروا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی ایران کے سب سے بڑے عالم، جنہیں ان کی استعمار دشمنی پر قتل کر دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت اللہ خمینی ایران کے اسلامی انقلاب (فروری 1979ء) کے قائد تھے لیکن اس انقلاب کے معمار ڈاکٹر شریعتی تھے۔

ڈاکٹر صاحب بیسویں صدی میں ایران کے سب سے بڑے اسلامی مفکر تھے۔ افسوس کہ جس اسلامی انقلاب کی بنیادیں انہوں نے اٹھائیں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچتے دیکھنا انہیں نصیب نہ ہوا۔

دفتروں میں بازاروں میں یونیورسٹیز میں ہر جگہ انقلاب کے آغاز کے وقت ڈاکٹر صاحب کا نام لیا جاتا تھا۔ کتابوں کی دکانوں میں ان کی تحریر کردہ کتب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ ”اسلام شناسی، مسیحائی محمد، امت و امامت، انسان و تاریخ، روشن بریں قرآن، تاریخ تشیع علوی وغیرہ۔

وہ علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح تھے اور علامہ کے افکار کو ایران میں شائع کرنے میں پیش پیش رہے۔ خاص طور پر وہ مغرب پر علامہ کی تنقید سے بہت متاثر تھے اور

اقبال کو روحِ عصر کہا کرتے تھے۔
وہ کہتے تھے۔ ''ہم خود رو جڑی بوٹیوں کی طرح ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ سے اجنبی ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے ہر مسئلے کا حل حکیموں کی طرح ڈھونڈتے ہیں۔ ہم قبرستانوں کے مجاور بن گئے۔ ہم شہیدوں کی معصومیت کے دروازے کے فقیر ہیں۔''

ایران کا یہ سپوت۔ 1933ء میں خراسان میں پیدا ہوا۔ دہشتِ کاویر کے کنارے ایک گاڑی میں اس مناسبت سے انہوں نے اپنی خود نوشت کا نام بھی ''کاویر'' رکھا۔
ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے حالات دل چسپ اور بہت ہی ولولہ خیز ہیں۔ اس لیے ان کے حوالے سے ذرا تفصیل سے لکھا جا رہا ہے۔
ان کے والد استاد تقی شریعتی ایک ممتاز مجتہد تھے۔ انہوں نے شہر میں ایک تبلیغی مرکز بھی کھول رکھا تھا۔
علی شریعتی کے اندر تخلیقی جذبہ شروع سے موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنانے کی بجائے ماحول کو اپنے مطابق بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں ہر مرحلے پر ان کے والد نے ان کی مدد اور رہنمائی کی۔
ہمارے مشہور ادیب مختار مسعود (آوازِ دوست والے) نے ان کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔
ایک طرف وہ انتہائی روایت پسندوں سے لڑ رہے تھے جو اسلام کو معاشرے سے الگ کر کے مسجد و مدرسوں میں بند ہو گئے تھے اور دوسری طرف ''جدید جہالت'' کے علمبردار مغرب زدہ اور بے احساس نام نہاد دانش وروں سے معرکہ آرا تھے۔
علی شریعتی ایک بہت بڑے مجتہد اور اسکالر تھے لیکن ان کی وضع قطع وہ نہیں تھی جو علما کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی یعنی لانبا چغہ وغیرہ، وہ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔
1958ء میں علی شریعتی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا گیا تو وہ پیرس یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ اگلے پانچ برسوں تک مذہب اور سوشیالوجی کا مطالعہ کرتے رہے۔
پیرس سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی۔
فرانس میں زمانہ طالب علمی کے دوران شریعتی نے پہلوی آمریت کے خلاف ایرانی طلبہ کی تحریک مزاحمت میں بھرپور حصہ لیا۔
ایرانی قوم پرستوں کے ایک گروپ کے ساتھ مل کر ''ایران آزاد'' کے نام سے ایک جریدہ شروع کیا جو یورپ میں فارسی زبان کے مقبول ترین پرچوں میں سے ایک تھا۔

ڈاکٹر علی شریعتی 1964ء میں جب فرانس سے وطن لوٹے تو خفیہ پولیس ان کی منتظر تھی۔ انہیں ایران کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔ گھر کی بجائے انہیں سیدھا قید خانے کی کال کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

چھ ماہ تک انہیں قید میں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اس کے بعد اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ ایرانی یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھائیں گے۔

حالانکہ وہ ڈبل پی ایچ ڈی تھے۔ شریعتی نے ایک مردِ مومن کے صبر و حوصلے کے ساتھ اپنے آبائی قصبے کے قریب ایک دیہاتی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔

مختار مسعود نے اس موقع پر لکھا ہے کہ ''دورِ شہنشاہی میں قدر شناس اور مرتبہ دانی کا یہ عالم تھا کہ جب پیرس سے شریعتی ایک ڈاکٹریٹ سوشیالوجی میں اور ایک تاریخِ اسلام میں حاصل کرنے کے بعد ایران پہنچے تو انہیں فردوس نامی ایک قصبہ کے ہائی اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے تعینات کر دیا گیا۔ جب ہر طرف شور مچ گیا۔ محکمے نے تنگ آکر مشہد یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا۔ یہاں انہوں نے ایک نظریہ ساز دانش ور کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔''

جس توحید کا ذکر علی شریعتی کرتے تھے یہ وہی تھا جس کی طرف امام غزالی اور مجدد الف ثانی جیسے مجددین نے بگڑے ہوئے اسلامی معاشروں کو دعوت دی تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ ایران کی پیاسی سرزمین مدت سے خالص توحید کے اس پیغام کے لیے ترس رہی تھی۔ مختار مسعود آگے چل کر لکھتے ہیں۔

تہران کے حسینیہ ارشاد میں ان کے لیکچرز کے گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ ان کی کتابیں ان کے ہم خیال انقلابیوں کے لیے قیمتی سرمایۂ افتخار تھیں۔ لوگ قید اور گرفتاری کا خطرہ مول لے کر ان کتابوں کو خفیہ ذرائع سے حاصل کر کے پڑھا کرتے۔

Kenneth crag نے اپنی کتاب Penand Faith میں بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے۔

علی شریعتی کے لیکچروں کا موضوع عام طور پر شہادت امام حسینؓ ہوا کرتا۔ اس وقوع کی رعایت سے وہ ایرانی نوجوانوں کو حق کے لیے جہاد اور جدوجہد پر تیار کرتے تھے۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں لوگوں نے انہیں تقریر کے لیے نہ بلایا ہو۔ تین برسوں میں انہوں نے دو سو کے قریب تقریریں کیں۔

بہت ذہین انسان تھے۔ سب کچھ فلسفۂ تاریخ، انسان شناسی، جامعہ شناسی، دینی اور شیعی حوالوں سے کہتے رہے۔

1958ء میں انہیں گرفتار کر کے ساواک کی انتہائی بدنام زمانہ جیل میں رکھ دیا گیا (ساواک ایران کی اس خفیہ ایجنسی کا نام تھا جسے شاہ نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے بنایا تھا) وہ آٹھ ماہ تک جیل میں رہے۔ اس دوران ان پر بے پناہ تشدد ہوتا رہا۔

ایسے لوگ قید و بند سے کہاں گھبرایا کرتے ہیں۔ رہا ہوئے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

1973ء میں حسینیہ ارشاد کو بند کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ساتھ ہی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہو گئے۔

شریعتی اس وقت شدید بیمار تھے۔ لوگوں نے مشورہ دیا اور وہ زیرِ زمین چلے گئے۔ حکام نے ان کے بیمار اور بوڑھے والد کو گرفتار کر لیا۔

شریعتی جیسے انسان کو یہ کہاں گوارا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً اپنی گرفتاری دے دی۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ ساواک تو ان کے خون کی پیاسی ہے۔

شریعتی مارچ 1973ء تک قیدِ تنہائی میں رکھے گئے۔ اس دوران ان پر تشدد کے سارے حربے آزمائے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر وہ آئندہ کے لیے اسلام کو بطور انقلابی آئیڈیالوجی پیش کرنے سے باز آجائیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔

شریعتی نے اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کا نتیجہ یقیناً ان کی موت کی صورت میں نکلنا تھا لیکن پورے ملک میں ان کے حق میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ لہٰذا دباؤ میں آکر 1975ء میں انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔

ان پر لکھنے اور بولنے کی پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے خفیہ طور پر مئی 1977ء میں برطانیہ چلے آئے۔

لندن کے قریب ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی لیکن 19 جون 1977ء ہی کو وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ یہ لازمی طور پر ساواک ہی کا کام تھا۔

امام غزالی کے بعد ایران نے علی شریعتی سے بڑا اسلامی مفکر شاید ہی کوئی اور پیدا کیا ہو۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف چوالیس برس تھی لیکن ان کے وہ چوالیس سال چوالیس صدیوں کے برابر تھے۔

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

ترپ کا پتا

ابن کبیر

ٹرم تاش کے پتوں کا وہ کھیل ہے جو مقابل کو حیران کردیتا ہے جسے ہم اردو میں ترپ کا پتا کہتے ہیں۔ امریکا کے نو منتخب صدر کے افکار و خیالات بھی حد سے زیادہ چونکا دینے والے ہیں۔ امریکا کی تاریخ میں شاید ہی ایسا کوئی صدر گزرا ہو جس کے منتخب ہونے پر عوامی مظاہرے شروع ہوئے ہوں۔ جس شخص کے غصے اور بدزبانی کو عالمگیر شہرت حاصل ہو جس نے کھل کر دھمکیوں کی تاریخ رقم کی ہو پھر بھی امریکی عوام اسے پسند کرے، ایسے متنازعہ شخص کی روداد بھی کم دلچسپ نہیں۔

امریکا کے نو منتخب صدر کی زندگی کے کئی گوشے

”یہ زبردست رات ہے۔ امریکا کے لیے ایک عظیم رات۔ پوری دنیا کے لیے ایک عظیم رات!“

یہ کرٹس ایلس کے الفاظ تھے۔ وہ فرطِ جذبات سے لرز رہا تھا۔ کرٹس ہمارا پالیسی مشیر تھا اور میرے لیے اس کا جوش قابلِ فہم تھا۔ الیکشن سے عین پہلے جب نیویارک ٹائمز جیسے معتبر جریدے نے میری جیت کی پیشگوئی کی، تو کسی نے اسے توجہ نہیں دی۔ پروفیسر ایلن لچ مین جیسے ایکسپرٹ کی رائے کو بھی، جو 1984 سے امریکی صدر کی درست پیشگوئی کرتے آرہے

ہیں۔۔۔۔۔ در خورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ری پبلکن امیدوار سے دنیا کو کسی اَن ہونی کی اُمید نہیں تھی۔

اِسی لیے کرٹس کے جذبات پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں۔ وہ خوش ہونے کا حق رکھتا ہے۔ مگر اِس بات سے میں قطعی متفق نہیں کہ یہ پوری دنیا کے لیے ایک عظیم رات ہے۔۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا صدمے میں ہے۔ ان کے دل ڈیموکریٹک پارٹی کی امیدوار کے ساتھ تھے۔ وہ مقبولیت کی دوڑ میں بھی مجھ سے آگے تھی اور پھر میرے مقابلے میں وہ عالمی دنیا کے لیے موزوں بھی تھی۔ اس کے شوہر نے آٹھ برس ”دنیا کے طاقتور ترین آدمی“ کے خطاب کو سنبھالے رکھا، اس عرصے میں وہ ایک پسندیدہ خاتون اوّل رہی، اوباما کے دور میں اس نے لبطور وزیرِ خارجہ پوری دنیا میں اپنی اہمیت اور ذہانت منوائی۔ اسامہ کے خلاف پاکستان میں ہونے والے آپریشن کی جو اعلیٰ ترین شخصیات نگرانی کر رہے تھے، وہ اس میں شامل تھی۔ اس کی قابلیت اور مقبولیت نے یہ اُمید پیدا کردی کہ ڈیموکریٹک پارٹی لگاتار تیسری بار صدارتی معرکہ اپنے نام کرنے میں کامیاب رہے۔۔۔۔۔ حالات اس کے ساتھ تھے۔

مگر 8 نومبر کی رات جس نو منتخب نائب صدر نے مائیک پر آکر نئے امریکی صدر کو خطاب کی دعوت دی، وہ ڈیموکریٹک نہیں تھا جناب۔۔۔۔۔ قطعی نہیں۔ وہ تو ری پبلکن تھا۔ مائیک پنس نے کہا تھا۔ ”یہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ امریکی عوام نے فیصلہ دے دیا، انھوں نے اپنا نیا فاتح منتخب کرلیا، امریکا کو نیا صدر مل گیا!“

دوستو، مائیک پنس اس رات ہیلری کلنٹن کی نہیں، میری بات کر رہا تھا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی۔۔۔۔۔ جواب دنیا کا طاقتور ترین شخص ہے، دنیا کا نیا حکمران۔

جب میں اسٹیج پر آیا، تو منظر دھندلا سا گیا۔ ہاں، میری آنکھوں میں نمی تھی۔ مسرت کا ایک سمندر تھا، مگر میں نے خود کو جلد سنبھال لیا۔ میرے عین پیچھے میرا چھوٹا بیٹا چل رہا تھا۔ پھر میری بیوی میلانیا تھی۔ وہ اب امریکا کی فرسٹ لیڈی بن چکی تھی۔ میری دو سابق بیویوں کو آج اپنے فیصلے پر ضرور افسوس ہوگا۔ میلانیا کے عین پیچھے آئیونکا تھی۔۔۔۔۔ میری پیاری بیٹی۔ میرا بازو، میری انتخابی مہم کا سب سے اہم کردار۔ کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ اب آئیونکا امریکا کی طاقتور ترین خاتون ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں وہ درست ہیں۔ ایک باصلاحیت، کامیاب ورکنگ وومین ہے، جس نے خواتین سے متعلق میرے نازیبا جملوں اور مجھ پر لگنے والے جنسی زیادتی کے الزامات کے باوجود امریکا کی کروڑوں خواتین کو قائل کرلیا کہ اس کا باپ ہی صدارت کے لیے بہترین امیدوار ہے۔

کچھ دیر قبل ہیلری کلنٹن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ بے شک وہ صدمے میں تھی، مگر اسے خود کو سنبھالنا آتا ہے۔ مجھے اعتراف کرنے دیجیے کہ میں نے اس کے بارے میں جو گرخت الفاظ کہے تھے، ان میں سے بیشتر الیکشن مہم کا حصہ تھے۔ میں اس کی صلاحیتوں کا معترف ہوں، اس لیے میں نے اپنی وکٹری اسپیچ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے ایک کامیاب مہم چلانے پر مبارک باد دی، مگر یہ بھی واضح کردوں کہ میں اس کے اور اوباما کی پالیسی کے سخت خلاف ہوں۔ انھوں نے جمود بڑھایا، وسائل ضائع کیے اور امریکا کو کمزور کیا، مگر اب وقت بدل چکا ہے۔ میں امریکا کو پھر سے عظیم تر بناؤں گا۔ امریکا پھر دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگی۔۔۔۔۔ میرے ان ہی ارادوں کی وجہ سے عالمی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔

ہیلری کے برعکس عالمی دنیا کے لیے میں ایک مشکل شخص ہوں۔ ایک کامیاب اور زیرک بزنس مین، ایک منہ پھٹ آدمی، جسے اس کے مخالفین نے غیر محتاط کے ساتھ غیر متوازن بھی ٹھہرایا۔ جی ہاں، میں نے جاپان اور جنوبی کوریا کو ایٹمی ہتھیار بنانے کا پُرخطر مشورہ دیا تھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ چین اور شمالی کوریا کے خلاف ہمیشہ ہم پر انحصار کریں، ہم پہلے ہی ان کی خاصی مدد کرچکے ہیں جناب! اور اگر میکسیکو اور امریکا کی سرحد پر دیوار تعمیر کرنے کا اعلان کیا تھا، تو اس میں غلط کیا ہے؟ کیا وہ بدمعاش، منشیات فروش اور جنسی بھیڑیے نہیں۔ ہاں میں نے کہا تھا کہ امریکا کے بین الاقوامی تجارتی معاہدوں پر از سرِ نو مذاکرات کیے جائیں گے۔ امریکی عوام کو یقین دلایا تھا کہ ان کا ہتھیار رکھنے کا حق محفوظ رہے گا۔ میں نے مسلمانوں کی امیگریشن پر پابندی لگانے اور تارکینِ وطن کو ملک بدر کرنے کی بات بھی کی تھی اور میں ان باتوں پر قائم ہوں۔ بھلا اس میں غلط کیا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میری فتح کا اعلان ہونے کے بعد فسادات پھوٹ پڑے۔ کینیڈا کا ویزا دینے والی ویب سائٹ کریش کرگئی۔ انھیں لاکھوں امریکیوں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ کچھ روز بعد نیوزی لینڈ کی امیگریشن ویب سائٹ کا بھی بھٹا بیٹھ گیا تھا۔ پیشگوئیاں کی جانے لگیں، مواخذے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے ان مظاہروں سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے ان سے تکلیف پہنچی، مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کس بات نے ڈیموکریٹک پارٹی کے حامیوں کو اتنا آگ بگولا کر دیا کہ امریکی تاریخ میں پہلی بار انھوں نے الیکشن کے نتائج ماننے سے انکار کر دیا۔

ڈیموکریٹس ایک سیاہ فام امریکی صدر کے بعد اس امریکا کو پہلی خاتون صدر کا تحفہ دینا چاہتے تھے۔ آہ، یہ کیسا خوبصورت تصور تھا اور پھر جو خاتون انھوں نے چنی، وہ مقبول بھی تھی اور تجربہ کار بھی اور دوسری طرف ایک بوڑھا، موٹا اور منہ پھٹ آدمی تھا، جس کا کوئی خاص سیاسی پس منظر نہیں تھا۔ جس پر غبن کا الزام تھا، جو مقروض تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرے بیانات متنازع تھے، جنھوں نے خاصی بے چینی پیدا کی، بالخصوص خواتین سے متعلق بیانات۔ البتہ واضح کر دوں کہ مجھ پر لگنے والے جنسی الزامات جھوٹے اور بے بنیاد تھے۔

تو یہ درست ہے کہ عالمی دنیا خواہش مند تھی کہ ہیلری فاتح ٹھہرے۔ میڈیا اس کے ساتھ تھا۔ سروے میں بھی اس کا پلڑا بھاری تھا۔ تجزیہ کاروں کا خیال تھا کہ امریکی ایک قوم پرست، متعصب اور جارحانہ شخص کے ہاتھوں میں اپنی قسمت نہیں سونپیں گے...... مگر ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ امریکا نے مجھے چنا۔

جی ہاں میں...... جو نوجوانی میں فلم ایکٹر بننا چاہتا تھا، جس کی کاروباری کامیابیوں کے پیچھے کئی تنازعات تھے، جس نے ایک متنازع تعلیمی ادارہ بنایا تھا، جو برطانیہ میں ایک گولف کورس کے تعمیراتی منصوبہ کے باعث ناپسندیدہ ٹھہرا تھا، جس پر نسل پرستی کو بڑھاوا دینے کا الزام تھا، جو خارجہ پالیسی میں ڈرامائی تبدیلیوں کا اشارہ دے چکا تھا...... اب دنیا کا نیا حکمران بن گیا تھا۔ میرے اقتدار میں آنے سے امریکا کے اتحادیوں کو شدید پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ ظاہری بات ہے، وہ امریکی بالادستی اور سرپرستی کے عادی ہو گئے تھے، جب کہ میں کہہ رہا تھا کہ اب دنیا اپنے مسئلے خود نمٹائے، مجھے تو بس امریکا کی پروا ہے۔

تو کرٹس ایلس کی آواز فرطِ جذبات سے لرز رہی تھی۔ وہ آج کی رات کو ایک عظیم رات قرار دے رہا تھا۔ میں بھی مسرور تھا، خوشی سے آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ کیونکہ اب مجھے ان لوگوں کی آواز بننا تھا، جنھوں نے مجھے وائٹ ہاؤس پہنچایا، ان کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا، جنھیں امریکا کی غیر متوازن اقتصادی صورت حال نے زخمی کر ڈالا تھا، جنھیں بے روزگاری اور سہولت کے فقدان نے گہنا دیا تھا۔

ہم امریکا میں پسماندہ علاقوں کو ریسٹ اسٹیٹس کہتے ہیں۔ یعنی زنگ آلود ریاستیں۔ یہ وہ ریاستیں ہیں، جہاں اوباما دور میں بڑی بڑی صنعتیں لگانے کے دعوے کیے گئے۔ کارخانے تو بے شک لگے، مگر وہ کاروبار پنپ نہیں سکا۔ سرمایہ کار ان منصوبوں سے الگ ہو گئے۔ کارخانے زنگ زدہ ڈھانچوں میں بدل گئے اور ریاستوں میں بے روزگاری کے عفریت نے ڈیرے ڈال لیے۔ یہ محنت کش موجودہ سیٹ اپ سے مایوس تھے اور اس کا سبب واضح تھا کہ انھیں بری طرح نظر انداز کیا گیا۔ ایسے میں میرے نعرے نے انھیں اپیل کیا۔ میں نے ان سے یہی کہا۔ ”تمھاری کسی نے پروا نہیں کی، مگر مجھے تمھاری پروا ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔“

یہ بھی درست ہے کہ میں نے سفید فام طبقے میں نسل پرستانہ خیالات کو پروان چڑھایا اور انھیں اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ اگر انھوں نے فوری فیصلے نہیں کیے، تو وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے، ان کے حقوق غصب کر لیے جائیں گے۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں، کیا میں نے غلط کہا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ غیر قانونی تارکین وطن نے امریکا پر دھاوا بول دیا ہے۔ ان کی اکثریت ان مسلم ممالک سے آ رہی ہے، جو دہشت گردی کا شکار ہیں۔ مجھے شک نہیں، بلکہ یقین ہے کہ ان کی آڑ میں کئی انتہاپسند امریکا میں آن گھسے ہیں۔ کیا دہشت گردی کے حالیہ واقعات اس کا ثبوت نہیں۔ میں انھیں نہ صرف بوجھ، بلکہ خطرہ سمجھتا ہوں اور میں ان سے امریکا کو نجات دلاؤں گا۔

ذرا ایک عرب، فرانسیسی اور چینی بن کر سوچیں، اگر آپ کے ملک کے شہری صرف اس لیے بے روزگار ہو جائیں، کیونکہ دوسرے ممالک سے آنے والے تارکین وطن کم تنخواہوں پر ملازمت کرنے کو تیار ہوں، تو آپ کیا کہیں گے؟ یہی ناں کہ انھوں نے آپ کے شہریوں کا روزگار چرا لیا۔ عزیزو، میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔ ایشیا، جزیرہ عرب اور یورپ کے پس ماندہ ممالک سے امریکا آنے والے کم تنخواہوں پر بھی کام کرنے کو تیار ہیں، اسی وجہ سے ہمارے لوگ بے کار ہو گئے۔

مخالفین نے میرے خیالات ہی نہیں، اندازِ بیان، لباس، بالوں کی تراش خراش اور لائف اسٹائل سمیت ہر شے کا

مذاق اڑایا۔ میری بیوی بچوں پر پھبتیاں کسیں، مگر وہ مجھے شکست نہیں دے سکے۔ بی بی سی کی نمایندہ کیٹی ... کو آخر یہ کہنا پڑا: ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ امریکی سیاست میں سب سے بڑا اپ سیٹ ہے۔“

دنیا بھر کے تجزیہ کار یہ کہہ رہے ہیں کہ میری جیت کے اصل محرکات اقتصادی ہیں، قوم پرستی کا نعرہ میرے کام آیا، جمود کے خلاف آواز اٹھانا میرے حق میں گیا، مگر وہ اصل وجہ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ اس ماخذ تک رسائی پانے میں ناکام ہیں، جو حقیقت میں میری فتح کا سبب بنا۔ جس نے مجھے تمام تر رکاوٹوں کے باوجود وائٹ ہاؤس میں پہنچا دیا۔

آئیں، میں آپ کو وہ راز بتاتا ہوں۔

☆☆☆

”کوئی بھی خواب ایسا نہیں، جس کی تعبیر ممکن نہ ہو۔“

یہ الفاظ میں نے اپنی وکٹری اسپیچ میں کہے تھے اور ان ہی میں وہ راز پنہاں ہے۔ یہ سچ ہے دوستو کہ میں ڈیموکریٹس کا گڑھ سمجھی جانے والی ریاستوں میں اپنے مدمقابل کو زیادہ پریشان نہیں کرسکا، نیویارک اور کیلی فورنیا میں ہیلری کامیاب رہیں، مگر یہ ریاستیں میری توجہ کا محور نہیں تھیں۔ میری نظر ”سوئنگ اسٹیٹس“ پر تھی، درمیانی اور چھوٹی ریاستیں...... جو حتمی فیصلے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ وہاں ہماری پارٹی کی کارکردگی حیران کن رہی۔ اتنی حیران کن کہ میری جیت کے بعد اخباری کارٹونوں میں امریکا کی علامت سمجھے جانے والے مجسمۂ آزادی کو کہیں سر پکڑے دکھایا گیا، کہیں دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے..... اور کہیں آنسو بہاتے ہوئے۔

سچ کہوں تو کچھ کارٹون مجھے ناگوار گزرے۔ بے شک میرے اجداد کا تعلق جرمنی سے تھا اور میری ماں اسکاٹ لینڈ سے تھی، مگر میں نے امریکی کو تعبیر کیا۔ یہ مجھے اپنے باپ سے وراثت میں ملا۔ سچ تو یہ ہے میں ہی امریکی خواب کی تعبیر ہوں۔ میں بہترین ہوں اور مجھ جیسا کوئی نہیں۔ میرے دشمن بھی میرے قائل ہیں۔ آپ نے مائیکل مور کا نام تو سنا ہوگا۔ ہاں ہاں بالی ووڈ کا وہی معروف فلم ساز، جس نے بش سرکار کے خلاف 9/11 کے موضوع پر ”فارن ہارٹ 9/11“ نامی فلم بنائی تھی۔ وہ میرا سخت مخالف تھا۔ اس بدتمیز نے الیکشن سے چند ماہ قبل اپنے ایک مضمون میں میری پیاری بیٹی آئیونکا کو مشورہ دیا کہ پیاری، تمھارے باپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ دن بہ دن حالت بگڑتی جارہی ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ کچھ کرو۔ انھیں اس بھیڑ سے دور لے جاؤ۔

جی میں تو آیا کہ اسے ایک گھونسا رسید کردوں، مگر سہہ گیا۔ البتہ اس موٹے ساؤنڈ کو آخری دنوں میں 5 Reasons Why Trump Will Win نامی مضمون لکھنا پڑا، جس میں اس نے یہ دعا بھی شامل کی کہ کاش اس کا تجزیہ غلط ثابت ہوجائے، مگر خدا نے اس کی نہیں سنی۔

اس نے جو اسباب گنوائے، اس میں ہیلری سے متعلق پائی جانے والی ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ سفید فاموں تک میرے پیغام کی رسائی اور دیہی علاقوں کے خوابیدہ ووٹ کو انتہائی اہم ٹھہرایا۔ وہ درست تھا۔ ہم نے ان عناصر پر توجہ خصوصی دی۔ ہم نے کچلے ہوئے محنت کش امریکیوں کے لیے آواز اٹھائی اور فتح اپنے نام کی۔

کچھ تجزیہ کاروں کا خیال تھا کہ میں نے امریکی سیاست کو مصالحے دار ریالٹی شو میں بدل دیا ہے، کبھی کسی روتے ہوئے بچے کو اپنی ریلی سے باہر کردیتا ہوں، روسی صدر پر مضحکہ خیز الزامات لگاتا ہوں، اتحادی ممالک کے سربراہان کی جاسوسی کی تجویز دیتا ہوں اور کبھی اپنی مخالف کو ہیلری کو ہولناک دھمکیاں دیتا ہوں۔

وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہاں میں نے اسے مصالحے دار ریالٹی شو بنا دیا تھا۔ اور لوگوں کو ریالٹی شوز پسند ہیں۔

دنیا میں بسنے والے کروڑوں افراد نے، جن کے مستقبل کا کلی دارومدار اب میرے فیصلوں پر ہے، شاید میرا نام تب سنا ہو، جب میں نے گزشتہ موسم سرما میں ریپبلکن امیدوار بننے کے لیے دیگر حریفوں کو شکست دی تھی۔ یہ گروہ کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ میں دنیا کا سب سے طاقتور شخص کیسے بنا۔

اس کے اسباب پُر پیچ ہیں۔ ان میں رئیل اسٹیٹ کے میدان میرے حیران کن اور پُرخطر فیصلوں کا بہت دخل ہے، جو میں نے 70 کی دہائی میں کیے۔ بلند و بالا ”ٹرمپ ٹاورز“ تعمیر کرنے کے جنون اور Trump: The Art of the Deal جیسی بیسٹ سیلر کتاب کی کہانی بھی سبب پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہے، 90 کی دہائی میں طلاق کے صدمے، قرضوں کے بوجھ کو شکست دینے کا قصہ اور مس یونیورس فرنچائز کی خریدی کی تفصیلات بھی اِس ضمن میں معاون ہوسکتی ہیں، مگر سب سے اہم ہے 2000 میں شروع ہونے والا ریالٹی شو: The Apprentice۔

جی جناب The Apprentice...... ایک شو جس نے نیویارک کے رئیل اسٹیٹ کنگ کو راتوں رات انٹرٹینمنٹ کی دنیا کا چمکتا دمکتا ستارہ بنا دیا۔ اِس شو کے ذریعے

جہاں میں نے اپنے اندر کے دلیر، منہ زور اور لڑاکا شخص کو دریافت کیا، وہیں وہ نسخہ بھی پالیا کہ کیسے کسی خیال اور نظریے کو تفریح سے جوڑ کر ٹیلی ویژن کے ذریعے کروڑوں افراد تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ایک مارکیٹنگ جینیئس کی حیثیت سے یہی نسخہ میں نے الیکشن میں استعمال کیا۔ وکٹری اسپیچ میں میرا یہ جملہ ''بڑے خواب دیکھیں، جرأت کریں!'' اُسی پروگرام سے لیا گیا تھا۔

☆☆☆

ایک فرانسیسی رپورٹر نے الیکشن مہم کے دوران مجھ سے پوچھا تھا۔ ''آپ نے سیاست کے بارے میں کب سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا؟''

یہ ایک اہم سوال ہے۔ میری عمر 70 برس ہے۔ کم عمری میں عملی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ پیشہ وارانہ سفر چار عشروں پر محیط ہے۔ اگر میں کہوں کہ ان برسوں میں کبھی میرے ذہن میں الیکشن لڑنے کا خیال نہیں آیا، تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اِس معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے میرے علاوہ اور بھی کئی افراد اور ادارے ماضی میں یہ سوچتے رہے ہیں کہ ایک نہ ایک دن میں صدارتی انتخابات میں ضرور حصہ لوں گا۔

1999 میں ایک راک بینڈ ''ریج اگینسٹ دا مشین'' نے اپنے نئے گانے ''سلیپ ناؤ ان دا فائر'' کی میوزک ویڈیو ریلیز کی تھی، جس میں ایک شخص ہاتھ میں ایک بینر اٹھائے نظر آتا ہے۔ بینر پر درج ہے: ''صدارت کے لیے ڈونلڈ جے ٹرمپ!''

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ویڈیو کو کسی اور نے نہیں، اسی مائیکل مور نے بنایا تھا، جسے کچھ لوگ سیاسی مبصر بھی کہتے ہیں...... ویسے اس نے 2016 میں ''ٹرمپ لینڈ'' کے نام سے ایک ڈاکومینٹری فلم بھی بنائی تھی، جس میں ناظرین کو میرے صدر بننے کے ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا گیا۔ بے چارہ، لوگوں کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔

مجھے یاد ہے، اب سے 27 سال پہلے میری بیٹی آئیونیکا ایک روز روتی ہوئی میرے آفس میں داخل ہوئی تھی۔ اسکول میں کسی سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ اپنی لاڈلی کو یوں روتا ہوا دیکھ کر میرا جی کٹ گیا۔ گو آج وہ خود ماں بن چکی ہے، کاروبار کے علاوہ اپنے بچوں کی دیکھ ریکھ بھی اس کے ذمے ہے، مگر شاید ہی ایسا کوئی دن گزرتا ہو، جب ہم دونوں بات نہ کرتے ہوں۔ وہ میرے دل کے قریب ہے۔ میرا بڑا بیٹا ہنستے ہوئے اسے ڈیڈیز گرل کہتا ہے۔

خیر، تو میں بتا رہا تھا کہ ایک سہ پہر وہ روتے ہوئے میرے آفس میں آئی۔ وہ بار بار ایک فلم ''بیک ٹو دی فیوچر'' کا تذکرہ کر رہی تھی۔ مجھے اُس کی بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ایسے میں میری سیکریٹری مدد کے لیے آگے آئی۔ اس نے آئیونیکا کو چاکلیٹ دے کر بہلایا، پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''سر، دراصل اس فلم کے ولن......'' اس نے گہرا سانس لیا۔ ''آپ ہیں۔ اور آئیونیکا کے دوست یہ کہہ کر اسے چڑا رہے ہیں۔''

اچانک بات میری سمجھ میں آئی۔ میں مسکرایا۔ شام ڈھلے میں اور آئیونیکا اسی سینما گئے اور ہم نے وہ فلم دیکھی۔ میں نے خوب قہقہے لگائے۔ میرا بیٹا بھی خوب ہنسا۔ واپسی میں بھی ہم فلم پر بات کرتے رہے۔ یوں آئیونیکا کو نصیحت ہوگئی کہ اگر کوئی آپ کا مذاق اڑائے، تو اُسے دل پر مت لے۔ زیادہ سنجیدگی جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ ''بیک ٹو دی فیوچر'' کا قصہ یہ ہے کہ اس فلم کے ولن بف ٹینن اور مجھ میں کئی مماثلتیں تھیں۔ وہ ایک کامیاب کاروباری شخص تھا، جو شہر میں 27 منزلہ کیسینو بناتا ہے اور اپنی دولت امریکی سیاست پر اثرانداز ہونے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جب میں صدارتی امیدوار کے طور پر مہم چلا رہا تھا، تو ایک نیوز رپورٹر فلم کے مصنف کے پاس پہنچ گیا، جس نے تصدیق کی کہ اس نے یہ کردار مجھے سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں تنہا وہ شخص نہیں تھا، جس کے ذہن میں یہ خیال پنپ رہا تھا۔ شاید پورا امریکا ہی یہ سوچنے لگا تھا کہ میرا جارحانہ رویہ، دلیری اور دولت ایک دن مجھے وائٹ ہاؤس پہنچا دے گی۔

شاید اس سوچ کا ایک سبب سیاست میں میری دلچسپی ہو۔ میری کئی بڑی سیاسی شخصیات سے دوستی رہیں۔ میں نے اپنی بے پناہ دولت سے چند سیاست دانوں کی الیکشن مہم بھی چلائی۔ اور ان کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کی قیمت وصول کی۔ گو مرکزی دھارے میں تو نہیں شامل ہوا، مگر میں نے سن 2000 میں سیاست میں آنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی۔ میری خواہش تھی کہ انتخابات میں ریفورم پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے میدان میں اتروں۔ مجھے شوبز سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں کی بھرپور سپورٹ حاصل تھی۔ میں نے وفاقی بجٹ کا خسارہ کم کرنے کے لیے امیر ترین افراد پر 14.25 فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز دے کر سب

کو ہلا دیا تھا، میں صنعتوں سے حاصل ہونے والے ٹیکس کو صحت کے شعبے میں استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میری اٹھان اچھی تھی۔ اخبارات میں بھی مثبت تبصرے لکھے گئے، مگر ریفورم پارٹی میں کھینچا تانی جاری تھی، خاصا خلفشار تھا۔ میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔

تو آخر میں نے کب اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا؟

سنیے، اب سے سولہ برس قبل معروف کارٹون سیریز ''سمپسنز'' کی ایک قسط نشر ہوئی تھی، جس کا عنوان تھا: بیک ٹو دی فیوچر!

اس میں مرکزی کردار کسی طرح مستقبل میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اسے خبر ہوتی ہے کہ اس کی بہن لیزا امریکا کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوگئی ہے۔ جب لیزا دفتر سنبھالتی ہے، تو اسے بریفنگ دیتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ امریکا دیوالیہ ہوگیا ہے اور اس کا سبب سابق صدر تھے۔

آپ نے درست اندازہ لگایا صاحب، جی ہاں اُس کارٹون میں امریکا کو کنگال کرنے والا صدر کوئی اور نہیں، بلکہ ڈونلڈ ٹرمپ تھا۔ ایک منظر میں امریکی وزیر داخلہ یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی مدت اقتدار میں ملکی معیشت تباہ و برباد ہوگئی۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا، جب مجھے طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ میں ایک معروف آدمی ہوں، جس کا مذاق اڑا کر کوئی بھی شہرت حاصل کرسکتا ہے۔ مگر اس کارٹون سیریز نے مجھے خاصا برانگیختہ کر دیا تھا۔ ٹھیک ہے، آپ میرا مذاق اڑائیں، میرے بولنے کے انداز، میرے ہیر اسٹائل کی نقالی کریں، مگر آپ تو مجھے امریکا کے لیے مضر قرار دینے پر کمربستہ ہیں۔ مجھے ایک ناسور کہہ کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس روز مجھے شدید غصہ آیا۔ تب ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس کارٹون کے مصنف کو ایک دن غلط ثابت کروں گا۔ 2012 کے انتخابات نے جلتی پر تیل کا کام کیا، جب اوباما نے دوسری بار صدارت کا حلف اٹھایا۔ اس نے جشن منانے کا یہ بھونڈا طریقہ ڈھونڈا کہ مجھ پر پھبتیاں کسے۔ میرا مذاق اڑائے۔ اس نے بے کیف لطیفے سنائے اور اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا رہا۔

مجھے اُمید ہے کہ اب...... جب کہ ڈونلڈ ٹرمپ ملک کا 45 واں صدر بن گیا ہے اور ہیلری کلنٹن کا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام ہوگیا، اوباما اس شام کو یاد کرکے خود کو کوس رہا ہوگا،

جب اُس نے میری برداشت کا غیر ضروری امتحان لیا۔ میں نے اسے سبق سکھا دیا اور میں جلد سمپسنز کے مصنف ڈین گرینی کو بھی سبق سکھا دوں گا، جس نے اس قسط کو امریکا کے لیے ایک وارننگ قرار دیا تھا۔ اب وہ کبھی شرفا کو اپنے گھٹیا لطیفوں کا نشانہ نہیں بنا سکے گا۔

خیر، تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میری کامیابی میں بڑا کردار اس ریالٹی شو نے ادا کیا، جس میں، میں ایک جارحانہ مگر ذہین بزنس ایگزیکٹو کے طور پر نظر آتا ہوں۔ اس شو سے سیکھے ہوئے نسخے استعمال کرکے میں اُن لاکھوں افراد کو ووٹ کاسٹ کرنے کے لیے گھروں سے باہر لانے میں کامیاب رہا، جو سسٹم سے اکتائے ہوئے تھے۔

آئیں، اب ماضی میں چلتے ہیں، تاکہ میں آپ کو اپنی پوری کہانی سنا سکوں۔

☆☆☆

میں نے 1946 میں نیویارک کے علاقے کوئنز کے ایک کیتھولک گھرانے میں آنکھ کھولی۔

میرا نام ڈونلڈ جان ٹرمپ رکھا گیا۔ میرے ڈیڈ فریڈ کرائسٹ ٹرمپ رئیل اسٹیٹ کے کاروبار سے منسلک تھے۔ علاقے کے شرفا میں ان کا شمار ہوا کرتا تھا۔ ہمارے اجداد کا تعلق جرمنی سے تھا۔ میرے دادا نے 1885 میں جرمنی سے ہجرت کی اور اس ریاست کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ زندہ دل آدمی تھے۔ وہ ہوٹلنگ کے کاروبار سے وابستہ رہے۔ 1918 میں ''اسپینش فلو'' نامی وبا پھیلی تو میرے دادا بھی متاثر ہوئے۔

اُس وقت میرے ڈیڈ فقط تیرہ برس کے تھے۔ انھوں نے اپنے محنتی باپ کی تقلید کرتے ہوئے محنت کو اپنا شعار بنا لیا۔ خاندان کی کفالت کے لیے خاصی تگ و دو کی۔ 1936 میں ان کی ملاقات میری میکلاوڈ سے ہوئی، جو اسکاٹ لینڈ سے چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی۔ وہ میرے ڈیڈ کو دل دے بیٹھی۔ جلد ان کی شادی ہوگئی۔ خدا نے اس جوڑے کو پانچ بچوں سے نوازا۔ میں، یعنی ڈونلڈ ٹرمپ ان بچوں میں چوتھا تھا۔

نیویارک ایک تیز رفتار شہر ہے، پھر رئیل اسٹیٹ مشکل ترین پیشہ۔ ڈیڈ کا اس سمت آنا ایک بولڈ فیصلہ تھا۔ انھیں کڑی محنت کرنی پڑی۔ موسم سرما میں وہ گھنٹوں کام میں جتے رہتے۔ میری ماں نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لوگ کہتے ہیں، یہ میری ماں کی قسمت تھی، جس نے اس خاندان کے مستقبل کو تابناک بنایا۔ میرے والد کا 1999 میں انتقال ہوا۔ اُس

وقت وہ 400 ملین ڈالر کے مالک تھے۔ موت کے وقت ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے بھرپور انصاف کیا۔ ان کی آخری نصیحت مجھے یاد ہے۔ ”بیٹا، ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو اور خود پر بھروسا رکھو!“

اس وقت میں اُن کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا اور اُن کے لیے دعا کررہا تھا۔ میں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی۔ وہ چلے گئے، مگر ہر صبح جب میں بیدار ہوتا ہوں، تو ان کے کہے ہوئے الفاظ دہراتا ہوں۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ نصیحت مجھے وائٹ ہاؤس تک پہنچانے کا سبب بنی، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بے شک یہ سادہ سی نصیحت اتنی پُراثر اور بیش قیمت ہے کہ آپ کو روزانہ اپنے بچوں سے یہ جملے کہنے چاہییں۔

انتقال کے وقت ان کی عمر 93 سال تھی۔ ورثے میں انھوں نے تقریباً 300 ملین ڈالر چھوڑے۔ ان کے جنازے میں 650 سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ وہ میری زندگی کا مشکل ترین دن تھا۔ مجھے جان ایف کینڈی جونیئر کی جانب سے ایک تعزیتی خط موصول ہوا تھا، جس میں اس نے لکھا۔ ”چاہے آپ زندگی کے کسی بھی موڑ پر ہوں، والدین کی موت آپ کو تبدیل کردیتی ہے۔“

وہ درست کہتا تھا، 1981 میں مجھے اپنے بھائی فریڈ جونیئر کی موت کا صدمہ سہنا پڑا تھا، جسے ڈیڈ نے کثرت شراب نوشی کی وجہ سے دولت سے عاق کردیا تھا، مگر 1999 میں...... جب میں خود ادھیڑ عمر تھا، باپ بن چکا تھا...... اپنے ڈیڈ کو کھونا ایک کرب ناک تجربہ تھا، جس نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

چلیں، اس تذکرے کو چھوڑتے ہیں۔ یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ ماضی میں چلتے ہیں۔ میں نے دی کیو فارسٹ اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، جو فورسٹ ہل کے علاقے میں واقع تھا۔ وہاں میں ایک مغرور نوجوان کے طور پر مشہور تھا۔ سب مجھے بگڑا ہوا رئیس زادہ کہتے۔ میرے تضحیک کرنے کے لیے کبھی مجھے جرمن اور کبھی اسکاٹش کہہ کر پکارا جاتا۔ اس بات پر میں ہتھے سے اکھڑ جاتا۔ میں لمبا چوڑا اور خاصا تگڑا تھا۔ اگر مذاق اڑانے والا میرے ہاتھ چڑھ جاتا، تو اس کی خوب درگت بنتی۔

ماں مجھے اکثر سمجھانے کی کوشش کرتی کہ مجھے خود پر قابو رکھنا چاہیے۔ ڈیڈ بھی یہی کہتے کہ اپنی صلاحیتیں مثبت مشغلوں میں خرچ کرو۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان کے انداز میں یقین اور عزم ہوتا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہوکر میں بالکل ڈیڈ جیسا بنوں گا۔

میرے معصوم خیالات شاید آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کردیں کہ میں ماں باپ کا لاڈلا ایک سدھارا ہوا بچہ تھا۔ نہیں جناب۔ میں بڑا بدمعاش تھا۔ لڑنے بھڑنے کو ہمیشہ تیار رہتا۔ ایک روز والد کو میری دراز سے ایک چاقو ملا۔ انھیں اندازہ ہوگیا کہ پانی سر سے اوپر چلا گیا ہے۔ انھوں نے میری ماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ کچھ ٹیلی فون کالز کیں۔ جب میں گھر لوٹا تو خبر ملی کہ مجھے نیویارک ملٹری اکیڈمی میں داخل کروا دیا گیا ہے۔

ایک تیرہ سالہ لاابالی بچے کے لیے یہ خبر کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ پہلے میں ہنسا، مگر ان کی سنجیدگی برقرار رہی۔ پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آخر منتیں کرنے لگا۔ ماں نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ پریشان تھی، مگر اپنے شوہر کی دور اندیشی کی بھی قائل تھی۔

”ڈونلڈ......“ ڈیڈ نے مجھے پکارا۔ میں نے دیکھا، وہ کھڑکی کے پاس کسی چٹان کی طرح کھڑے تھے۔ پیچھے سورج غروب ہورہا تھا۔ ”اکیڈمی کی تربیت تمھاری صلاحیتوں کو پالش کرنے میں معاون ثابت ہوگی!“

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر وہ درست ثابت ہوئے۔ ملٹری اکیڈمی نے میری یادوں پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ تربیت نے مجھے سخت جان بنا دیا۔ میں اسپورٹس کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا۔ میرا شمار اکیڈمی کے بہترین کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ بیس بال اور فٹ بال کی ٹیمیں میرے بغیر نامکمل تصور کی جاتیں۔

64ء میں مجھے اپنے شفیق استاد اور وہاں کے معروف ٹرینر ٹیڈ ڈوبس کی جانب سے ”کوچ ایوارڈ“ دیا گیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ میری پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اکیڈمی کی تربیت نے مجھے سکھایا کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے قوت فیصلہ پہلی شرط ہے، آپ کو ذہنی طور سخت جان ہونا چاہیے۔ آپ میں لڑنے کی چاہ ہو۔ آنے والے چند برس میں نے فورڈہم یونیورسٹی میں گزارے۔ اکیڈمی کی تربیت اور ایک امیر شخص کا صاحب زادہ ہونے کی وجہ سے وہاں میں سب کی توجہ کا محور رہا۔

☆☆☆

امریکا اور بالی ووڈ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

دونوں ایک دوسرے کا پرتو ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ ہر امریکی نوجوان فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہوئے جوان ہوتا ہے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ فلم انڈسٹری مجھے پکار رہی تھی۔ میں اداکار بننا چاہتا تھا اور ایک زمانے میں فلم اسکول میں داخلے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

گو ڈیڈ کے مشورے پر میں بزنس کی طرف آگیا، مگر انٹرٹینمنٹ کی دنیا سے میرا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ جب میں یونیورسٹی آف پینسلوانیا کے وارٹن اسکول سے اکنامکس میں بیچلرز کر رہا تھا، امریکا میں ترقی کی شرح تیزی سے بڑھنے لگی۔ زمینوں کی قیمت آسمان پر پہنچ گئی۔ جب میں ڈگری لے کر میدان میں اترا، تو اعتماد سے بھرپور تھا۔ میں نے جس کمپنی میں پہلی ملازمت اختیار کی، اس کا مالک ایک زیرک، سخت جان اور منہ پھٹ بڈھا تھا، جس کے ساتھ کام کرنا سہل نہیں تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اُسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا، تو دنیا کے ہر شخص کو قائل کر سکتا ہوں، کیونکہ وہ شخص کوئی اور نہیں، میرا باپ فریڈ کرائسٹ ٹرمپ تھا۔

ایک مانوس عمارت میں داخل ہونا۔ شناسا چہروں کے درمیان سے گزرنا، ایک ایسے آفس میں داخل ہونا، جسے میں نے ہی ڈیزائن کیا تھا اور پھر اپنے باپ سے ملازمت مانگنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ ڈیڈ نے کھڑے ہو کر مجھے گلے لگا لیا۔ دی ٹرمپ آرگنائزیشن میں میرا استقبال کیا گیا۔ میرا استاد اس شعبے کا ماہر ترین شخص تھا اور میں سیکھنے کے لیے تیار تھا۔

آنے والے دنوں میں بروکلین، کوئنز اور اسٹیٹن آئس لینڈ کے پروجیکٹ میری توجہ کا مرکز رہے۔ ڈیڈ کثیر المنزلہ عمارتوں کے منصوبے مجھے فوری سونپنے کو تیار نہیں تھے اور ان کی احتیاط قابل فہم تھی۔ میں نے ریاست اوہیو میں سینٹون ویلیج اپارٹمنٹس کمپلیکس کا پروجیکٹ مکمل کیا۔ اس دوران ڈیڈ نے میری نگرانی تو کی، مگر کسی طرح کی مداخلت نہیں کی۔ سمندری طوفان کے باوجود ہم نے اُسے کامیابی سے مکمل کیا۔ ہمیں چھ ملین ڈالر کا فائدہ ہوا۔ اب کمپنی کو مجھ پر اعتبار تھا۔

یوں تو نیویارک کے تمام اضلاع کاروباری نقطۂ نگاہ سے آئیڈیل تھے، مگر میرا انتخاب مین ہیٹن کا علاقہ ٹھہرا۔ میں نے وہاں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈیڈ کے استفسار پر میں نے کہا۔ ”ڈیڈ، وہاں کثیر المنزلہ عمارتوں کی تعمیر کے وسیع امکانات ہیں۔ اس پروجیکٹ سے ہم کروڑوں کما سکتے ہیں۔“

”نیک تمنائیں!“ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ویسے منصوبہ کیا ہے؟“

”منصوبہ؟“ میں مسکرایا۔ ”آپ تو خوب جانتے ہیں، کبھی کموڈور ہوٹل مین ہیٹن کی جان تھا۔ مگر پھر یہ دیوالیہ ہوگیا۔ میں اسے اپنے پیروں پر کھڑا کروں گا۔“

ڈیڈ کی بھنویں تن گئیں۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ ایک مشکل منصوبہ ہے، مگر وہ رک گئے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے اپنے دل کی آواز سننے کی نصیحت کی تھی اور اب میں یہی کر رہا تھا۔ وہ بھلے مجھے کیسے روک سکتے تھے۔

اس منصوبے کے لیے مجھے شہر کی اہم ترین شخصیات سے ملنا پڑا۔ ان میں کئی میرے باپ سے کئی گنا زیادہ دولت مند تھے۔ چند کی بڑی بڑی جائیدادیں تھیں اور چند جدی پشتی امیر تھے۔ ان میں بڑی بناوٹ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ منہ پھٹ اور جارح ہونے کے باعث میں ان سے یکسر مختلف تھا۔ مجھے ان سے گھلنے ملنے میں دقت محسوس ہوتی۔

کموڈور ہوٹل کی تزئین کے اعلان نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ انھیں ایک نوجوان سے ایسی جرأت کی توقع نہیں تھی۔ مجھے کامیابی کا یقین تھا، اس لیے میں نے بھاری سود پر قرضہ لیا۔ ایک بڑی رقم جمع کر لی۔ یہ ایک پیچیدہ ڈیل تھی، مگر مجھے ڈیڈ کی رہنمائی حاصل رہی۔ ہم نے سات کروڑ ڈالر میں 42 اسٹریٹ پر واقع یہ ہوٹل خریدا اور اس کی ازسرِنو تعمیر کی۔ اسے دی گرانڈ حیات ہوٹل کا نام دیا گیا۔ 1980 میں اس کا افتتاح ہوا۔ جب اخبارات نے اس ہوٹل کی تعریف کی، تو میں خوشی سے نہال ہوگیا۔ میری محنت رنگ لائی تھی۔

اب میری نظریں جیوٹس کونشن سینٹر پر ٹکی تھیں، جس کا مرکز مین ہیٹن کا مغربی علاقہ تھا۔ حکومت کثیر سرمایہ کاری کا ارادہ رکھتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ پروجیکٹ 750 ملین ڈالر میں مکمل ہوگا، لیکن میرا اندازہ مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ لاگت کا تخمینہ لگانے والے یا تو نااہل ہیں یا بدعنوان بھی ہیں۔ اچھے میٹیریل کے استعمال کے باوجود اِس منصوبے کو 110 ملین ڈالر میں مکمل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے چند اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا، اپنا پلان پیش کیا، مگر انھیں کل کے لونڈے کو منہ لگانا گوارا نہیں تھا...... میری آفر ٹھکرا کر انھیں جو نقصان ہوا، وہ آج تاریخ کا حصہ ہے۔

چند روز بعد مجھے ایک خبر ملی۔ ایک حکومتی ادارہ سینٹرل پارک میں خواتین کے اسکیٹنگ ایریا پر جتا ہوا تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ 1980 میں شروع ہونے والا یہ منصوبہ ڈیڑھ

برس میں مکمل ہو جائے گا، تاہم سن 86ء تک بارہ ملین خرچ ہو چکے تھے اور منصوبہ تکمیل سے کوسوں دور تھا۔ میں نے اعلان کردیا کہ اگر یہ منصوبہ مجھے سونپ دیا جائے، تو قلیل مدت میں اسے مکمل کرسکتا ہوں۔

شومئی قسمت، ایک بار پھر حکومت نے مجھے ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا۔ یہ پیشکش رد کردی گئی۔ میں خاصا مایوس تھا، مگر میں جانتا تھا کہ یہ رئیل اسٹیٹ کا بزنس ہے، یہاں کمزوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں نے ڈیڈ کی نصیحت دہرائی۔ ''ڈونلڈ خود پر یقین رکھو!''

میرا یقین میرے کام آیا۔ میڈیا نے میری پیشکش کو خصوصی اہمیت دی۔ حکومت پر لعن طعن شروع ہوگئی۔ بالآخر مجھے منصوبہ سونپ دیا گیا۔ گو تیس لاکھ ڈالر مختص کیے گئے تھے، مگر میں نے فقط ساڑھے سات لاکھ ڈالر صرف کیے۔ چھ ماہ میں پروجیکٹ ہوگیا۔

خوب واہ واہ ہوئی۔ جب ایک رپورٹر نے پوچھا کہ میرا اگلا منصوبہ کیا ہے، تو میں نے جواب دیا۔ ''اب میں دنیا کا شاندار کیسینو تعمیر کروں گا۔''

☆☆☆

آپ کے علم میں ہوگا، امریکا کی موجودہ خاتون اوّل دراصل میری تیسری بیگم ہیں۔ میری پہلی بیوی تو ایوانا زیلنکو وا تھی۔

ہماری پہلی ملاقات ایک اسپورٹ ایونٹ پر ہوئی۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ میں اس ایونٹ کا مہمان خصوصی ہوں اور جب اسے خبر ہوئی، تب بھی اُس نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس کا تعلق چیک ری پبلک سے تھا۔ ہم 76ء میں ملے۔ وہ ایتھلیٹس میں خود کو منوانے کے بعد اب ماڈلنگ میں نام پیدا کر رہی تھی۔ ہماری محبت کو پروان چڑھانے میں موسم نے بھی کردار ادا کیا۔ ایک شام طوفانی بارش میں وہ اور میں ایک ریسٹورنٹ میں پھنس گئے۔ اس طویل ملاقات نے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دیا۔ 1977 میں ہماری شادی ہوئی اور وہ ایوانا ٹرمپ ہوگئی۔

دسمبر 77ء میں ڈونلڈ جونیئر نے اِس دنیا میں آنکھ کھولی۔ وہ ایک پُرمسرت لمحہ تھا۔ 81ء میں میری پیاری بیٹی آئیونیکا کا جنم ہوا، جو امریکا کا مستقبل ہے۔ تین برس بعد ایرک پیدا ہوا۔

ان ہی دنوں کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کرنے کا میرا شوق عود کر آیا۔ میں نے مین ہٹن میں ٹرمپ ٹاور تعمیر کرنے کا اعلان کر کے سنسنی پھیلادی۔ یہ ایک میگا پروجیکٹ تھا۔ جو جگہ ہم نے خریدی، وہاں دو قدیم مجسمے آویزاں تھے۔ بے شک وہ بیش قیمت تھے، مگر میں اس سے بھی نایاب شے تعمیر کرنے والا تھا۔ میں نے انھیں گرانے کا حکم دے دیا۔ نیویارک ٹائمز...... جس نے 2016 میں میری جیت کی پیشگوئی کی تھی، اس وقت مجھ پر کڑی تنقید کیا کرتا تھا۔ ایک اور اسکینڈل نے بھی پریشان رکھا۔ مجھ پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ میں نے منصوبے کی تکمیل میں ان پولش مزدوروں کو استعمال کیا، جن کی دستاویزات مکمل نہیں تھیں۔

یہ الزام بالکل درست تھا...... ہاں میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی وجہ سے مجھے خاصی بچت ہوئی۔ میرے پاس وکلا کی پوری ٹیم تھی، جس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کیس کو بہ آسانی سنبھال لیں گے اور بھی چند تنازعات کھڑے ہوئے، مگر جب یہ 28 منزلہ عمارت مکمل ہوگئی، تب میں نے ایک شان دار دعوت کا اہتمام کیا۔ میرے تمام ناقدین مدعو تھے۔ نیویارک کے میئر ایڈ کوچ کو بھی دعوت بھجوائی گئی۔ ہم نے میڈیسن ایونیو پر جشن منایا۔ ہوا میں 10 ہزار رنگین غبارے چھوڑے گئے۔ پورے نیویارک کو خبر ہوگئی تھی کہ رئیل اسٹیٹ کی دنیا کا بازی گر میدان میں اتر چکا ہے، جو نڈر اور بے باک ہے۔ میں نے اعلان کیا۔ ''ٹرمپ ٹاور مین ہٹن کے ماتھے کا جھومر ثابت ہوگا۔''

اس روز...... کسی شخص میں مجھ سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ وہ ششدر تھے اور ان کے سر میرے سامنے جھکے جاتے تھے۔

دنیا بھر میں معروف شخصیات کتابیں لکھ کر خوب کماتی ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ایک دن ایک دھماکے دار، بیسٹ سیلر کتاب لکھوں، مگر امید نہیں کہ یہ موقع اتنی جلدی آجائے گا۔ 1986 میں ایک مشہور پبلشنگ ہاؤس نے مجھے اپنی زندگی کے اہم واقعات اور رہنما اصول قلم بند کرنے کی پیشکش کی۔ وہ اگلے برس موسم سرما میں کتاب مارکیٹ میں لانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کتاب کا نام ''دا آرٹ آف دا ڈیل'' میرے والد نے تجویز کیا تھا۔ چند رہنما اصول تو میں نے ان ہی کی باتوں اور زندگی کے اخذ کیے۔

پبلشر نے یہ کہہ کر اس کی تشریح کی کہ اسے پڑھ کر آپ بھی ڈونلڈ ٹرمپ جتنے امیر بن سکتے ہیں۔ بات تو احمقانہ تھی، مگر جملہ کام کر گیا۔ یہ نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلر لسٹ میں 13 ہفتے تک سرفہرست رہی۔ اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت

ہوئیں۔ میری آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک ہوئی۔ پھر اس نے میری شہرت کو مہمیز کیا۔ مجھے کامیاب تجارت کی علامت تصور کیا جانے لگا۔ ٹرمپ آرگنائزیشن کو بھی خاصا منافع ہوا۔ ہمیں دھڑا دھڑ پروجیکٹ ملنے لگے۔ میں نے کئی عمارتیں تعمیر کیں۔ ساتھ ہی ٹرمپ ایئر لائنز بھی شروع کر دی۔ میں آسمان کی بلندی پر تھا، مغرور اور منہ پھٹ تھا۔ طاقت کی علامت بن گیا تھا، مگر تب...... قدرت نے مجھے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

حالات اپنی ڈگر پر جا رہے تھے کہ 1989 کا گھاتک سال آ گیا۔

کساد بازاری عروج پر تھی۔ ہمارے ادارے کو مشکلات نے گھیر لیا۔ ہم قرضوں کی ادائیگی میں ناکام رہے۔ حالات سنبھالنے کی میری کوششوں نے مزید بگاڑ پیدا کیا۔ ہم نے بڑے چاؤ سے اٹلانٹک سٹی میں ایک شان دار کیسینو تعمیر کیا تھا، جس کا نام دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک...... یعنی تاج محل پر رکھا تھا۔ 1991 میں یہ ہوٹل دیوالیہ ہو گیا۔ 1992 میں ہمارا پروجیکٹ ٹرمپ پلازا بھی خسارے میں چلا گیا۔ ایئر لائن سے بھی بری خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ہم پر 90 کروڑ ڈالر کا قرضہ تھا۔

ہماری بورڈ میٹنگز کا اختتام مایوسی پر ہوتا۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار میٹنگ کے بعد میں کھڑکی میں کھڑا تھا۔ میں نے سڑک سے ایک بدحال شخص کو گزرتے دیکھا تو اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ شخص مجھ سے زیادہ امیر ہے۔ یہ اور میں...... دونوں خالی ہاتھ ہیں، مگر مجھ پر 90 کروڑ ڈالر کا قرض ہے، جو میرا خون نچوڑ رہا ہے۔“

میں ”تاج محل“ کو بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اضافی قرض لینے کا فیصلہ کیا، مگر اس سے حالات اور بگڑ گئے۔ ہماری خاندانی کمپنی کو شدید گھاٹے کا سامنا تھا۔ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے والے بھی شدید صدمے سے دوچار تھے۔ مصائب کے ان دنوں میں بھی میں نے اپنے والد کو مطمئن پایا۔ انھیں مجھ پر بھروسا تھا۔

میں نے اخراجات کم کرنے کی کوشش کی۔ کیسینو تاج محل کے پچاس فی صد شیئرز ہمارے کمپنی میں پیسے لگانے والوں کو سونپ دیے۔ یہ صدمہ تو میں نے سہہ لیا، مگر جب مجھے ٹرمپ پلازا ہوٹل کے شیئرز فروخت کرنے پڑے، تب لگا جیسے کسی نے میرے دل پر گھونسا مارا ہو۔ مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ ہم نے شرط عائد کی کہ چیف ایگزیکٹو کا عہدہ میرے ہی پاس رہے گا۔ یوں بمشکل میں اپنی پسندیدہ عمارت کو دیوالیہ ہونے سے بچا سکا۔

کاروباری زندگی کے ساتھ میری ازدواجی زندگی بھی بحرانوں کی زد میں تھی۔ لیونکا نے اب آرگنائزیشن میں خصوصی اہمیت اور طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے اور میرے تعلقات مثالی تصور کیے جاتے تھے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ پیدا ہونے لگا تھا اور اس فاصلے کی وجہ تھی مارلا میپلیس۔ ایک حسین دوشیزہ۔ جارجیا کی اس اداکارہ سے میری سن 1990 میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے دل میں کھب گئی۔ وہ احساسات عود کر آئے، جو میں نے لیونکا کے لیے پہلے پہل محسوس کیے تھے۔

معاشقہ چند ہی روز چلا تھا کہ میری بیگم کو اُس کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے مجھے کریدنے کی کوشش کی، مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا، مگر مارلا ابھی نوجوان اور جذباتی تھی۔ ایک روز میڈیا کی موجودگی میں دونوں کا سامنا ہو گیا۔ تو تو میں میں ہوئی۔ اخبارات اور چینلز نے مسالہ لگا کر اس خبر کو خوب اچھالا۔ بات طلاق تک پہنچ گئی۔ ہر کوئی اسی متعلق بات کرتا دکھائی دیتا۔

میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ لیونکا میں میری دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ اب میں مارلا کو چاہتا تھا، مگر طلاق کے عوض جس رقم کا لیونکا نے مطالبہ کیا تھا، اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ عدالت میں اُس نے مؤقف اختیار کیا کہ اس نے ہماری کمپنی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی عرصے میں لیونکا کو اپنے باپ کے انتقال کا صدمہ سہنا پڑا تھا، جس کی وجہ سے وہ ٹوٹ چکی تھی۔ ہم نے اچھا وقت ساتھ گزارا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی کوشش کی۔ 92ء میں ہم الگ ہو گئے۔ بے شک یہ مہنگی طلاق تھی۔ فقط مجھ جیسا امیر آدمی یہ صدمہ سہہ سکتا تھا۔

مارلا سے شادی کے ایک برس بعد ٹیفنی کی پیدائش ہوئی۔ ہم خوش تھے، چند سال ایسے ہی گزر گئے، مگر دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہونے لگا کہ مارلا اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ شیلف میں رکھی گڑیا کے مانند تھی، جسے دیکھنا اور سراہا جانا تو قابل فہم تھا، مگر اس سے شادی رچانا اچھا خیال نہیں تھا۔ بالآخر 99ء میں ہم علیحدہ ہو گئے۔

اس دوران کئی اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ 1994 تک میں نے ذاتی بنیادوں پر لیے جانے والے 900 ملین ڈالر کے قرض کا بڑا حصہ چکا دیا تھا۔ برا وقت مجھ سے چھن گیا۔ البتہ ٹرمپ ٹاور اور اٹلانٹک سٹی کے تین کیسینو کا

اختیار میرے پاس رہا۔ وہ مشکل وقت تھا۔ میں روز صبح آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر کہتا۔ ”ڈونلڈ مائی بوائے، تمھیں ہر صورت جیتنا ہے۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے!“

95ء میں امریکن گیمنگ ایسوسی ایشن کی جانب سے میرا نام ”گیمنگ ہال آف فیم“ کے لیے منتخب کیا گیا۔ لوگ مجھ پر اب بھی اعتبار کرتے تھے۔ اسی برس میں نے اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو سمیٹنے کی غرض سے اپنے کیسینو اور ہوٹلز کی ملکیت یکجا کر کے ”ٹرمپ ہوٹلز اینڈ کیسینو ریزورٹس“ نامی کمپنی بنالی۔ یہ ایک پُرخطر فیصلہ تھا، مگر میں نے فقط اپنے دل کی آواز سنی۔

میں نے ٹرمپ ایئرلائنز فروخت کر دی تھی اور انٹرٹینمنٹ کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ ہم نے مس یونیورس کی فرنچائز خرید لی، جس کے تحت مس امریکا اور مس ٹین امریکا کے مقابلۂ حسن کا انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا، جو بڑا کامیاب رہا۔ اسی زمانے میں میری دوسری کتاب ”دا آرٹ آف دا کم بیک“ شائع ہوئی، جو ایک بار پھر چارٹس میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

☆☆☆

1998 میں حالات نے پھر پلٹا کھایا۔

ہماری کمپنی کا منافع خاصا کم ہوگیا۔ شیئر ہولڈرز اور قرضوں کی ادائیگی میں ایک بار پھر مشکل ہوگئی تھی۔ اس دوران مجھے اپنے والد کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ آخر مجھے کمپنی میں اپنی ملکیت کو 56 فیصد سے گھٹا کر 27 فیصد کرنا پڑا۔ میں نے سی ای او کا عہدہ بھی چھوڑ دیا۔ بعد میں ہم نے کمپنی کا نام بدل کر ٹرمپ انٹرنیشنل ریزورٹس رکھ دیا۔ 2001 میں مکمل ہونے والا 72 منزلہ ٹرمپ ورلڈ ٹاور میرا تخلیق کردہ ایک شاہ کار تصور کیا جاتا ہے، جس پر خاصے مضامین لکھے گئے۔

اب میری خاصی عمر ہو چکی تھی۔ دو شادیاں ناکام ہو گئی تھیں اور مجھے بظاہر کسی ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، مگر 2004 میں جب میلانیا کینوس سے ملاقات ہوئی، تو یکدم احساس ہوا کہ میں کس قدر اداس اور تنہا ہوں۔ وہ ایک ماڈل تھی اور تیزی سے کامیابی کے زینے طے کر رہی تھی۔ ہم جلد قریب آ گئے اور جنوری 2005 میں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ اُس سے میرا بیٹا بیرون ولیم پیدا ہوا۔ میلانیا میری سابق بیویوں سے خوش قسمت ہے۔ خاتونِ اوّل بننا فقط اسے نصیب ہوا۔

ہوائی کے علاقے ہونولولو میں تعمیر ہونے والا ٹرمپ انٹرنیشنل ہوٹل اینڈ ٹاور فائدہ کا سودا ثابت ہوا۔ ساحلِ سمندر کے پاس کھڑی اس پُرشکوہ عمارت سے ہمیں خاصا منافع ہوا۔ نومبر 2006 میں اس کی تکمیل مکمل ہوئی۔ اس کے 460 یونٹس صرف ایک دن میں بک گئے۔ ہمیں 700 ملین ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ہم نے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ٹرمپ ٹاور تعمیر کیا تھا۔ گو اس میں کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑا، مگر جلد حالات ہمارے قابو میں تھے۔ ٹھیک فلوریڈا ٹرمپ ٹاور کے مانند، جو ابتدا ہی سے تنازعات کا شکار رہا۔ ہاں، جورجیا کے ٹرمپ ٹاور سے ہمیں اچھی آمدنی ہوئی۔

میں نے کئی مالیاتی بحرانوں کو شکست دی، مگر 2008 انتہائی کٹھن تھا۔ کئی ادارے دیوالیہ ہوگئے۔ کئی صنعتیں تباہ ہوئیں۔ مجھے بھی سخت معاشی مسائل کا سامنا رہا۔ قرضے کی ادائیگی دشوار ہوگئی۔

بینک سے دھمکی آمیز خطوط آنے لگے۔ انھوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ مجبوراً ہمیں شکاگو کا ہوٹل اور ٹاور فروخت کرنا پڑا۔ اور بھی کڑے فیصلے لینے پڑے۔ 2010 کے اوائل میں کسی نہ کسی طرح میری کمپنی نے مالیاتی بحران کی نحوست سے نجات حاصل کرلی۔ پھر چیزیں ڈگر پر آ گئیں۔

دوستو میرے حالاتِ زندگی آپ کے سامنے ہیں، اب اس شو کی سمت چلتے ہیں، جس نے نیویارک کے ایک بلڈر کو دنیا کی مقبول ترین شخصیت بنا دیا تھا۔ جی ہاں، میں دی اپرینٹس کی بات کر رہا ہوں۔

☆☆☆

میرے ناقدین کا یہ اعتراض احمقانہ ہے کہ ٹرمپ نے انتخابات کو ایک مصالحے دار ریالٹی شو میں بدل دیا۔ اصولی طور پر تو انھیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ میں نے ایک طویل اور اکتاہٹ سے بھرپور عمل کو دلچسپ اور سنسنی خیز بنا دیا اور یہ کارنامہ صرف ڈونلڈ ٹرمپ ہی انجام دے سکتا تھا، کیونکہ وہ انٹرٹینمنٹ کنگ ہے۔

میں بڑھکیں نہیں مار رہا جناب۔ امریکی شوبز انڈسٹری پر نظر رکھنے والے میری بات کی تصدیق کریں گے۔ یہ دنیا آغاز ہی سے میری توجہ کا مرکز رہی۔ ریئل اسٹیٹ میں آنے کے بعد بھی میں کسی نہ کسی طرح انڈسٹری سے جڑا رہا۔ چند فلموں میں بطور مہمان اداکار کام کیا، جیسے ”ہوم آلون 2“، ”لوسٹ ان نیویارک“، ”دی نینی“ اور ”ڈیز آف اور لائف“۔ میری شخصیت پر بھی فلمیں بنیں۔ اسٹینڈ اپ کامیڈین میرے

انداز کی نقل کر کے خوب کماتے رہے۔ اخبارات میں میرے کارٹون شائع ہوتے۔ مجھے ٹاک شوز میں مدعو کیا جاتا۔ یعنی میں ابتدا سے شوبز انڈسٹری کا حصہ رہا۔

البتہ 2003 میں کچھ انوکھا رونما ہوا۔ کچھ ایسا، جو مستقبل میں مجھے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے والا تھا۔ معروف چینل NBC پر ریالٹی شو The Apprentice شروع کیا گیا، جس نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ اور میری شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔

یہ ایک میگا پروجیکٹ تھا۔ ماضی میں اس سے ملتے جلتے کچھ تجربات ہوئے، مگر وہ ناکام ٹھہرے کہ ان میں سے کسی میں ڈونلڈ ٹرمپ نہیں تھا۔ The Apprentice میں شرکا میرے ادارے میں ایک اعلیٰ پوسٹ حاصل کرنے کے لیے کڑا مقابلہ کرتے ہیں۔ عام طور سے سولہ سے اٹھارہ افراد حصہ لیتے ہیں۔ انھیں دو حصوں میں بانٹ دیا جاتا۔ پھر کوئی "ٹاسک" یا بزنس پروجیکٹ سونپا جاتا، جیسے کسی ایونٹ کا انعقاد کرنا، چندہ اکٹھا کرنا، کسی فرم کے لیے اشتہار تیار کرنا وغیرہ۔

فاتح ٹیم محفوظ رہتی ہیں، شکست کا سامنا کرنے والی ٹیم میرے بورڈ روم میں آتی ہے۔ جہاں اندھیرا بھی ہوتا ہے اور ٹھنڈ بھی۔ میرے ساتھ وہاں میرے قابلِ اعتبار ساتھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار میرے بچے بھی بورڈ روم میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں ہر چہرہ تنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ملازم ایسی جگہ آنا پسند نہیں کرے گا، جہاں آپ کی صلاحیتوں کو کڑی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

بے شک وہ لمحات اعصاب شکن ہوتے ہیں۔ شرکا نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے سخت سوالات کرتا ہوں...... تابڑ توڑ حملے کر کے اُن پر غالب آ جاتا ہوں...... اس دوران میں ان کو پرکھتا رہتا ہوں...... آخر میں جو شخص کمزور کڑی ہوتا ہے، میں اس کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں: "You're fired" یعنی تمھیں برخاست کیا جاتا ہے!

یہ جملہ میرے پروگرام کا ٹریڈ مارک ہے۔ کئی ہفتوں پر مشتمل اس پروگرام میں، میں متعدد بار "You're fired" کہتا ہوں، تا آں کہ آخری قسط آن پہنچتی ہے اور تب میں فائنل تک رسائی حاصل کرنے والے ایک شخص کو کہتا ہوں۔ "You're hired" وہ میرے ادارے میں ملازم ہو جاتا ہے۔

پروگرام کے پہلے ہی سیزن نے جھنڈے گاڑ دیے۔ یہ سب سے زیادہ دیکھا جانے والا شو تھا۔ ہم نے ہر برس نئے نئے تجربات کیے۔ بے پناہ کامیابیاں سمیٹیں، دنیا بھر میں خود کو منوایا اور خوب دولت کمائی۔ اس پروگرام کا مقصد یہ پیغام دینا تھا کہ اس تیز رفتار زندگی سے مقابلہ کرنے کے لیے سخت جان ہونا ضروری ہے۔ آپ کو کڑی محنت کرنی ہوگی، دوسروں کو شکست دینی ہوگی، ظالم بننا ہوگا...... فقط تب ہی آپ چوٹی پر پہنچ سکتے ہیں۔

اس پروگرام کے تجربے نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ عام لوگ خود فیصلہ کرنے سے کتراتے ہیں، وہ ذمہ داری اٹھانے سے خائف ہوتے ہیں، خود کو کمزور، غریب اور شکست خوردہ سمجھتے ہیں، اسی باعث وہ چاہتے ہیں کہ کوئی پُراعتماد اور طاقتور شخص ان کی رہنمائی کرے، کوئی دولت مند شخص ان کے مسئلے حل کر دے، وہ متکبر لوگوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور منکسر المزاج لوگوں کو اہمیت دینے سے کتراتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ٹی وی کے ذریعے آپ کروڑوں لوگوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، متنازع بیانات دے کر انھیں متوجہ کر سکتے ہیں اور خود کو غصیل ظاہر کر کے انھیں لبھا سکتے ہیں...... آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہی کچھ میں نے الیکشن مہم کے دوران کیا۔ میں قطعی برا آدمی نہیں جناب۔ متعصب ہوں، مگر اتنا بھی متعصب نہیں۔ گوری چمڑی پر فخر ہے، مگر مجھے نسل پرست مت کہیں۔ میں نے جو کچھ کیا، الیکشن جیتنے کے لیے کیا۔ اور کیا میرے مخالفین نے صنفی تفریق سے فائدہ اٹھانے کی سستی کوشش نہیں کی۔ کیا ڈیموکریٹک پارٹی نے پہلی خاتون صدر کا نعرہ نہیں لگایا تھا؟ کیا انھوں نے خواب بیچنے کی کوشش نہیں کی؟

بالکل کی جناب۔ انھوں نے بھی وہی چالیں چلیں۔ انھوں نے بھی میوزک کنسرٹ کیے، شوز کیے، نتائج سے پہلے ہی جشن منانا شروع کر دیا۔ انھوں نے بھی بارہ مصالحوں کی چاٹ تیار کی تھی...... مگر انٹرٹینمنٹ کی دنیا کو میں ان سے بہتر سمجھتا تھا اور پھر مجھے لوگوں کے مسائل کا بھی علم تھا۔ انھوں نے تباہ حال ریاستوں کو نظر انداز کر دیا، جب کہ میں نے ان بدحال لوگوں سے کہا۔ میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔

ٹی وی انتظامیہ کی جانب سے پہلے سیزن کی ہر قسط کے عوض مجھے پچاس ہزار ڈالر ملتے تھے، لیکن ہر گزرتے سیزن کے ساتھ میرا معاوضہ بڑھتا گیا۔ دسویں سیزن آتے آتے مجھے ایک قسط کے تین لاکھ ملنے لگے۔ میں سب سے بڑا پر

اسٹار بن گیا۔

میں نے The Apprentice کے چودہ سیزن کیے۔ پھر مجھے سیاست نے گھیر لیا۔ اب ممتاز اداکار اور کیلی فورنیا کے سابق گورنر آرنلڈ شیوازنگر یہ شو کریں گے۔ کیا وہ میری طرح اس ذمہ داری کو نبھا پائیں گے؟

سچ کہوں تو مجھے یہ مشکل لگ رہا ہے۔ اس پروگرام کی ریٹنگ بہت نیچے جانے والی ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ اس کی مقبولیت قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کروں۔ میں صدر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد پھر یہ شو کرنا چاہوں گا۔ یہ میری زندگی میں بہت معنی رکھتا ہے۔

''ہالی ووڈ واک آف فیم'' نامی معروف سڑک پر میرے نام کا بھی ایک ستارہ ہے، دو بار مجھے ایمی ایوارڈ جیسے مستند اعزاز کے لیے نامزد کیا گیا، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں انٹرٹینمنٹ کنگ ہوں۔

☆☆☆

میرے صدر بننے کے بعد سوشل میڈیا پہ وہ ویڈیوز وائرل ہوگئیں، جن میں مختلف ریسلرز میری دھنائی کر رہے ہیں۔

بھائی آپ کب سمجھیں گے، امریکا میں کسی بھی شے کو کامیاب بنانے کے لیے اسے مصالحے دار بنانا ضروری ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے، ریسلنگ انٹرٹینمنٹ (WWE) میں اصلی مقابلے ہوتے ہیں۔ کیا وہ واقعی آپس میں لڑتے ہیں، یہ خون اور چوٹیں اصل ہوتی ہیں...... جی نہیں، یہ سب اسکرپٹ ہے، یہ سب ریسلر دراصل اداکار ہیں۔ کیونکہ میں بھی انٹرٹینمنٹ کی دنیا کا آدمی تھا، اس لیے وقتاً فوقتاً WWE کے مقابلوں میں شریک ہوتا رہا۔ البتہ اپریل 2007 کی اس سرد شام کا ذکر ضروری ہے جب میں نے ایک دھماکے دار انٹری کی۔

نیویارک میں منعقدہ ریسلنگ ایونٹ اختتام کے قریب تھا۔ ورلڈ ریسلنگ انٹرٹینمنٹ کا سی ای او، ونس مکمین ...... جو میرا دوست بھی ہے، مائک ہاتھ میں تھامے اکھاڑے میں کھڑا تھا۔ بڑا کمال کا اداکار ہے اور اس شام بھی وہ خوب شور مچا رہا تھا۔ حاضرین اس پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

جواب میں اس نے وہاں آنے والوں کو غریب اور پھٹے حال کہہ کر ان کا مذاق اڑایا اور کہا۔ ''مجھے تم غریبوں کی کوئی پروا نہیں۔ میں ایک امیر آدمی ہوں۔''

اچانک ہال کا داخلی حصہ روشنی میں نہا گیا۔ ستر ہزار حاضرین چونک اٹھے۔ ونس بھی داخلی حصے کی طرف دیکھ رہا تھا اور تب میں ہال میں داخل ہوا۔ شور اٹھا۔ نعرے چھت تک پہنچ گئے۔ ونس بوکھلا گیا۔ اچانک کچھ رنگین دھماکے ہوئے ...... آسمان سے کچھ گر رہا تھا۔ بظاہر یہ رنگ برنگی کاغذ کے ٹکڑے تھے، جو تیرتے ہوئے نیچے آرہے تھے، مگر جب وہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے، وہ خوشی سے نہال ہوگئے۔ وہ دس دس ڈالر کے اصلی نوٹ تھے!

بھئی، جب مجھ جیسے ارب پتی میدان میں داخل ہوگا، تو نوٹ ہی برسیں گے ناں۔ خیر، تو اس طرح میں ریسلنگ کے مختلف ایونٹس میں شرکت کرتا رہا۔ کبھی کبھی مقابلے بھی کیے۔ جو جعلی مقابلے ہوتے۔ کبھی میں کسی کی پٹائی کرتا، کبھی کوئی میری دھنائی کرتا۔ یہ شوبز ہے پیارے۔

خیر، اس پورے عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی میں ملکی سیاست سے غافل نہیں رہا۔ میں باقاعدگی سے اخبارات پڑھتا تھا۔ قریبی دوستوں سے طویل بحث ہوتی۔ میں ٹاک شوز میں شریک ہوتا رہا، جن میں بے لاگ تبصرے کرتا۔ 2007 میں لیری کنگ کے پروگرام میں سابق صدر جارج بش پر میں نے سخت تنقید کی۔ میں اس کی عراق پالیسیوں کا ناقد تھا۔ ان کی وجہ سے ہمیں نقصان پہنچا۔ میرے بیان پر بش اور اسٹیبلشمنٹ ناراض بھی ہوئی، مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

بش پر تنقید کے باوجود میں نے 09-2008 کے انتخابات میں ریپبلکین امیدوار جان مکین کی بھرپور حمایت کی۔ بدقسمتی سے ڈیموکریٹس کا ''پہلا سیاہ فام امریکی صدر'' کا نعرہ جیت گیا اور وائٹ ہاؤس میں اوباما پہنچ گیا۔ مگر اب...... حالات بدل گئے ہیں۔ اب وائٹ ہاؤس میری جاگیر ہے۔ میں ہوں دنیا کا طاقتور ترین شخص۔

میرے دشمنوں کو چاہیے کہ تیار ہو جائیں۔ میں انھیں خاک میں ملا دوں گا۔ امریکا پھر عظیم ترین ہوگا۔ یہی میرا مشن ہے۔ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا: ''میں قطعی نہیں چاہوں گا کہ دشمنوں کو کبھی یہ اندازہ ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں!''

دنیا کے سربراہان مجھے جیت کی مبارک باد دے چکے ہیں۔ اب وہ اپنی خارجہ پالیسی پر غور کر رہے ہیں۔ وہ فکرمند ہیں کہ مجھ جیسے اڑیل شخص سے کیسے معاملہ کیا جائے۔ میرے حریف بھی بوکھلاہٹ کا شکار ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیے...... کیونکہ اب ڈونلڈ ٹرمپ امریکا کا صدر ہے۔
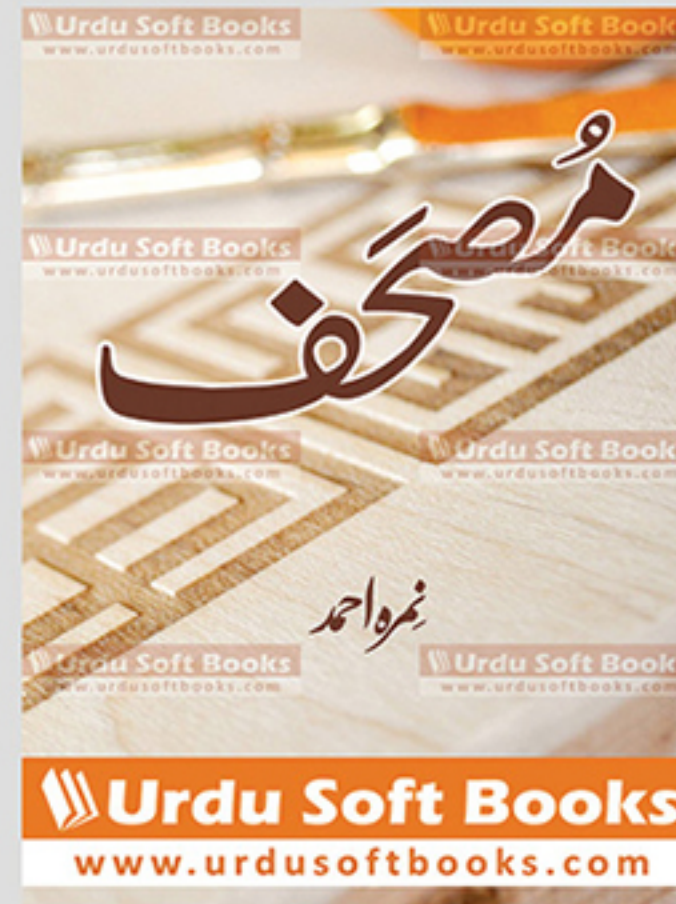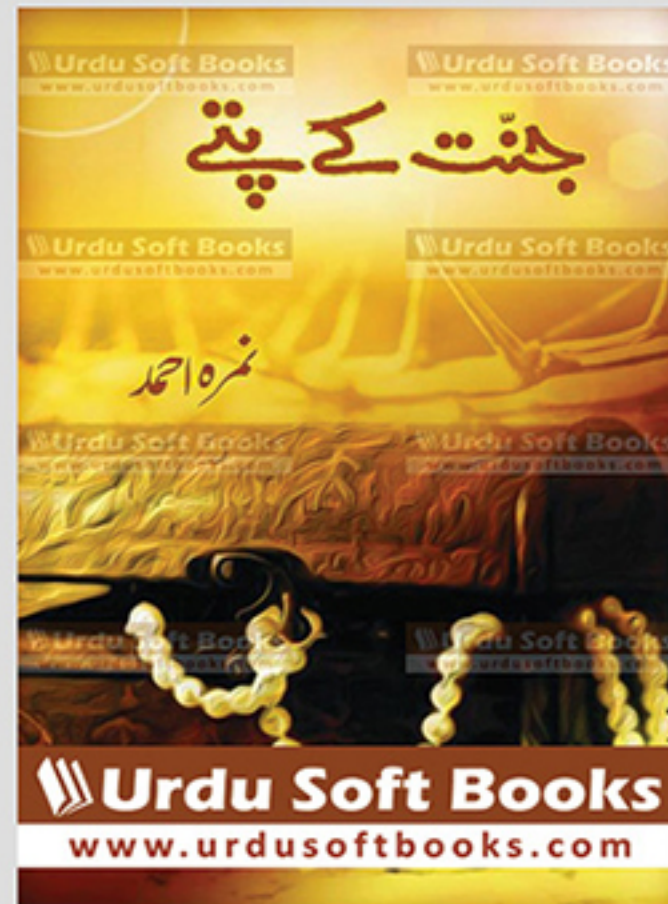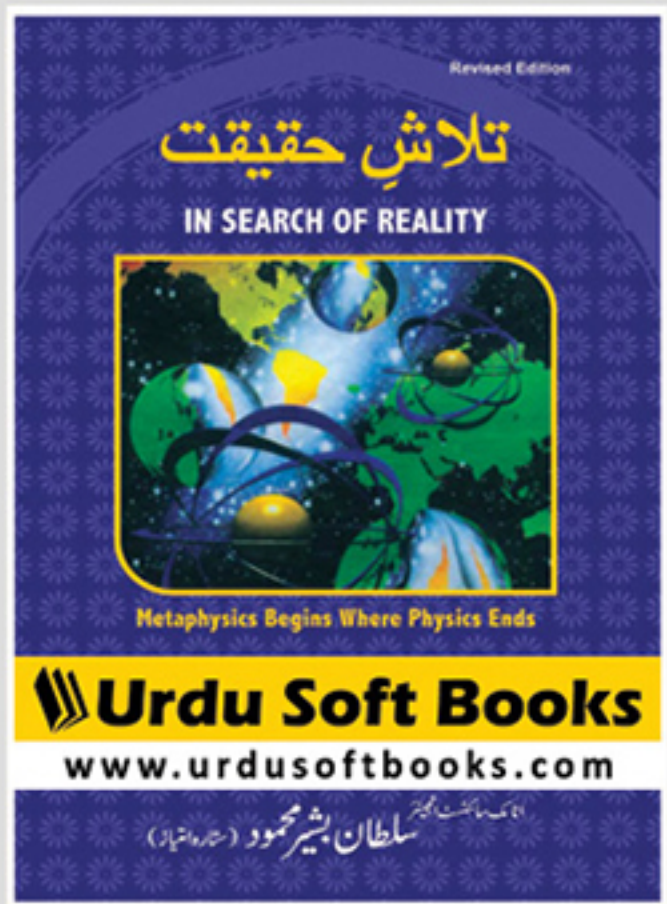
سراب

راوی: شہباز ملک

قسط نمبر:116

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایك کشش اور ایك للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

INDIA

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہروتی تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور چیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر......“ مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے لگ کر کہا ”پاپا“ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زینی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کرکے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچادیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسر نو تیاری کرانا شروع کردی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہوگیا اور اس نے زیر لب کہا ”اعلان جنگ!“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کردیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا

تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ ابھی سوہرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو کیرٹ کی بیٹی تھی۔ کیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔

اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا کے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شامین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شامین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شامین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زیبی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امداد غیبی بن کر آ گیا۔ اس کے ساتھی نے زیبی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ریناٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو لتستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ حد نظر تک برف ہی برف تھی۔ سفیر، عبداللہ اور وسیم کو غار میں چھوڑ کر میں راستہ تلاش کرنے باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے قید کر لیا۔ قید کرنے والے ریاست خان کو کسی سے ملنا تھا۔ ہم نے پہچان لیا کہ وہ انڈین بندہ ہے۔ ریاست خان کو حقیقت کا پتا چلا کہ وہ نادانستگی میں انڈین کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ محب وطن تھا اس نے میرا ساتھ دیا اور اس بندے کی خوب دھنائی کی اور اسے انڈیا میں دھکیل دیا۔ پھر ہم سب پیدل کسی آبادی کی تلاش میں نکلے۔ ایک چھوٹی سی آبادی نظر آ گئی۔ وہ لوگ مہمان نواز تھے۔ انہوں نے ایک گاڑی جو نگر جا رہی تھی اس میں میرے ساتھیوں کو بھیج دیا کہ وہ جا کر نگر سے گاڑی لے آئیں۔ میں اسی آبادی میں تھا کہ امداد شاہ نامی بندے سے ملاقات ہوئی جو گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ہم ریاست خان اور اس کے دستوں کے ساتھ چل پڑے۔ امداد شاہ نے دھوکے سے مجھے اور ریاست خان کو قید کر لیا اور تشدد کرنے لگا۔ مگر میں نے پہلے خود کو آزاد کیا اور پھر ان سب پر قابو پا لیا۔ امداد شاہ کو لے کر ہم آگے بڑھے۔ ریاست خان کو اسپتال میں داخل کرایا اور نئے سفر پر نکل پڑے۔ راستے میں کئی بار مرشد کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا مگر میں اس کے گھیرے سے نکلتا رہا۔ میں جلد سے جلد راولپنڈی پہنچنا چاہتا تھا راستے میں ایک ہوٹل میں رکا وہاں ایک آدمی کو سر پکڑے روتے دیکھا تو اس کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس کی بیٹی کو ایک لالچی دولہا سے بچایا اور راولپنڈی کے لیے چل پڑا۔ سفیر وغیرہ سے مل کر خانقاہ پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔

(اب آگے پڑھیں) ....

اتنی اطلاع میرے لیے کافی تھی۔ میں نے ٹھان لیا تھا کہ کسی بھی طرح اندر داخل ہو کر رہوں گا۔ روز روز کی موت سے اچھا ہے کہ ایک بار ہی موت گلے لگ جائے۔ اتنے دن کی رسہ کشی ختم ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ اس خیال کے تحت میں نے سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ہمیں اس کے قلعہ نما مکان میں داخل ہونا چاہیے یا اسے باہر لانا ہوگا؟"

"سکہ اوپر اچھالیں، چت گرے گا یا پٹ۔ لیکن ٹاس کا فیصلہ سکہ اچھالنے سے ہی مشروط ہے۔ جب تک سکہ اچھالیں گے نہیں ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ ٹاس کس کے حق میں ہے۔" سفیر کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عبداللہ بولا:

"سیدھے سیدھے بولو کہ ہمیں گھس کر مارنا ہے۔" پھر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔

مجھے اپنے دوستوں کی یہی ادا پسند ہے کہ وہ ڈرتے نہیں ہیں۔ موت کو کھیل سمجھتے ہیں۔ وہ سب جب اس نکتے پر متفق تھے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا تو میں پیچھے کیوں ہٹتا۔ اس بارے میں، میں کچھ کہتا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون ندیم کا تھا۔ وہ مقدمے کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا "کل میں خود اس کے گھر آنے والا ہوں۔"

"کیا تم پنڈی پہنچ گئے؟"

"جی ہاں۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کل آ کر بتاؤں گا۔ اپنی جان جگر سے کہنا وہ کلیجی پکا کر رکھے۔ بہت دن ہو گئے اس کے ہاتھ کا بنا کھانا کھائے ہوئے۔"

"او بھائی کلیجی کی قیمت معلوم ہے؟ میرے پاس اتنا فالتو پیسا نہیں ہے۔ اب تک فیس کے نام پر ایک دھیلا تک نہیں دیا اور چلے ہیں کلیجی کھانے۔"

"اگر میں نے کلیجی نہ کھائی تو تمہارا کلیجہ کھانے پر غور کرنے لگوں گا۔ شاید تمہیں پتا نہیں کہ مجھے ایسے کئی نام معلوم ہیں جن کا ذکر بھی تمہاری زوجہ محترمہ کے سامنے کر دیا تو وہ تمہارا کلیجہ کچا کھا جائیں گی، کہو تو میں انہیں فون پر بتا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب باقی باتیں کل ہوں گی۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس کی دکھتی رگ پر میں نے انگلی رکھ دی ہے۔

مسکراہٹ میرے لبوں پر آ گئی تھی۔ فون رکھتے ہوئے میں نے سفیر سے کہا "ایک الجھن سی ہے؟"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"راستے میں دو بار مرشد کا فون آیا۔ وہ میری لوکیشن بھی بتاتا رہا ہے۔ تب سے میں اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ اس نے تعاقب میں جس کو لگا رکھا ہے وہ کہاں سے میری نقل و حرکت دیکھتا ہے؟"

"وہ کیا کہتا تھا؟ یعنی آپ کی لوکیشن کے بارے میں کیا کہتا تھا؟"

"بالکل صحیح لوکیشن بتاتا تھا۔ جس مقام پر کھڑا ہوں وہاں کے بارے میں سر مو فرق نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ارد گرد کا اچھی طرح جائزہ لیا لیکن ایسا کوئی نظر ہی نہیں آیا جو میری نگرانی کر رہا ہو۔"

"بات ہے تو عجیب۔" وسیم نے کہا۔

"کوئی عجیب بات نہیں۔ بعض دفع ایسا ہوتا ہے کہ سامنے کی بات سمجھ نہیں آتی اور ہم الجھے رہتے ہیں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ وہ کس طرح لوکیشن بتا دیا کرتا تھا۔"

"ہاں ہاں کہو گے کہ اس کے پاس جام جمشید تھا جس میں وہ بیٹھا ان کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔" وسیم نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"بالکل اس کے سامنے جام جمشید تھا۔ آئینہ سکندری تھا... ارے بے وقوف یہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہر انسان نظروں کے سامنے رہتا ہے۔" سفیر نے ہنستے ہوئے کہا "اس آئینہ سکندری کا نام گوگل ہے... عقل استعمال کرو۔ وہ گوگل ارتھ میں شہباز کے فون کا نمبر ڈالتا اور سرچ کرتا۔ گوگل لوکیشن بتا دیتا۔ یہ ایسی کون سی حیرت کی بات ہے۔ تم خود ابھی کسی کے فون کا نمبر انٹر کرو اس کا لوکیشن آ جائے گا۔ اب تو ایسے ایسے سوفٹ ویئر آ چکے ہیں جو مقام کیا، بہت کچھ بتا دیتا ہے۔"

"ہاں... یہ سامنے کی بات عقل میں نہیں آ رہی تھی۔ یہی ہوا ہوگا۔ وہ تو ہمارے اس گھر کا لوکیشن بھی دیکھ چکا ہوگا۔"

"اپنا موبائل ادھر دیں۔ یہ قیمتی موبائل ہے اس لیے ایسا ہو جاتا ہے۔" کہہ کر اس نے میرا موبائل لیا اور اس سے سم نکال لی پھر بولا۔ "اب اس کا باپ بھی ڈھونڈ نہیں سکتا۔ اب تو آپ کی بھی سمجھ میں یہ بات آ چکی ہوگی۔" سفیر نے کہا۔

"ہاں بہت کچھ سمجھ میں آ چکا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اب اصل مدعے کی طرف آتے ہیں۔ وہ یہ کہ اب کیا پروگرام ہے۔ مرشد کے ساتھ کیا، کب اور کیسا سلوک کیا جائے؟" وسیم بولا۔

”ابھی تو میں تھکا ہوا ہوں۔ ایسا کرتا ہوں کہ ایک نیند لے لیتا ہوں تاکہ ذہن فریش ہو جائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں آپ سو لیں ہم انتظار کر لیتے ہیں۔“ کہتے ہوئے سفیر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب باہر نکل گئے تو میں لیٹ گیا۔

میں نے اس وقت تو سوچنے کے لیے مہلت مانگ لی لیکن میرا ابھی ارادہ تھا کہ مرشد کو اس کے گھر میں گھس کر مارنا ہی بہادری ہے۔ ایک بار تو وہ بچ گیا لیکن اس بار اسے بچنے کا راستہ نہیں دوں گا تاکہ یہ روز روز کا قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا اس لیے میں نے بھرپور انداز میں پلاننگ پر غور کرنا ضروری سمجھا اور ان سب سے بہانہ کیا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔

ان سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ اب میں تھا اور میری تنہائی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تمام باتوں کو ایک سطر میں لا کر اس پر غور کرنا شروع کر دیا کہ حملہ کس طرح اور کس رخ سے کیا جائے۔ اندر جانے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کیا جائے۔ انہی سب باتوں پر غور کر رہا تھا کہ دروازے کو کسی نے تھپتھپایا۔ میں نے پوچھا، کون؟

”میں ہوں۔ مرجس۔“ باہر سے آواز آئی۔

”ارے ...تم کو بھی اجازت لینے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے وہ جیکٹ اتار دی تھی جو اس کی پہچان بن گیا تھا۔ جب سے وہ ہمارے ساتھ تھا اس کے جسم پر ایک ہی جیکٹ دیکھ رہا تھا۔ کئی بار میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بھائی اسے اتار دو لیکن وہ بس مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس لڑکی نے اسے دیا تھا جسے وہ اپنے گھر کی ملکہ بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے دوبارہ ضد نہیں کی تھی لیکن آج اس کو بغیر جیکٹ کے دیکھ کر میں نے پوچھ لیا ”تمہاری جیکٹ کہاں گئی؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ ... یہاں کچھ گرمی زیادہ ہے اسی لیے اتار دی۔“ پھر میرے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا ”میں ایک دوست کے پاس سے آرہا ہوں۔ آج مان لیا ہے کہ دنیا گول ہے۔“

”اچھا... اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔ وہ وجہ کیا ہے جس نے تمہیں سمجھایا کہ دنیا گول ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں جس دوست کے پاس گیا تھا وہ بھی گلگت میں رہ چکا ہے۔ اس کا نام نادر شاہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ریاست خان کا رشتے دار ہے۔ ریاست خان کو ہم اسپتال میں چھوڑ آئے ہیں لیکن وہ ہمارا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے فون پر نادر شاہ کو ہدایت دی ہے کہ ہم سے رابطہ کرے۔ ریاست خان بھی پنڈی آنے والا ہے۔“ مرجس نے بتایا۔

”تمہیں یقین ہے کہ نادر شاہ مخلص ہے۔ کہیں وہ بھی مرشد کا بندہ نہ ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”اپنے تئیں سوالات کر کے میں تو مطمئن ہو گیا ہوں۔ پھر بھی آپ اسے کرید کر تشفی کر لیں۔ آپ تجربے کار ہیں۔ زیادہ اچھی طرح سے حقیقت اگلوا سکتے ہیں۔ ویسے تو وہ مرشد کا مرید ہے لیکن اب وہ بھی مرشد سے بغاوت کرنا چاہ رہا ہے۔“

”صحیح ہے۔ اسے بلا لو ہم آزما لیتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔

”بلانا کیا ہے۔ ابھی کہیں ابھی بلا لوں، اس کا موبائل نمبر لے آیا ہوں۔ ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ آپ سے اجازت نہیں لی تھی۔“

”بلا لو....“

اجازت ملتے ہی اس نے فون نکالا اور کال کرنے لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہم کسی پر بھروسا نہیں کرتے لیکن اس وقت میں نے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ باتیں کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھ میں نے سکھ کی سانس لی اور دوبارہ سے لیٹ گیا۔ مگر لگتا ہے آرام مجھے نو انٹری کا بورڈ دکھانے پر اتر آیا تھا۔ وہ باہر گیا تھا کہ وسیم آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا ”مبارک ہو جناب.... آپ اپنے پیچھے ایک بندے کو بھی لے آئے تھے۔ وہ سڑک کے اس پار کھڑا کسی کو خبر دے رہا تھا کہ ہمارے بندوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس وقت وہ گیراج میں آرام کر رہا ہے۔ باہر کتے کے ساتھ آدمی کا بھی پہرا ہے۔ ان دونوں کو دھوکا دینا آسان نہیں۔ وہ کتنی ہی کوشش کر لے لیکن بھاگ نہیں سکے گا۔“

”یہ تمہارے آدمی کہاں سے آ گئے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”حضور، میں نے کل ہی پنڈ سے ہجرت کی ہے۔ اور میں اوّل عمر سے ہی پنڈ میں پودینہ کی کاشت کرتا تھا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا ”میں نے اپنے تمام کونٹیکٹ جمع کر لیے ہیں۔ صرف میں نے ہی نہیں۔ عبداللہ نے بھی اپنے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔“ اسی

وقت سفیر اندر داخل ہوا تھا کہ اسے چھیڑنے کے لیے وہ بولا۔ ''رہا سوال سفیر کا تو اس کی فوج ابھی ریزرو میں ہے۔ وہ آپ کے ہاں سب کو سمیٹ کر بیٹھیں ہیں۔ جس دن آگئیں اس دن ان کی پھرتی دیکھیے گا۔''

سفیر نے سلسلہ کلام کا آخری حصہ سنا تھا اس لیے تلملا اٹھا۔ وسیم نے سیدھی چوٹ کی تھی کہ وہ مونا کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ اسی لیے خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ''اور یہ جناب تو سادی کی ہر بات سے اختلاف کرتے ہیں۔ اگر وہ رات کو رات کہتی ہے تو یہ کہتے ہیں' نہیں یہ دن ہے۔''

''میں تو جدی پشتی زن مرید ہوں آپ کو اعتراض ہے؟'' وسیم لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔

''جد کی تو خبر نہیں کیونکہ میں ابھی اتنا بڑا گستاخ بنا نہیں ہوں لیکن تمہاری حرکتیں دیکھ کر دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم زن مرید ہو۔'' سفیر نے جواب الٹ دیا۔

''ابھی میں فون کر کے مونا کو کہتا ہوں کہ یہ جناب فرما رہے ہیں کہ میں مونا کی سنتا نہیں ہوں اور نہ اس کی باتوں پر کان دھرتا ہوں۔''

''ضرور ضرور۔ فون حاضر ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنا موبائل بڑھا دیا۔

ان دونوں کی بے معنی بحث طویل ہوتی جائے گی اس ڈر سے میں نے جلدی سے کہا ''ہم ایک اہم بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ تم آگئے۔ اور اس نے تمہیں چھیڑنے کے لیے بات بدل دی۔''

''واہ یہ کیا بات ہوئی.. یہ کوئی صنف مخالف ہیں جو میں ان کو چھیڑوں گا۔'' وسیم پھر بول اٹھا۔

سفیر کچھ کہتا کہ میں نے دوبارہ دخل دیا ''بات ہو رہی تھی مرشد کی کہ اس سے کس حکمت عملی کے تحت پنجہ آزمائی کی جائے۔''

''آپ کہتے ہیں تو میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔'' وسیم نے کہا ''میں یہ بتا رہا تھا کہ ایک بندہ ہمارے گھر کی ریکی کر رہا تھا کہ ہم نے اسے چھاپ لیا اور اسے گیراج میں لاکر بند کر دیا۔''

''کب؟'' سفیر نے پوچھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ کام ابھی اور اسی وقت ہوا ہے اسی لیے سفیر بھی لاعلم ہے۔ ورنہ یہ بات اس کے علم میں ضرور ہوتی۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے اسے نصیر اور اشفاق نے پکڑا ہے۔ اس کی زبان کھلوانے میں کچھ دیر لگی۔ اس سے نمٹ کر میں یہ خبر شہباز کو دینے آیا ہوں۔ تمہیں بتانے کا وقت ہی نہیں ملا۔''

''کیا اگلوایا؟'' سفیر نے پوچھا۔

''دو چار ٹھنڈے ہی کافی ثابت ہوئے۔ دس منٹ میں ہی وہ ریڈیو کی طرح بجنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اسے شہباز کی ریکی کا حکم ملا تھا اور وہ بس اسٹاپ پر پہلے سے موجود تھا مگر جب شہباز وہاں نہیں پہنچا تو اس نے موبائل پر اپنے باس سے بات کی تب اسے اس سڑک پر جانے کو کہا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہیں کسی عمارت میں شہباز ہے۔''

''یہ سب آئی فون کا کمال ہے کہ وہ تمہاری لوکیشن کو ٹریس کرتے رہے۔ جب سم بند ہو گئی تو اندھیرے میں آگئے۔'' سفیر نے کہا تو مجھے اس نکتے پر غور نہ کرنے والی بات یاد آگئی اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔

''چلو چل کر اس سے دو تین سوالات میں بھی کر لوں۔'' سفیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''چلو میں بھی چلتا ہوں۔'' میں بھی بیڈ سے اتر گیا۔

ہم کمرے سے باہر نکل رہے تھے کہ مرجس داخل ہوا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا ''وہ بندہ آ رہا ہے۔ بس آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔''

''اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔'' کہہ کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وسیم سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ ہم سب گیراج کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ کتے کے پاس چوکیدار کھڑا تھا۔ اس وجہ سے کتا خاموش تھا۔ ہم اس کے برابر سے گزر گئے لیکن اس نے کوئی آواز نہ نکالی۔

اندر پہنچ کر دیکھا کہ ایک بندہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے' اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ وہیں قریب دو کرسیوں پر دو بندے پستول بدست بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ میں اس بندے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا پھر وسیم سے کہا۔ ''کیوں نہ اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا جائے تا کہ سوالات کے جوابات دینے میں اسے آسانی ہو۔''

وسیم نے اشارہ دیا اور ان دونوں میں سے ایک نے اسے سیدھا کیا پھر اسے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ میں اس کے مزید قریب ہو گیا اور پھر پوچھا ''ہاں بھائی اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کس کے کہنے پر میرا پیچھا کر رہے تھے۔''

وہ خاموش رہ کر میری طرف دیکھتا رہا تب میں نے سفیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''یہ جو ہے نا' اپنے کام کا

ماہر ہے۔ پورے پاکستان میں اس کے جوڑ کا بندہ نہیں ملے گا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ اذیت دینے پر اتھارٹی رکھتا ہے۔ اس کے آگے گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری مرضی کہ تم بولو یا خاموش رہو۔''

وہ ایسا کمزور بندہ تھا کہ دوسری دھمکی کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور وہ بول اٹھا۔ ''میں نے تو ان صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔''

''ایک بار پھر بتاؤ گے تو گناہ نہیں ہوگا۔ شاباش شروع ہو جاؤ۔'' وسیم نے کہا۔

''مجھے فون پر کہا گیا کہ بس اسٹینڈ پہنچو۔ مری والی بس پر ایک آدمی ہوگا جس نے دھاری دار قمیص اور نیلے رنگ کی پینٹ پہن رکھی ہے۔ اسے گھیر کر ہمارے پاس لاؤ۔ لیکن وہ بس تو آ گئی مگر اس میں ایسا کوئی بندہ نہیں تھا جس نے دھاری دار شرٹ اور نیلے رنگ کی پینٹ پہن رکھی ہو۔ میں نے فون پر بتایا تو ادھر سے کہا گیا کہ وہ راستے میں اتر گیا ہے۔ تم فوراً مرکزی سڑک پر پہنچو۔ وہاں داہنی جانب ایک پوش علاقہ ہے اس میں اسے تلاش کرو کہ وہ کس مکان میں ہے۔''

''تمہیں یہ حکم دیتا کون ہے؟''

''احمد سعید۔'' اس نے کہا تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں کہ وہ خانقاہ کو نئے سرے سے بنوا رہا ہے۔

''اچھا اب آرام کرو میں دیکھتا ہوں کہ احمد سعید ہے کیا چیز۔'' کہہ کر میں واپسی کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ رک گیا اور بغیر مڑے وسیم سے کہا ''اس کے ہاتھ پیر کھول دو لیکن سمجھا دینا کہ باہر مسلح بندے بھی ہیں اور کتا بھی جو ایک منٹ میں چیر پھاڑ دے گا۔''

باہر نکلا ہی تھا کہ مرجس مجھے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی کہا۔ ''وہ بندہ آ گیا ہے۔ آپ اس سے مل لیں۔''

میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ سامنے ہی ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ چہرے سے ہی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مدرسہ سے اٹھ کر آیا ہو۔ بہت بھولا بھالا۔ عام سے کپڑے میں ملبوس۔ سر پر جالی والی ٹوپی اور کندھے پر چار خانوں والا رومال۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بلیغ انداز میں سلام کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا اس لیے مجھے اسے بیٹھنے کا کہنا پڑا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ ''ہاں بھائی کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میرا نام نادر شاہ ہے اور مجھے ریاست خان نے فون پر کہا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔ وہ بھی شام تک پہنچ جائیں گے۔ آپ کا ساتھ دینے کے لیے ریاست نے اس لیے مشورہ دیا ہے کہ وہ میرے حالات اور خیالات سے آگاہ ہے۔ دراصل میں سمجھ چکا ہوں کہ مرشد اور اس کے لوگ اللہ کا نام لے کر شیطان کا کام کر رہے ہیں۔ مجھے جہنم کی آگ میں جلنا نہیں ہے اس لیے میں چاہ رہا ہوں کہ مرشد کا یہ کاروبار بند ہو جائے۔''

''ہر بات کی ایک وجہ ہوتی ہے۔ اپنے پیر سے تم بغاوت کرنے کی سوچ رہے ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ کوئی بات ہے جس کی وجہ سے تم اس کے دشمن ہو گئے؟'' سفیر نے سوال کیا۔

''مجھے اس سے تو شکایت ہے ہی لیکن اصل شکایت یہ ہے کہ وہ دین کا نام لے کر لوگوں کو گناہ کے راستے پر چلا رہا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کا ساتھ بھی نہ دو۔''

''تو پھر تم خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔'' وسیم بولا۔

''یہی کیا ہے لیکن وہ چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا ہے۔ میں سرگودھا چلا گیا تھا۔ اس کے کارندے وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب تک اس کی کمر نہیں ٹوٹے گی وہ اسی طرح ستاتا رہے گا۔''

''وہ جہاں بیٹھا ہے سنا ہے وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔''

''اس کو کمزور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ احمد سعید کو دبوچ لیں۔ اگر وہ مرشد سے الگ ہو گیا تو مرشد بالکل ٹوٹ جائے گا خانقاہ کو بھول بھلیاں میں تبدیل کرنے والا وہی شخص ہے۔''

''احمد سعید ملے گا کہاں۔''

''وہ ایک ہفتہ پہلے تک خانقاہ میں ہی رہ رہا تھا لیکن اب وہ ایک بنگلے میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس نے ایک سولہ سال کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر وہ اس لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے۔''

''تم ایسا کرو کہ اپنے ساتھ وسیم کو لے جاؤ۔ اسے بنگلا بھی دکھا دینا تاکہ وہ اس کو دبوچنے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ سکے۔''

''جی ضرور۔ میں ان کو ساتھ لے جا کر وہ بنگلا دکھا دیتا ہوں۔'' کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''یاد رکھنا ہمیں مرشد کی سلطنت کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ سوچ کر رکھنا ہے کہ یہ ہماری آخری جنگ ہے۔ اس وقت وہ

اپنے قلعہ نما مکان میں بیٹھا خود کو محفوظ سمجھ رہا ہے اور اسی کو ہمیں غلط ثابت کرنا ہے۔“ میں نے وسیم سے کہا اور پیٹھ پر تھپکی دے کر بولا ”اللہ تمہیں کامیابی عطا کرے۔“

وسیم کے جاتے ہی میں نے کہا۔ ”سفیر یہ ایک اہم بات ہے کہ مرشد نے ڈھیروں ڈھیر لوگوں کو اکھٹا کر لیا ہے لیکن ان پر قابو نہیں کر پا رہا۔ یعنی ان کو صحیح طور پر قابو میں رکھ نہیں سکا ہے۔ تبھی تو لوگ اس سے ٹوٹ رہے ہیں۔“

”مرشد کے لوگ دراصل اس کے مرید ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان سے کوئی اہم کام نہیں لے رہا ہوگا۔ صرف افرادی قوت دکھانے کے لیے وہ ان کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔“

”تو پھر ایسے لوگوں کو ڈھونڈو۔ یہی لوگ ہمارے کام کے ہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھ کر اس کا ساتھ دے رہے ہیں کہ بابا جی کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مسلکی بنیاد پر اس کی خانقاہ کو برباد کیا گیا ہے۔ جب انہیں اس کی اصلیت کا پتا چلتا ہے تو وہ دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ایسے باغیوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔“

”اتنے بڑے شہر میں اس کے مریدوں کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی کوشش کروں گا۔“

”شاباش، یہ ہوئی نا بات۔ اب نکل پڑو تاکہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔“ میں نے کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سفیر ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے آنکھیں بند کی تھیں اور سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے عبداللہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”اب تم بھی بتا دو کہ تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”سنا آپ سو رہے ہیں؟“ عبداللہ نے گھبرا کر کہا۔

”پتا نہیں کس دشمن نے اڑا دی ہے۔ میں تو بستر پر لیٹا گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ بچپن کو بلا رہا تھا۔“

”بس.. یوں ہی آ گیا... اچھا میں جا رہا ہوں۔ آپ سو جائیں۔“

”یار تم بھی نا... لگتا ہے برا مان گئے... میں تو مذاق کر رہا تھا... بولو کیا بات ہے؟“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”کچھ کہنے ہی آئے ہو گے اور وہ بات یقیناً ضروری ہو گی اس لیے کہہ ہی دو۔“

”وہ بات یہ ہے کہ میرے ایک بندے نے ایک ایسے آدمی کو ڈھونڈا ہے جو خانقاہ کی تعمیر کے وقت مزدوری کر چکا ہے۔“

”کہاں ہے اسے بلاؤ۔“

”وہ باہر بیٹھا ہے۔“ وہ مڑ گیا اور باہر نکلنے سے پہلے بولا ”ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔“

عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں کہا ”بو آج آرام کرنا کفر بن گیا ہے۔ عبداللہ کے بندے سے سوال جواب کرنا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

ابھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ عبداللہ ایک بندے کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ جواں سال تھا لیکن چہرے اور کپڑوں سے ہی مفلوک الحال نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سامنے بچھے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا ”ان کے لیے چائے کا کہہ دو۔“

عبداللہ نے کمرے میں لگے انٹر کام پر کسی کو چائے لانے کا کہا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے اس بندے کی طرف رخ کیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ شاید وہ امارت سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ریلیکس دینے کے لیے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام شیدے ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”بھائی شیدے آپ روز کتنا کما لیتے ہو۔“

”جی اگر دہاڑی لگ گئی تو ہر روز ایک ہزار روپیا لیکن کام ہفتے میں دو تین دن ہی ملتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کیا تم چائے وغیرہ بنا لیتے ہو؟“

”بہت اچھی تو نہیں لیکن جیسی ہم لوگ پیتے ہیں۔ بنا لیتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ آتے وقت تم نے باہر لان دیکھا ہے نا... کیاری میں طرح طرح کے پھول لگے ہیں۔ گھانس بڑے قرینے سے کٹی ہوئی ہے۔ اگر تمہیں مالی کے ساتھ کام کرنا پڑے تو کیا کر لو گے۔“

میری اس بات سے اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک آ گئی۔ جو میں چاہ رہا تھا وہ میں نے حاصل کر لیا۔ اس کے اندر جو ہچکچاہٹ تھی، جو مرعوبیت تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کے اندر یہ لہر پیدا ہو گئی کہ اسے میں نوکری پر رکھ لوں گا۔ وہ مطمئن دکھائی دینے لگا تھا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اسے چائے پینے کا اشارہ کرتے ہوئے میں نے کپ اٹھا لیا اور

سپ لے کر کہا ''تم کل سے کام پر آسکتے ہو۔ تمہیں فی الحال دس ہزار دوں گا اور بعد میں اضافہ کر دوں گا۔''

عبداللہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے بندے کو کس مقصد سے بلایا تھا اور میں اسے کون سا کام سونپ رہا ہوں۔

میں نے چائے کا کپ برابر میں رکھی تپائی پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی چائے ختم نہیں کر پایا تھا۔ میں نے عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا ''ان کو ایڈوانس میں آدھی تنخواہ دے دو۔''

عبداللہ نے بغیر کچھ پوچھے.. جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس وقت اس کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ اس کے ہر انگ سے خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تب میں نے اس سے پوچھا ''شیدے بھائی آپ مرشد کے ہاں کب سے کام کر رہے تھے۔''

''جی میں نے ان کے ہاں تین مہینے تک کام کیا ہے لیکن دربار میں حاضری دس بارہ سال سے دیتا آرہا ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ ان کی خانقاہ جب تباہ ہو گئی تو بھی تم لوگ آتے رہے۔ ایسا کیوں؟''

''شاہ جی نے بتایا تھا کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو نہیں چاہتے کہ ہماری خانقاہ میں کوئی آئے۔ یہاں جو درس دیا جاتا ہے ان لوگوں کی نظر میں یہ غلط ہے اسی لیے انہوں نے دہشت گردوں سے حملہ کرا دیا۔''

شیدے کی بات سن کر میں نے قہقہہ لگایا تو وہ بولا ''جی میں سمجھ گیا کہ آپ کیوں ہنسے ہیں۔ جب میں خانقاہ کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے وہاں رہنے لگا۔ رہتا اس لیے تھا کہ یہاں میرے بیوی بچے تو ہیں نہیں، سب گاؤں میں ہیں۔ اس لیے وہیں ایک شیڈ کے نیچے رات کو سو جاتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے میں نے شاہ جی کا اصل چہرہ دیکھا۔ وہی شخص جو دن میں نیکی کی ہدایت کرتا ہے، رات میں گناہ کا بازار سجا لیتا ہے۔ یہ ڈائلوگ ایک فلم کا ہے لیکن بات سچی ہے۔ یہی سب دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا لیکن روزی لگی ہوئی تھی اس لیے میں کچھ کہتا نہیں۔''

''کام کرنے کے درمیان بھی تم اس کی محفلوں میں جاتے تھے؟''

''دن والی محفل میں جاتا تھا۔ رات والی محفل میں صرف گنے چنے لوگ ہوتے تھے۔''

''اندر خانقاہ کیسی بنائی ہے؟''

''اتنی عمدہ ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ دن رات کام ہوتا تھا۔ سب کو ڈبل ڈبل دہاڑی دی جاتی تھی لیکن کام بھی گدھے جتنا کرنا پڑتا تھا۔ اندر ایک تین منزلہ عمارت ہے جو واعظ کے لیے مختص ہے، نیچے بڑی محفل ہوتی ہے اور اوپر پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اوپر کی منزل پر صرف ایک چھوٹا ہال ہے باقی کمرے ہی کمرے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ دوسری اور تیسری منزل کو ملا کر گنیں تو کئی سو کمرے ہیں۔ وہ عمارت صرف دو مہینے میں تیار ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے کہا بھی تھا کہ ابھی پلاستر نہ کریں بنیاد بھی کچی ہے لیکن شاہ جی کا حکم تھا اس لیے ہمیں کچے وقت میں ہی پلاستر کرنا پڑ گیا تھا۔''

''اس عمارت میں پلاستر تم نے کیا تھا؟''

''نہیں جی..... اوپر کسی اور نے پلاستر کیا ہے۔''

''کل کتنے کمرے ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''الہی توبہ..... قطار در قطار اتنے کمرے ہیں کہ ان کو گنا ہی نہیں جا سکتا۔ تین منزلہ عمارت اور کمرے اتنے کہ یقین نہ آئے۔ آٹھ بائی آٹھ کے کمرے ہیں اور ہر منزل پر پچاس ساٹھ کمرے ہیں۔ جگہ بھی تو دیکھیں کتنی بڑی جگہ پر بلڈنگ کھڑی کی گئی ہے۔''

''تمہاری نوکری پکی اب تم جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ تم اب ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔'' کہہ کر میں نے اسے جانے کا اشارہ دیا اور خود سونے کے لیے کروٹ بدل لی مگر آرام اپنی قسمت میں کہاں ہے۔ ابھی میں نے آنکھیں بند ہی کی تھی کہ نادر شاہ اور وسیم واپس آگئے۔ وہ دونوں پُر جوش تھے۔ وسیم نے کہا: ''ہم نے آدھی جنگ جیت لی ہے۔''

''ایسا کیا کر دکھایا؟''

''اگر کہیں تو میں پورا واقعہ من و عن بیان کر دوں۔'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وسیم کا جوش دیکھ کر میں نے اجازت دے دی۔ مجھے ہمہ تن گوش دیکھ کر اس نے بتانا شروع کیا ''ہم لوگ یہاں سے نکلے اور مین روڈ پر پہنچے۔ مین روڈ پر معمول سے زیادہ رش ہونے کے سبب میں دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔

''لگتا ہے آگے چیک پوائنٹ لگی ہوئی ہے۔'' نادر نے رینگتی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں اس روڈ پر باقاعدہ کوئی چیک پوائنٹ نہیں ہے مگر آج.....''

''ہاں، شہر کے حالات بھی تو عجیب سے ہو گئے ہیں۔'' نادر نے ایک موٹر سائیکل سوار کو گھورتے ہوئے کہا جو

گاڑیوں کے بیچوں بیچ تیزی سے راستہ بناتا ہوا گزر رہا تھا۔
”مگر کر کچھ نہیں سکتے۔“

”بیچارے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو نادر مسکرا دیا۔ گاڑی اب چیونٹی کی چال رینگ رہی تھی۔ دائیں بائیں گاڑیوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ رکشوں اور موٹر سائیکلوں کا شور اور سلنسر کے دھوئیں سے بچنے کے لیے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ سنٹر لائن میں سرکتے ہوئے ہم چیک پوائنٹ تک پہنچ گئے۔

تین پولیس مین گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ دو تین روڈ کے بیچ لگائی گئی رکاوٹوں کے پاس کھڑے تھے۔ ایک موٹی توند والا کانسٹیبل ہمارے پاس آیا۔ میں نے شیشہ نیچے کر دیا۔ اس نے جھک کر پہلے ہم دونوں کو دیکھا پھر گاڑی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں جی صاحب کہاں سے آ رہے ہو اور کدھر کو جانا ہے؟“

”یونیورسٹی سے آ رہے ہیں اور گھر جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ اس نے طویل ہنکارا ابھرا۔ ”ذرا ڈگی کھولنا۔“

میں نے بٹن دبا کر ڈگی کھول دی۔

”اوئے اقبال ڈگی چیک کر۔“ اس نے قریب کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔ وہ سر ہلاتا ہوا ڈگی کی جانب چلا گیا۔

”آپ لوگ باہر آ جائیں۔ مجھے اندر سے گاڑی چیک کرنی ہے۔“

ہم دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی اچھی طرح چیک ہو چکی تو ہمیں جانے کا گرین سگنل ملا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اس روڈ پر تو کوئی چیک پوائنٹ نہیں تھا۔ آج یہ غیر معمولی چیکنگ، خیریت ہے نا؟“

بھاری توند والا کانسٹیبل دوسری گاڑی کی جانب بڑھنے کی بجائے رک کر مجھے گھورنے لگا۔

”نیوز نہیں دیکھتے ہو کیا؟“ اس نے نسبتاً غصے سے پوچھا۔

”پڑھائی دیگر سرگرمیوں کے لیے فرصت کہاں دیتی ہے؟“

کانسٹیبل نے چبھتی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نیوز دیکھا کرو حالات حاضرہ کی جان کاری ہوتی ہے۔“

”جی بہتر۔“ میں اس کی بات سن کر بولا۔ پھر میں نے یوں سر ہلایا جیسے پوری بات سمجھ گیا ہوں اور گیئر لگاتے ہوئے نادر سے بولا۔ ”حکومت کے ساتھ وفاداری نبھا رہا ہے۔“

پھر میں نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر میں ہم احمد سعید کے بنگلے کے باہر موجود تھے۔ سفید رنگ کی کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں تھا۔ ناصر میرے ساتھ براجمان تھا۔ شام ڈھلے کا وقت تھا۔ دور افق پر سرمئی بادل زرد روشنی میں ڈھلنے لگے تھے۔ روڈ بالکل سنسان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کے مکان مکینوں سے خالی ہیں۔ روڈ کے ایک طرف بڑے بڑے بنگلے اور خوبصورت کوٹھیاں تھیں، جبکہ اس طرف جہاں احمد سعید کا بنگلا تھا کافی پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے۔ پلاٹ پر مکینوں کی گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ میں نے بھی اپنی کرولا اسی قطار میں کھڑی کر دی۔ اب احمد سعید کا بنگلا ہمارے سامنے تھا۔

”تو یہ ہے احمد سعید کا بنگلا؟“ میں نے پوچھا۔ میری نظریں بنگلے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ہاں یہی ہے، بنگلا نمبر اکیس۔“

”کافی بڑا بنگلا ہے۔“

”ہاں.... سنا ہے یہ پہلے اکانومی فلیٹوں کے ایک کمپلیکس میں رہتا تھا۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”اور فلیٹ بھی کمپلیکس کے دیگر فلیٹوں سے نچلے درجے کا تھا۔ مگر اب شہر کی کئی ہاؤسنگ سوسائٹیاں، بڑی بڑی کالونیاں، شاپنگ مال، کئی بڑے شہروں میں کوٹھیاں اور بنگلے۔ ان سب کا مالک ہے احمد سعید۔“ اسے جو کچھ یاد تھا دہرا دیا۔ ”یہی نہیں سنا ہے موصوف نے اب ایک موبائل کمپنی میں شیئر بھی خرید لیے ہیں۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے۔ ”شہر کی کئی ہاؤسنگ سوسائٹیاں، بڑی بڑی کالونیاں، شاپنگ مال، کلفٹن کے ساحل سمندر پر بڑے بڑے ہوٹل، کئی بڑے شہروں میں کوٹھیاں اور بنگلے۔ ان سب کا مالک ہے احمد سعید۔“ اسے جو کچھ یاد تھا دہرا دیا۔

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے مراد علی پرلے درجے کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔“

”وہ بھی سچ ہے۔“

”گویا مرشد کے پاس آتے ہی اس کے ہاتھ الہ دین کا چراغ ہاتھ آ گیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں، سنا گیا ہے کہ مرشد کے پاس آنے کے کچھ دن

پہلے ہی وہ کیا یکا یک امیر ہو گیا تھا۔"

"اس کے معنی ہیں کہ دولت کی دیوی کسی اور ذریعہ سے اس تک پہنچی۔"

"جی ہاں، وہ یکا یک ہی امیر بنا ہے۔ امیر بننے کے بعد اس نے مرشد سے دوستی کی۔ اس کی دوستی کے بعد مرشد جو بالکل ٹوٹ چکا تھا، پھر سے عملاً میدان میں آ گیا۔"

"گویا جو اسے امیر بنا رہا تھا اسی نے اسے مرشد سے راہ رسم بڑھانے پر اکسایا اور وہ مرشد کے قریب ہو گیا مگر اب بس چند دنوں کی بات ہے۔" میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جلد ہی سب سے تجھے ہو جائے گا۔" میری نظریں متواتر بنگلے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک اندر سے ایک ٹینس بال دیوار کے اوپر سے اچھلتی ہوئی ہمارے سامنے آ گری۔ بال نے دو تین گدے کھائے اور گاڑی کے ساتھ ٹک گئی۔ میں نے گیند کو دیکھا پھر مرکزی دروازے کو۔ اسی وقت ایک دس سالہ بچہ باہر نکلا، میں نے بھاگتے ہوئے بچے کا جائزہ لیا۔ بچے کے پیچھے دو سیکیورٹی گارڈز بھی لپکے تھے۔ بچہ بھاگتا ہوا ہمارے نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر ایک نظر ہمیں دیکھا اور گیند اٹھا کر واپس گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔ اسے واپس آتا دیکھ سیکیورٹی گارڈ رک گئے۔ میں بغور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

نادر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کس سوچ میں ہیں؟"

"یہ بچہ؟"

"احمد سعید کا نہیں ہے۔"

"پھر.....؟"

"اس بچے کا نام شاویز ہے احمد سعید نے جس لڑکی سے شادی کی ہے یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ یہ بچہ احمد سعید کے پوتے سے بھی چھوٹا ہے۔ اس سے سمجھ لیں کہ اس کی نئی بیوی کی عمر کیا ہو گی جو اس لڑکے سے چند سال ہی بڑی ہو گی۔"

"ہوں..... میں نے طویل سانس بھری۔ "فطرت میں کتنی یکسانیت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" نادر نے کہا۔

"تمام بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب اسے ہی دیکھ لو۔ اس کے پاس گیندوں کی کمی ہے کیا؟ مگر پھر بھی بچہ وہ گیند جس کے ساتھ کھیل رہا تھا لینے کے لیے باہر بھاگ آیا؟" میں نے دور خلاؤں میں نظریں گاڑتے ہوئے کہا جیسے اپنا ماضی دیکھ رہا ہوں۔

"ہاں بچپن واقعی بہت بھلا ہوتا ہے۔" نادر نے کہا۔

ہم اس بنگلے کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک گارڈ آ گیا۔ اس گارڈ نے بغیر کچھ پوچھے نادر کی گال پر تمانچہ جڑ دیا۔ وہ ہمیں دھمکا کر وہاں سے بھگانا چاہتا تھا جیسے وہ سڑک اس کو وراثت میں ملی ہے۔ میرا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا لیکن اس وقت میں کوئی ہنگامہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لیے میں نے گیئر لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"تم نے بچپن میں نانی یا دادی سے کوئی کہانی سنی ہے؟" گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے نادر سے پوچھا۔

"ہاں کئی بار مگر یہاں اس سوال کا کیا مقصد؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم نے کون سی کہانی سنی ہے؟"

"بہت ساری سنی ہیں یار اب کیا بتاؤں؟"

"اچھا تم نے جن اور طوطے والی کہانی سنی ہے؟"

"ہاں سنی ہے۔" نادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہانی میں جن کی جان طوطے میں قید ہوتی ہے۔"

"بالکل اور اسے طوطے کی گردن توڑ کر دیوہیکل جن کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا ہے۔ مگر میں سمجھ نہیں پا رہا آپ نے یہ بچپن کا قصہ کیوں چھیڑ دیا۔"

"احمد سعید بھی ایک دیوہیکل جن ہے۔ اور اس جن کی جان اس طوطے میں ہے جسے ہم نے گیند کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بلی کو تھیلے سے باہر نکالنے کے لیے ہمیں اس بچے کا سہارا لینا پڑے گا۔"

"مطلب بچے کا اغوا۔۔۔ اگر ایسا سوچ رہے ہیں تو شاید غلط ہو۔"

"اغوا نہیں..... کچھ اور......"

"مگر اس سے کیا ہو گا؟"

"احمد سعید اس بچے سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"بچے کی بہن بچے سے پیار کرتی ہے اور یہ بیوی سے یعنی دنیا میں شاید واحد بچہ ہے جسے احمد سعید دل و جان سے پیار کرتا ہے بھلے ہی دکھاوے کو پیار کرتا ہو۔"

"احمد سعید خانقاہ سے اسی وقت واپس آتا ہے نا۔"

"وقت لگ بھگ یہی ہے۔"

"ہوں......" میں نے پُرسوچ ہنکارا ابھرتے ہوئے کہا "تصور کرو احمد سعید کی گاڑی بنگلے میں داخل ہوتی ہے، عین اسی وقت گیٹ کے سامنے اس کے پیارے سالے پر فائرنگ ہوتی تو وہ کیا کرے گا؟" میں نے چند ساعتیں رک کر سانس لیا پھر بولا۔ "وہ تمام تر احتیاط بھول کر باہر لپکے

گا۔ گارڈز فائرنگ کرنے والوں کا پیچھا کریں گے۔"

"یہاں تک تو بات ٹھیک ہے مگر آپ نے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا ہے؟"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ احمد سعید کی موونگ کے وقت ساتھ میں مسلح گارڈ بھی ہوتے ہیں۔ ہم عین اس کے گھر کے سامنے پہنچیں گے کیسے؟ پھر بچے پر فائرنگ ہونے کے بعد اس کا ہدف۔ میں سمجھ نہیں پایا۔" ناصر نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"پہلے مجھے چند سوالات کے جواب دو تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔"

"ہاں پوچھیں؟"

"احمد سعید کے بنگلے کے ارد گرد اور سامنے کن لوگوں کے مکان ہیں؟"

"اس گھر کے دائیں بائیں دونوں پلاٹ خالی ہیں۔ قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں پلاٹ بھی اسی کی پراپرٹی ہیں۔ ہاں البتہ سامنے کا ایک گھر ریٹائرڈ آئی جی کا ہے اور دوسرا ایک بڑے تاجر خان محمد کا۔"

"اچھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"آئی جی صاحب ملک میں نہیں ہیں۔ وہ پچھلے دنوں بیوی کی ہارٹ سرجری کروانے لندن گئے ہیں۔"

"ان کی کوٹھی میں مزید کتنے افراد ہیں؟"

"میرا خیال ہے گھر میں چند ملازموں اور گارڈ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

"اب میرا پورا پلان سنو۔" کہہ کر مختصر الفاظ میں اپنا پلان بتایا۔

"مجھے اس پلان پر کوئی اعتراض نہیں، ماسوائے ایک بات کے۔"

"کون سی بات؟"

"احمد سعید آپ کو تنہا ٹارگٹ کریں گے؟"

"ہاں اور میرے خیال میں یہ کوئی قابلِ اعتراض بات بھی نہیں۔"

"وہ......" ناصر کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار نہیں ہے؟" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسے کام کرتا رہا ہوں۔ ابھی اسے چھیڑنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے گارڈ نے تمہیں تھپڑ مار کر مجھے اکسا دیا ہے کہ میں کچھ کروں۔"

"مگر یہ مشن خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"بھروسا رکھو مجھ پر۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "جیسا تم مناسب سمجھو۔"

تبھی مرکزی سڑک سے احمد سعید کی گاڑی مڑی۔ اس کے آگے پیچھے کئی گاڑیاں تھیں۔ احمد سعید کی گاڑی بنگلے کے اندر داخل ہوئی تو اس کی پیروی میں دیگر گاڑیاں بھی اندر چلی گئیں اور میں کچھ نہ کر سکا۔ ایک گاڑی سے چار محافظ اتر کر مرکزی دروازے پر ہی جم گئے تھے۔ اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے شاہ ویز کی بال پھر باہر آ گری اور اس کے پیچھے شاہ ویز نکلا۔

احمد سعید کی گاڑی پورچ میں رکی ہوئی تھی۔ گاڑی کے لیے گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ ادھر بچہ جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچا میں نے اس کے پیروں کے پاس زمین پر فائرنگ کر دی۔ گیٹ کے محافظ بھی حرکت میں آ گئے انھوں نے بھی فائر کھول دیے تھے۔ میرے اعصاب تن گئے۔

گیٹ کھلا ہونے کے سبب احمد سعید نے نہ صرف شاہ ویز کی چیخیں سنیں بلکہ اسے زمین پر گرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ بدحواسی میں باہر بھاگا۔ جب تک اندر کے محافظ سچویشن سمجھتے وہ باہر آ چکا تھا۔ وہ میرے سامنے عین نشانے پر تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کر دیے۔ احمد سعید جو اپنے عزیز از جان سالے پر جھکنے ہی والا تھا سینے پر ہاتھ رکھے پیچھے کی جانب اچھل کر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

"چلو جلدی کرو۔" میں نے کہا۔ کار اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ گیئر لگایا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"خس کم جہاں پاک، جو ہم نے چاہا وہ پورا ہو گیا اب ہمیں سب سے اہم مسئلے کی طرف آ جانا چاہیے آپ نے کیا سوچا ہے۔ اپنا منصوبہ بتائیں۔" عبداللہ جو وسیم کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا "مجھے ایک دن کا وقت چاہیے اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے۔ مکمل تیاری کے بعد ہی میں کچھ بتاؤں گا۔ اس لیے کہ جلد بازی میں وسیم سے چوک ہو گئی۔ اب مرشد ہوشیار ہو گیا ہوگا۔ اس لیے کہ احمد سعید اس کے لیے بہت اہم تھا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے کہ اسے پتا ہے کہ آپ آ چکے ہیں۔ خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جیسی آپ کی مرضی اب آرام کریں۔" کہہ کر وہ سب اٹھ گئے ان کے جانے کے بعد میں مرجس کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا جسے ایک بار

پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔

☆......☆

وہ دن ایسے گزر گیا جیسے تین گھنٹے۔ میرے ساتھ سفیر اور وسیم بھی مصروف رہے تھے۔ اگلے دن میں نے سب کو بلا لیا ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے میں نے اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے وسیم اور سفیر پر نظر ڈالی پھر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”دوستو ہم بہت بڑا جوا کھیلیں گے یہ زندگی کا جوا ہوگا اسے کھیلنے کے بعد یا تو مرشد نہیں یا ہم نہیں۔“

”اس جوئے کی شروعات کہاں سے ہوں گی؟“ وسیم نے ہنس کر کہا۔

”مرشد کی نئی خانقاہ سے۔ لیکن اس جوئے میں آپ سب شریک نہیں ہوں گے۔ صرف میں مرجس اور سفیر اندر جائیں گے باقی سب باہر رہیں گے۔ یہ موت کا کھیل ہے اس کھیل میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو بے جگر ہو آپ کے ساتھیوں میں بھی ایسے بے شمار بندے ہوں گے جو موت کو کھیل سمجھتے ہوں گے لیکن یہ لڑائی کچھ ایسی ہے جس میں سب کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ آپ نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟ بساط پر سپاہی، فیل، اسپ، وزیر، بادشاہ وغیرہ سجایا جاتا ہے۔ سپاہی، سپاہی کو مارتا ہے وزیر وزیر کو، یہ کھیل بھی مہروں کا نہیں، وزیروں کا ہے۔ مہروں کو تب لڑایا جاتا ہے جب کسی ملک کو فتح کرنا ہو اور وزیر تب میدان میں آتا ہے جب بادشاہ کا تخت چھیننا ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں۔“

”میں میدان میں آنے کو تیار ہوں۔“ مرجس نے جلدی سے کہا۔

میں نے نادر شاہ کے چہرے کا جائزہ لیا پھر کہا ”آپ مرجس کو مرشد کی خانقاہ کا حفاظتی نظام بتائیں اسے بھی ایک اہم کام انجام دینا ہے یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہم تینوں ایک ساتھ اندر داخل ہوں گے۔“

”اور میں؟ مجھے کیوں بھول رہے ہو۔“ عبداللہ نے کہا۔

”جنگ لڑتے وقت فوج کا ایک حصہ ریزرو رکھا جاتا ہے۔ تمہارا کام بعد میں شروع ہوگا۔ پہلے پورا منصوبہ سنو ہاں محترم آپ اسے اندر کا حفاظتی انتظام سمجھائیں۔“ میں نے نادر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نادر نے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وسیم نے کہا ”یہ تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے۔ ہم اندر کیسے داخل ہوں گے؟

”ہم داخل ہوں گے اور ضرور داخل ہوں گے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اس وثوق سے اندر داخل ہونے کی بات کر رہے ہیں تو یقیناً اندر جانے کا کوئی خفیہ راستہ دریافت کر لیا ہوگا؟“ عبداللہ نے کہا۔

”ہم کسی بھی خفیہ راستے سے اندر داخل ہوں چھپ نہیں سکتے، سب کی نظریں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ پہرے دار بھی ہمیں دیکھیں گے اور کنٹرول روم کے اسکرین پر بھی ہمیں دیکھا جا رہا ہوگا۔ اس لیے کہ اس بار مرشد نے خانقاہ کو کیمروں سے بھر دیا ہے۔ قدم قدم پر کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ بھرپور حفاظت کا انتظام ہے۔“

”ایسا کیوں نہ کریں کہ مانی کو دبئی سے بلا لیں۔ وہ انٹرنیٹ کا چیتا ہے۔ ایک منٹ میں وہ اس کے نیٹ ورک کو فیل کر دے گا۔“ وسیم نے کہا۔

”وہاں صرف کیمرے ہی نہیں اور بھی انتظام ہے۔ کچھ باتیں نادر شاہ نے بتائیں باقی میں نے اپنے سورس سے معلوم کی ہیں۔ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”ایسا کیا کر دیا ہے؟ اس نے روبوٹ کی فوج بٹھا دی ہے کیا؟“ وسیم نے ہنس کر کہا۔

”گزشتہ شکست نے، خانقاہ کی تباہی نے اسے بہت بڑا سبق دیا ہے۔ پھر اسے کوئی ایسا بندہ مل گیا ہے جو دماغ دار ہے۔ خانقاہ میں جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں وہ ناقابلِ تسخیر سمجھ کر بنائی جا رہی ہیں۔ اس کا ہر کمرا خود میں جیل ہے۔ ہر کمرے کی دیواروں اور فرش پر باریک تار بچھائے گئے ہیں جن میں کرنٹ دوڑتا ہے۔“

”پھر وہاں کے لوگ کیسے آنا جانا کرتے ہیں؟“

”جب دشمن کا خطرہ ہوتا ہے تبھی کرنٹ دوڑایا جاتا ہے ورنہ بجلی بند رہتی ہے۔“

”اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ہم اندر داخل ہو جائیں گے؟“ سفیر نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بریف کیس کو اٹھایا۔ اس اٹیچی نما بریف کیس کو کھول کر میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر اس میں سے لباس کے پیکٹ کو نکالا۔ سرمئی رنگ کے اس لباس کو کھول کر ٹیبل پر پھیلا دیا۔ وہ چغہ نما لباس تھا۔ پھر میں نے تقریر کے انداز میں کہنا شروع کیا ”آپ سب جانتے ہیں کہ گولیوں سے بچنے کے لیے بلٹ پروف جیکٹ پہنا جاتا۔ اس قسم کے جیکٹ کے سینے اور پیٹ پر اسٹیل کی پلیٹیں

استعمال کی جاتی ہیں جو حرکت میں آڑے آتی ہیں۔ یہ بھی بلٹ پروف جیکٹ ہے مگر اسے آسانی سے پہنا جاسکتا ہے۔ اس کپڑے میں ایسے اسٹیل وائر اور کیمیکل استعمال کیے گئے ہیں کہ جو آگ اور بارود کے اثر کو زائل کردیتے ہیں۔ یہاں تک کہ چاقو بھی استعمال کیا جائے تو اس کپڑے کے پار نہیں ہوسکتا۔ اس میں لچک بھی ہے اور مضبوطی بھی۔ ہم مسلمان تعداد میں بہت بڑی طاقت ہیں مگر ہمیں بھی بھر پڑوس کے غیر مسلم اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ ہماری دماغی صلاحیت، پوری طاقت، آپس میں دست و گریباں ہونے کے لیے وقف ہے جبکہ وہ اپنی دماغی صلاحیت کا صحیح استعمال کررہے ہیں۔ وہ نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔

یہ ایجاد یہودیوں کی ہے جو ہم پر یعنی اس قوم پر آزمارہے ہیں جس نے سائنس کی نئی تشریحات دنیا کو دی تھیں۔ جو کبھی علم وعقل میں سب سے آگے تھی۔ اس جیکٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پہن کر انسان بہت آسانی سے حرکت کرسکتا ہے۔ گولیوں سے بچ سکتا ہے لیکن وہاں تک کا حصہ محفوظ رہتا ہے جہاں تک پیرہن ہے۔ اس لیے اضافی کپڑا بھی لایا ہوں جس کا ڈھاٹا باندھا جائے گا۔ یہ باریک باریک تاروں سے بنا کپڑا چبھن ضرور پیدا کرتا ہے مگر زندگی کو محفوظ رکھتا ہے۔''

''اس کپڑے کے ذریعے ہم گولیوں سے تو محفوظ رہ جائیں گے لیکن الیکٹرک شارٹ سے کیسے بچیں گے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''الیکٹریکل شارٹ کا پتا لگانا تو معمولی بات ہے۔ ہائی وولٹیج سرکٹ پر کام کرنے والوں کی یہ عینک لے کر آیا ہوں اسے لگا کر دیکھو۔'' کہہ کر میں نے بریف کیس سے گول شیشوں والا کورلا گوگلس نکال کر اسے دیا پھر الیکٹرک وائر کو سرکٹ میں لگا کر سیٹ آن کیا اور بولا ''خالی آنکھ سے کچھ نظر نہیں آئے گا مگر گوگلس لگا کر دیکھو۔''

سفیر اور وسیم نے گوگلس لگایا اور چیخ کر بولے ''واہ اس چشمے کی وجہ سے ننگا تار سرخ انگارے سے بھرا دکھائی دے رہا ہے۔''

''ذرا میں بھی دیکھوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

سفیر نے عینک بڑھادی۔ عبداللہ نے عینک سے ننگے تار کو دیکھا پھر اسے اتار کر تعریفی لہجے میں بولا۔ ''اب مجھے یقین آگیا ہے ہم مرشد کو گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لائیں گے۔''

''تمہارا... کیا خیال ہے؟ کیا ہم کامیاب ہوجائیں گے؟'' میں نے سفیر سے پوچھا۔

''کامیاب میرا تو خیال ہے کہ ایک پرسنٹ بھی ناکامی کا سوال نہیں ہے۔''

''نہیں کامیابی اور ناکامی کا ففٹی ففٹی چانس ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں دونوں باتوں کا برابر کا چانس ہے۔'' وسیم نے تائید کی۔

''اگر ہم میں سے کوئی مرگیا تو......؟'' عبداللہ نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس جنگ میں اگر میں مارا گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' عبداللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اگر آپ مرگئے تو ہم پر بہت فرق پڑے گا۔ ہم سب آپ کی طاقت پر کھیل رہے ہیں۔ آپ کے بعد میں اکیلا رہ جاؤں گا اور مرشد پوری قوت سے مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔''

کافی دیر تک میں خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچتا رہا پھر گردن نیچی کرکے بولا۔ ''تمہارا کہنا ٹھیک ہے'' پھر میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر میں مرگیا تو میرے مشن کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہوگی اور تم تمام ساتھی اس کے اشارے پر چلوگے جو میری حیثیت ہے میرے بعد وہی حیثیت اس کی ہوگی۔ میرے بعد اگر یہ مشن مکمل کرنے سے گریز کرے پھر بھی اس کا ساتھ دوگے۔''

سب نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''آج رات ہم پوری تیاری کے ساتھ مرشد کی قلعہ نما خانقاہ میں گھس جائیں گے۔'' میں نے کہا اور ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی ہر ایک کے چہرے پر جوش تھا۔

☆......☆

رات کے دس بج رہے تھے مرشد کی قلعہ نما خانقاہ سے سو گز کی دوری پر میرے ساتھ 'سفیر' اور مرجس کھڑے تھے۔ دیگر ساتھیوں کو ہم نے دوسری طرف بھیج دیا تھا۔ میری آنکھیں لوہے کے بڑے سے گیٹ پر اٹکی ہوئی تھیں۔ اس سلاخوں والے گیٹ کے اندر کا منظر بھی صاف نظر آرہا تھا۔ کئی پہریدار ادھر سے ادھر گشت کیے جارہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ شاید اتنی مستعدی خانقاہ کی تباہی کے بعد کا نتیجہ تھی۔ میں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ عبداللہ کے علاوہ سب نے بلٹ پروف لباس پہن رکھے تھے۔ چہرے بھی پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ بلٹ پروف

کپڑوں سے انہوں نے اس طرح چہرے اور سر کو ڈھانپ رکھا تھا کہ ایک انچ جگہ بھی خالی نہ تھی۔ دیکھنے کے لیے انہوں نے تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑی تھی چہرے کو کور کرنے کے لیے آڑی پٹی کی طرح اوپر سے بھی کپڑے لپیٹے تھے۔ اگر وہ کپڑا عام قینچی سے کٹ سکتا تو وہ نقاب بنا لیتے مگر باریک تاروں سے بنا کپڑا جس پر کیمیکل کی تہیں جمی ہوئی تھیں اتنا مضبوط تھا کہ اس پر قینچی چل ہی نہیں سکتی تھی اور الیکٹرونک کٹر ہمارے پاس تھا نہیں کہ ہم اسے استعمال کرکے نقاب بناتے۔ میں نے باریک بینی سے ان سب کا جائزہ لیا پھر عبداللہ سے کہا "تم باہر رہ کر ہم پر نظر رکھنا۔"

یوں بھی بلٹ پروف کپڑے صرف تین کے جسم پر تھے۔ سفیر، مرجس اور میرے۔ میں نے سفیر سے کہا "سامنے سے اندر داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے اس لیے ہمیں عقبی حصے کی طرف سے کوشش کرنا ہوگی۔ ادھر ایک درخت ہے اس کے ذریعے ہم سرونٹ کوارٹر کی چھت پر اتریں گے پھر وہاں سے سیدھے برآمدے کی طرف۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" کہہ کر سفیر اور مرجس عقبی سمت بڑھتے چلے گئے۔

"اس خیال میں نہ رہنا کہ ادھر سے ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے یقیناً خفیہ کیمرا ہمیں دیکھ لے گا وہ راستہ ہم نے صرف اس لیے منتخب کیا ہے کہ مزاحمت کا سامنا کچھ دیر میں ہوگا۔" کہہ کر میں نے بھی قدم بڑھا دیا۔

ہم سب اس پیڑ پر چڑھ کر سرونٹ کوارٹر کی چھت پر اترنا ہی چاہتے تھے کہ میری نظر چھت پر پڑی اور میں نے سب کو روک دیا۔ اگر ہماری آنکھوں پر خاص قسم کے چشمے نہ ہوتے تو حادثہ یقینی تھا۔ چھت پر باریک سے تین تار ایک فٹ کی بلندی سے گزر رہے تھے۔ تاریں اتنی باریک تھیں کہ ایک نظر میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چشمے کی وجہ سے ہمیں ان میں دوڑتی بجلی نظر آ گئی تھی۔ اندھیرے میں وہ تاریں انگاروں سی دہکتی نظر آ رہی تھیں۔

"ان سے بچ کر۔" میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

میرے کہنے پر سب ہوشیار ہو گئے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ ان تاروں کو پھلانگ کر ہم چھت کے درمیان میں پہنچے۔ سب کے پیروں میں نفیس قسم کے لونگ بوٹ تھے بالکل ایسے جنہیں "برساتی جوتے" بھی کہا جاتا ہے۔ ربر کے جوتے جو الیکٹرک شاک سے تو محفوظ رکھتے ہی ہیں آواز بھی پیدا نہیں کرتے۔ اسی لیے میں نے اس قسم کے جوتوں کو ترجیح دی تھی۔ یکے بعد دیگرے ہم چھت سے لٹک کر نیچے اترے۔

بی پی کی درست پیمائش

اگر ایک شخص کا کلینک میں داخل ہوتے ہی بلڈ پریشر چیک کیا جائے اور اس کی ریڈنگ 140/90 آ جائے تو اسے فوراً بلڈ پریشر کا "مریض" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ "مریض" جب اسپتال آئے تو وہ کم از کم پانچ منٹ تک آرام سے کرسی پر بیٹھے، اسے کوئی خوف، خدشہ یا ذہنی تناؤ نہ ہو اور اس کا بازو بھی آرام کی حالت میں ہو۔ یہ شرائط اس لیے ضروری ہیں کہ مذکورہ حالتیں بلڈ پریشر کو عارضی طور پر بڑھا دیتی ہیں۔ پُرسکون حالت میں اس کا بلڈ پریشر کم از کم دو دفعہ چیک کیا جائے اور گھر جا کر اسی طرح کے پُرسکون ماحول میں اسے دوبارہ چیک کیا جائے۔ اگر وہ پھر بھی 140/90 یا اس سے زیادہ آئے تو پھر اسے "ہائی بلڈ پریشر" کہا جائے گا۔ اگر کسی کو اپنے بلڈ پریشر کے ہائی ہونے کا شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ تین یا چار دن تک روزانہ تین یا چار بار پرسکون حالت میں اسے چیک کرے۔ اس طرح حاصل شدہ 10 یا 12 ریڈنگز کی اوسط نکالی جائے۔ اگر وہ 130/85 سے زیادہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا بلڈ پریشر کنٹرول میں نہیں ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر تحسین فاطمہ۔ لاہور

ابھی ہم نے نیچے قدم رکھے ہی تھے کہ ہمارے استقبال میں پہریداروں کی گنز گرج اٹھیں۔ دھائیں دھائیں کرتی ہوئی گولیاں ہمارے جسم سے ٹکرائیں اور ہمیں اس جدید بلٹ پروف کپڑوں کی اہمیت سے آگاہ کر گئیں۔ گولیوں کے ٹکرانے سے ہمیں خاصی چوٹ لگی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے غلیل سے کسی نے پتھر مارا ہو۔

"رکنا نہیں دوڑتے چلو۔" عباد نے چیخ کر کہا۔

ہم دوڑتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھے۔ اس درمیان میں کئی گارڈز رائفل تانے آگے آئے جنہیں ہمارے پستولوں سے نکلی ہوئی گولیوں نے روک دیا۔ کتنے زخمی ہوئے کتنے مرے یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گئے۔ پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

ہمارا پیچھا کرنے والے بھی برآمدے تک آئے لیکن وہ سب کے سب وہیں رک گئے۔ مجھے یاد آیا کہ مرشد کا حکم تھا کہ کسی بھی حالت میں باہر کے گارڈز اندر نہ آئیں۔ اندر کی حفاظت کے لیے دوسرے گارڈز ہوں گے۔

کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ ہم سب کھڑے لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔ سفیر نے اپنے دونوں ریوالوروں کو پھر سے لوڈ کیا۔ مرجس نے بھی اپنی اسٹین گن کا چیمبر بدلا۔ میں

نے سب سے کم گولیاں چلائی تھیں پھر بھی خالی خانوں کو بھر لیا۔ اب ہم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔

”مرشد اور اس کے گارڈز ہمیں اسکرین پر دیکھ رہے ہوں گے۔“ سفیر نے دھیمی آواز میں کہا ”سنبھل کر بولنا ہماری زبان سے نکلا ایک ایک لفظ خفیہ مائکروفون کے ذریعہ کنٹرول روم میں پہنچ رہا ہوگا۔“

بات اس کی صحیح تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی اور تیکھی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہم پچاس فٹ لمبی راہداری میں کھڑے تھے۔ راہداری کے آخری سرے پر دائیں اور بائیں جانے کے راستے تھے۔ اس کے علاوہ خاموش دیواریں تھیں۔ کمروں کا دروازہ ابھی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ دوسری طرف ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سفیر نے کہا:

”لگتا ہے وہ لوگ ابھی اسی فکر میں ہوں گے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہے ورنہ اسکرین پر تو ہم انہیں نظر ہی آرہے ہوں گے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ ابھی وہ ہمارے اگلے قدم کے منتظر ہیں۔“ میں نے کہا میری نظریں ایک ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں کیمرا فٹ ہے مگر مجھے ابھی تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔

”وقت برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آگے بڑھیں۔“ سفیر نے کہا۔

تب ہی میری نظر داہنی جانب کی دیوار پر پڑی اور میں نے کہا۔ ”ہوشیار کرنٹ آن ہو چکا ہے۔“

دیوار پر لگے ٹائلز کے جوڑوں میں باریک باریک تاریں گزر رہی تھیں جو عینک کی وجہ سے سرخ نظر آرہی تھیں۔ ایسا ہی کچھ فرش کے ٹائلز میں بھی نظر آیا۔

”نہایت احتیاط سے پنجوں پر وزن ڈال کر آگے بڑھو۔ ذراسی بے احتیاطی خاک کر دے گی۔ میرا خیال ہے چار سو چالیس واٹ کا کرنٹ گزر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم سب نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک ٹائلز پر پیر رکھتے ہوئے چیونٹی کی رفتار سے ہم سب آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ ہم مڑنے ہی والے تھے کہ نہایت تیز آواز میں دیوار کے اندر فٹ مائیک سے آواز ابھری۔ ”اہلاً وسہلاً مرحبا شہباز میرے دشمن نمبر ایک۔ تم کیا سمجھ رہے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں ہے؟ یہ سچ ہے کہ اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا اس لیے اس دھوکے میں رہا کہ تم ان کے ساتھ نہیں ہو مگر جیسے ہی تم سرونٹ کوارٹر کی چھت پر چڑھے میں نے تمہیں پہچان لیا۔ ویسے فکر کی بات نہیں میں اپنے دشمنوں کو سسکا سسکا کر مارنے میں ثانی نہیں رکھتا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے داہنے ہاتھ امداد شاہ کو گلگت میں بہت اذیت دی ہے میں بھی وہ قرض اتارنا چاہتا ہوں۔“ بولتے بولتے وہ رک گیا۔

کوریڈور میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو دل میں خوف پیدا کر دے۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ ”تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے جس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک عرصہ گزارا اسے تم نے کچھ گھنٹوں میں ختم کر دیا تھا۔ میری کمر توڑنے کی پوری کوشش کرلی تھی۔ مجھے معذور بنانے کے لیے میرے اہم بندوں کو تم نے ختم کر دیا۔ تم نے مجھے کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہارا ریشہ ریشہ الگ کروں گا۔ تمہارے ساتھیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اذیت دے دے کر ہلاک کروں گا۔ تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی میرا نام سن کر کانپ اٹھیں گی لیکن ابھی نہیں ابھی تو میں تمہاری مہمانداری کروں گا۔ جس طرح بلی چوہے کو مارنے سے پہلے اسے بھاگنے دوڑنے کا بھرپور موقع فراہم کرتی ہے اسی طرح میں تمہیں خوب موقع دوں گا۔ تم نے دلدل میں پیر رکھ تو دیا ہی ہے اب اپنے ڈوبنے کا بھی مزہ لو۔ اب یہ پہلے والی خانقاہ نہیں ہے۔ ہر راہداری ہر کمرا ایک پھندا ہے۔“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا اور پھر کہہ رہا ہوں کہ برائی خواہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو اچھائی سے شکست کھانا اس کا مقدر ہے۔ تم پوری کوشش کرلو مگر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”ہاں میں تمہیں تباہ ضرور کردوں گا.... اور اس بار ادھورا کام نہیں کروں گا۔“

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ویسے تم لوگوں کا یہاں آنا مجھے راحت بخشنے کا سبب بن رہا ہے۔ ورنہ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی آخر کو بدلہ لینا بھی ضروری ہے ناں۔“

”چلو بھئی آگے بڑھو اسے ہمارا انتظار ہے۔ کیوں بے چارے کو انتظار کی سولی پر لٹکائے ہوئے ہو۔“ وسیم نے کہا۔

”اسے انتظار ہے مگر ہمیں نہیں۔“ کہہ کر میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور اسے سلگا کر گہرا کش لیا پھر دھیمی آواز میں بولا ”آپ سب نہایت احتیاط سے آگے

بڑھیں۔“

مرتجس مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا اس لیے کہ اس نے اس سے پہلے مجھے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن سفیر سمجھ گیا تھا کہ میں کوئی چال چلنے والا ہوں۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے جو عینک لگا رکھی ہے یہ اسی کا کمال ہے کہ تمہیں وہ تمام تاریں نظر آ رہی ہیں جن میں کرنٹ ہے۔ خدا نابود کر دے۔ فیض خان کو جو ان عینکوں کو بیچ رہا ہے۔“

ہم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہماری خاموشی پر اس نے پھر کہا ”کیا بات ہے میرے قابلِ احترام مہمانو ہم سے ناراض ہیں کیا؟ کوئی بھی بولنے پر رضامند نہیں ہے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہو۔“ مرشد کی آواز میں اس کی تجسی بھی شامل تھی۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مرشد ہمیں بولنے پر اکسا رہا ہے۔ شاید آواز سے ہماری موجودگی کے مقام کا صحیح اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔ اس لیے بھی ہم خاموش تھے کہ عقب سے آواز آئی۔

”دائیں مڑیں یا بائیں؟“ مرتجس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

”بائیں۔“ میں نے دونوں اطراف کا جائزہ لے کر سرگوشی میں کہا۔

سفیر اسی طرف مڑ گیا۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے مرتجس۔

”صحیح راستے پر مڑے ہو۔“ مرشد کی کھنکتی ہوئی آواز پھر سنائی دی ”اگر دائیں جانب مڑتے تو میں خود تمہیں آواز دے کر روک لیتا۔ تم لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہو اور داہنی راہداری پھر تمہیں باہر کی کھلی فضا میں پہنچا دیتی۔ میں بائیں جانب ہوں۔ آگے بڑھتے رہو۔“

”کذاب کی اولاد بھونکے ہی جا رہا ہے چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔“ سفیر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

ہم سب آگے بڑھتے رہے۔ سب کے قدم نپے تلے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دور جاتے ہی ہم ٹھٹک گئے۔ آگے کرنٹ کا جال سا پھیلا ہوا تھا، تقریباً چھ فٹ لمبائی میں۔ پورا کاریڈور گھرا ہوا تھا۔ اس طرح سے تاروں کو بچھایا گیا تھا کہ ان کی درمیانی جگہ میں ایڑی تک نہ رکھی جا سکے۔ آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ ہم کھڑے ہو کر یہی سوچنے لگے۔ ہر چہرے پر بس یہی ایک سوال تھا۔

”تم جواں مردوں کے لیے لانگ جمپ لگانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے۔“ مرشد نے زہر خند لہجے میں کہا ”اس کھیل میں اب مجھے بھی مزہ آنے لگا ہے۔“

میری نگاہیں مرتجس کی جانب اٹھ گئیں۔

”چھ فٹ کی چھلانگ لگانا ناممکن تو نہیں ہے۔“ مرتجس نے چشمے سے جھلکتے ہوئے جال پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں پار کرتا ہوں۔“ میں نے مرتجس کو دیکھتے ہوئے کہا ”بعد سفیر اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سنبھال لیں گے۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگائی۔ وہ چھ فٹ کی دوری جیسے سمٹ گئی۔ ایک اسپورٹس مین کے لیے یہ دوری تو بہت عام سی بات ہے۔ میں نے تو دس فٹ کی لانگ جمپ لگائی ہے۔ میں نے دوسری جانب پہنچ کر مرتجس کی طرف دیکھا ذرا سی بے احتیاطی بڑے حادثے کو جنم دے سکتی تھی، اگر اس کا کپڑا بھی ان تاروں سے چھو جاتا تو وہ پل بھر میں خاک ہو جاتا۔ چار سو چالیس واٹ کا بھی تو کمال ہوتا ہے کہ جاندار کو ایک پل میں کباب بنا دیتا ہے۔ تبھی مرتجس نے چھلانگ لگائی اس نے بھی اس دوری کو پار کر لیا۔ وہ تقریباً سات فٹ کے فاصلے پر گرا تھا۔

”واہ بہت خوب۔ اس کلکتی میں بھی جان ہے۔“ مرشد کی طنزیہ آواز سنائی دی ”لگتا ہے یہ میرے حضور پیش ہو کر رہے گا۔“

”یہ نانگا پربت کی گود میں پلا بڑھا ہے۔ غور سے دیکھو، تم نے وطن دشمنوں سے ساز باز کی تو تم سے نمٹنے کے لیے میں ہر صوبے کے نمائندہ کو لے کر آیا ہوں۔“ اس نے تو تمہارے کئی جانبازوں کو جہنم کا راستہ بھی دکھایا ہے۔“

”معلوم ہے کتا جب پاگل ہو جائے تو اپنے آقا کو بھی کاٹ لیتا ہے۔ تمہارے ساتھ مجھ سے غداری کرنے والے بھی ہیں جو کبھی ہمارا جھوٹا کھایا کرتے تھے۔“ مرشد اس بار کھل کر ہنسا۔

”میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ریاست خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے۔ کتوں سے بچ کر رہنا کہیں تمہیں کاٹ ہی نہ لیں۔ لیکن تم بچ گئے کیسے؟ کیوں کہ تمہارا نرخرہ تو میں خود ادھیڑوں گا۔“ مرتجس نے تلملا کر جواب دیا۔

”خوب، تو زبان میں بھی خارش ہونے لگی۔“ مرشد کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔

”بھونک لو، جتنا جی چاہے، بھونک لو پھر موقع نہیں ملے گا۔“ مرتجس نے پھر چوٹ کی۔

’’بہت موقع ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟‘‘
بحث کو فضول سمجھ کر ہم نے قدم آگے بڑھا دیے۔ فرش اور دیواریں بالکل صاف تھیں۔ لگتا تھا اب آگے کرنٹ کا جال نہیں ہے۔ ہم بے فکر ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ اس کوریڈور کے آخر میں پھر دو راستے آ گئے تھے۔ دونوں میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اب صحیح معنوں میں اس عمارت پر کسی ہوٹل کا گمان ہو رہا تھا۔ تمام کمروں کے دروازے اندر سے بند تھے۔ وہ سب رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں سوال تھا کہ اب کس طرف مڑنا چاہیے۔ ہم ابھی کھڑے ہو کر راستے کا انتخاب کر ہی رہے تھے کہ مرشد کی آواز سنائی دی ’’واپسی کے بارے میں مت سوچنا۔ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ جن راستوں سے تم لوگ آئے ہو اب وہ اس طرح بند کر دیے گئے ہیں کہ تم خود بھی پہچان نہیں پاؤ گے کہ یہاں سے گزرے تھے۔ سامنے ہی قطار میں کمرے ہیں جس میں دل چاہے داخل ہو جاؤ۔ ہر کمرے میں بیڈ موجود ہے۔ دل بھر کر آرام کرو۔‘‘

’’ہم آرام کرنے نہیں تم سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔‘‘

’’غصہ نہیں، تم لوگ میرے مہمان ہو اور مہمان کا میزبان کی مرضی پر چلنا فرض ہے۔ ابھی بہت وقت باقی ہے یوں بھی یہ وقت ملاقات کا نہیں آرام کا ہے، جو کچھ کہنا ہے صبح کے لیے بچا کر رکھو، اب صبح ہی ملاقات ہوگی۔‘‘

’’ہم صبح نہیں ابھی ملاقات کریں گے۔‘‘ میں نے بلند آواز میں کہا۔

’’ایسی بھی کیا جلدی ہے اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے پھر مجھے تم لوگوں کی تلملاہٹ سے بھی تو لطف اندوز ہونا ہے۔‘‘

’’ہمیں جلدی ہے ہم فوراً تم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’اگر پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جاؤ ورنہ آرام کرو۔ آخر ان کمروں کا کچھ تو مصرف نکلے۔ تمہاری بوٹیاں کرنے سے پہلے میں تمہیں آرام دینا چاہتا ہوں۔ آخر کو قربانی کے جانوروں کو کھلا پلا کر موٹا تازہ بھی کرنا چاہیے ناں، اسی لیے کہہ رہا ہوں آرام کر لو، اچھا شب بخیر صبح ملاقات ہوگی۔‘‘
آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ اب اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو بم کا دھماکا محسوس ہوتی۔ اس خاموش ماحول میں ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز بھی صاف سن رہے تھے۔

’’اب کیا ارادہ ہے؟‘‘ سفیر نے پوچھا۔
’’ایک اینٹ پر دوسری رکھو دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ اس معقولے پر عمل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لیں کسی میں تو وہ ملے گا۔‘‘ میں نے کہا۔
میرا حکم پاتے ہی سب اسے ڈھونڈنے کی جستجو میں لگ گئے۔ ایک کے بعد ایک کمروں کو کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سفیر کمروں کو گنتا جا رہا تھا۔ دراصل ہم یہی چاہتے تھے کہ ایک کمرا بھی نہ بچے۔
وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن کمروں کی تعداد کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نچلی منزل کے بعد ہم اوپر کی منزل پر آئے پھر تیسری منزل کے کمروں کو بھی دیکھ لیا۔ اب ہم اسی منزل پر کھڑے تھے جو ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ تعمیر جاری تھی۔ پلاستر مکمل نہیں ہوا تھا۔ دروازے کھڑکیاں بھی نہیں لگیں تھیں۔ اتنے کم وقت میں ایسی شاندار عمارت بنا لینا بھی کمال تھا۔ لیکن ہم اس نکتے پر غور کرنے تو آئے نہیں تھے۔ اس لیے تلاشی کا کام جاری رکھا۔ اس منزل کے آخری کمرے کی تلاشی لینے کے بعد میں نے پوچھا ’’سفیر تم نے اچھی طرح گنا ہے ناں کہ یہ چالیسواں کمرا ہے۔‘‘
سفیر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ’’گنتی میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے یہ واقعی چالیسواں کمرا ہے۔ اس آخری کمرے کے بعد اب ایک بھی کمرا نہیں بچتا۔‘‘
’’اگر تمہاری گنتی درست ہے تو میرا خیال ہے کہ مرشد نے کچھ اور نئے کمرے بھی بنوائے ہیں۔‘‘
’’تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس عمارت کے اندر بہت سی تبدیلیاں کروائی ہیں لیکن تبدیلی کی نوعیت کیا ہے یہ کسی کو نہیں پتا۔ کہتے ہیں کہ اس نے جن مزدوروں سے کام کروایا تھا انہیں پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ سننے میں آتا ہے کہ انہیں مرشد نے قتل کروا دیا ہے تاکہ اندرونی راز کوئی نہ جان سکے۔‘‘ مرجس نے کہا ’’میرے دوست نے بتایا ہے کہ اندر جن لوگوں کی ڈیوٹی لگی تھی وہ بھی غائب ہو گئے۔‘‘
’’مجھے یاد آ گیا اس نے ایک اضافی جنریٹر روم بھی تو بنوایا ہے جو انڈر گراؤنڈ ہے یقیناً اس وقت وہ کسی تہ خانے میں ہے جبھی تو اب تک نظر نہیں آیا۔ اب ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔‘‘ میری آواز اب بھی سرگوشی سے بلند نہ تھی۔
’’تو آؤ ہم سب نیچے چلتے ہیں لیکن لطف کا استعمال

اب بھی نہیں کریں گے یقیناً وہ ہمیں اسکرین پر دیکھ رہا ہوگا۔ ہماری آواز بھی سن رہا ہوگا۔ ہم لفٹ میں داخل ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبائیں اور وہ بجلی آف کردے اس طرح تو ہم چوہے دان میں پھنس جائیں گے۔‘‘ سفیر بولا۔

ہم سب سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگے اب ہم نچلی منزل کے کمروں کا معائنہ پھر سے کر رہے تھے۔ اس بار ہم اس زاویے سے دیکھ رہے تھے کہ شاید کہیں ایسا نشان مل جائے جس سے ثابت ہو کہ وہاں تہ خانہ بھی ہے۔ کافی دیر کی تلاش نے بھی ہمیں اُمید کی کرن نہ دکھائی۔ اب مجھے بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ تھکن بھی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ’’میرا خیال ہے کہ اس تلاش کو ادھورا ہی چھوڑ دیا جائے۔‘‘ میں نے مشورہ دیا۔

’’کیوں؟ واپس چلنے کا ارادہ ہے کیا؟‘‘ سفیر نے پوچھا۔

’’شاید تم کو اندازہ نہیں کہ اب واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ مرشد نے گارڈز کو خصوصی ہدایات جاری نہیں کی ہوں گی؟ اب تک گارڈز کی تعداد بھی بڑھا دی گئی ہوگی۔ گارڈز خود بھی پوری ہوشیاری کے ساتھ پہرے پر بیٹھے ہوں گے۔ سب کی گنز کا رخ دروازے کی سمت ہوگا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلیں گے وہ سب ٹوٹ پڑیں گے۔ اب بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مرشد پر قابو پالیں۔‘‘ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

’’پھر کیا کریں؟‘‘ مرتجس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں عقل مند دشمن مقابل کو تھکا دینے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ تھکا ہوا دشمن تر نوالہ ہوتا ہے۔ عقلمندی کا تقاضہ ہے کہ ہم خود کو تازہ دم رکھیں۔‘‘ میں نے جواب دیا ’’تازہ دم رہنے کے لیے نیند ضروری ہے ایسا کرتے ہیں کہ ہم اوپر کے کمروں میں سے ایک کا انتخاب کر کے کچھ دیر سو لیتے ہیں۔‘‘

’’سویا ہوا انسان مردے کے برابر ہوتا ہے۔‘‘ سفیر نے ہنس کر کہا۔

’’ہم سب سوئیں گے مگر قسطوں میں۔ دو آدمی سوئیں گے اور ایک آدمی پہرا دے گا۔ دو تین گھنٹے بعد اٹھا دے گا تب جاگنے والا نیند پوری کرے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، چلو اوپر چل کر اسی کمرے میں سو جاتے ہیں جو سجا ہوا ہے۔ وہاں ایک بیڈ ہے اس پر دو آدمی سو سکتے ہیں۔‘‘ سفیر نے کہا۔

ہم تینوں پھر سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر لائن سے بنے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم آخر والے کمرے کے سامنے پہنچے۔

’’ہاں یہی ایک ایسا کمرا ہے جس میں رات گزاری جا سکتی ہے۔ سیڑھیوں سے دور ہے۔ اس لیے اوپر آنے والے کو ہم پہلے ہی دیکھ لیں گے۔‘‘ سفیر نے کہا۔

ہم سب اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ نیند لینے سے پہلے جاگنا آسان ہے لیکن آدھی نیند کے بعد پہرا دینا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔ ’’پہلے ہم اور سفیر سو لیتے ہیں۔ دو گھنٹے بعد مرتجس ہمیں اٹھا دے گا۔‘‘

’’ہاں یہ صحیح ہے‘‘ کہہ کر سفیر نے کندھے سے لٹکے کلاشنکوف کو بستر پر پھینکا اور لیٹ گیا۔

’’آپ کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم یہاں پکنک منانے آئے ہیں۔‘‘ مرتجس نے ہنس کر کہا۔

’’ہم سب قسمت کے محتاج ہیں۔ قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا تو پھر ہم کیوں پریشان ہو کر انرجی برباد کریں۔ سوچنے، راہ تلاش کرنے کے لیے شہباز ہے اس لیے ہم بے فکر ہو جاتے ہیں۔‘‘ کہہ کر سفیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں لاتعلق سا بنا لیٹا تھا۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ وہی میرے ساتھ ہوا۔ میں بے خود ہو گیا۔

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ فائر کی آواز سنائی دی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

’’مرتجس کہاں گیا؟‘‘ سفیر کے ہونٹوں سے حیرانی بھری آواز نکلی۔

میں پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ گن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ میری آنکھیں سرچ لائٹ کی طرح گھوم رہی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے تین راستے تھے۔ ایک بالکل سامنے دوسرا دائیں اور تیسرا بائیں طرف جا رہا تھا۔ ہر سیکنڈ میں تینوں راستوں پر میری نظریں جا رہی تھیں۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔

’’گولی کس نے چلائی، کسے لگی؟‘‘ سفیر بولا۔

مرتجس یوں اچانک غائب ہو گیا تھا اس وجہ سے سب پریشان ہو گئے تھے۔ وہ اتنا تو غیر ذمہ دار نہ تھا کہ ہمیں سوتا چھوڑ کر کہیں چلا جاتا۔ اسے کوئی زبردستی لے گیا ہو یہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔

’’بولتے کیوں نہیں، گولی کسے لگی؟ کہاں چلی؟‘‘ سفیر نے اپنا سوال دہرایا۔

"گولی یہاں نہیں چلی ہے کہیں دور سے آواز آئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔
"کیا مطلب؟" سفیر کے لہجے میں حیرانی تھی۔
"گولی کہیں دور چلی ہے۔ کہیں دور سے یہ آواز آئی تھی۔" میں نے جواب دیا
"کیا مطلب؟" سفیر کے لہجے میں حیرانی تھی۔
"گولی کہیں دور چلی ہے" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "یہاں بارود کی بو نہیں ہے۔ اگر کہیں قریب میں گولی چلتی تو بارود کی بو فضا میں تیرتی ضرور محسوس ہوتی۔"
"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں ہم تھک کر چور تھے اسی لیے نیند بھی گہری آئی تھی۔ نیند کی حالت میں آواز سنی تھی اسی لیے صحیح اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔"
میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجے تھے ہم نے تین گھنٹے لمبی نیند کا مزہ لیا تھا۔
"کچھ تو منہ سے پھوٹو یہ کیا ہوا ہے؟"
"مرجس پر قابو پانا آسان نہیں ہے یہ جو کچھ ہوا برا ہوا ہے کیونکہ فائر کی آواز کے ساتھ مرجس یہاں سے غائب ہیں۔" کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا "مرجس کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہیں کرنا ہے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمیں صرف اپنے لیے کرنا ہے اپنے لیے۔"
"بڑے مطلبی ہو، وہ مصیبت میں ہے اور تم......" سفیر نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔
"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو" میں نے تیز لہجے میں کہا "ہم نہیں جانتے کہ مرجس کے ساتھ کیا ہوا اس وقت وہ کس حالت میں اور کہاں پر ہے۔ اسے تلاش کرنا مشکل ہے جب کہ ہمیں اپنی جان کو بھی محفوظ رکھنا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے چکر میں وقت برباد کرنا بیکار ہے پھر اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالیں؟"
سفیر کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ میری باتوں سے متفق نہیں ہے۔ لیکن جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے کھڑا رہا جبھی دیواروں میں چھپے ہوئے کئی مائیک ایک ساتھ چیخ پڑے۔ "صبح بخیر میرے عزیز مہمانو کو میرا اسلام پہنچے اُمید ہے میرے مہمانوں کو بہت گہری نیند آئی ہوگی۔"
سفیر کے جبڑے بھنچ گئے غصے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی اس نے نہایت تیز لہجے میں پوچھا۔ "مرجس کہاں ہے؟"
"وہ کمروں کے جال میں الجھا ہوا بھٹک رہا ہے بے چارہ۔"
"گولی کس نے چلائی تھی؟" میں نے پوچھا۔
"مرجس نے، ہم اپنے مہمانوں کی گولیوں سے میزبانی نہیں کرتے۔" آواز میں ہنسی کی جھلک تھی۔ "آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی۔ واپس پلٹیے اگلے کوریڈور میں ٹرالی آپ کی منتظر ہے جائیے۔"
میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر پوچھا "تم سامنے کیوں نہیں آتے؟"
"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے میرے بلاوے پر آتے تو بات کچھ اور تھی، باتیں تو ہو ہی جائیں گی ضرورت سمجھوں گا تو بلا لوں گا۔"
"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس سے پہلے ہی اس تہہ خانے کو ڈھونڈ لیں جہاں تمہارا کنٹرول روم ہے اور تم خود چھپے ہوئے ہو۔"
"کوشش کر کے دیکھ لو، اگر تم نے تہ خانہ ڈھونڈ لیا تو مرشد تمہارا غلام ہو جائے گا۔ جاؤ ناشتا کرلو، کھا پی کر تلاش کرنا بھوکے پیٹ سے اچھا ہے ورنہ تو دل ہی نہیں لگے گا۔"
میں نے کچھ کہنے کے بجائے کوریڈور کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سفیر بھی میرے ساتھ تھا۔
"تم نے بتایا نہیں کہ مرجس کہاں ہے؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔
"میں نے بتایا تو تھا کہ وہ ایک کوریڈور سے دوسرے کوریڈور کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ بھٹک گیا ہے اسے بلانا چاہتے ہو تو آوازیں دو، وہ آواز کے سہارے چلا آئے گا۔" خفیہ مائیک سے مرشد کی آواز آئی۔
باتوں کے درمیان ہم برابر والے کوریڈور میں پہنچ گئے وہ کوریڈور بھی سیڑھیوں کے سیدھ والے کوریڈور جیسا تھا۔ اس کوریڈور کے بھی دونوں طرف کمرے تھے۔ وہاں ٹرالی موجود تھی ٹرالی پر ناشتے کی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔ سفیر جلدی سے آگے بڑھا مگر نزدیک پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔
"اس میں زہر بھی ہوسکتا ہے۔" سفیر نے کہا۔
"نہیں فکر نہ کرو اس میں زہر نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اگر مرشد ہمیں ختم کرنا چاہتا تو کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ وہ مزہ لے رہا ہے، ہماری بے بسی کا لطف لے رہا ہے۔"
"شہباز صحیح کہہ رہا ہے۔" خفیہ مائیک سے آواز آئی۔
میں بھی ٹرالی کے نزدیک پہنچ گیا تبھی میری نظر سامنے کی دیوار پر پڑی۔ میں نے کہا۔ "گولی اسی کمرے میں چلی

ہے گولی کا نشان سامنے والی دیوار پر صاف نظر آرہا ہے۔‘‘
’’ہاں، اسی لیے بارود کی بو اس کوریڈور تک نہیں پہنچی۔‘‘ سفیر نے گولی کے نشان پر انگلی پھیر کر کہا۔

’’اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہا ہے۔ مرشد کا نوکر ٹرالی دھکیلتے ہوئے یہاں پہنچا، اس پر مرجس کی نظر پڑ گئی۔ مرجس نے اسے گھیرنے کی کوشش کی وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا مرجس بھی اس کے پیچھے دوڑا اور کوریڈور کے جال میں پھنس گیا۔‘‘

’’اب کیا کریں؟‘‘ وسیم نے پوچھا۔

’’اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے آواز کو قید نہیں کیا جا سکتا اگر مرشد کی بات سچ ہے تو مرجس یہیں کہیں بھٹک رہا ہے۔ ایسا کرو کہ اسے آواز دو۔‘‘

سفیر نے زور سے پکارا ’’مرجس‘‘ اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی بازگشت بھی سنائی دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

’’پھر پکارو۔‘‘ میں نے کہا۔

سفیر نے دوبارہ آواز دی ابھی آواز کی گونج بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مرجس کی ہلکی سی آواز سنائی دی ’’جی۔‘‘

’’پھر پکارو۔‘‘ اس نے تمہاری آواز سن لی ہے‘‘ میں نے سفیر سے کہا۔

سفیر نے پھر آواز دی ابھی اس کی پکار ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ مرجس سامنے والے کوریڈور سے نکل کر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

’’یار یہاں کوریڈور کا جال پھیلا ہے۔ عجب انداز سے کمرے بنے ہیں ہر پانچ کمرے کے بعد ایک نئی کوریڈور۔ ہم پہلے بھی ان گلیاروں میں آ چکے ہیں لیکن سب ساتھ تھے اور کوئی مخصوص مقام نہیں تھا اس لیے توجہ نہیں دی۔ اب جو واپسی کے لیے چلا تب پتا چلا کہ کمروں کی سیٹنگ اس طرح سے کی گئی ہے کہ چاہ کر بھی کوئی کمرا یاد نہیں رہے۔ اس انداز میں کمرے بنے ہیں کہ انہیں یاد نہیں رکھا جا سکتا۔ سب ایک جیسے ہیں اسی لیے میں ٹھٹک گیا تھا۔‘‘

’’اب تو آ گئے۔ اس لیے شروع ہو جاؤ۔ کھانا سامنے ہو تو اسے انتظار نہیں کرانا چاہیے۔‘‘

ٹرالی پر کھانا ناشتا دیکھ کر وہ رکا نہیں فوراً شروع ہو گیا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ’’ہوشیار رہنا اتنی دیر میں، میں نے جان لیا ہے کہ ہم مرشد کے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے ٹرالی لانے والے کو دیکھ لیا تھا اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تھا کہ وہ اس طرح غائب ہو گیا جیسے اس نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہو۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہاں خفیہ راستوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارے قدموں کے نیچے بھی کوئی خفیہ سرنگ ہو۔‘‘

’’آپ کی بات سے میں متفق ہوں لیکن یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ ہم اس کے رحم و کرم پر نہیں۔ ہم تو اس کی برابری پر ہیں۔ اگر رحم و کرم پر ہوتے تو کب کے مار دیے جاتے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر وہ مقابلے پر آئے گا تو مر بھی سکتا ہے اس کی ہڈیوں میں نوجوانوں جیسی قوت بھی نہیں ہے اسی لیے ابھی تک چھپا بیٹھا ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’آئیں میں آپ کو ایک جگہ دکھاؤں۔ میں بھٹکتے بھٹکتے وہاں پہنچ گیا تھا۔‘‘ مرجس نے کہا اور کوریڈور کی جانب بڑھنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ تھے کوریڈور کی اس بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ اس ہال میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک پچاس فٹ کا ہال تھا اس ہال کی مغربی سمت میں ایک اسٹیج نما چبوترا تھا جس پر مخملی پردے پڑے تھے۔ انتہائی نفاست سے سرخ پردوں کو لگایا گیا تھا۔ چبوترے پر سرخ فرش گیر بچھی ہوئی تھی۔ اسٹیج کے سامنے کل آٹھ بڑی بڑی کرسیاں نصف گولائی میں لگائی گئی تھیں جن کا رخ اسٹیج کی جانب تھا۔ اس اسٹیج کی سجاوٹ کسی دربار کا منظر پیش کر رہی تھی مگر تخت غائب تھا۔

’’یہ تو کسی مہاراجا کا دربار ہے۔‘‘ سفیر نے کہا۔

’’ایسے محل نما مکان میں دربار کا ہونا ضروری ہے۔ شاید اسی جگہ بیٹھ کر مرشد مریدوں سے ملاقات کرتا ہوگا۔‘‘ میں نے خیال ظاہر کیا۔

’’اگر مرشد اپنا دیدار کرانے کے لیے یہاں بیٹھا کرتا ہے تو پھر اس کی کرسی کہاں گئی اس کے لیے تو ان سے اعلیٰ کرسی ہونا چاہیے تھی جبکہ کرسیاں نیچے بچھی ہوئی ہیں۔‘‘ مرجس بولا۔

’’اسٹیج پر کرسی کا نہ ہونا مجھے بھی کھٹک رہا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اور مجھے دیواروں پر سجے آئینے کھٹک رہے ہیں۔ خوامخواہ تو اس کمرے کو شیش محل کا درجہ نہیں دیا گیا ہوگا ضرور کوئی خاص بات ہے۔‘‘ سفیر نے کہا۔

مرجس دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اسٹیج کے نزدیک پہنچا اور قدمچے پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گیا۔ اسٹیج پر چڑھ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے مایوسی ہوئی ہے۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ شیش محل اس بے وقوف نے عیاشی کے لیے بنوایا ہے۔" مرجس نے اسٹیج کے درمیان پہنچ کر کہا۔

"تم لوگ اسٹیج بنانے کی وجہ پر غور کرو میں تب تک آرام کرلیتا ہوں۔" کہہ کر سفیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم وقت برباد کررہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر تم ہی کوئی راستہ تلاش کرو۔"

"تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ تہ خانے کا راستہ اسی کمرے میں ہے۔ دو دیواروں کے درمیان سے لفٹ یا چھوٹی سیڑھی بنا کر تہہ خانے کا راستہ رکھا جاسکتا ہے تاکہ لوگ نیچے راستہ تلاش کرتے رہ جائیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر جلد پتا لگاؤ۔ ضرورت سمجھو تو دیواروں کو گرا کر راستہ ڈھونڈو۔"

"نہیں ابتدا اسٹیج سے کرتے ہیں اسے کھود کر دیکھنا پڑے گا کہ اس کے نیچے کیا ہے۔"

"تو شروع ہوجاؤ۔ کرسی اٹھا کر پٹخو ایک اینٹ نکل گئی تو باقی بھی اپنی جگہ چھوڑ دیں گی۔"

میں نے ایک کرسی اٹھائی اور اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی میں نے قدمچے پر پہلا قدم رکھا تھا کہ زن کی آواز آئی اور زور کی جھنکار گونجی چھت کے اندر سے لوہے کی سلاخوں والا پنجرہ نیچے گرا۔ اس پنجرے نے پورا اسٹیج گھیر لیا۔ مرجس اس پنجرے میں قید ہوکر رہ گیا تھا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ سفیر کی دبی دبی سی چیخ سنائی دی میں نے پلٹ کر دیکھا وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا اس میں سے شکنجے نکل کر اسے جکڑ چکے تھے۔ وہ آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

"کیوں اب پتا چلا کہ یہ اسٹیج کیوں بنا ہے۔" ایک تیز کھرکھراتی ہوئی سی آواز گونجی۔

"یہ مرشد کی آواز ہے۔" میں نے پنجرے کی سلاخوں کو پکڑ کر کہا "رات بھر ہم سے جو باتیں کرتا رہا وہ کوئی اور تھا۔"

"ہاں میری جان وہ میں نہیں تھا۔" وہی کھرکھراتی آواز گونجی "میں بے وقت ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ آرام کے وقت آرام اور کام کے وقت کام میرا اصول ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ تمہارے دھوکے میں کوئی اور ہمارا شکار نہیں بنا۔" سفیر نے دانت پیس کر کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ چند لونڈے، میرے مقابلے میں لا کر مجھے شکست دے دو گے۔ میں تو کب سے تم سب کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے خبر تھی شہباز تم اندر ہی اندر سازش تیار کررہے ہو۔ وطن پرستی کے کھوکھلے نعروں کے ساتھ تم لوگوں کو اکسا رہے ہو۔ حرام کی دولت میں بڑی کشش ہے۔ وہ اچھے اچھوں کا ایمان خرید لیتی ہے۔ تم ایمان کی دہائی دیتے رہو میں دولت کی چمک دکھا کر سب کو توڑ لوں گا۔ اب اس ملک پر میری حکومت ہوگی۔ میرے دوستوں نے مجھے بھرپور مدد دینے کی یقین دہانی کرادی ہے۔"

"جو صاحب ایمان ہوتے ہیں وہ دنیاوی چمک کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو تمہیں لاتعداد ایسی مثالیں ملیں گی۔ رہ گیا اس ملک پر حکومت کرنا... تو یہ ملک عوام کا ہے اور اس پر صرف محب وطن کا حق ہے۔ کتنے ہی لوگ آئے اور چلے گئے۔ ہزاروں سازشیں ہوئیں لیکن کامیابی کسی کو نہیں ملی۔ تمہیں بھی اقتدار نہیں ملے گا۔"

"وقت پر وہ بھی دیکھ لیں گے۔ تم نے تو میری خانقاہ کو تباہ کرکے سمجھ لیا تھا کہ میں ٹوٹ گیا ہوں۔ میرے بندوں کو ختم کرکے تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرا مورال کم ہوجائے گا۔ بے وقوف آدمی یہ میرے بندے تو میرے لیے تن ڈھانپنے کے کپڑے ہیں۔ پھٹ گئے تو پھینک دیے۔ دو دن میں سب پہلے جیسا کرلیا۔ تمہاری اوچھی حرکتوں سے مرشد کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اب جا کر ہتھے چڑھے ہو۔ میں ایک ایک بات کا بدلہ لوں گا۔"

"غلط تمہارے ہتھے چڑھا نہیں، خود آیا ہوں۔ تمہارے بل سے تمہیں کھینچ کر باہر نکالنے کے لیے آیا ہوں۔"

"یہ چوہے کا بل نہیں شیر کی کچھار ہے" مرشد کی ہنسی میں موت کی چاپ تھی۔ عجیب سی کھرکھراتی ہنسی تھی۔ "اس حد تک بے وقوفی کی بات کرو گے مجھے معلوم نہ تھا۔ شہباز، کسی چھوٹے سے بچے کو شیر کے سامنے بٹھا دیا جائے تو وہ خوش ہوگا۔ قہقہے لگائے گا۔ اس سے کھیلنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس بچے کو کیا معلوم کہ شیر کی دہشت کیا ہوتی ہے۔ بچے میں سمجھداری نہیں ہوتی اس لیے وہ شیر سے نہیں ڈرتا، سمجھدار انسان کو معلوم ہے کہ شیر شیر ہوتا ہے۔ اس کے قریب نہیں جانا چاہیے، اگر گیا تو وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ تم بھی اس ناسمجھ بچے کی طرح ہو جسے یہ علم نہیں کہ شیر کا خوف کیا ہوتا ہے۔ ایسی بے وقوفی کرنے والے کی تعریف نہیں کرنا چاہیے۔ سمجھے۔"

"تم اور شیر" میں نے قہقہہ لگایا۔ "شیر کبھی دم دبا کر گیدڑ کی طرح دبکتا نہیں ہے بلکہ دھاڑتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔ تم ایسے گیدڑ ہو جسے غلطی سے شیر کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور تم خوش ہو رہے ہو، ہمت ہے تو سامنے آ کر دکھاؤ۔"

"ٹھیک ہے اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں خود کو گیدڑ اور تمہیں شیر مان لیتا ہوں۔"

"مگر جس پر سے یہ پنجرہ کب ہٹے گا۔"

"یہ موت کا پنجرہ ہے اور جان لے کر ہی ہٹے گا۔ یہ مر چکا ہے۔ اس کی قسمت میں موت لکھ دی گئی ہے۔" مرشد کی آواز میں خونخواری بھری تھی "موت تو اسی دن تم سب کا مقدر بن گئی تھی جس دن تم لوگوں نے دوبارہ سے خانقاہ میں آنے کا پلان بنایا تھا۔ اب موت کو اتنے قریب پا کر تمہارے ہوش کیوں اڑ گئے۔ کیا آنے سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔"

"ہمیں معلوم تھا۔" اس بار میں نے سیاست بھرے لہجے میں جواب دیا "اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم موت کے جزیرے میں سر دینے جا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے گی۔ ہم بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ہم تم سے ملنے آئے تھے، تمہیں بہادری کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھا ایسی بزدلی کا تو ہمارے ذہن میں شائبہ تک نہ تھا کہ تم پھندا لگائے بیٹھے ہو گے اور ہم اس دام میں پھنس جائیں گے۔"

"جو کام بغیر سامنے آئے ہو جائے وہی اچھا ہے، اسے بزدلی نہیں سیاست کہتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم بہادر ہو۔ مجھے تم سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے تھی۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو ہم "اس ملک" کے مالک ہوتے مگر اب تو یہ پرانی بات ہو گئی ہے دشمنی کا فیتہ جل چکا ہے بغیر دھماکا کیے کیسے خاموش ہو گا؟ مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ تم جیسے بہادر انسان کا مجھے ساتھ نہ مل سکا۔ تمہیں جس مقصد سے ساتھ ملانا چاہتا تھا وہ بھی فوت ہو چکا ہے اب تو موت ہی تمہارا مقدر ہے۔ صبح کا سورج دیکھے گا کہ تمہارے ایسے بہادر آدمی کی لاش چوراہے پر پڑی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ ہم سے ٹکرانے والوں کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ آج دن اور آنے والی رات تم سے کھیلنے کے لیے مختص ہے۔ جتنی اچھل کود مچا سکتے ہو مچا لو۔"

"تم کل صبح کی بات کر رہے ہو جبکہ ابھی پورا دن اور پوری رات باقی ہے۔"

مسکراہٹیں

یونیورسٹی کا ایک پروفیسر افریقا کے چڑیا گھر میں گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیر اور بکری ایک ہی پنجرے میں بند ہیں۔ گائیڈ نے بتایا: "جناب! یہ ہے باہمی امن کا ایک عملی مظاہرہ، ہمارے ہاں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔"

پروفیسر پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میں اس بارے میں اپنے وطن جا کر لکھوں گا مگر اس کامیابی کا راز کیا ہے؟"

"ہمیں روزانہ ایک نئی بکری پنجرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔" گائیڈ نے جواب دیا۔

......

ایک دوست دوسرے دوست سے: "مجھے ایک کیشیئر کی تلاش ہے۔"

دوسرا بولا۔ "لیکن دو ماہ پہلے ہی تو تم نے کیشیئر رکھا تھا۔"

پہلے نے جواب دیا۔ "اسی کی تو تلاش ہے۔"

مرسلہ: زیبا الیاس۔ شیخوپورہ

......

1950ء کی بات ہے ایک چور جیل سے رہا ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھی قیدی نے اس سے پوچھا۔ "تم جیل سے رہا ہونے کے بعد سب سے پہلا کام کون سا کرو گے؟"

چور نے جواب دیا۔ "سب سے پہلے بازار جا کر ایک ٹارچ خریدوں گا کیونکہ پچھلی دفعہ میں نے اندھیرے میں بجلی کے بٹن کی بجائے ریڈیو کا بٹن آن کر دیا تھا۔"

مرسلہ: ابوزر عابدی۔ ملتان

......

ایک سیاح کسی گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے ایک کسان سے پوچھا۔ "یہ جو سامنے گائے نظر آ رہی ہے اس کے سینگ کیوں نہیں ہیں؟"

کسان نے جواب دیا۔ "سینگ نہ ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ بعض کے سینگ ہوتے ہی نہیں ہیں، بعض کے لڑنے بھڑنے میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ بعض کے ہم خود کاٹ دیتے ہیں۔ رہی بات سامنے والی گائے کی کہ اس کے سینگ کیوں نہیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گائے نہیں گھوڑا ہے۔"

مرسلہ: ابوزر عابدی۔ ملتان

''کل صبح کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ کل دن بھر میں تمہارا حشر کروں گا۔''

''تمہیں خود پر اتنا غرور ہے یقین ہے تمہیں کہ تم ہمیں قید رکھ سکو گے۔''

''بالکل اس کے علاوہ اور مجھے کیا کرنا ہے؟''

میں نے اس بار کچھ بولنے کے بجائے گن کا رخ پنجرے کی جانب کیا اور ٹریگر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا ٹھک ٹھک دو گولیاں پنجرے کی سلاخوں میں لگیں مگر اسے نقصان پہنچائے بغیر دونوں گولیاں اچٹ کر گر گئیں۔

''بے کار ہے میرے مٹی کے شیر، یہ پنجرہ عام لوہے کا نہیں۔ تم چاہو تو مزید فائر کر کے دیکھ سکتے ہو لیکن سلاخوں پر ہاتھ نہ رکھ دینا سلاخوں میں کرنٹ دوڑنے والا ہے۔''

میں نے بے بس نظروں سے مرتجس کو دیکھا اور سفیر کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو'' مرشد کی آواز گونجی۔ فائر کر کے تم اس لڑکے کو آزاد کرا سکتے ہو مگر گولی سے تیز کرنٹ دوڑ رہا ہے ادھر لبلبی دبی اور میں نے بٹن دبایا چند سیکنڈ صرف چند سیکنڈ میں اس کا جسم کوئلہ بن جائے گا۔''

مرشد کی آواز نے میرے دل میں بھی دہشت پیدا کر دی۔ سفیر کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ موت کی آہٹ کتنی وحشت ناک ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔ جس پر گزرتی ہے صرف وہی جانتا ہے۔

''پلیز شہباز صاحب کچھ کریں، مجھے آزاد کرانے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے یہ کھوکھلی دھمکی ہو۔'' مرتجس کی آواز میں خوف کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک چمک سی پیدا ہوئی مرتجس کی بھیانک چیخ گونجی اور مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ مرتجس میرا یار اس کا ساتھ بہت تھوڑے دنوں کا تھا لیکن اس کی معصومیت۔ اس کا والہانہ پن مجھے گرویدہ کیے رکھتا تھا۔ جو لڑائی بھڑائی کی دنیا کا بندہ نہیں تھا پھر بھی ہمارے ساتھ ہر محاذ پر قدم سے قدم ملا کر چلتا تھا۔ جس نے اکیلے ایک بار پوری بازی الٹ دی تھی وہ اتنی آسانی سے ساتھ چھوڑ جائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں اس کا جسم سیاہ پڑ گیا تھا۔ پتا نہیں کتنے واٹ کا کرنٹ تھا کہ ایک پل میں وہ سوختہ ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہم پتھر جیسے بن گئے تھے۔

''میں کھوکھلی دھمکی نہیں دیتا۔'' مرشد کی مکروہ آواز گونجی ''موت کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایک کر کے میں تم سب کو اسی طرح ماروں گا۔ شہباز سب سے بھیانک موت تمہاری ہو گی تمہیں نے مجھے تباہ کیا ہے۔ یہ تمہیں تھے جس نے مجھے ڈیوڈ سے فتح خان سے دوست بنا کر مار کھلائی۔ مجھ سے فاضلی کو چھینا اسے مکاری سے ڈیوڈ شا کا نشانہ بنوایا۔ یہ تمہارے ہی شیطانی دماغ کی پیداوار تھی جس نے مجھے دھوکا پہنچایا ہے اس کا مزہ تمہیں ضرور چکھنا ہو گا۔ تم ہر ایک کی موت کا منظر دیکھو گے۔ مجھے صرف اس کا رنج ہے کہ تمہاری موت کا منظر صرف میں دیکھوں گا۔ اب تم سفیر کا حشر دیکھو۔''

''ٹھہرو۔'' سفیر نے چیخ کر کہا۔

''موت سے ڈر گئے۔'' مرشد نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''موت برحق ہے ہر ایک انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ پھر ہم تو حالت جہاد میں ہیں گھر سے یہ سوچ کر نکلے ہیں کہ ہم موت پر جا گریں گے یا موت ہم پر آ گرے گی۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا ''شہباز ہم خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستان تمام عالم میں واحد ملک ہے جہاں اسلام کے شیدائی گلی کوچوں میں سر بکف ملتے ہیں۔ یاد رکھو پاکستان تحفہ خداوندی ہے۔ نزول قرآن کے روز یہ ملک ہمیں ملا ہے۔ اسی بات سے اس ملک کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہو تمہیں اسی ملک کی قسم ہے اپنے مشن سے پیچھے نہ ہٹنا۔ وطن کے لیے ہم جیتے ہیں اسی کے لیے ہم مرتے ہیں۔ فوج اگر سرحد کی حفاظت کرتی ہے تو ہم اندر رہ کر وطن کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ حافظ۔''

میں کہہ کر... ایک قدم آگے بڑھا پھر گن کی نال سفیر کے ہاتھ کو جکڑے شکنجے کے بالکل نزدیک لے جا کر ٹریگر پر دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ تڑتڑ کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔

''بے کار ہے۔'' مرشد کی آواز سنائی دی۔ ''ان سلاخوں پر گولیاں بے اثر ہیں۔''

''دیکھو او کافر کے بچے سلاخیں مڑ گئی ہیں۔'' سفیر کی آواز میں خوشی کی چہکار تھی ''اب میں اسے توڑ کر ہی دم لوں گا۔'' کہہ کر میں نے گولی چلائی مگر افسوس میگزین خالی ہو چکا تھا۔

''چچ چچ چچ یہ کوشش بھی بیکار گئی اب میرا کمال دیکھو۔'' اس مردود کی آواز کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ چھناکا سا ہوا... اور سفیر پر ایک جال سا آ گرا۔ اس جال کے گرتے

ہی سفیر کی دردناک چیخ گونجی۔ میں نے اسپیشل لینس والے چشمے سے جال میں دوڑتی چنگاریوں کو دیکھ لیا تھا اس جال میں کرنٹ تو دوڑا تھا مگر چند لمحے کے لیے جس نے اسے نیم جان کر دیا۔ ظالم کی طاقت کو سرنگوں کرنے کی قسم کھا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے والا شیر مرد بے ہوش ہو گیا۔ اس کی بے بسی پر میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ اوپر سے اس پر گرنے والا جال پھر اٹھ گیا تھا۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ مرشد ہم سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس نے سفیر کو سزا دے کر مجھے دھمکایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سفیر مجھے بہت عزیز ہے۔ اسی لیے اس نے اسے بجلی کا جھٹکا دے کر مجھے پیغام دیا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مجھے اب خاموش نہیں رہنا تھا۔ اسے بھرپور جواب دینا تھا۔ لیکن جوش سے نہیں ہوش سے۔ جوش اندھا بنا دیتا ہے اور اندھے پن میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مجھے عقل سے یہ جنگ جیتنی ہے۔ اس خیال سے میں نے کہا:

”مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیسی موت ملے گی جب ملے گی تو تمہارے سارے الفاظ کو تول لوں گا کہ تم نے سچ کہا تھا یا جھوٹ میرے مرنے میں ابھی بہت وقت باقی ہے۔“

”کوئی وقت نہیں ہے۔“ مرشد کا لہجہ پُریقین تھا۔

میں نے سفیر پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا، مجھے اب کون سا قدم اٹھانا چاہیے کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کمرا موت کا کنواں ہے۔ کنٹرول روم میں بیٹھا مرشد بٹن پر انگلی رکھے موت بانٹ رہا ہے۔ میں نے جھک کر مرجس کے پستول کو اٹھایا جو اس کے ہاتھ سے پھسل کر سلاخوں سے باہر آ گیا تھا پھر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تبھی مرشد کی آواز گونجی۔ ”کمرے سے نکلنا چاہتے ہو؟ اپنے دوست کو اس حالت میں چھوڑ کر جاؤ گے؟ لو میں نے اسے آزاد کر دیا۔

کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ پیر کو جکڑنے والا شکنجہ کھل گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ مرشد میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ شکنجہ کھلتے ہی میں نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

کمرے سے باہر آ کر میں نے مڑ کر ایک نظر مرجس کی سوختہ لاش پر ڈالی اور اس کمرے سے دور ہوتا چلا گیا۔

گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ نے کمروں کے اس جنگل کا جغرافیہ بتا دیا تھا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی تھی۔ میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر ڈالی تھی۔ مجھے یہاں آنا نہیں چاہیے تھا۔ زندگی کے لالے پڑ چکے تھے زندگی بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس عمارت سے باہر نکلا جائے لیکن باہر کیسے نکلا جائے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گلیاروں کی اس بھول بھلیوں میں پھنس کر میں اصل راستہ بھول چکا تھا۔

سیڑھیوں کی طرف جانے والا کوریڈور پتا نہیں کس طرف ہے۔ تبھی ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس منزل پر بنے کمروں کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں۔ اگر میں کھڑکی

سے لان میں کود جاؤں تو بچ سکتا ہوں۔

میں نے سامنے والے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ بولٹ کر دیا پھر کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا باہر گارڈز کا ہجوم تھا۔ سب کی نگاہیں بلڈنگ پر جمی ہوئی تھیں انہوں نے گولیوں کا انجام دیکھ لیا تھا ان کی گولیاں میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکی تھیں۔ شاید اسی لیے اب ان کے ہاتھوں میں روایتی ہتھیار تھے کسی کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا تو کسی نے تلوار اٹھا رکھی تھی کوئی برچھا لیے کھڑا تھا۔

آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی، اب میں کیا کروں؟

کھڑکی پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا کہ مرشد کی آواز گونجی "کیا موت سے ڈر گئے؟"

"موت میرے لیے کھیل ہے۔"

"پھر رک کیوں گئے۔ کود جاؤ۔ بے چارے گارڈز کی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔"

☆......☆

کھڑکی سے ہٹ کر میں دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ہم تین آدمی یہاں آئے تھے۔ ایک مر چکا تھا دوسرا بے ہوش تھا۔ میرا قیاس تھا کہ مرشد کو سفیر سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسے اگر سزا دینا ہوتی تو وہ ایک بار میں ہی اسے ختم کر دیتا۔ وہ تو مجھے دھمکانے کے لیے اسے شاک دے رہا تھا۔ اسے سزا دینے کی وجہ میں ہوں اسی لیے مرشد طنز کی تیلی سے مجھے سلگا رہا ہے۔ میں نے دانت بھینچ کر کہا "مرشد میں تجھے تو ایسا سبق دوں گا کہ تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

ذہنی دباؤ سے ایک حد تک آزادی ملی تو میں نے کندھے سے لٹکتی ہوئی کلاشن کو داہنے ہاتھ سے اٹھا کر چوما اور کہا "مرشد تجھے میں راکھ کر دوں گا۔" میں نے خود کلامی کی پھر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ گارڈز کی پوری جماعت مستعد تھی۔ ان کے حوصلے پست کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسٹین گن کی نال کھڑکی سے باہر نکالی اور بغیر نشانہ لیے برسٹ مارا۔ کئی پہریدار گرے باقی نے اِدھر اُدھر ہو کر آڑ لے لی۔ اب میں ٹھہر ٹھہر کر فائر کر رہا تھا جو بھی نشانے پر آتا خاک اور خون میں لتھڑ جاتا۔ موت کا کھیل عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس کھیل کو مرشد نے شروع کیا تھا انجام پر اسے میں پہنچا رہا تھا۔ میرے دوست کو اس نے زندہ جلایا تھا۔ میں اس کے بدلے دو سو کی زندگیاں چھین لوں گا۔ اب تک پچاس سے زائد گارڈز میرا نشانہ بن چکے تھے۔ پھر بھی اچھی خاصی تعداد ادھر ادھر چھپی نظر آ رہی تھی۔

اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہی سوچا جا سکتا تھا کہ مرشد نے اپنی حفاظت کے لیے ایک پوری فوج جمع کر رکھی تھی۔ گارڈز جو روایتی ہتھیار تلوار، خنجر، کلہاڑی وغیرہ سے مسلح تھے اب انہوں نے وہ پھینک کر پھر سے آتشیں ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

جوابی گولیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے اب تک دو بار میگزین بدلا تھا۔ اسٹین گن کی نال گرم ہو چکی تھی۔ میرے پاس فالتو گولیاں بھی نام کو نہ تھیں۔ مجھے اب فیصلہ کن قدم اٹھا لینا چاہیے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔ مرشد کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ شاید اپنے آدمیوں کی موت پر وہ گھبرا اٹھا تھا۔ یقیناً وہ اندر باہر دونوں اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہوگا۔ میں نے ایک نظر کمرے پر ڈالی اور دوڑتا ہوا اٹیچ باتھ روم میں گھس گیا۔ نل کی ٹونٹی کھول کر پانی کی دھار پر نال کو رکھ دیا تاکہ حدت کم ہو جائے۔ پھر میں باہر نکلا تھا کہ مرشد کی مکروہ آواز سنائی دی "اب کیا کرو گے میری جان گولیاں تو ختم ہونے والی ہیں۔"

"آخری گولی سب سے اہم ہوتی ہے اور وہ میں نے تمہارے نام لکھ دی ہے" میں نے باتھ روم سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یہ الفاظ میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کے منہ سے سن چکا ہوں۔" مرشد نے قہقہہ لگایا۔

ابھی اس کے قہقہے کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے کہا "میرا کہا پتھر کی لکیر ہے اس وقت میرا پلہ ہلکا پڑ رہا ہے مگر یقین کرو میں تمہیں جہنم واصل ضرور کروں گا۔"

"کیسے؟"

"میں جا رہا ہوں۔ اس عہد کے ساتھ کہ میں پھر آؤں گا۔ بہت جلد۔ تم سے ایک ایک زخم کا حساب لینے۔" ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پوری عمارت کانپ کر رہ گئی۔ میں خود بھی چونک گیا تھا پھر تو دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ "یہ دھماکے گرینڈ کے ہوں گے۔" میرے دماغ نے کہا کیونکہ دھماکے تیز تھے اور ان کی گونج کافی دیر تک قائم رہتی تھی لہٰذا آواز بھی دور تک پھیل رہی ہوگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ دروازے کھڑکیاں بجنے لگے تھے۔

کہانی ابھی جاری ہے
اگلی کڑی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

بیت بازی

قارئین

(زرین تبسم سکھر کا جواب)

عبدالجبار رومی..........لاہور

کیفیت بدلی بدلی سی ہے موسم کی
شاید کچھ عنایات ہونے والی ہیں

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے
غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے

عشی عزیز مے..........لڈن

کوئی زنجیر بھی نہیں پھر بھی قید ہوں تجھ میں
نہیں معلوم تھا کہ تجھے ایسا ہنر بھی آتا ہے

سیف اللہ..........ملک وال

کس کو ہمارے حال سے نسبت ہے کیا کہیں
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پرنم ہیں دوستو

عینی..........گجرات

کنول ہیں چاند ستاروں کے جا بجا روشن
شب وصال میں اللہ رہے اہتمام ترا

احمد حسین جامی..........کراچی

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

سید محمد حسین شاہ..........حیدرآباد

حسن فطرت کو ڈھونڈنے والے
کیا کبھی تو نے صبح دیکھی ہے

احمد جاوید..........جیکب آباد

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

فرمود اقبال..........پشاور

حال دل نے بوجھ بن کر پیس ڈالا ہے مجھے
کاش سنتا جائے کوئی اور کہتا جاؤں میں

محمد طفیل ساحر..........وہاڑی

حسن اور الفت میں ربط باہمی کے باوجود
عید کو صیاد سیغافل نہ رہنا چاہیے

(شبیر فدا لاہور کا جواب)

نزاہت افشال..........میورہ فتح جنگ

عجیب حسن اتفاق تھا کہ ان کی گلی میں ہم
ایک کام سے گئے تھے ہر کام سے گئے

زرین اکبر..........کراچی

کبھی کسی غزل میں تھی آپ ہی کی چبھن
کوئی رضا تھا کبھی آپ نے سنا ہو گا

فیض خان کاکڑ..........ڈی آئی خان

کیا زیست کا مصرف ہے جو بیدار نہ ہو دل
ہر شخص کو محسوس زیاں ہو نہیں سکتا

(سندس علی کراچی کا جواب)

محمد احسن جاوید..........ڈی جی خان

یہ کھلا کھلا سا چہرہ یہ حسین مسکراہٹ
تیری خم بہ خم یہ زلفیں میری زیست کا سہارا

توفیق اللہ چانچڑ..........سکھر

یہی ہے روز مسرت یہی ہے شام نشاط
بجھی بجھی ہوئی کرنیں اڑا اڑا ہوا رنگ

(طلعت حسین عثمانی اسلام آباد کا جواب)

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

اے درد تیا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ معاملہ نہ ہوا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں یا آپ دل بے تاب ہیں ہم

نسیم شاہ..........مظفر گڑھ

آہ کچھ دیر اندھیرے سے یوں ہی جی بہلے
رنگ پھیکا ہے چراغوں کا سحر ہو شاید

(اریبہ آفاق وینہ جہلم کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..........ڈاہرانوالہ

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں

(زریں مجید لاہور کا جواب)

رفیق احمد ناز..........ڈی جی خان

اس قدر شاخوں پہ سوکھے اور تنہا پھول
شاید کوئی بھنورا ادھر سے گزرا نہیں

ابریز عالم..........مظفرگڑھ

اس نقاد سے مل کر جی خوش نہ ہو آزاد کہ جو
علم کا بوجھ لیے پھرتا ہے ذوقِ سخن سے عاری ہے

عنایت مسیح..........کراچی

اس کو اوروں سے جدا سمجھے تھے ہم
سادگی میں جانے کیا سمجھے تھے ہم

(نزاہت افشاں مہورہ کا جواب)

نسرین مشتاق..........جھنگ

یوں لٹا خانہ دل یاس کے ہاتھوں ہمدم
کوئی مسرت نہ رہی کوئی بھی ارمان نہ رہا

(محمد ممتاز قادری شادی پور کا جواب)

قاضی مشرف معروف حمیدی..........کراچی

مرگ انبوہ بھی حسن ساماں بھی
اب کوئی قتل گاہوں میں جائے تو کیا

اکبر عابدی..........کراچی

مظلوم نہ گھبرائیں کہ برحق ہے قیامت
دنیا ہے یہ انصاف یہاں ہو نہیں سکتا

(عارف حسن عمرکوٹ کا جواب)

نزاہت افشاں..........مہورہ

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا

محمد اشفاق..........سکھر

مقصد نظر میں تھا نہ ضرورت کی بات تھی
ہم اس سے مل رہے تھے محبت کی بات تھی

افسر علی افسر..........سکھر

مرگ نین کامنی من موہنی سج کامنی
شعلہ رخ، شمشاد قامت نوش لب شاداب رنگ

اشرف عباس..........دبئی یو اے ای

میں بہرصورت ترا کرب تغافل سہہ گیا
اب مجھے اس کا صلہ دے صرف شرمندہ نہ ہو

رانا حیات محمد..........گجرات

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خواب حقیقت ہے آگہی کیا ہے

(نجمی رحمان برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

عباس جوکھیو..........ٹنڈوالہ یار

زخم برحق ہیں ان کی دوا کیا کروں
ان غموں کا مداوا بنا کیا کروں

وحید نیازی..........لاہور

زخم سہے کے ظہوری میں کریدوں کس لیے
پوچھتی ہے مجھ سے دنیا کیوں مرا دیکھا سنا

عارف حسن..........عمرکوٹ

ذرا یہ دھوپ ڈھلے تو حواس میں آئیں
سلگتی سوچ میں ڈوبے ہوئے شجر ہیں ابھی

امجد علی عطاری..........کراچی

زبان سے ہجر کی شب جلد کٹنے کی دعا کی تھی
اسی سے وصل کی شب کی طوالت کی دعا کیا ہو

(سید مسرت حسین رضوی کراچی کا جواب)

ماہین فاطمہ..........کراچی

نہ جنوں فتنہ خیزی نہ چج نہ جام و مینا
نہیں جانے کیسے گزرے گا یہ موسم بہاراں

مہناز فتح..........چنیوٹ

نظر بندی یہ کیسی اس نے کی ہے
سوا اس کے نظر کچھ بھی نہ آئے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.. ہے۔

نام:..

پتا:..

علمی آزمائش 132
30 دسمبر 2016ء

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 دسمبر 2016ء تک علمی آزمائش 132 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 93

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 132

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2016ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ریڈیو ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے تحریر کیے۔ حکومت نے تمغۂ امتیاز سے نوازا۔

علمی آزمائش 130 کا جواب

وسیم حسن راجا ملتان میں 3 جولائی 1952ء میں پیدا ہوئے۔ بائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور لیگ بریک گگلی بالر تھے۔ 1985ء تک ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ 2821 رنز بنائے جن میں 4 سنچریاں شامل ہیں۔ بہترین اسکور 125 ہے۔ 51 وکٹیں حاصل کیں۔ 20 کیچ پکڑے۔ پاکستان کے نامور کرکٹ کھلاڑی کہلاتے ہیں۔

انعام یافتگان

1- علی حسن۔ لاہور　　2- فرزانہ خان۔ پشاور　　3- اکرام صدیقی۔ کوئٹہ

4- واجد علی۔ لاہور　　5- ثمرین عباس۔ کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے کامران خان، عباس خان، راغب الحسن، شجاع رضوی، طیب خان، اشرف اللہ خان، سید فرح محمود، فیض محمد، دانش قریشی، محمد اختر، توقیر عباس اچکزئی، سلطان جونائی، ایاز سکھیرا منیب الرحمن، زینت النساء، وجاہت وکیل عثمان خان، شاہد اقبال شاہد، محمد اختر، سلطان خان، فرحین سلطان، ناصر حسین، عارف اچکزئی، خادم حسین، نسرین عزیز، عبدالحکیم قمر، کیپٹن فواد خالد خان، حمیرا محمد اکرم، نسرین عزیز، بلال شاہد، قاضی مشرف معروف حمیدی، ڈاکٹر حسین پروین اختر، انعام اللہ، وسیم اختر، فیض الحسن، خالق نیاز عبدل، نثار حسن، ارباب حسن، سید عباس، خالدہ یوسف، یاسین خان، ایم ناصر، اشتیاق محمد، دانش قریشی، مزمل صدیقی، عباس زیدی، توقیر ناصر، منیبہ حبیب، منیر الحسن، اکبر حیات، عنایت خان،

مرزا سلیم، خادم حسین، صالح محمود، امجد اسلام، نازو، نمرہ، صاحب شاہ، شبینہ کوثر۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، محمد مستقیم۔ وزیر آباد سے سلمٰی فرحت، نسیم احمد۔ لاہور سے عبدالجبار رومی، نغمہ نفیس، شاہد علی، عنایت علی، امداد اللہ، ڈاکٹر کامران آرزو، مسز احمد جمال، نگین بٹ، ظفر جتوئی، فہد اللہ، خادم علی، نوید اصغر، محمد اکرام، عباس علی، سرور جاوید، آصف خان، عبدالخالق، انیس الحسن، ظفر قاسم، نواب احسن، فاضل اختر، فیح محمد، یاسمین محمد، فرحت مصطفٰی، ناصر علی، زرینہ ایوب، چوہدری فضل اللہ، برکات اللہ، ذیشان علی، احمد صدیقی، ناظم حسین سید، راحیل عثمان، نیاز ملکانی، کائنات علی، تابش بلوچ، فرحت بٹ، جاوید عثمانی، ابرار رضوی۔ پشاور سے مظہر حسین غلام عباس طوری بنگش، فتح باری، نوازش علی سید، اکرام مصطفٰی، باسط علی، شاہ زرولی، رضوان شاہ، قدرت خان، ملک نوروز علی، زاہد زرعلی، بخت آور خان، خرم پاشا، عنایت علی، محمد عرفان، وزیر محمد خان، عباس حسن زئی، گلفشاں گل سید بخاری، نعمان شاہ۔ خانیوال سے محمد کاشف، حشمت علی بٹ۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری، محمد امیر ماجد۔ ملتان سے رمیض احمد، گلفشان افسر، محمد معین چشتی، عنبرین چشتی، اشرف عبداللہ، اقبال انصاری، لبنیٰ ارشاد، نوید اصغر بخاری، محمد معین خضر حیات بھٹی، خواجہ محمد حسین، بابر سعید، محمد آصف، اشفاق حسن، اویس سلمان، حسین ارشاد، معین خان، اقبال حسن خان، سلطان فتح علی، ناصر گواچہ، توقیر عباس، فتح محمد حسن، رشید علی سید، آفاق حسن، راشد علی خان، امام بخش، انعام حسن، فصاحت انس، پیر ناصر شاہ بخاری، امداد شاہ، حنیف محمد، اسماعیل آفاق، غلام علی شاہ بخاری، برکات اللہ بخش، ارشاد کاظمی، نہال کاظمی، شیخ نہال احمد، سید فرحت عباس، مظہر حسین سید، فرقان اللہ۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ، پیر محمد۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ مظفر آباد آزاد کشمیر سے رفعت عباس، اسماعیل حیات، زرین مجید، زاہد شاہ، ملک زین، حکیم حسن خان، ابرار حسن، ضیاء الحسن، فرحت عباس، جاوید بٹ، کاظم حسن شاہ۔ اسلام آباد سے محمد ریاض راحیل، نیلوفر شاہین، عباس ممکری، نازش ممتاز، ارباز خان، افشاں زیاد، انور یوسف زئی، افشاں زیاد، شیخ فتح یاب، صدیق بھٹی، ساغر علی، عبداللہ، عبدالاحد، خرم لودھی، فہد ملک، فیض بخش، شگفتہ مشتاق، یوسف حمد گل، عباس نیازی، ارشد خانم بتول کاظمی، جہانزیب خان، قیام حسین، ملائکہ احسن، وسعت اللہ، توصیف ہمدانی، منیر خان۔ راولپنڈی سے محمد آصف محمود، ڈاکٹر سعادت علی خان، عنایت اللہ ککھر خان زادہ، وسیم الدین ہمدانی، انیم زرین زرولی، کاظم حسین، معین خان، بے بی فرحت اعجاز، قیام الدین، زرفشاں، ثمر متین، علی اسد، طیب حسن، غلام علی، آصف علی، نیلم خان، عباس مشہدی، عنایت بھٹو، زویا اعجاز۔ کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے زہرا نوشین۔ فیصل آباد سے حامد امین صوفی ایڈووکیٹ۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے جاوید مسیح، جمعہ مسیح، نوید احمد علیزئی، اعجاز احمد علیزئی۔ اٹک سے سید محمد حسین شاہ، حیا علی، فلک خان اچکزئی، نعمان ملک۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی (فرید ٹاؤن)، اسماعیل شاہ، نصیر الدین، عباس علی، حسن اختر صدیقی، آغا علی شاہ، ذیشان حیا، سید محمد، حافظ افراسیاب خان قاسمی۔ میانوالی سے اظفر کمال، شہاب شیخ، فتح الدین، خرم بٹ۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، موموسلمیٰ اقبال، ناصر حسین زیدی، ممتاز علی، واحد حسن، ڈاکٹر حنین مصطفٰی، کوکب سلمان، نعمت خان، اسد اللہ، اقبال کاظمی، کاوش بخاری، فریحہ سلطان، اختر عباس، امداد اللہ، حسین مرزا، اللہ بخش سولنگی، فیروز حسن۔ حیدر آباد سے مریم بتنا کاشف، ناصر رند، وسیم چانڈیو، امامہ تجمل، شہاب علی، رفیق احسن، عبدالغفار، سید کاظم علی، نعمان فاروقی، بشیر اللہ اسدی، ساجد فاروق، فرحت علمان، نصیر بوترابی، بے بی پروین، زین انصاری، اختر ہاشمی، عنبرین فاطمہ، دانش فتح محمد، کاظم علی کاظمی۔ سانگھڑ سے عاشق حسین مغل، رضوانہ اسحاق، ملک یاسر، عفت انصاری، ملک یاسر، عائشہ اعوان، منیر الدین، بدر اسحاق، عباس علی، عثمان پیرزادہ، بھیرول جسکانی، یکی علی سید۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ (کچھی درہ)۔ بہاولپور سے محمد منیب جاوید، سعیدہ طارق، اشفاق محمود، زاہد بٹ، ارشد عباس، زاہد علی، ابرار حسن خان، ذیشان احمد۔ وزیر آباد سے سلمٰی فرحت، ظریف حسن، محمود علی، حسن نواز شاہ، برکت اللہ، نورین اشفاق، عبدالخالق، فیض محمد شاہ۔ مردان سے م انور (باڑی چم ہوتی)۔ گوجرانوالہ سے محمد وقار بٹ، عبدالغفار، علی عباس، زہد شاہ، فرحت خان، عثمان علی، بندہ شاہ، ملک ممتاز۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے صائمہ عمران، عبدالجبار خان، فرید الدین، مشتاق ناز، دانش احسن، ناصر خان، توقیر ضیائی، یاسین احمد، شاہد خان۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد احسن جاوید، رفیق احمد ناز، ماریہ حسن، غلام علی، لبنیٰ فرید، اصغر نوید، معین احسن، ابرار حسن، برکات اللہ۔ میلسی سے محمد جہانگیر شاہ، شگفتہ پروین، مشتاق احمد، منیر فراست۔ بگرام سے زین الاسلام۔ جہلم سے ملک شاہین۔ لودھراں سے محمد یار شاہد، حافظ احمد یار، مولوی بشیر قاسمی، حافظ الدین۔ شیخوپورہ سے سلمٰی مہر، ثاقب علی، فہیم الدین قاسمی، کاظم شاہ، اسد بٹ، منیر چوہان۔ اوکاڑہ سے صاحب جان، اسماعیل شاہ، نذر محمد، عباس جنبانی، شبیر علی ڈرائیور، صالح الدین۔ لیہ سے امروز اسلم مغل، نسیم ناظر، اسلم شیخ، ظریف ابن علی، عبدالقادر، نعمانہ شیخ، رابعہ متین، زبیر اسلم پراچہ۔ کمالیہ سے زاہد طارق۔ خوشاب سے شمس الاسلام، حافظ فیروز، محمد محسن۔ ہری پور ہزارہ سے طوبیٰ شاہ، نعمت اللہ، تہذیب حسین، مہ جبیں، الماس فاطمہ، نازش سلطان، اشرف الدین، شریف خان، رفیق ناز۔ بہاولنگر سے غلام یاسین، زرین اشفاق، ساجد شاہ۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ میرپور خاص سے ملیز علی خان۔

بیرون ملک سے نجمی رحمٰن، برٹ لیٹ، امریکا۔ امداد اللہ خان پاکستانی (جدہ۔ سعودیہ)، ارشد ع۔ ہ ارشد (سعودہ عربیہ) انجینئر جنید مصطفٰی (مانچسٹر یوکے)، ملک محمد ظفر عباسی (مانچسٹر یوکے) ظہیر الدین عباسی (اوسلو، ناروے)۔

مرد کی غلامی

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

عورت کی قسمت میں مردوں کی غلامی ہے پھر بھی ہم عورتیں قسمت سے پنجہ آزمائی کرتی ہیں۔ یہ میری سوچ ہے پتا نہیں دیگر عورتیں مجھ سے متفق ہیں بھی یا نہیں۔ میں ایسا کیوں کہہ رہی ہوں اس کے ثبوت میں اپنی روداد حیات کہانی کے انداز میں لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ پلیز اگر کوئی کمی بیشی ہو تو کسی رائٹر سے دور کرا لیں۔

نورین

(کراچی)

ہر لڑکی پر یہ وقت ضرور آتا ہے اور کسی کے لیے بھی اس سے فرار ممکن نہیں۔ میں بھی ان دنوں ایسی ہی کشمکش سے گزر رہی تھی۔ آئے دن کی بک بک جھک جھک اور فضول بحث کی وجہ سے میرا موڈ خراب رہنے لگا تھا۔ میں ان باتوں سے تنگ آچکی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں دور چلی جاؤں لیکن اس سے بھی کیا ہوتا۔ مجھے لوٹ کر تو اسی گھر میں آنا تھا۔ یہ عارضی بن باس میرے مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ میری جان اسی وقت چھوٹ سکتی تھی جب میں اپنے گھر والوں کی بات مان لیتی۔

دراصل ان دنوں گھر میں میری شادی کی بات بڑے زور و شور سے چل رہی تھی۔ امی، بابا اور بھائی سب یہی چاہتے تھے کہ میری شادی کردی جائے حالانکہ میں ابھی بائیس کی بھی نہیں ہوئی تھی اور یونیورسٹی میں میرا فائنل سیمسٹر چل رہا تھا لیکن امی کا خیال تھا کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی لڑکیوں کی شادی کردینی چاہیے اگر ذرا سی بھی تاخیر ہوجائے تو اچھے رشتے نہیں ملتے اور اسی انتظار میں لڑکیوں کی عمر نکل جاتی ہے۔ ان کا یہ خدشہ بے سبب نہیں تھا۔ خاندان میں کئی ایسی لڑکیاں تھیں جو اچھے رشتوں کے انتظار میں کنواری بیٹھی ہوئی تھیں۔ امی خود بھی ایک سماجی کارکن تھیں اور ایک این جی او چلانے کے ساتھ ساتھ بلا معاوضہ رشتے کروانے کا کام بھی کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں کئی تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا خود ان کی بہنوں کی شادیاں بھی دیر سے ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا اور وہ جلد از جلد میری شادی کردینا چاہتی تھیں۔

میں نے گریجویشن کیا تو امی کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ انہوں نے کئی ملنے جلنے والوں سے کہہ دیا کہ وہ میرے لیے کوئی مناسب رشتہ دیکھیں۔ ان کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا۔ پاپا ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ ان کی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امی نے بھی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ وہ اپنی این جی او چلانے کے علاوہ کئی سماجی تنظیموں اور کلبوں کی ممبر تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے غریب لڑکیوں کی شادی کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ ان سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کی رسائی شہر کے اعلیٰ سرکاری اور کاروباری حلقوں تک ہوگئی تھی اور انہی تعلقات کے بل بوتے پر وہ یہ توقع کررہی تھیں کہ بہت جلد میرا رشتہ کسی اچھے گھرانے میں طے ہوجائے گا۔

میں آگے پڑھنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے امی کی خواہش کو نظرانداز کرتے ہوئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوئیں لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے پاپا اور بھائیوں کی سپورٹ حاصل تھی۔ امی نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کرلی لیکن اپنے طور پر وہ میرے رشتے کے لیے کوششیں کرتی رہیں۔ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک روز صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے فرمان جاری کیا۔

”نورین! آج ذرا جلدی گھر آجانا۔ شام کو کچھ

مہمان آرہے ہیں۔"
میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں حالانکہ میں یہ بات کئی دفعہ کہہ چکی تھی کہ تعلیم مکمل کرنے سے پہلے میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ لہٰذا انہیں ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "سوری آج تو یہ ممکن نہیں۔ یونیورسٹی میں ایک سیمینار ہے۔ شام سے پہلے واپسی نہیں ہوسکتی۔"
"بھاڑ میں گیا تمہارا سیمینار۔ میں نے ان لوگوں کو پانچ بجے کا وقت دے دیا ہے اگر تم گھر پر موجود نہ ہوئیں تو مجھے بہت شرمندگی ہوگی۔"
"وہ آپ کے مہمان ہیں پھر میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
"تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکو۔ وہ مجھ سے ملنے نہیں بلکہ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔"
"اوہ آئی سی۔" میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو یوں کہیں ناں کہ پھر آنا شروع ہوگئے ہیں۔ امی پلیز ان لوگوں کو منع کردیں۔ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں ماسٹرز ہوجائے تو شادی بھی کرلوں گی۔"
"میں تمہیں پڑھنے سے نہیں روک رہی۔" امی نے نرم لہجے میں کہا۔ "شادی بعد میں بھی ہوجائے گی خدا کا شکر کرو کہ مسز انجم نے اتنا اچھا رشتہ بتایا ہے۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں پسند کرلیا تو سمجھو تمہاری قسمت کھل گئی۔"
"گویا سارا معاملہ اگر سے مشروط ہے۔" میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں انہیں پسند آگئی تو وہ رشتہ ڈال دیں گی ورنہ نہیں۔"
"ظاہر ہے یہی طریقہ ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ یہ حق دونوں فریقوں کو ملنا چاہیے۔ جس طرح وہ مجھے دیکھنے کے بعد اپنی پسند یا ناپسند کا فیصلہ کریں گی۔ اسی طرح میں بھی چاہوں گی کہ اس لڑکے کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرسکوں۔ اس لیے آپ فون کرکے کہہ دیں کہ موصوف کو ساتھ لے کر آئیں۔"
امی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے ان کی بات سنے بغیر ہی کتابیں اٹھائیں اور یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوگئی۔ امی کی باتیں سن کر میرا موڈ آف ہوچکا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے پہلا پیریڈ بھی مس کردیا اور لان میں جاکر بیٹھ گئی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ اسماء مجھے ڈھونڈتی ہوئی آگئی۔ وہ صرف میری کلاس فیلو ہی نہیں، مخلص دوست اور ہمراز بھی تھی۔ میں اس سے بہت سی باتیں شیئر کرلیتی تھی اور وہ بھی بعض اوقات مجھے بہت اچھے مشورے دیا کرتی تھی۔ اس نے آہستہ سے مجھے ٹہوکا دیا اور میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔
"کیا بات ہے۔ آج تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔"
"بس یار کیا بتاؤں۔ امی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ آج صبح ہی صبح نادر شاہی حکم جاری کردیا کہ شام کو جلدی گھر آجانا۔ کچھ مہمان آرہے ہیں۔"
"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے دیکھے بھالے بغیر تو رشتے طے نہیں ہوتے۔"
"تم میرا پوائنٹ نہیں سمجھ رہی ہو۔ میں کہتی ہوں کہ یہ حق صرف لڑکے والوں کو ہی کیوں حاصل ہے کہ وہ آئیں دیکھیں اور لڑکی کو پسند یا ناپسند کرکے چلے جائیں۔ میں کہتی ہوں کہ یہ ون وے ٹریفک کیوں، ہمیں بھی یہ حق ہونا چاہیے کہ ہم کسی لڑکے کو پسند یا مسترد کرسکیں۔"
"تمہیں یہ حق استعمال کرنے سے کس نے روکا ہے۔ اگر لڑکا پسند نہیں تو انکار کرسکتی ہو کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔"
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں صرف لڑکے والوں کی چلتی ہے۔ لڑکی والے تو ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس لڑکے نے ان کی لڑکی کے ساتھ شادی کرکے کوئی احسان عظیم کیا ہے۔"
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" اسماء اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔
"میں برابری کی بنیاد پر زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ شادی ایک سمجھوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں مرد کی بالادستی قبول کرلوں، اپنی آزادی اور خودمختاری اس کے پاس گروی رکھ دوں۔ اس شخص سے شادی کروں گی جو میرے معاملات میں قطعاً مداخلت نہیں کرے اور نہ ہی اس کے گھر کا کوئی فرد مجھے ڈکٹیشن دے۔ میں ملازمت کروں یا گھر پر بیٹھوں۔ اپنی ساری آمدنی خرچ کردوں یا بینک میں جمع کروں۔ مجھے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی۔"
"بس تو پھر ہوچکی تمہاری شادی۔" اسماء نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور عورت چاہے کتنی ہی معقول بات کیوں نہ کہے۔ مرد اسے تسلیم کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ

ہے کہ کسی کے سامنے یہ شرطیں مت رکھنا ورنہ شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاؤ گی۔ میری بات غور سے سنو۔ ہوشیار لڑکیاں یوں برملا اپنے عزائم کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ شادی کے بعد حالات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

"میں منافق نہیں ہوں اور نہ ہی خوش حال زندگی گزارنے کی خاطر اپنی آزادی اور خود مختاری کا سودا کر سکتی ہوں۔ اس کے برعکس کسی ایسے غریب یا متوسط طبقہ کے مرد سے شادی کرنے کو ترجیح دوں گی جو میرے ساتھ برابری کی بنیاد پر زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔" اسماء نے تلخ لہجے میں کہا۔ "پیسا ہر دور میں انسان کی بنیادی ضرورت رہا ہے۔ اس کے بغیر اچھی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"شاید میں تمہیں اپنا پوائنٹ آف ویو نہیں سمجھا سکی۔ بہرحال میں وہی کروں گی جو میرا دل اور دماغ کہے گا۔ شام کی کارروائی کی رپورٹ تمہیں کل مل جائے گی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ میری باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھ رہی تھی۔ اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی اس میں مرد کو مجازی خدا کا درجہ دیا جاتا ہے اور عورت ذہنی طور پر اس کی محکوم اور غلام بن کر رہنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ عورت اور مرد کی برابری کا تصور محض کتابوں، اخبارات کے مضامین اور تقاریر تک محدود ہے۔ عملی طور پر اس کا مظاہرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور بلند ترین منصب پر پہنچ جانے کے باوجود گھریلو زندگی میں آزادانہ فیصلے نہیں کر سکتی اور اسے زندگی کی آخری سانس تک مرد کی مرضی اور خواہشات کا اسیر رہنا پڑتا ہے لیکن اپنا حق مانگنے کے لیے آواز بلند کرنا ہوتی ہے اور میں اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے برابری کی بنیاد پر زندگی گزارنے کا حق مانگ رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ لڑکے کی والدہ کے ساتھ اس کی بہنیں، بھابیاں اور ایک آدھ کزن ضرور آئے گی لیکن مسز انجم کے ساتھ صرف لڑکے کی والدہ ہی آئیں۔ انہوں نے سرسری انداز میں مجھے دیکھا، چند رسمی باتیں کیں اور چائے پینے کے بعد اپنے بیٹے کی تصویر دے کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد امی نے پلٹ کر تصویر کو دیکھا۔ اس پر کامران

ڈائریا، ہیضہ ایک چھوت دار مرض ہے جو عام طور پر آلودہ پانی پینے اور ایسی غذا کھانے سے ہوتا ہے اور بعض اوقات وبا کی صورت میں پھیل جاتا ہے۔ موسم گرما میں گرمی کی شدت کی وجہ سے مکھیاں اور مچھر کافی حد تک کم ہو جاتے ہیں مگر برسات کے موسم میں ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہیضے کے پھیلاؤ کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ شفیع میڈیکل سینٹر فیصل آباد کے ماہر امراض معدہ و جگر ڈاکٹر فیصل جبار کے مطابق: "ہیضہ جراثیم کے باعث پھیلتا ہے۔ اس میں مریض کو پے در پے قے اور اسہال آتے ہیں جس سے جسم میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو فرد قریب المرگ ہو جاتا ہے۔" ڈاکٹر جبار ہیضہ سے محفوظ رہنے کے لیے درج ذیل تدابیر تجویز کرتے ہیں:

☆ برسات شروع ہوتے ہی پانی کی ٹینکی میں پانی صاف کرنے کے لیے پوٹاشیم پرمیگنیٹ ڈال دی جائے اگر یہ نہ کر سکیں تو پانی ابال کر ٹھنڈا کر کے پئیں۔ ☆ ہمیشہ تازہ کھانا کھائیں اور گلی سڑی چیزوں سے پرہیز کریں۔ ☆ کھانے پینے کی چیزیں ڈھانپ کر رکھیں۔ ☆ بازاری کھانوں سے پرہیز کریں۔ ☆ کھانے کے برتن گرم پانی سے دھو کر استعمال کریں۔ ☆ بدہضمی نہ ہونے دیں۔ ہلکی اور زود ہضم غذا کھائیں۔ ☆ برسات میں اپنی غذا میں پودینہ، سرکہ، پیاز اور لیموں ضرور شامل کریں۔ ☆ موسمی سبزیاں مثلاً کدو، ٹینڈے، توری کھائیں۔ اس کے علاوہ آم، خوبانی، آڑو، آلو بخارے جیسے پھل کھائیں تاکہ جسم کو غذائیت بھی حاصل ہو اور نظام ہضم پر بوجھ بھی نہ پڑے۔ ☆ پیاس بجھانے کے لیے برف کو پانی میں ڈال کر پینا مفید نہیں۔ اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ برف میں گلاس یا صراحی لگا کر پانی ٹھنڈا کر کے پئیں یا پھر فریج میں پانی کی بوتل بھر کر رکھ دیں اور ٹھنڈا ہونے پر پئیں۔ برف کا زیادہ استعمال معدے اور جگر کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ☆ چائے کافی کا استعمال کم سے کم کریں۔ ☆ غذا کے دوران ٹھنڈا پانی پینے سے ہاضم رطوبت (گیسٹرک انزائم) پتلی ہو جاتی ہے جس کے باعث غذا دیر سے ہضم ہوتی ہے۔ اس لیے کھانے کے دوران ٹھنڈا پانی پینے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

مرسلہ: انجم فاطمہ۔ لاہور

کے گھر اور کمپنی کا پتا، فون نمبرز اور ای میل ایڈریس وغیرہ سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ امی اگر چاہیں تو کامران کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔

ان کے جانے کے بعد میں امی سے الجھ پڑی۔ ”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ کامران دبئی کی کسی پیٹرولیم کمپنی میں انجینئر ہے۔“

”تم نے میری پوری بات ہی کب سنی جو میں تفصیل بتاتی۔ بہرحال اب تو معلوم ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے تمہیں پسند کرلیا ہے۔ اسی لیے لڑکے کی تصویر دے گئی ہیں۔ شکل وصورت تو اچھی ہے، خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ باپ کا اپنا کاروبار ہے۔ دونوں بڑے بھائی شادی شدہ ہیں۔ ایک چھوٹی بہن ابھی کالج میں پڑھ رہی ہے۔ مجھے تو یہ لوگ بہت پسند آئے۔ سچ پوچھو تو تمہارے لیے یہ ایک آئیڈیل رشتہ ہے۔“

”یہ بھی خوب رہی۔ آپ نے لڑکے کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر کے کسی فرد سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی اور آپ نے صرف لڑکے کی ماں کو دیکھ کر ہی پسندیدگی کا سرٹیفکیٹ جاری کردیا۔“

”تم نے کیا مجھے بالکل ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ آنکھ بند کرکے یہ رشتہ قبول کرلوں گی۔ وہ تصویر دے گئی ہیں۔ تمہارے پاپا اپنے ذرائع سے اس کے بارے میں معلومات کریں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ معلومات کرلیں لیکن میں کامران سے ملے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ ان کے اور میرے خیالات میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ خاص طور سے بیوی کے بارے میں ان کی کیا سوچ ہے۔ وہ بیوی کو لائف پارٹنر سمجھتے ہیں یا پاؤں کی جوتی، اگر بیوی کے بارے میں ان کی سوچ مثبت ہے تو ٹھیک ورنہ سوری۔“

امی نے کبھی میری باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لیکن اس وقت وہ میرے خیالات جان کر گھبرا گئیں۔ غالباً مسز انجم انہیں یقین دلا چکی تھیں کہ کامران کے گھر والوں کی طرف سے یہ رشتہ پکا سمجھو۔ بس انہیں ہمارے جواب کا انتظار ہے۔ امی خود بھی اس رشتے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہ رہی تھیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ وہ عید کی چھٹیوں میں پاکستان آئے گا تو اس سے مل لینا لیکن اس وقت تک اپنی زبان بند رکھو کسی کے سامنے اپنے زریں خیالات کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔“

میں مطمئن ہوگئی کہ وقتی طور پر معاملہ ٹل گیا۔ دراصل ان دنوں یونیورسٹی میں میرا ایک پروجیکٹ چل رہا تھا جس میں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی تھی۔ شاہد میرا کلاس فیلو تھا اور وہ بھی میرے ساتھ اس پروجیکٹ پر کام کررہا تھا۔ اس کے بارے میں، میں صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ کسی غریب گھرانے کا فرد ہے اور بڑی مشکل سے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ ایک ذہین اور محنتی نوجوان تھا اور اس کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب جگمگا رہے تھے۔ پروجیکٹ پر کام کرنے کے دوران مجھے اس کے قریب آنے کا موقع ملا تو اس کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آگئے اور میرے دل میں اس کے لیے عزت واحترام کا جذبہ بڑھتا گیا۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی لڑکی کے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھار سکتی ہیں۔ مجھے اس کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں برابری کا قائل تھا۔ اتفاق سے میرے پروجیکٹ کا موضوع بھی یہی تھا۔ ہم معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے سماجی اور گھریلو مسائل کے بارے میں سروے کررہے تھے۔ اس سلسلے میں ہم پوش علاقوں میں بھی گئے۔ وہاں رہنے والی خواتین کے مسائل معلوم کیے۔ متوسط طبقے کی بستیوں، کچی آبادیوں اور دیہاتوں میں رہنے والی خواتین کے بارے میں جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ ننانوے فی صد خواتین مرد کی بالادستی کا شکار ہیں۔ ان میں امیر وغریب کی کوئی تخصیص نہیں۔ البتہ دکھوں، تکلیفوں اور مسائل کی نوعیت الگ ہے۔ میں تو اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے شرطیں عائد کررہی تھی لیکن ان مظلوم اور بے بس عورتوں سے مل کر احساس ہوا کہ مردوں کے اس معاشرہ میں عورت محض ایک جنس بن کر رہ گئی ہے۔ اس کا جسم، روح، ذہن، تعلیم، ہنر اور صلاحیت سب کچھ مرد کے پاس گروی ہے، اسے تو اپنی مرضی سے سانس لینے کی بھی اجازت نہیں۔

میں شاہد کے ساتھ لائبریری میں بیٹھی ان رپورٹز پر ڈسکس کررہی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرکے مجھے یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ معاشرے میں مردوں کی بالادستی کے سخت خلاف ہے اور عورتوں کو مساوی حقوق دینے کا حامی ہے۔ خصوصاً اسے کچی آبادیوں اور دیہات میں رہنے والی عورتوں کی حالت زار پر بہت افسوس ہوتا تھا اور وہ ان کے

ساتھ ہونے والے سلوک اور مردوں کے رویے کے خلاف کھل کر بولتا تھا۔ میں اس کے خیالات سے بہت متاثر تھی اور بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنا کرتی۔ اس نے بڑی تیزی سے میرے دل میں جگہ بنانا شروع کردی تھی اور بہت جلد میں یہ محسوس کرنے لگی کہ جس آئیڈیل مرد کی تلاش تھی۔ وہ شاہد کی شکل میں مجھے مل گیا ہے۔

میں نہیں جانتی تھی کہ اس کے دل میں میرے لیے کیا جذبات ہیں۔ میں جو کچھ محسوس کررہی ہوں۔ کیا وہ یک طرفہ ہے یا وہ بھی میرے بارے میں اسی انداز سے سوچ رہا ہے۔ اس نے ابھی تک کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا جس سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ ہوسکے لیکن وہ جس مؤدبانہ انداز میں مجھ سے پیش آتا تھا۔ اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ میرے اسٹیٹس اور فیملی بیک گراؤنڈ سے کافی مرعوب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسی لیے دل کی بات زبان پہ لاتے ہوئے ڈرتا ہو۔

ایک دن ہم قریبی گاؤں میں سروے کرنے گئے۔ موسم خاصا گرم تھا۔ ہمیں تین چار میل پیدل چلنا پڑا۔ دو تین جگہ گاؤں کے اکھڑ مزاج مردوں سے تلخ کلامی بھی ہوگئی۔ انہیں اعتراض تھا کہ ہم گورنمنٹ کے آدمی ہیں اور گاؤں میں ترقیاتی کام ہونے والے ہیں جس کے لیے یہ معلومات اکٹھی کی جارہی ہیں۔ تب کہیں جاکر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

اس واقعے کے بعد شاہد کی طبیعت سخت مکدر ہوگئی تھی۔ وہ راستے بھر ان مردوں کو برا بھلا کہتا رہا۔ اسے اس بات پر بھی شدید غصہ تھا کہ گاؤں کی عورتیں محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتی ہیں یہ نکھٹو مردان سے وہ بھی چھین لیتے ہیں اور ان کی محنت کی کمائی شراب و جوئے کی نذر کردیتے ہیں۔ میں نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے تجویز پیش کی کہ کہیں کچھ دیر بیٹھ کر ستا لیتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یونیورسٹی جاکر ہمیں اس سروے کی رپورٹ بھی لکھنا تھی۔ وہ میری بات مان گیا اور ہم سڑک کے کنارے واقع ایک کولڈ اسپاٹ پر بیٹھ کر کوک سے دل بہلانے لگے۔

جب اس کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا تو میں بولی۔ ”یہ تو میں جان گئی ہوں کہ تم معاشرے میں مردوں کی بالادستی کے خلاف اور عورتوں کو فکر و عمل کی آزادی دینے کے حق میں ہو لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کیا تم شادی کے بعد اپنی بیوی کے معاملے میں قول و فعل کے تضاد کا شکار تو نہیں ہوجاؤ گے اور اسے وہی آزادی اور خودمختاری دو گے جس کا تم پرچار کرتے ہو۔“

”بالکل۔“ وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ”میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا قائل ہوں اور سمجھتا ہوں کہ دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر زندگی گزارنے کا حق ہے۔“

اس کا جواب سن کر میرے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا لیکن ابھی اس نے دل میں جگہ بنائی تھی۔ دماغ اسے قبول نہیں کررہا تھا اور اس کی وجہ ہم دونوں کے درمیان اسٹیٹس کی گہری خلیج تھی اور شاہد ساری عمر اس خلیج کو عبور نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے دماغ کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے شاہد کا خیال وقتی طور پر دل سے نکال دیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ شاید امتحان کے بعد اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔ اس طرح میرے اور شاہد کے درمیان حیثیت کا فرق کچھ کم ہوجائے۔

چند روز بعد ایک بار پھر امی نے ناشتے کی میز پر ایک نئے مہمان کی آمد کی نوید سنائی اور اپنا مخصوص جملہ دہرایا کہ شام کو جلدی آجانا۔ میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا اور بولی۔

”امی ابھی تک تو کامران والا کیس ختم نہیں ہوا۔ اب یہ دوسرا؟“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ کامران کے گھر والے ابھی تک ہمارے جواب کا انتظار کررہے ہوں گے اس دوران انہوں نے نہ جانے کتنی لڑکیاں دیکھ ڈالی ہوں گی جس طرح انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ اسی طرح ہم بھی چوائس کا حق رکھتے ہیں۔“

”پھر بھی امی کچھ پتا تو چلے آخر کون لوگ ہیں لڑکا کیا کرتا ہے؟“

”تمہارے پاپا کے دوست ہیں صمدانی صاحب۔ انہی کی طرح کے سرکاری افسر۔ ان کی بیگم آج کل اپنے بیٹے سعد کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں۔ وہ فارن کوالیفائیڈ ہے اور باہر سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آیا ہے اور آج کل کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہے۔“

مسز صمدانی کا نام سن کر میرا چہرہ اتر گیا۔ میں انہیں تھوڑا بہت جانتی تھی۔ انتہائی بددماغ اور مغرور عورت تھی۔ انہیں اپنے شوہر کے مرتبے اور حیثیت کا بڑا زعم تھا اور وہ ہر ایک کو اپنے سے کم تر سمجھتی تھی۔ میں ان کی فیملی سے کبھی نہیں ملی تھی لیکن جانتی تھی کہ وہ بھی امی کی طرح مغرور اور بددماغ

ہو گی۔ میرا دل چاہا کہ امی کو انکار کر دوں لیکن ان کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بے چاری میری شادی کے لیے پریشان تھیں۔ اچھا ہے۔ اس طرح دو چار رشتے اور آجائیں تو انہیں انتخاب میں آسانی ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی ایسا لبرل بندہ نکل آئے جو میری شرائط اور معیار پر پورا اترتا ہو۔

شام کو مسز صمدانی اپنے شوہر دونوں بیٹوں اور بیٹے سعد کے ہمراہ تشریف لے آئیں۔ سعد کو دیکھ کر میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ انتہائی ڈیشنگ اور اسمارٹ بندہ تھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، مضبوط جسم، گہری سیاہ آنکھیں، سلیقے سے سنورے ہوئے گھنے سیاہ بال۔ اس نے سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ کے ساتھ سیاہ چمکدار جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے باتیں کرنے اور کھانے پینے کے انداز میں سلیقہ اور شائستگی تھی۔ وہ بالکل میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور میرے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں بظاہر اس کی بہنوں سے باتیں کر رہی تھی لیکن میری نظروں کا محور وہی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی اور بہانے بہانے مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماحول کچھ ایسا تھا کہ کوئی اس کی چوری نہیں پکڑ سکتا تھا۔ صمدانی صاحب بابا سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیگم امی سے محو گفتگو تھیں اور سعد کی بہنیں مجھ سے فلموں، فیشن اور ڈراموں کی باتیں کر رہی تھیں۔ سعد اپنی جگہ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنے کا خواہاں ہے لیکن اسے کوئی موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

کھانے پینے کا دور ختم ہوا تو وہ لوگ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسز صمدانی کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ میں انہیں پسند آگئی ہوں۔ انہوں نے جاتے وقت بڑی گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا اور بولیں۔ ''ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ جس گھر میں جائے گی وہاں اجالا بکھیر دے گی۔''

مجھے بہت زور کی ہنسی آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو یہ محترمہ اپنے مطلب کی خاطر مجھ پر محبت کے پھول نچھاور کر رہی ہیں لیکن جیسے ہی انہیں میرے زریں خیالات کا علم ہوا تو میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گی۔ مسز صمدانی نے جاتے وقت ہم لوگوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے مجھے پسند کر

چکی ہیں اور بات آگے بڑھانا چاہ رہی ہیں۔ بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے سعد نے اپنی رفتار آہستہ کر لی اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

''کیا میں آپ سے فون پر بات کر سکتا ہوں؟''

''کیا یہ بہت ضروری ہے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یونہی سمجھ لیں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ میرا نمبر نوٹ کر لیں لیکن دن میں فون مت کیجیے گا۔ میں یونیورسٹی میں ہوتی ہوں۔ آپ کی کال اٹینڈ نہیں کر سکوں گی۔''

''او کے۔ میں رات دس بجے کے بعد فون کروں گا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد امی اور بابا دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اتنا تو میں سمجھ گئی کہ ان کی گفتگو کا موضوع میری ذات تھی لیکن اس کی تفصیل مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ بابا کو یہ رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ ایک تو یہ کہ صمدانی صاحب ان کے دوست تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ سعد سے شادی ہونے کے بعد میں اسلام آباد میں ہی رہتی جب کہ کامران کے ساتھ مجھے دبئی جانا پڑتا۔ پھر خلیجی ممالک میں کام کرنے والوں کی ملازمت بھی غیر محفوظ ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو کنٹریکٹ پر رکھا جاتا ہے۔ اگر کام ہے تو کنٹریکٹ میں توسیع ہو جاتی ہے ورنہ فارغ۔ پھر آپ دوسری ملازمت ڈھونڈیں۔ اس کے برعکس سعد کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نہ صرف اس کی ملازمت محفوظ تھی بلکہ اسے اپنے باپ کی سپورٹ بھی حاصل تھی۔

ٹھیک دس بجے سعد کا فون آگیا۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ بڑے مہذب انداز میں بولا۔ ''معاف کیجیے۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ آپ سو تو نہیں گئی تھیں؟''

''جی نہیں۔ بس سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ آپ بتائیں کس لیے فون کیا ہے؟''

''یہ تو آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ ہم لوگ کس سلسلے میں آپ کے گھر آئے تھے۔ امی تو یہ رشتہ جوڑنے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بات پکی ہونے سے پہلے ہماری ایک میٹنگ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیا آپ مجھ سے کہیں باہر مل سکتی ہیں۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

’’اس سے پہلے کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ آؤٹنگ پر نہیں گئی۔‘‘

’’معاف کیجیے محترمہ۔ میں آپ کو ڈیٹ پر نہیں لے جا رہا۔ بس آپ سے کچھ باتیں شیئر کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔‘‘

’’اگر آپ اصرار کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کہاں ملنا پسند کریں گے؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ سن رائز ریسٹورنٹ ٹھیک رہے گا۔ وہ جگہ یونیورسٹی سے قریب ہے۔ آپ باآسانی وہاں آسکتی ہیں۔ ہم لنچ وہیں کریں گے۔ اسی دوران کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔‘‘

’’اوکے، میں ایک بجے تک وہاں پہنچ جاؤں گی۔‘‘

دوسرے روز میں نے اسماء کو سعد اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بتایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی اور میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ’’اسے کہتے ہیں۔ چپڑی اور وہ بھی دودو۔ تو بڑی خوش قسمت ہے نورین۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب مزید ٹال مٹول ٹھیک نہیں۔ جلد از جلد ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔‘‘

’’دیکھو بھئی مجھے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت نہیں ہے۔‘‘ میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ’’جب تک ان لوگوں سے نہ مل لوں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ کامران کے آنے میں ابھی کچھ وقت ہے لیکن سعد نے آج مجھے لنچ پر انوائیٹ کیا ہے۔ پتا چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔‘‘

’’دیکھو نورین میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا ورنہ وہ رسی تڑا کر بھاگ جائے گا۔ تم جن شرطوں کو سینے سے لگائے بیٹھی ہو۔ انہیں کوئی مرد قبول نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی مہذب پڑھا لکھا اور روشن خیال کیوں نہ ہو۔ اس کی انا یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ آزادی اور خود مختاری کی آڑ میں عورت کو من مانی کرنے دے۔ مرد ہمیشہ سے بالادست ہے اور رہے گا کیونکہ یہی قانون فطرت ہے اور تم اسے نہیں بدل سکتیں۔‘‘

’’میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا لیکن مجھے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق تو ملنا چاہیے۔ اس لیے ایسے شخص سے شادی کروں گی جو مجھے اپنے سے کم تر نہ سمجھے اور یہی بات میں سعد کے کان میں بھی ڈال دوں گی۔‘‘

’’تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے نورین۔‘‘ وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ’’اس سے تو بہتر ہے کہ تم سعد سے ملنے نہ جاؤ۔ کیونکہ وہ کیا، کوئی بھی مرد تمہاری یہ بے تکی شرطیں... نہیں مان سکتا۔‘‘

’’اس سے ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دیکھوں تو سہی وہ کیا کہتا ہے۔‘‘

ہماری گفتگو جاری تھی کہ مجھے شاہد آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میں نے موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ شاہد قریب آکر بولا۔ ’’آپ یہاں بیٹھی ہیں اور میں پورے ڈیپارٹمنٹ میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔‘‘

’’کیوں۔ ایسی کیا ایمرجنسی آگئی؟‘‘

’’کوئی ایمرجنسی نہیں۔ دراصل ہمارے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ لائبریری میں بیٹھ کر اپنی رپورٹس فائنل کرلیں تاکہ ان کی سمری بنائی جاسکے۔‘‘

میں نے گھڑی دیکھی نو بج رہے تھے اور مجھے ایک بجے سعد سے ملنے جانا تھا۔ گویا ابھی میرے پاس چار گھنٹے تھے۔ اس دوران کافی کام ہو سکتا تھا۔ میں نے اسماء کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اچھا ڈیئر، خدا حافظ۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے کام ضروری ہے۔‘‘

شاہد اور میں لائبریری کی طرف چل دیے۔ وہاں ہماری مخصوص میز پر نعمان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ’’ہائے نورین میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دراصل پچھلے دنوں میری کچھ کلاسز مس ہو گئی تھیں۔ اس لیے نوٹس نہ لے سکا۔ اگر پلیز تم دے سکو پرامس دو دن بعد واپس کر دوں گا۔‘‘

عثمان کی بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ میرا کلاس فیلو ضرور تھا لیکن اس سے بہت کم بات ہوا کرتی تھی۔ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ کسی صنعت کار کا بیٹا ہے اور گوجرانوالہ میں ان کی بہت بڑی پنکھے بنانے کی فیکٹری ہے۔ اب انہوں نے اسلام آباد میں بھی اپنا کاروبار پھیلا لیا تھا۔ نعمان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود اس میں غرور و تکبر نام کو نہ تھا بلکہ وہ اپنے تمام کلاس فیلو کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور کشش تھی۔ وہ ہنسنے ہنسانے والا شوخ اور کھلنڈرا بندہ تھا اور ہر وقت لطیفے سنا کر دوستوں کو ہنساتا رہتا تھا۔ میں نے اسے کلاس میں بہت کم آتے دیکھا تھا۔ اس کا زیادہ وقت کینٹین

یا آرٹس لابی سے متصل لان میں گزرتا تھا جہاں وہ دوستوں کی محفل سجائے بیٹھا رہتا اور اس کے قہقہے فضا میں گونجتے رہتے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نوٹس تو میں دے دوں گی لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں پڑھائی سے یکایک اتنی دلچسپی کیسے ہوگئی؟''

''دراصل میں شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن ڈیڈی نے شرط لگادی ہے کہ پہلے ماسٹرز کرو پھر شادی کی بات کرنا۔'' وہ ہمیشہ کی طرح غیر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہیں شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دادی کہتی ہیں کہ بچوں کی شادیاں چھوٹی عمر میں ہی کردینی چاہئیں ورنہ وہ بگڑ جاتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ بگڑنے سے پہلے میری شادی ہوجائے۔'' وہ مسلسل غیر سنجیدگی پر اترا ہوا تھا۔

اب میرے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''اب تو میں تمہیں ضرور نوٹس دوں گی تاکہ تمہاری شادی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے۔ ہمیں تو بلاؤ گے نا اپنی شادی میں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، تم بھی کوئی بھولنے والی چیز ہو۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''بس کل نوٹس ضرور لیتی آنا۔ بھول گئیں تو میرا مستقبل تباہ و برباد ہو جائے گا۔''

اس دوران شاہد بے زاری سے منہ ایک طرف کیے کھڑا رہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے میرا نعمان سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''ہونہہ، چھچھورا کہیں کا۔ ان لوگوں کو تو لڑکیوں سے باتیں کرنے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔''

مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے تنک کر کہا۔

''کیا ہوا اگر اس نے مجھ سے دو چار باتیں کرلیں تم کیوں جیلس ہورہے ہو؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''البتہ وقت ضائع ہونے کا افسوس ضرور ہے۔ اتنی دیر میں تھوڑا بہت کام تو کرلیتے۔''

''اچھا اب اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ ہم کام شروع کرتے ہیں۔''

اس نے فائل کھولی اور باری باری رپورٹیں پڑھ کر ان کے چیدہ چیدہ پوائنٹس ایک کاغذ پر نوٹ کرنے لگا۔ میں نے بھی اپنی فائل کھول کر یہی کام شروع کردیا۔ یہ وہ رپورٹس تھیں جو ہم نے سروے کے دوران دیہاتوں اور کچی آبادیوں میں رہنے والی عورتوں سے انٹرویو کرکے تیار کی تھیں۔ ہم رپورٹیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان پر ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ بھی کرتے جارہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت دیر سے ایک ہی کاغذ پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تلخی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''بے غیرت۔''

''کیا ہوا؟ کون ہے بے غیرت؟'' میں نے پوچھا۔

''لو تم خود ہی پڑھ لو۔'' اس نے وہ کاغذ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے وہ رپورٹ پڑھی تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ یہ ایک ایسی مظلوم عورت کا انٹرویو تھا جسے شادی کے بعد ایک دن بھی سکھ کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا شوہر نکھٹو ہونے کے ساتھ شراب اور جوئے کا عادی تھا۔ وہ بے چاری کچھ گھروں میں کام کرکے چار پیسے کماتی تو وہ بھی چھین لیتا اور انکار کرنے پر اسے بری طرح مارتا پیٹتا۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ گھر میں راشن نہ ہونے کے سبب وہ اور اس کے بچے بھوکے سوگئے لیکن اس کے شوہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے تو بس اپنی طلب پوری کرنے کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ بیوی اپنے شوہر کی سلامتی کی دعا مانگتی ہے لیکن وہ آسمان کی طرف اس کے مرنے کی دعائیں کرتی ہے تاکہ وہ اور اس کے بچے سکون کی زندگی گزار سکیں۔

''واقعی۔ بڑی اندوہناک کہانی ہے۔'' میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے ایسی کتنی عورتیں اسی طرح ظلم کی چکی میں پس رہی ہوں گی۔''

''تم بتاؤ ایسے شخص کو بے غیرت نہ کہوں تو کیا کہوں۔'' اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا اور گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ''ان لوگوں کو شرم نہیں آتی بیوی کی کمائی کھاتے ہوئے۔ میرا بس چلے تو اس شخص کا گلا دبا دوں۔''

''تم کس کس کا گلا دباؤ گے۔ جب تک اس معاشرے پر مرد کی بالادستی کا تصور حاوی رہے گا یہ ظلم بھی اسی طرح ہوتا رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر میل شاؤنزم کے خلاف آواز بلند کریں ورنہ عورت اسی طرح محکومی کی زنجیر میں جکڑی رہے گی۔''

”میں تو ایسے لوگوں کو مرد ہی نہیں سمجھتا جو عورت کی کمائی کھاتے ہیں۔ میری نظر میں یہ سب نامرد ہیں۔“ شاہد نے غصے سے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
اس لمحے وہ مجھے اپنے قد سے بہت زیادہ بلند اور عظیم لگا۔ وہ عام مردوں سے بہت مختلف تھا۔ بڑے ارفع خیالات تھے اس کے۔ وہ عورت پر حکم چلانے کی بجائے اس کی عزت کرنے اور برابری کا درجہ دینے کا قائل تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ غریب ہونے کے باوجود اس کی یہی سوچ تھی کہ کمانا مرد کی اور گھر چلانا عورت کی ذمے داری ہے۔
میں نے حسرت سے سوچا کہ کاش شاہد غریب نہ ہوتا تو میں اسے بھی کامران اور سعد کے برابر کھڑا کر کے اسے زندگی کا ساتھی چن لیتی لیکن ہمارے درمیان جو گہری خلیج حائل تھی۔ اسے عبور کرنا ہم دونوں میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔
شاہد کے ساتھ کام کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ جب لائبریری میں لگے ہوئے وال کلاک نے بارہ کا گھنٹا بجایا تو میں جیسے نیند سے بیدار ہو گئی اور مجھے یاد آگیا کہ ایک بجے سعد کے ساتھ لنچ کرنا ہے۔ میں نے اپنے کاغذات سمیٹے اور بولی۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ مجھے ذرا جلدی گھر جانا ہے۔ باقی کام کل کر لیں گے۔“
”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہو سکے تو ان رپورٹوں کی سمری بنا لینا۔ اس طرح کام کو آگے بڑھانے میں آسانی رہے گی۔“
مجھے اس کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ ساری رپورٹیں اس کے پاس بھی تھیں اور وہ خود بھی سمری بنا سکتا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کیوں کہا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ایک مرد تھا اور اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مجھے ڈکٹیشن دے رہا تھا۔ شاید عورت پر حکم چلائے بغیر ان مردوں کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یہ زبان سے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن اندر سے سب ایک ہیں۔
میں مقررہ وقت پر ریستوران پہنچ گئی۔ سعد پہلے سے وہاں موجود تھا۔ لنچ ٹائم ہونے کی وجہ سے ریستوران میں کافی رش تھا لیکن سعد نے پہلے سے ایک کیبن مخصوص کروا رکھا تھا۔ وہ مجھے لے کر اس جانب بڑھ گیا اور بولا۔ ”مس نورین! میرے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔ دو بجے ایک میٹنگ ہے۔ اس لیے کیوں نہ کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جائیں۔“ پھر اس نے میز پر رکھا ہوا مینو مجھے پکڑایا اور بولا۔ ”اس میں جو آپ کو پسند ہو وہی منگوا لیں۔“
میں نے ایک سرسری نظر مینو پر ڈالی اور کہا۔ ”میری کوئی خاص پسند نہیں ہے آپ جو منگوائیں گے وہی کھا لوں گی۔“
اس نے بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا اور بولا۔ ”دراصل میں نے آپ کو یہاں آنے کی اس لیے زحمت دی ہے کہ میری والدہ آپ کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں اور خود میری بھی یہی خواہش ہے لیکن میں عملی آدمی ہوں۔ خوابوں اور خواہشات پر یقین نہیں رکھتا میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ پہلے ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد بات کو آگے بڑھایا جائے۔“
”جی میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔
”ویری گڈ۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ سکتا ہوں؟“
”ضرور پوچھیے۔ میں بالکل مائنڈ نہیں کروں گی۔“
”کیا آپ کسی کو پسند کرتی ہیں یا کرتی تھیں۔“
”جی نہیں۔ فی الحال میری توجہ اپنی پڑھائی پر ہے اس لیے میں نے کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک کوئی میری جانب متوجہ ہی نہیں ہوا۔“
”یہ تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے رویے اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے کسی نے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی ہو۔“
”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔“ میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ آپ کا اسکور کیا ہے۔“
”میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا بیرا کھانا لے کر آگیا۔ اس کے جانے کے بعد سعد نے کھانا شروع کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل کچھ عرصہ پہلے ایک لڑکی سے میرا تعلق ہو گیا تھا اور ہم اس بارے میں کافی سنجیدہ تھے لیکن اس نے ایک ایسی شرط عائد کر دی کہ مجھے پیچھے ہٹنا پڑ گیا۔“
”وہ کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
”اس کا مطالبہ تھا کہ شادی کے بعد وہ الگ گھر میں رہے گی۔ آپ ہی بتائیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی خاطر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیتا۔ میں نے اس کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا اور ہمارے راستے الگ ہو

گیے۔“

”اوہ آئی سی۔“ میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی ہونے والی بیوی سے کیا توقعات رکھتے ہیں اور آپ کی نظر میں عورت کی کیا اہمیت ہے؟“

”صرف یہ کہ وہ مجھے ایک پُرسکون زندگی کی ضمانت دے کیونکہ میں ایک پروفیشنل آدمی ہوں اور مجھے آگے بڑھنے کے لیے سکون کی ضرورت ہے اس کے عوض میں اسے زندگی کی ہر خوشی اور آسائش مہیا کروں گا اور جہاں تک عورت کی اہمیت کا تعلق ہے تو یہ باہمی اعتماد کا رشتہ ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے پر اعتماد کریں تو زندگی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

”ویری رائٹ! اب میری بھی سن لیجیے کہ میں اپنے ہونے والے شوہر سے کیا توقع کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا پھر اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی اور بولا۔ ”دیکھیے محترمہ میں آپ سے منافقت، دھوکا اور بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت میں آپ کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا اُلو سیدھا کرسکتا ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد آپ کی تمام ڈیمانڈز پوری نہ کر سکوں بلکہ کوئی بھی مردان شرائط کو پورا نہیں کرسکتا۔ ہمارے یہاں کے مرد خواہ کتنے ہی پڑھے لکھے اور روشن خیال کیوں نہ ہوں۔ میل شاؤنزم کی روایت سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتے۔ اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنی شرائط میں کچھ نرمی کریں ورنہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

اس طرح یہ ملاقات بے نتیجہ ثابت ہوئی تاہم چلتے وقت اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ عورت کی آزاد و خود مختاری کا احترام کرتا ہے اور بے جا پابندی لگانے کا قائل نہیں تاہم اس کا ماننا ہے کہ عورت کو بھی ان حدود سے باہر نہیں آنا چاہیے جو معاشرے اور مذہب نے اس کے لیے متعین کر رکھی ہیں۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی اور ہمارے درمیان یہ طے پا گیا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے بلکہ مزید ملاقاتیں بھی کریں گے۔ مجھے سعد کی بہت سی باتوں سے اتفاق تھا لیکن میں اس سے کلین چٹ لینا چاہ رہی تھی۔

شام کو مجھے امی کے ساتھ ایک فلاور شو میں جانا پڑ گیا۔ میں عام طور پر اس قسم کے فنکشنز میں نہیں جاتی تھی لیکن ہوا یوں کہ ڈرائیور چھٹی پر تھا اور امی کو چیف گیسٹ ہونے کے ناتے اس شو کا افتتاح کرنا تھا۔ وہ بار بار پاپا کو فون کرکے کسی دوسرے ڈرائیور کی ڈیمانڈ کرنا چاہ رہی تھیں لیکن وہ کسی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے اس لیے ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھ سے ان کی یہ بے چینی نہیں دیکھی گئی اور میں نے اپنی خدمات پیش کردیں۔

وہاں فیصل بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ”ارے نورین تم۔“ پھر اس نے امی کو سلام کیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ مسز ہمدانی کی بیٹی ہو۔“

”تم امی کو جانتے ہو؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”انہیں کون نہیں جانتا۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنی مما سے ملاؤں۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بھاری بھرکم خاتون کے پاس لے گیا جو گل داؤدی کے پھولوں کو بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو فیصل نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”ممی یہ میری کلاس فیلو ہے نورین۔ مسز ہمدانی کی بیٹی۔“

”اوہ آئی سی۔“ ان خاتون نے بڑے اسٹائل سے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ”میں ان سے مل چکی ہوں اور یہ بچی بھی بڑی پیاری ہے۔ بیٹی کبھی آؤ نا ہمارے گھر بلکہ ایسا کرو یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد فیصل کے ساتھ ہی آجاؤ۔ ہم اکٹھے مل کر لنچ کریں گے پھر میں تمہیں گھر بھیجنے کا بندوبست کردوں گی۔“

ان کے انداز میں جو والہانہ پن تھا۔ اسے محسوس کر کے میں کھٹک گئی۔ مجھے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور مجھے دیکھ کر بڑی بی کی رال ٹپک پڑی ہے۔ میں نے اخلاقاً کہا۔ ”جی میں ضرور آؤں گی۔“

دوسرے دن انہوں نے امی کو فون کرکے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ میرے اور فیصل کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں۔ امی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی فیصل کی امی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو بہت غصہ آیا اور میں نے فیصل کی کلاس لے ڈالی۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون سی انہونی بات ہے۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“

''یہ فضول محاورہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔''

''تمہارے موڈ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ کہیں تم انکار نہ کردو۔''

''وہ تو میں اب بھی کرسکتی ہوں۔'' میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

''اب انکار کروگی تو تمہیں اپنے گھر والوں کو بھی اس کی وجہ بتانی ہوگی اور یہ تمہارے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا کیونکہ مجھ میں ایسی کوئی خامی نہیں جس کی بناء پر مجھے ریجیکٹ کرسکو۔''

''اوہو بڑی خوش فہمی ہے اپنے بارے میں۔'' میں نے تھوڑا سا شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ہے جبھی تو مما کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے لیے پہلے ہی دو رشتے آئے ہوئے ہیں۔''

''جہاں دو وہاں تین۔'' اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''اچھا ہے اس طرح تمہیں اور تمہارے والدین کو انتخاب کرنے میں آسانی رہے گی۔ ویسے بائی دا وے تم نے کسی کو سلیکٹ تو نہیں کیا؟''

''نہیں فی الحال دونوں رشتے زیرِ غور ہیں۔ ایک سے مل چکی ہوں۔ دوسرا دبئی میں ہے۔ عید پر آئے گا اور تیسرے تم ٹپک پڑے لیکن میں صرف اسی بندے سے شادی کروں گی جو میرے معیار پر پورا اترتا ہو۔''

''اور تمہارا معیار کیا ہے؟''

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال کلاس کا وقت ہورہا ہے۔ اب چلتی ہوں۔''

فیصل کی امی اپنے شوہر شیخ غیاث الدین اور اپنی ایک شادی شدہ بیٹی کے ہمراہ تشریف لائیں، گو کہ انہوں نے اپنی طرف سے سادگی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے ہر انداز سے امارت کا اظہار ہورہا تھا۔ ان کے مقابلے میں ہم کچھ نہیں تھے۔ پاپا نے ساری عمر سرکاری نوکری کی اور اپنی محنت و صلاحیت کے بل بوتے پر گریڈ اکیس تک پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیشہ رزقِ حلال کو ترجیح دی۔ حالانکہ اس وقت وہ جس سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے وہ کروڑوں کی جگہ تھی لیکن انہوں نے کبھی حرام کمانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ خود کھاتے تھے اور نہ کسی کو کھانے دیتے تھے۔ اسی لیے آئے دن ان کا تبادلہ ایک وزارت سے دوسری وزارت میں ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں وہ وزارتِ تجارت میں تھے اور شیخ غیاث الدین جیسے سرمایہ دار ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔

اسی لیے جب میں نے فیصل کے ابا کو پاپا کے سامنے انتہائی مؤدبانہ انداز میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی اور میں سمجھ گئی کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارے گھر آنے پر کیوں تیار ہوگئے۔ انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ پاپا کی ریٹائرمنٹ میں ابھی دس سال باقی تھے۔ اگر یہ رشتہ ہوجاتا ہے تو سمدھی بن جانے کے بعد وہ پاپا سے کئی کام نکلوا سکتے تھے۔ بعد میں مجھے فیصل نے بھی یہی بات بتائی تھی کہ اس کی مما کسی امیر گھرانے میں اس کا رشتہ طے کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ انہیں یہی فکر لاحق تھی کہ ایک معمولی سرکاری افسر اپنی بیٹی کو جہیز میں کیا دے سکتا ہے لیکن ڈیڈی نے یہ کہہ کر انہیں قائل کرلیا کہ وہ چند لاکھ کے جہیز کی فکر کرنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ اس رشتے سے ہمیں کتنے فائدے ہوں گے۔

فیصل کی زبانی یہ بات سن کر مجھے اس کے باپ کی ذہنیت پر بہت غصہ آیا کہ جب باپ اتنا مطلبی، خود غرض اور لالچی ہے تو بیٹا کیا ہوگا۔ خون کبھی نہ کبھی تو اپنا اثر دکھاتا ہی ہے۔

شیخ غیاث الدین نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا مدعا بیان کردیا۔ انہیں نورین بیٹی یعنی میں بہت پسند آئی تھی اور وہ جلد از جلد مجھے اپنی بہو بنانے کے خواہش مند تھے لیکن پاپا نے انہیں بھی وہی روایتی جواب دیا کہ انہیں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے اور یہ کہ میری مرضی جانے بغیر وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ پاپا کا جواب سن کر شیخ صاحب کے چہرے پر مایوسی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ پاپا ان کی امارت سے مرعوب ہوکر فوراً ہی ہاں کردیں گے۔

دوسرے دن فیصل سے یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تو اس کا موڈ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے انتہائی تلخ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو پھر فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ کیسی۔ تمہاری جو بھی رائے ہے وہ اپنے والدین کو بتادو۔''

''معاف کرنا فیصل۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ ''میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتی کیونکہ اس سے پہلے تم صرف میرے کلاس فیلو تھے جس سے کبھی کبھار ہائے ہیلو ہو جاتی تھی۔ اب تم میرے امیدوار کے روپ میں سامنے آئے ہو تو مجھے بھی اسی نظر سے دیکھنا اور پرکھنا ہوگا۔''

”اچھا تو تم میرا انٹرویو چاہ رہی ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟“

”سوری یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں۔“ میں نے شاہد کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر کہا۔ ”تم مجھے رات کو فون کرنا۔“

شاہد نے مجھے فیصل سے باتیں کرتے دیکھا تو اس کا منہ بن گیا۔ وہ میرے قریب آ کر بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”کچھ نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”نورین!“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ یہ انتہائی چھچھورا شخص ہے۔ اس سے زیادہ بے تکلف ہونا ٹھیک نہیں۔ یہاں بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔“

مجھے شاہد کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ وہ کون ہوتا ہے میرے معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ میری مرضی جس سے چاہوں بات کروں۔ تاہم میں اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”مشورہ دینے کا شکریہ۔ میں اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کیا تم جو چاہو کرو۔ میں نے تو ایک دوست کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا تھا۔“

میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ”ایک بار پھر شکریہ۔ اب کام کی بات کرو۔“

وہ آہستہ سے بولا۔ ”میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔ دراصل بابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹروں نے بائی پاس کے لیے کہا ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ اس لیے شاید کچھ دن باقاعدگی سے یونیورسٹی نہ آسکوں۔ تمہیں اکیلے ہی اس پروجیکٹ کو سنبھالنا ہوگا۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ لوں گی تم پوری توجہ سے اپنے بابا کا علاج کرواؤ۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتانا۔ شاید میں کوئی مدد کرسکوں۔“

”سب سے بڑا مسئلہ تو آپریشن کا ہے۔“ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”پرائیویٹ اسپتال میں تین چار لاکھ کا خرچا ہے اور میرے پاس تو تین چار ہزار بھی نہیں ہیں۔ سرکاری اسپتال میں نہ جانے کب نمبر آئے۔ اس وقت تک نہ جانے کیا ہوجائے۔“

میں نے اس کی ہمت بندھائی اور بولی۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں پاپا سے بات کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی کوئی جان پہچان نکل آئے۔“

”بہت مشکل ہے۔ میں نے سب معلوم کرلیا ہے۔ آپریشن نمبر آنے پر ہی ہوگا۔ بہرحال تم کوشش کرکے دیکھ لو۔“

وہ چلا گیا تو میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک طرف تو مجھے باپ کی بیماری کی وجہ سے اس سے ہمدردی ہو رہی تھی تو دوسری جانب اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ فیصل کو مجھ سے باتیں کرتا دیکھ کر جیلس کیوں ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی ایک روایتی مرد تھا جو عورت پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ کتنا تضاد تھا اس کے قول و فعل میں۔ ایک طرف تو وہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی بات کرتا تھا اور دوسری جانب اس کا یہ حال ہے کہ وہ مجھے فیصل سے باتیں کرتا دیکھ کر جیلس ہوگیا۔ کیا میں اس کی بیوی تھی، منگیتر یا محبوبہ، اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ مجھے فیصل سے بات کرنے سے منع کرے۔ میں نے اپنے دل میں اس کا جو بت بنا رکھا تھا وہ ایک پل میں پاش پاش ہوگیا۔

رات کو فیصل کا فون آیا۔ تو میں نے اس سے کہا کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں اس سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتی ہوں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے مزاج، عادات و اطوار اور خیالات کا پتا چل سکے۔ یونیورسٹی میں تو یہ ممکن نہیں۔ کیوں نہ ہم کسی پارک یا ریستوران میں ملیں بلکہ ریستوران ہی زیادہ بہتر رہے گا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے اسی ریستوران کا نام تجویز کیا جہاں میں سعد کے ساتھ لنچ کرچکی تھی۔

دوسرے دن میں ٹھیک ایک بجے اس ریستوران میں پہنچ گئی وہ وہاں پہلے سے میرا انتظار کررہا تھا اس نے وقت ضائع کیے بغیر بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا اور مجھ سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ میں کیا کھانا پسند کروں گی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فیصل کے مقابلے میں سعد زیادہ مہذب اور وضع دار شخص تھا۔ کم از کم اس نے مجھے اپنی مرضی سے کھانا منگوانے کا حق تو دیا تھا۔

بیرا کھانا رکھ کر چلا گیا تو اس نے ایک ڈش اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”بس شروع ہو جاؤ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔“

یہ بھی اس کے کردار کا ایک کمزور پہلو تھا کہ کھانے کو دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی اور وہ سب کچھ بھول کر کھانے میں جت گیا۔ اس وقت وہ مجھے ایک امیر گھرانے کا

بگڑا ہوا بچہ لگا جسے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ہنسی مذاق کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ اس نے کھانے کے دوران مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ بولا۔ ”آئس کریم کھاؤ گی۔ یہاں کی آئس کریم بہت اچھی ہوتی ہے۔“

مجھے اس کی بے تکی باتوں پر سخت کوفت ہو رہی تھی۔

میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ”فیصل ہم یہاں صرف کھانا کھانے نہیں آئے اور بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”ہاں ہاں وہ بھی کرلیں گے۔ پہلے تم اپنا فلیور تو بتاؤ۔ کون سا منگواؤں؟“

میں نے بے زار ہوتے ہوئے کہا۔ ”کوئی سا بھی منگوالو۔ میرے لیے سب ایک جیسے ہیں۔“

بیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے کہا۔ ”دیکھو فیصل! شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں بلکہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا نام ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جب مرد حکم چلاتا تھا اور عورت اس کا حکم مانتی تھی۔ آج کی عورت اپنے حقوق کے بارے میں باشعور ہوگئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر سلوک کیا جائے۔“

”شاید اسی لیے ہمارے معاشرے میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ان مردوں میں سے ہو جو عورت کو اپنا محکوم بنا کر رکھنا چاہتے ہیں؟“

”یہ میں نے کب کہا۔“ وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ ایک لمبی بحث ہے۔ تم بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد بھی میری آزادی اور خود مختاری برقرار رہے اور میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہ ہو۔ جہاں چاہوں جاؤں۔ جس سے چاہوں ملوں۔ میرے معاملے میں کوئی مداخلت نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔“

”دیکھو نورین! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ صرف تم ہی اپنی مرضی چلاؤ۔ تمہیں میری مرضی کے مطابق چلنا ہوگا۔ فرض کرو کہ مجھے شاہد سے تمہارا میل جول پسند نہیں تو کیا پھر بھی تم اس سے ملتی رہو گی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کرے گا۔ ایک بات اور کہ ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں تمہیں میری ممی ڈیڈی کو برداشت کرنا ہوگا۔ وہ بزرگ ہیں۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنا میری مجبوری ہے کیونکہ سب کچھ انہی کا ہے۔ میں تو خود اپنے اخراجات کے لیے ان کا محتاج ہوں۔“

”اوہ آئی سی۔“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا اور جو سننا چاہ رہی تھی وہ سن بھی لیا۔ اٹھو اب چلتے ہیں۔“

”تم مجھے غلط مت سمجھنا نورین۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں خود بھی بے جا پابندیوں کا قائل نہیں ہوں لیکن قدرت نے مرد اور عورت کے درمیان جو فرق رکھا ہے اسے تو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ تم خود ہی سوچو کہ ہم فطرت کے خلاف کیسے جاسکتے ہیں۔“

”بس بس مزید وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا پوائنٹ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“

شام کو میں نے پاپا سے شاہد کے باپ کے علاج کے بارے میں بات کی۔ وہ اصول کے پکے تھے اور کسی کی سفارش نہیں کرتے تھے لیکن یہ انسانی ہمدردی کا معاملہ تھا۔ اس لیے ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اسپتال کے ایم ایس کے نام ایک رقعہ لکھ کر مجھے دیا اور بولے۔ ”یہ اپنے دوست کو دے دینا۔ وہ جا کر ایم ایس سے مل لے۔ اگر اس کے بس میں ہوا تو وہ ضرور مدد کرے گا۔“

دوسرے دن میں یونیورسٹی آئی لیکن شاہد سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ شاید وہ چھٹی پر تھا۔ اس طرح وہ دوسرے اور تیسرے دن بھی نہیں آیا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میرے لیے اس سے ملنا اور وہ رقعہ پہنچانا بہت ضروری تھا۔ تب میں نے اسماء کو ساتھ لے کر اس کے گھر جانے کا پروگرام بنایا کیونکہ اس سے فون پر رابطہ ممکن نہ تھا لیکن ایک مشکل یہ آن پڑی کہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ اسماء نے اس کے کسی دوست سے ایڈریس لیا اور ہم اس سے ملنے چل دیے۔

شاہد کا گھر پیر بدھائی سے بھی آگے ایک کچی آبادی میں تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو بسیں بدلنا پڑیں اور پیر بدھائی سے آگے کا فاصلہ ہم نے رکشے سے طے کیا۔ اس آبادی کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ لوگ ایسی جگہوں پر رہتے ہوں گے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، تنگ گلیاں، کچے پکے مکان، ادھ کھلے دروازوں میں کھڑی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ہم کوئی اجنبی مخلوق ہوں۔ دو چار لوگوں سے پتا پوچھتے پوچھتے ہم اس کے

گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ شاہد نے ہی کھولا تھا۔ وہ ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم......تم......کیسے آگئیں۔'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں......ہاں کیوں نہیں آؤ۔'' وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولا تو ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا صحن عبور کر کے برآمدہ تھا۔ جہاں تخت پر اس کی ماں بیٹھی ہوئی مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا اور سوالیہ انداز میں شاہد کی طرف دیکھنے لگی۔ تخت کے کونے پر ایک نوعمر لڑکی پاؤں لٹکائے ہمیں حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جب کہ اس سے عمر میں کچھ ہی چھوٹی ایک اور لڑکی صحن کے کونے میں لگے ہوئے نل پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔

''اماں، یہ نورین اور اسماء ہیں۔ میرے ساتھ پڑھتی ہیں۔ بابا کی بیماری کا سن کر پوچھنے آئی ہیں۔''

''اچھا اچھا آؤ بیٹھو۔'' اس نے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بیٹھی ٹکر ٹکر دیکھے جارہی ہے۔ جا اندر سے مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لے کر آ۔''

جب تک وہ لڑکی کرسیاں لے کر آئی۔ میں گردوپیش کا جائزہ لے چکی تھی۔ برآمدہ کے ایک کونے میں باورچی خانہ اور اس کے برابر میں غسل خانہ تھا۔ برآمدے کے عقب میں دو کمرے تھے اور برآمدہ کی ظاہری حالت سے لگ رہا تھا کہ اس سے بیک وقت ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور لاؤنج کا کام لیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو شاہد کی ماں نے کہا۔

''بڑی مہربانی، بہت تکلیف کی، تم لوگوں نے۔'' انہوں نے بوجھل آواز میں کہا جو شاہد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ''جاؤ بیٹا! ان کے لیے کوئی بوتل وغیرہ لے کر آؤ۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔''

شاہد کے جانے کے بعد وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولیں۔ ''بے چارہ باپ کی بیماری میں دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو گیا ہے۔ پڑھائی کا بھی ہرج رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ پرائیویٹ اسپتال کے اخراجات ہم برداشت نہیں کر سکتے اور سرکاری اسپتال میں بہت دیر سے نمبر آتا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ شاہد آجاتے تو اسے سب سمجھا دوں گی۔''

''بس بیٹا! میں نے شاہد سے ہی ساری امیدیں لگا رکھی ہیں۔ بے چارہ باپ کی بیماری میں دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو گیا ہے۔ میری تو خدا سے دعا ہے کہ یہ سولہ جماعتیں پاس کرے تو کسی پڑھی لکھی لڑکی سے اس کی شادی کر دوں۔ دونوں میاں بیوی کمائیں گے تو ہمارے گھر میں بھی خوش حالی آئے گی۔''

ان کی باتیں سن کر میرے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ میں شاہد کو کیا سمجھ رہی تھی اور وہ کیا نکلا۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ شاہد نے بھی اپنے چہرے پر منافقت کا نقاب چڑھا رکھا تھا۔ وہ خود تو مرد اور عورت کی برابری کی باتیں کرتا ہے اور اس کی ماں پڑھی لکھی بہو لانے کا خواب دیکھ رہی ہے تا کہ اس کی کمائی پر پورا گھر عیش کر سکے پھر کیا فرق رہ گیا تھا شاہد اور اس دیہاتی مرد میں جو اپنی بیوی کی کمائی کھا کر سارا دن چارپائی توڑتا رہتا۔

شاہد کی ماں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکوں گی۔ اگر اپنی شرطوں پر اڑی رہی تو میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ فطرت نے مرد کو بالادست بنایا ہے۔ اس لیے عورت پڑھنے لکھنے اور بلند حیثیت رکھنے کے باوجود مرد کی محکوم ہے۔ میں جان گئی تھی کہ مرد کی غلامی عورت کا مقدر ہے اور مقدر سے کون لڑ سکتا ہے پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب غلامی ہی کرنا ہے تو پھر شاہد جیسے مفلوک الحال اور مفلس شخص کی بجائے کسی دولت مند اور خوش حال شخص کا انتخاب کیوں نہ کیا جائے۔

میرے تینوں امیدوار ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ جب میں نے ان کا موازنہ کیا تو فیصل پر سوئی اٹک گئی۔ وہ ہر لحاظ سے دوسروں سے بہتر تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ پاپا کی ریٹائرمنٹ میں دس سال باقی تھے اور فیصل کے ڈیڈی اپنے کام نکلوانے کے لیے میری ناز برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے اور فیصل بھی مجھ سے دب کر رہتا۔ اس طرح میری آزادی اور خود مختاری کا خواب کسی حد تک پورا ہو سکتا تھا شاید میرے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ اپنے لیے سونے کا پنجرہ قبول کر لوں۔

ادھورا آدمی

محترم مدیر
السلام علیکم
اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔ پہلی بار ایک تحریر ارسال کررہا ہوں۔ اس میں شامل تمام واقعات صد فیصد سچ ہیں صرف اس لیے ارسال کیا کہ لوگ سبق حاصل کر سکیں۔

انور سجاد
(حیدر آباد)

مرزا صاحب کہہ رہے تھے۔ ''بھائی پہلے زمانے میں میرا کیا نشانہ ہوا کرتا تھا سوئی بھی ہوا میں اچھالو تو میں چھید کردوں۔ شکار پر جاتا تو مجال ہے کہ کسی شکار کے لیے دوسری گولی چلانے کی ضرورت ہوئی ہو۔ بس ایک ہی پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔''

''مرزا صاحب وہ شیر والا واقعہ تو سناؤ۔'' رحیم نے یاد دلایا۔

''اب کون سے شیر والا۔'' مرزا صاحب نے پوچھا۔

"اس طرح کے تو پندرہ بیس واقعات ہیں۔"

"وہی جس میں پہلی بار آپ کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔"

"ہاں یاد آیا۔" مرزا صاحب نے ہنکارہ بھرا۔ "وہ بھی عجیب واقعہ ہے۔ ایک میں برما کے جنگل سے گزر رہا تھا۔ میرے پاس بندوق تھی لیکن اس میں صرف ایک گولی تھی۔ اب ہوا یہ کہ سامنے سے ایک شیر آ گیا۔ اب میں ہوں اور شیر ہے۔ صرف ایک گولی۔ یہ یاد رکھنا۔ لیکن مجھے اپنے نشانے پر بھروسا تھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف ایک گولی ہی اس کا کام تمام کر دے گی۔ اب ہوا یہ کہ اُدھر سے شیر نے مجھ پر جمپ لگائی اور اِدھر سے میں نے گولی چلا دی۔ اب یہ دیکھیے دونوں ہی کا نشانہ خطا ہو گیا۔ شیر جمپ لگاتے ہوئے مجھ سے کئی فٹ پیچھے کی طرف دور جا گرا۔ جب کہ میری چلائی ہوئی گولی اس کے برابر سے گزر گئی۔"

"اوہو مرزا صاحب۔ یہ تو بہت برا ہوا۔" کسی نے کہا۔

"ہاں میاں، بہت برا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہو گا کہ میرا نشانہ خطا ہوا ہو۔ ساری رات بے چینی رہی۔ اپنے آپ پر افسوس کرتا رہا کہ مرزا تو اب کسی کام کا نہیں رہا۔ تیرا ہاتھ بہکنے لگا ہے۔ پھر میاں میں نے دوسری صبح کارتوسوں کا صندوق اٹھایا اور اپنے نشانے کو درست کرنے جنگل کی طرف چل دیا۔ ایک درخت کے تنے پر دائرہ بنا کر پریکٹس شروع کر دی۔ اچانک ایسا لگا جیسے جھاڑیوں کی دوسری طرف بھی کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ بھائی جب میں نے جھاڑیاں ہٹائیں تو جانتے ہو کیا دیکھا۔"

"آپ ہی بتا دیں مرزا صاحب۔"

"وہی شیر جمپ لگانے کی پریکٹس کر رہا تھا۔" مرزا صاحب نے بتایا۔

پڑھنے والوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے مرزا صاحب کلاسیکل جھوٹ بولنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

ویسے اس قسم کے شاہکار گپ عام آدمیوں کے بس کا روگ نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ایک خاص قسم کی ذہانت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب میں ایسی ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ایک بار کسی نے کہا۔ "مرزا صاحب ہم نے سنا ہے آپ کی ایک بار ایک ہاتھی سے لڑائی ہو گئی تھی۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔" مرزا صاحب برا سا منہ بنا کر بولے۔ "میں اتنا بھی رستم نہیں ہوں کہ کسی ہاتھی سے جا کر بھڑ جاؤں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں نے اس ہاتھی کو قابو میں کر لیا تھا۔ لڑائی تو میرے بس میں نہیں تھی۔"

"مرزا صاحب اتنا بھی بہت ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مرزا صاحب نے ایک شانِ بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "لیکن میں تو بچپن سے پریکٹس میں رہا ہوں نا۔ اس لیے یہ مجھے کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔"

مرزا صاحب کا مکان اچھا خاصا بڑا تھا۔ انہوں نے مکان میں مشرقیت کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ ان کی بیٹھک ایسی تھی جیسی آپ پرانی حویلیوں کو فلموں میں دیکھتے ہوں گے۔ دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا تخت جس پر مرزا صاحب تشریف رکھتے۔ ان کے سامنے بید کی کرسیاں، جن پر ہم لوگ بیٹھے رہتے۔ دیواروں پر مرزا صاحب کے خاندان والوں اور بزرگوں کی تصویریں۔ اچھا خاصا رعب ہوتا تھا اس کمرے میں جا کر۔

کمی یہ رہ گئی تھی کہ مرزا صاحب حقہ نہیں پیتے تھے، سگریٹ پیتے تھے۔ کھاتے پیتے آدمی تھے۔ دو بیٹے تھے۔ دونوں باہر۔ ان کی اپنی دکانیں اور کئی فلیٹس تھے۔ جن سے کرایہ آیا کرتا۔ ایک بیگم تھیں جن کی آواز بہت کراری تھی۔ ان کے بارے میں سنا گیا تھا کہ وہ واقعی کسی نواب کی بیٹی ہیں۔

مرزا صاحب کو ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ برمحل اشعار سنا دیا کرتے۔ اس لیے مغرب کے بعد ہم دوست ان کے پاس جمع ہو جاتے اور بہت دیر تک یہ محفل گرم رہتی تھی۔

اس دوران اندر سے کئی بار چائے بھی آ جاتی۔ چائے کے ساتھ گرما گرم سموسے بھی ہوا کرتے۔ مرزا صاحب کھلا پلا کر خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ ایسے لوگ آج کل بہت کم ہوتے ہیں۔

ان میں خرابی بس یہ تھی کہ بہت کلاسیکل قسم کی گپ ہانکا کرتے اور اگر کسی کو ان کی گپ پر یقین نہیں آتا یا ہنسنے لگتا تو مرزا صاحب اس کی صورت دیکھنی بھی گوارا نہیں کرتے۔

ان کا ایک خاص ملازم تھا دینو، وہی ہمارے لیے چائے وغیرہ لے کر آیا کرتا۔ ہم سبھوں کو اس بات پر حیرت ہوا کرتی تھی کہ آج کے زمانے میں ایسی کون بیوی ہے جو شوہر کے دوستوں کا اتنا خیال رکھے کہ جب وہ آئیں تو ان کے لیے سموسے اور چائے وغیرہ بھیج دے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ مرزا صاحب کی بیگم ان سے دب کر رہتی تھیں اور گھر کے معاملات میں مرزا صاحب ہی کا حکم چلتا تھا۔

ایک بار ایک عجیب بات ہوئی۔

ہم عام طور پر مغرب کے بعد مرزا صاحب کے یہاں جایا کرتے تھے۔ اس شام مجھے دیر ہوگئی تھی۔ ایک کام میں الجھ گیا تھا۔ اس سے فراغت پاکر میں نے مرزا صاحب کے مکان کا رخ کیا۔ ان کے یہاں جانے کی عادت سی جو پڑ گئی تھی۔

میں نے مٹھائی کی دکان میں دینو کو دیکھا۔ مرزا صاحب کا خاص ملازم۔ عام طور پر بہت سے مٹھائی والوں کی دکان کے آگے سموسے اور پکوڑے وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔

اس مٹھائی کی دکان کے باہر ایک بڑا سا چولہا روشن رہتا اور سموسے وغیرہ تیار ہوتے رہتے۔ دینو سموسے لینے والوں کی لائن میں لگا ہوا تھا۔

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے دینو، خیریت تو ہے نا۔“

”سلام صاحب۔“ اس نے جھٹ سے سلام کر ڈالا۔

”دینو تمہاری بیگم صاحبہ تو خود اتنے اچھے سموسے بناتی ہیں۔ تم باہر سے کیوں لے رہے ہو؟“

”جانے دیں صاحب۔“ وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ”بیگم نے کبھی زندگی میں سموسے نہیں بنائے ہوں گے۔“

”اور وہ تم جو روزانہ اندر سے سموسے اور چائے لے کر آتے ہو وہ کیا ہے۔“

”وہ سموسے تو اسی دکان کے ہوتے ہیں صاحب اور چائے بھی ہوٹل سے آتی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں پچھلے دروازے سے مکان سے باہر نکلتا ہوں اور یہ سب خرید کر پچھلے دروازے سے اندر آجاتا ہوں اور ٹرے میں سجا کر لے آتا ہوں۔ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں یہ سب بیگم صاحبہ نے تیار کیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو دینو۔“

”ہاں صاحب، معاملہ ایسا ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”صاحب جی کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ بیگم صاحبہ سے چائے اور سموسے تیار کرنے کو کہیں۔“

”دینو یہ تو تم الٹی بات بتا رہے ہو۔ کیا صاحب جی بیگم سے ڈرتے ہیں۔“

دینو ہنس پڑا۔ ”بیگم صاحبہ کی ایک ڈانٹ پر وہ بالکل سیدھے ہوجاتے ہیں۔ کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے۔ بس ان کو اتنی اجازت دی ہوئی ہے کہ روز شام کے بعد اپنی محفل میں جا کر بیٹھ جائیں۔“

”میں تو سن کر حیران ہو رہا ہوں۔ ہم لوگوں نے تو کچھ اور سمجھا تھا۔“

”صاحب بے چارے تو بہت سیدھے آدمی ہیں۔“ دینو نے بتایا۔ ”میں نے خود انہیں دو تین بار بیگم سے مار کھاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن صاحب یہ سب مت بتا دیجیے گا ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔“

”نہیں دینو۔ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔“

دینو سموسے لینے لگا۔ میں اسے وہاں چھوڑ کر مرزا صاحب کے پاس آگیا۔ میرے سارے احباب معمول کے مطابق موجود تھے۔

مرزا صاحب اس وقت کسی جنگلی سردار سے اپنی مڈبھیڑ کی داستان سنا رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے ان پر افسوس ہو رہا تھا۔

انسان اپنا بھرم رکھنے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتا ہے۔ ان کی بیگم ان کو اپنے دباؤ میں رکھتی تھیں لیکن وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ وہ بیگم پر حاوی ہیں۔

ڈاکٹر وجیہہ ہارون ایک ماہر امراض بچگان ہیں جن کا تعلق لاہور سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بچے کی 6 سے 12 ماہ کی عمر الٹنے، پلٹنے، لڑھکنے، گھٹنوں کے بل چلنے اور قدم اٹھانے کی ہوتی ہے۔ یہی ان کے پسندیدہ مشاغل ہوتے ہیں جو انہیں لطف دینے کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی نشوونما میں مددگار بھی ہوتے ہیں ان کے بقول ”بچہ پہلے لڑھکتا، گھٹنوں کے بل چلتا اور پھر پیدل چلنا سیکھتا ہے۔ قدرتی انداز میں بڑھوتری بچوں کے اعضا میں توازن اور مطابقت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے بڑھوتری کے عمل کو ترتیب سے، بتدریج، اپنے وقت پر اور مرحلہ وار ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس بعض والدین اس قدرتی عمل کو تیز کرنے کے لیے بے بی واکر جیسی چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ نہ صرف اس قدرتی عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے بلکہ حادثات کا باعث بھی بنتا ہے۔“

پاکستان میڈیکل ایسوی ایشن کے جریدے میں ماہر امراض بچگان ڈاکٹر رفعت رحمانی کے تحریر کردہ ایک مضمون کے مطابق ”یہ بات ثابت شدہ نہیں ہے کہ واکر بچوں کے چلنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس اس کا استعمال بچوں کے متحرک ہونے کی قدرتی صلاحیت جو مرحلہ وار نشوونما پاتی ہے کو پیچھے لے جاتا ہے۔“

مرسلہ: انوار مجتبیٰ۔ کوئٹہ

ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوستوں کے لیے اپنی بیگم سے ایک کپ چائے بھی منگوا سکیں۔ اس لیے وہ اپنے ملازم کو ہوٹل کی طرف بھیج دیا کرتے تھے۔

ان میں اپنی بیگم کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن ظاہر یہ کرتے تھے کہ انہوں نے بے شمار معرکے سر کیے ہیں۔ ان جیسا بہادر شاید کوئی اور نہ ہو۔

یہ سب کیا ہے۔ جھوٹی انا، بلکہ نفسیاتی زبان میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اپنا کتھارسس کرنے کی کوشش۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اس دن وہ جو کچھ بھی بتا رہے تھے۔ شاید کسی اور کو احساس ہوا یا نہ ہو لیکن مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان کے الفاظ کھوکھلے ہیں۔ ان کے لہجے میں اعتماد نہیں ہے۔

بہرحال میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ اتنی دیر میں سموسے اور چائے بھی آگئی۔ اسی وقت دینو نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا بھی تھا۔

ایک شام کئی دنوں کے بعد میں نے مرزا صاحب کے سر پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی۔ وہ اس دن مجھے بازار میں مل گئے تھے۔

میں نے پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا مرزا صاحب خیریت تو ہے؟''

''ارے بس میاں معمولی سی خراش آگئی تھی۔'' انہوں نے بے پروائی سے بتایا۔

''کس طرح خراش آگئی؟''

''ارے بھائی، بیگم کے کمرے میں جو فانوس لگا ہوا ہے اس کو صاف کرتے ہوئے پاؤں سلپ ہوگیا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''تو یہ کام آپ دینو سے لیتے۔''

''ارے وہ کیا جانے خوامخواہ فانوس کو نقصان پہنچا دیتا۔ بیلجیئم کا بنا ہوا ہے۔'' مرزا صاحب نے فانوس کی کہانی تو سنا دی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ بات کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔

اس لیے میں اس شام جان بوجھ کر مرزا صاحب کی طرف نہیں گیا بلکہ مٹھائی کی دکان پر پہنچ گیا۔ دینو حسبِ معمول سموسے تلنے میں لگا ہوا تھا۔

''دینو آئندہ سے اپنے صاحب کو ایسے کام مت کرنے دو۔'' میں نے کہا۔

''کیسے کام صاحب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے وہی فانوس وغیرہ صاف کرنے والے۔ اب ہی دیکھ لو بے چارے کو فانوس صاف کرتے ہوئے چوٹ لگ گئی۔''

''ارے صاحب کہاں کا فانوس۔ پورے گھر میں کوئی فانوس نہیں ہے اور آپ جس چوٹ کی بات کر رہے ہیں وہ تو بیگم صاحبہ نے مارا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''بیگم نے مارا تھا؟''

''جی صاحب۔ چمٹے سے مارا تھا۔ صاحب کا سر پھٹ گیا تھا۔ اچھا خاصا خون نکلا تھا صاحب۔ میں تو وہیں پر تھا۔ میں ہی تو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا ان کو۔''

''یہ تو بہت ظلم ہے دینو۔''

''صاحب کیا بتاؤں۔ ایسا ظلم تو ان پر ہوتا ہی رہتا ہے۔'' دینو نے کہا۔ ''مجھے تو خود بھی بہت افسوس ہوتا ہے لیکن بیگم صاحبہ کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔''

اس وقت میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں مرزا صاحب کو کرید کر رہوں گا۔ ان کو سمجھاؤں گا کہ وہ اپنی جھوٹی آن اور بھرم کو ایک طرف رکھیں اور اگر بہادر ہیں تو واقعی بن کر دکھائیں ورنہ زندگی اسی طرح بیگم کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہوئے گزر جائے گی۔

لہٰذا اس شام میں مغرب سے بہت پہلے مرزا صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ابھی دوسروں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ مرزا صاحب وقت سے پہلے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''خیریت تو ہے نا؟'' مرزا صاحب نے مجھے بیٹھک میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''مرزا صاحب آج میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں۔ ضرور کہو۔''

''مرزا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کب تک اپنی جھوٹی انا اور شان کے خول میں بند رہیں گے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' مرزا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''سامنے کی بات ہے مرزا صاحب۔ یہ جو آپ ہاتھیوں اور شیروں سے لڑائی اور دشمنوں پر قابو پانے کے جو افسانے سناتے رہتے ہیں ان کو تو ایک طرف جانے دیں۔ میں ان پر کوئی بات نہیں کر رہا کیونکہ ان داستانوں نے آپ کو زندہ رکھا ہوا ہے۔''

مرزا صاحب حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

''میں تو اس وقت آپ کی بیگم کے حوالے سے بات کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ان سے دب کر رہتے ہیں۔ ان سے مار کھاتے ہیں۔ آپ ان کے سامنے زبان بھی نہیں ہلا سکتے۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔''

''جس نے بھی بتایا ہو۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ یہ سب سچ ہے یا نہیں۔''

اب مرزا صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گردن جھکالی تھی۔ بہت دیر بعد انہوں نے گردن اٹھائی۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

''بتائیں کیا یہ سب سچ ہے یا نہیں۔''

''ہاں بھائی، بات کچھ ایسی ہی ہے۔ بس کیا بتاؤں میں اپنی شرافت سے مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ عورت پر ہاتھ اٹھاؤں یا اس پر حکم چلاؤں۔''

''چاہے وہ آپ کے ساتھ کچھ بھی کرتی رہے۔ مرزا صاحب ہوش میں آئیں۔ آپ کی مردانگی کہاں چلی گئی ہے۔ آپ جو اپنی داستانیں سنایا کرتے ہیں۔ ان کا صرف ایک حصہ اگر اپنی بیگم کے لیے مخصوص کر دیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ آپ نے شاید پہلے ہی دن سے ان کو ڈھیل دے رکھی ہوگی۔''

''ہاں میاں۔'' وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''آپ نے پہلے دن بلی مارنے والی کہانی نہیں سنی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ پہلی رات بیگم پر اپنی دھونس جما دیتے تو آج یہ نوبت نہیں آتی۔''

''میاں اب تو زندگی اسی طرح گزارنی ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ابھی بھی ہو سکتا ہے مرزا صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''وقت ابھی بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جتنی زندگی رہ گئی ہے اس میں تو مردانگی کی شان کے ساتھ زندہ رہیں۔''

''میاں تم تو میری آنکھیں کھولتے جا رہے ہو۔'' مرزا صاحب نے کہا۔ ''تم سن لینا کہ اب میں کس طرح اس گھر کا حاکم بن گیا ہوں۔ آج سے میں کسی اور انداز سے اپنی بیگم کے سامنے آؤں گا۔''

''دیکھ لیتا ہوں مرزا صاحب۔''

اس کے بعد میں دو دنوں تک مرزا صاحب کی طرف نہیں گیا۔ تیسری شام کو جب ان کے گھر پہنچا تو اس وقت تک میرے علاوہ کوئی نہیں آیا تھا۔

مرزا صاحب مجھے دیکھ کر لہک اٹھے۔ ''ارے بھائی کہاں رہ گئے تھے۔ میں تو دو دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''کیا ہوا مرزا صاحب، آج آپ بہت ترنگ میں دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں! تمہارے نسخے پر عمل کر کے میری تو کایا ہی پلٹ گئی۔''

''واہ۔ یہ بات ہوئی نا۔ کیا کیا آپ نے اپنی بیگم کے ساتھ۔'' میں نے پوچھا۔

''یہاں کچھ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پہلی دفعہ پرسوں میں نے انہیں بہت زور سے ڈانٹ دیا اور دو چار چیزیں اٹھا کر ادھر اُدھر پھینک دیں۔''

''پھر تو ہنگامہ مچ گیا ہوگا۔''

''میں ... بھی یہی سمجھا تھا کہ اب میری خیر نہیں۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔''

''آخر ہوا کیا؟''

''بیگم تو ایک لمحے کے لیے ذرا پریشان ہوئی۔ پھر دوڑتی ہوئی میرے قدموں سے آکر لپٹ گئیں۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ بس شادی سے لے کر آج تک میں کسی مرد ہی کو تو تلاش کرتی رہی ہوں۔ جو مجھ سے پیار بھی کرے اور مجھ پر رعب بھی جمائے۔ ایسا شخص پورا مرد ہوتا ہے۔''

''کیا!''

''ہاں میاں! اس دن بیگم نے یہ احساس دلایا کہ جو مرد صرف پیار کرے اور رعب نہ جمائے وہ بھی آدھا ہے اور وہ بھی آدھا ہے جو صرف رعب دکھاتا رہے۔ عورت ایک مکمل مرد چاہتی ہے اور مکمل مرد پیار بھی کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر سختی بھی کر سکتا ہے۔ عورت مکمل مرد کے ساتھ خوش رہتی ہے۔ میاں زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے مکمل ہونے کا احساس ہوا ہے اور عورت کی وہ نفسیات سمجھ میں آگئی ہے جس کو میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔''

مرزا صاحب اب ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے یہاں محفلیں تو جمتی ہیں لیکن وہ اب انہیں کھیار یس کے لیے اپنے پرائیوں کی الٹی سیدھی داستانیں نہیں سناتے۔ نارمل افسانوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ اب ان کے یہاں سے چائے آتی تو پتا چلتا ہے کہ اس چائے کا ذائقہ گھر کا ہے۔ کسی ہوٹل کا نہیں ہے۔

میں اس وقت ایک شادی کی تقریب میں شریک تھا۔ کھانا لگنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ ہم چند دوست ایک ہی ٹیبل پہ بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ میرے ایک کزن اویس جو کہ میرا قریبی دوست بھی تھا، نے ٹنڈ کرائی ہوئی تھی۔ باقی دوست اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ وہ بھی بہت خوش مزاج اور حاضر جواب ہے۔ جواب میں وہ بھی مزے مزے کے چٹکلے سنا رہا تھا۔ ایک دوست نے اس سے کہا جو بھی کہو تمہیں ٹنڈ بہت سوٹ کر رہی ہے۔

اللہ کی مرضی

محترم مدیر

السلام علیکم

لوگ خود کو بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ کاتب تقدیر نے لوحِ محفوظ پر جو لکھ دیا ہے اس سے روگردانی ممکن نہیں۔ پھر بھی خود کو ارفع و اعلیٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسروں کو ہیچ سمجھ کر نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں۔ اس وقت انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ عمل ہی سے زندگی جنت اور جہنم بنتی ہے۔ شیراز نے بھی ایسا ہی سمجھا تھا۔ اس سچ بیانی سے اگر کسی نے سبق حاصل کر لیا تو میں سمجھ لوں گا کہ میری تحریر کامیاب ہے۔

کبیر احمد عباسی

(مری)
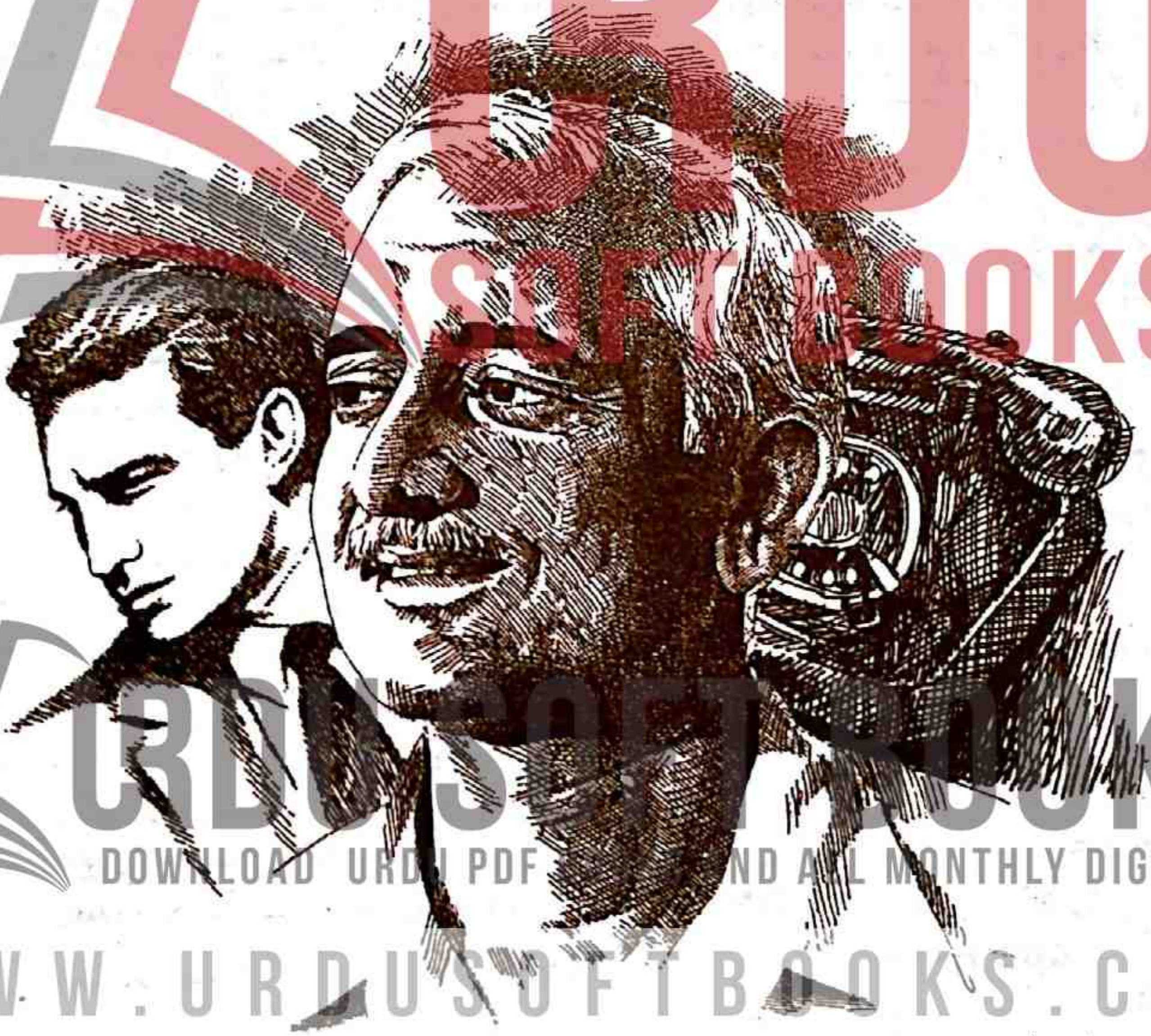
وہ برجستگی سے بولا۔ ''سوٹ کیوں نہیں کرے گی۔ پچاس روپیا خرچ کیا ہے۔'' اس پہ ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

دوسرے دوست نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے ٹنڈ کرائی کیوں ہے؟''

اس نے اپنی ٹنڈ کھجائی اور مصنوعی متانت سے بولا۔ ''ٹنڈ کرانے کے بے شمار فائدے ہیں۔'' یہ کہہ کے وہ منتظر نظروں سے سب کو دیکھنے لگا۔

''مثلاً؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

وہ لہجہ قطعاً نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ نمبر ایک، ٹنڈ کرائی ہوئی ہو تو جو وقت کنگھی کرتے ہوئے لگتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ اس وقت کو آپ کسی مثبت سرگرمی میں استعمال کرسکتے ہیں۔

دوسرا دوست یکدم بولا۔ ''مثلاً ٹنڈ کی مالش کرنے میں۔'' اس پہ سب دوستوں نے ایک بار پھر زوردار قہقہہ لگایا۔

قہقہہ تھما تو اویس پھر بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''اچھا تو میں آپ کو ٹنڈ کے فائدے بتارہا تھا۔''

''ارشاد ارشاد......'' ایک دوسرا دوست علی ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

جواب میں اسے علی ارشاد اور اویس نے گھورا۔ جبکہ باقی دوست ہنسنے لگے۔

اسے کچھ لمحات گھورنے کے بعد وہ پھر سے گویا ہوا۔ ''ٹنڈ کرانے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تازہ ہوا براہِ راست آپ کے دماغ کو لگتی ہے اور آپ کا دماغ فریش رہتا ہے۔ سو جب تک آپ ٹنڈ نہیں کراتے آپ ہوا کے اس فائدے سے محروم رہتے ہیں۔''

اتنا کہہ کے وہ رکا اور سب کے چہروں کا کسی ٹیچر کی طرح بغور جائزہ لینے لگا۔ جیسے مشاہدہ کررہا ہو کہ سب بچے اس کا لیکچر توجہ سے سن رہے ہیں یا نہیں اس کے چہرے پہ مصنوعی سنجیدگی تھی جبکہ باقیوں کے چہرے پہ شریر سی مسکراہٹ۔

اسے خاموش دیکھ کے میں بولا۔ ''ٹنڈ کے فوائد و ثمرات پہ بعد میں روشنی ڈالیے گا۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ٹنڈ کرائی کہاں سے ہے؟''

وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔ ''ڈاکٹر سے۔''

کچھ دوست اسے آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے لگے، جبکہ کچھ ہنسنے لگے۔

''یہ ڈاکٹرز نے ٹنڈ کرنا کب سے شروع کی۔'' ایک دوست مصنوعی حیرانی سے بولا۔

''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ جب ڈاکٹرز ختنہ کرسکتے ہیں تو ٹنڈ کیوں نہیں۔ ختنہ بھی تو پہلے حجام ہی کیا کرتے تھے۔'' وہ اسی طرح چہرے پہ مصنوعی سنجیدگی طاری کیے ہوئے بولا۔

''اوہ یہ تو حجاموں کے ساتھ بہت زیادتی ہے بھئی، پہلے ان سے ختنے کا حق چھینا گیا۔ اب عوام کی ٹنڈیں بھی اگر ڈاکٹرز نے ہی کرنا شروع کردیں تو حجام بے چارے کیا کریں گے۔'' ایک دوست مصنوعی تاسف سے بولا۔

باقی دوست بھی چہرے پہ گھمبیرتا طاری کرکے اس طرح اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے، جیسے اس نے کوئی بین الاقوامی مسئلہ چھیڑ دیا ہو۔

بات کا رخ مڑتے دیکھ کے مجھے پھر سے بیچ میں کودنا پڑا۔ ''بھئی تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ڈاکٹر نے تمہاری ٹنڈ کیسے اور کیوں کی؟''

''میرے ساتھ ایک بہت بڑی میڈیکل پرابلم تھی۔ میں اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ میرے پاس تمہارے مسئلے کا ایک کارنٹڈ حل ہے، شرط بس یہ ہے کہ تمہیں مہینے میں کم ازکم ایک بار میرے پاس آنا پڑے گا۔''

وہ مسئلہ حل ہوجاتا تو مہینے میں ایک چکر لگانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے اس سے فیس پوچھی اس نے کہا پہلی بار پانچ سو لگیں گے اس کے بعد ہر چکر کا پچاس روپیا۔

میں نے اسے اوکے کردیا، وہ بولا کہ تمہارا علاج تمہیں بے ہوش کرکے کیا جائے گا۔ خیر قصہ مختصر اس نے مجھ سے ایڈوانس فیس وصول کرلی۔ اور مجھے بے ہوش کردیا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میرا یہ حال کیا ہوا تھا۔ اس نے غمگین لہجے میں بولتے ہوئے اپنی ٹنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''پھر تمہارا مسئلہ حل ہوا؟'' علی ارشاد نے اس سے پوچھا۔

ہاں وہ تو ہوگیا کل ہی میں نے دوسری بار ٹنڈ کرائی ہے پچاس روپے میں اور وہ بھی اسی ڈاکٹر سے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایسی کون سی میڈیکل پرابلم ہے جو ٹنڈ کرانے سے حل ہوجاتی ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

بس ہے ایک پرابلم جس کا گارینٹڈ حل ٹنڈ ہی ہے، وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔

اسی وقت میری نظر شیراز علی پر پڑی۔ وہ اسی وقت ہال میں داخل ہوا تھا اور متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ہم پہ پڑی تو وہ سیدھا ہماری طرف ہی آیا۔ میرا موڈ اس وقت بہت خوشگوار تھا مگر اسے اپنے ٹیبل کی طرف بڑھتا دیکھ کے میرا منہ بن گیا۔ دنیا میں مجھے اگر کسی سے نفرت تھی تو وہ شیراز علی ہے۔ وہ میرا تایا زاد بھائی ہے۔ کسی زمانے میں وہ میرا بہترین دوست ہوتا تھا۔ مگر اب میں اس کا شمار اپنے واحد دشمن کے طور پہ کرتا تھا۔

وہ ہمارے پاس پہنچا تو کچھ دوست کھڑے ہو کر اس سے گلے ملنے لگ گئے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ باقیوں سے مل کے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی نیم دلی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ادھر ہی ایک خالی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ میرا اب ادھر بیٹھنا دوبھر تھا۔ میں واش روم جانے کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔ واش روم سے باہر آکے میں ادھر ہی ایک خالی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

شیراز علی اور میں ہم عمر ہی ہیں۔ ہمارے گھر بھی قریب قریب ہیں۔ ہم ایک ہی اسکول میں اکٹھے داخل ہوئے تھے۔ اس وقت میری اس سے گہری دوستی تھی۔ ہم اکٹھے اسکول آتے جاتے۔ اسکول میں ہم ایک ہی ڈیسک پہ بیٹھتے تھے بریک کے دوران بھی ساتھ رہتے، اسکول کے بعد مسجد جاتے وہاں بھی ہم اکٹھے بیٹھتے۔ بعد بھی اکثر ہم ساتھ ہی رہتے حتیٰ کہ رات کو بھی کبھی وہ ہمارے گھر رہتا اور کبھی میں ان کے گھر۔

چھٹی کلاس تک ہماری دوستی مثالی رہی۔ اس کے بعد ہماری کلاس میں ایک نیا لڑکا سلمان آیا۔ ہمارے ساتھ جو تیسرا لڑکا بیٹھتا تھا وہ چند دن پہلے ہی اسکول چھوڑ گیا تھا۔ ٹیچر نے سلمان کو ہمارے ساتھ ہی بٹھایا۔ وہ بڑا مغرور سا لڑکا تھا۔ اس کا تعلق کافی امیر کبیر گھرانے سے تھا۔ ہم بھی مالی لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھے مگر ہمارے والدین ہمیں جیب خرچ کے طور پر زیادہ رقم نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زیادہ پیسوں سے بچے خراب ہوجاتے ہیں۔

سلمان کا پرس پیسوں سے بھرا رہتا اور وہ ہر وقت اپنے پاس موجود رقم کی نمائش بھی کرتا رہتا۔ مجھے شروع میں ہی اس کی عادات پسند نہیں آئیں۔ میں نے اسے زیادہ لفٹ نہیں کرائی مگر شیراز ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ اسکول میں وہ مجھے بھی کم وقت دینے لگا۔ جوں ہی بریک ہوتی وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکلتا۔ کینٹین سے سلمان زیادہ مہنگی چیزیں لیتا اور وہ دونوں اکٹھے کھاتے۔ البتہ اسکول کے بعد ہم اکٹھے ہی رہتے۔ مجھے اس کا رویہ کھلتا مگر میں شروع سے کم گو مائنڈ نیچر کا حامل ہوں سو اس سے کبھی شکوہ تک نہیں کیا۔ بس خاموشی سے اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔

ایک دن ہم بریک کے وقت فٹبال کھیل رہے تھے۔ سلمان بھی کھیل رہا تھا۔ وہ میری مخالف ٹیم میں تھا جبکہ شیراز اور میں ایک ہی ٹیم میں تھے۔ میں فٹبال لے کے اپنے گول کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سلمان نے میری شرٹ کے کالر میں ہاتھ ڈال کے مجھے پیچھے کھینچا۔ میرا گلا گھٹ گیا۔ اور میں گر گیا میں نے اٹھ کے بغیر دیکھے اسے مکا مارا جو اس کے ناک پہ لگا۔ اس کے ناک سے خون نکلنے لگا۔ شیراز نے اس کے ناک سے خون نکلتے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اور میرے منہ پہ مکا دے مارا۔ مکا میرے رخسار پہ لگا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ مکا لگنے کی تکلیف سے زیادہ مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی کہ مکا میرے بہترین دوست نے مجھے مارا تھا۔ باقی دوست بیچ میں آگئے سو جھگڑا زیادہ طول نہ پکڑ سکا۔ مگر میں گم صم تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے چھن سے کچھ میرے اندر ٹوٹ گیا ہو۔ ٹوٹنے والی وہ چیز بھروسا تھا جو مجھے اس پہ تھا اور اس کی کرچیاں مجھے لہولہان کر رہی تھیں۔

سلمان روتا ہوا ٹیچر کے پاس چلا گیا۔ ادھر اسے فرسٹ ایڈ دی گئی۔ پرنسپل نے مجھے اور شیراز کو بھی بلا لیا۔ اس نے شیراز سے جھگڑے کی وجہ پوچھی تو شیراز نے صرف اتنا ہی بتایا کہ میں نے سلمان کے ناک پہ مکا مارا ہے۔ وہ یہ بات گول کر گیا کہ اس نے پہلے مجھے گرایا تھا۔ میں اسے ملامتی اور دکھ بھری نظروں سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔

پرنسپل نے ابو کے آفس کال کر کے انھیں اگلے دن بلایا۔

چھ سال میں وہ پہلا دن تھا جب میں اسکول سے گھر اکیلا جا رہا تھا۔ آنسو میرے رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے روک کے رونے کی وجہ پوچھی مگر میں خاموش رہا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے بہت تیز بخار ہو گیا۔

میں دو دن اسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں رہا۔ تیسرے دن جا کے میری کچھ حالت سنبھلی۔

دو دن بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں گھر آیا تو ابو نے بڑی نرمی سے مجھ سے اسکول میں جھگڑے کی وجہ پوچھی۔ میں نے روتے روتے انھیں سب بتا دیا۔

''ابو میں اب اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا۔'' ساری بات بتا کر میں نے اٹل انداز میں ان سے کہا۔

''اس پہ بعد میں بات کریں گے، بیٹا۔'' انہوں نے نرمی سے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر دبے دبے غصے سے بولے۔ ''ابھی تو میں شیراز کو بلوا کے سب پوچھتا ہوں۔''

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''نہیں ابو آپ اس سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ آپ کو میری قسم۔'' میں نے روتے ہوئے ان سے پُرزور انداز میں التجا کی۔

وہ میرے سامنے تو کچھ نہ بولے مگر انہوں نے ان کے گھر جا کے ساری بات بتا دی، شیراز کے ابو نے اپنے بیٹے کی سائیڈ لی، وہ ان سے لڑ جھگڑ کے واپس آ گئے۔

وہ واپس آئے تو کافی اداس لگ رہے تھے۔ مگر اس دن انہوں نے کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا یہ سب مجھے بعد میں پتا چلا۔

کچھ دن میں، میں ٹھیک ہو گیا۔ میرے ابو کی خواہش تھی کہ مجھے اسی اسکول میں واپس داخل کرائیں مگر میری ضد کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مجھے ایک اور اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

اس دوران میرا شیراز سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ میری بیماری کے دوران بھی نہ وہ مجھے دیکھنے آیا تھا نہ ہی اس کے گھر سے کوئی آیا تھا، جانے اس نے گھر میں کیا بتایا تھا کہ انہوں نے میرے ابو سے بھی جھگڑا کیا تھا۔ اب دونوں خاندانوں کے تعلقات بالکل منقطع تھے۔

ایک دن میں اپنے ایک کزن کے گھر گیا تو وہ ادھر ہی بیٹھا تھا۔ میرا دل اس کی طرف بے اختیار کھنچنے لگا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے محبت کم نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک شکوہ تھا۔ میں باقی لوگوں سے ملا تو ناراضی کے باوجود اس سے بھی ہاتھ ملانا پڑا۔ اس کے بعد ہم اگر ایک دوسرے کے سامنے آتے تو حال چال دریافت کر لیتے۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ میٹرک کے بعد ہم کالج میں آ گئے۔ ہمارے شہر میں ایک ہی کالج تھا۔ سو ہم پھر سے کلاس فیلو بن گئے۔ ہم دونوں نے کامرس کے مضامین کا انتخاب کیا تھا۔ وہ کبھی میرے ساتھ اچھی طرح ملتا اور کبھی مجھے نظر انداز کر دیتا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب کمپنی کے لیے اسے اور کوئی دوست میسر نہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اور جب اسے کوئی دوست ملتا تو وہ مجھے نظر انداز کر دیتا۔ مگر اس کے باوجود وہ جب بھی مجھ سے اچھی طرح ملتا میں بھی اس سے ایسے ہی ملتا۔ اب اس کی پڑھائی پہ توجہ کم تھی۔ اکثر وہ کلاسز بھی آف کر دیتا۔ ان کلاسز کے نوٹس وہ مجھ سے مانگ کے استفادہ کر لیتا۔ اسے جہاں مشکل پیش آتی میں اسے سمجھا بھی دیتا۔

ہمارے گھر والے بھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا شروع ہو گئے تھے۔ سو ہم بھی کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔ وہ تو اسی وقت ہمارے گھر کا چکر لگاتا جب اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا البتہ میں بغیر کسی کام سے بھی صرف اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر کبھی کبھار چلا جاتا۔

ایگزامز شروع ہوئے تو اتفاق سے میرا اور اس کا رول نمبر اکٹھا آ گیا۔ وہ مجھ سے پیچھے بیٹھتا تھا۔ امتحانی سینٹر میں زیادہ سختی نہیں تھی ایک دوسرے کا پیپر دیکھ کے کام چل جاتا تھا۔ میں نے کافی اچھی تیاری کی تھی۔ اسے پیپر میں جو کچھ نہ آتا وہ مجھ سے پوچھ لیتا البتہ میں اس سے کچھ پوچھتا تو وہ کہتا کہ مجھے بھی نہیں آتا۔ خیر میں نے اس چیز کی پروا نہیں کی۔ میرے پیپر کافی اچھے ہوئے تھے مگر جب رزلٹ آیا تو میں حیران رہ گیا۔ شیراز کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کے مجھے کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اس چیز نے میرا دل اس کی طرف سے مزید کھٹا کر دیا۔ مگر اب بھی میرا دل اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے مچلتا رہتا۔

آئی کام کے بعد ہم دونوں نے اسی کالج سے بی کام کیا۔ بی کام میں میرے نمبر زیادہ تھے۔ بی کام کے بعد وہ اپنے ابو کا بزنس میں ہاتھ بٹانے لگا جبکہ میں نے یونیورسٹی میں ایم بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی دوسرے شہر میں تھی۔ سو میں ہاسٹل میں ہی رہتا تھا۔

شیراز کا جب بھی اس شہر کا چکر لگتا وہ یونیورسٹی میں مجھ سے ملنے ضرور آتا۔ وہ میرے ذریعے سے یونیورسٹی کی لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھاتا۔ کبھی کبھار وہ رات کو بھی میرے ساتھ ہاسٹل میں رک جاتا۔ گو کہ وزیٹرز کو ہاسٹل میں رات گزارنے کی اجازت نہیں تھی تاہم میں اس کی

خاطر یہ رسک لے لیتا۔
اسی دوران ایک کلاس فیلو حمائلہ سے میری دوستی ہوگئی جو جلد ہی محبت میں بدل گئی۔ وہ یونیورسٹی کی نہ سہی کم سے کم ہماری کلاس کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ میں بھی کم وجیہہ نہیں تھا۔ بہت سی دیگر لڑکیوں نے بھی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر میں اور کسی کے ساتھ دوستی سے آگے نہیں بڑھا۔ شیراز گو کہ کبھی کبھار ہی آتا تھا مگر پھر بھی اس نے میرے ذریعے سے تین چار لڑکیوں سے اکسیر چلا لیے۔ میں اس کا ان سے بس تعارف کراتا اور وہ میری موجودگی میں ہی ...ان سے بے تکلفی پیدا کر لیتا۔ اس کی شخصیت بھی کافی پُرکشش تھی۔ وہ یونیورسٹی میں گاڑی لے کے آتا سو اسے لڑکیوں کو رجھانے میں زیادہ مشکل پیش نہ آتی۔
اس نے ایک بار حمائلہ کے بارے میں بھی کچھ کمنٹس کیے تو مجھے اس پہ بہت غصہ آیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ میں اور حمائلہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں وہ آئندہ اس کے بارے میں ایسے کمنٹس نہ دے۔ مگر اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔
''یار یونیورسٹی کے سب سے اچھی لڑکی پہ تو تم نے قبضہ جمالیا ہے اور مجھے گئی گزری لڑکیوں پہ ٹرخا رہے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں نا۔ کم سے کم جی بھر کے اس کے دیدار سے تو آنکھیں سینکنے دو۔'' وہ آنکھ میچ کے لوفرانہ انداز میں بولا۔
میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے اسے غصے سے کہا۔ ''ساری یونیورسٹی کی لڑکیاں تمہاری ہیں۔ جس سے چاہے تعلق رکھو مگر حمائلہ کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا تو میں سارا لحاظ بھول جاؤں گا۔''
اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے دوست اب میں اس کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھوں گا۔'' اس نے لفظ ''میلی'' پہ زور دیا۔
اس کے بعد وہ یونیورسٹی آتا بھی تو مجھ سے نہ ملتا اس نے ایک دو بار میری غیر موجودگی میں حمائلہ سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی کی مگر اس نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔ حمائلہ نے مجھے خود بعد میں یہ بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ میرا کزن ہے۔ انتہائی خود غرض بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یونیورسٹی کی کافی لڑکیوں سے تعلقات بھی ہیں۔
اسی دوران ہمارے آخری سمسٹر کے امتحانات ہونے لگے۔ امتحانات کے بعد میں گھر آگیا تو میرا حمائلہ سے رابطہ کافی کم ہو گیا۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی گھر کے فون سے مجھے کبھی کبھار کال کیا کرتی تھی۔
میں ایک بینک میں انٹرن شپ کرنے لگا۔
ایک دن میں شام کو گھر آیا تو شیراز ہمارے گھر میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔ میں نے بھی مروتاً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی میرے دل میں اس کے لیے محبت باقی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے اچھی طرح پیش آتا میرے دل میں پرانی دوستی کے دن تازہ ہو جاتے اور میں ساری کدورتیں بھول جاتا۔
حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ میری امی سے بولا۔ ''چچی اب اس کی بھی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کے جلد از جلد منگنی کر دیں۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت کے

علاوہ بھی ایک عجیب سا تاثر تھا۔

"ہاں بیٹا بس یہ نوکری پہ لگ گئے تو اس کی بھی منگنی کر دوں گی۔ تمہیں ایڈوانس میں بہت بہت مبارک ہو۔" وہ اس سے بولیں۔

میں سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا تو شیراز بولا۔ "یار اس سنڈے کو میری منگنی ہے میں ابھی اسی کی دعوت دینے آیا ہوں۔" یہ کہہ کے اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔

میں نے کارڈ کھول کے دیکھا اور اس پہ لکھی عبارت پڑھنے لگا۔

میرے پیارے بیٹے شیراز علی کی منگنی دختر ارشد نواز سے طے پائی ہے آپ کی شرکت ہمارے لیے باعث خوشی ہوگی۔۔۔وغیرہ جیسی روایتی سی تحریر تھی۔

منگنی ایک میرج ہال میں تھی۔ کارڈ پڑھ کے میں نے اسے مبارکباد دی اور وعدہ کرلیا کہ ضرور شریک ہوں گے۔

میں اس کا سابقہ رویہ بھول چکا تھا۔ آخر منگنی والا دن آ گیا۔ فنکشن رات کو تھا۔ میں اسے شام کو بیوٹی پارلر لے گیا۔ وہ تیار ہو کے بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ سفید لٹھے کے سوٹ پہ سرخ شیروانی اور میچنگ کلے میں وہ کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ہال میں مرد و خواتین کا الگ الگ انتظام تھا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے میں اور شیراز کچھ دیگر دوستوں کے ساتھ خواتین والے ہال میں گئے وہاں دلہن کے ساتھ فوٹو سیشن ہونا تھا۔

میں اس کا ہاتھ پکڑے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا راستے میں اس کی سسرالی خواتین اس سے ہیلو ہائے کرتیں اور اسے مبارکباد دیتیں میں تو کسی کو جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ میرا تعارف بھی ان سے کرا دیتا۔ اسٹیج پہ خواتین کا جمگھٹا لگا تھا۔ دلہن نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ دولہے کو دیکھ کے خواتین نے ہمیں راستہ دیا۔

ویسے تو ہمارا گھرانہ قدرے قدامت پرست ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اتنی سی گنجائش نکل آئی ہے کہ منگنی کے موقعے پہ دولہا اور دلہن کو اکٹھے بٹھا کر تصاویر لی جاتیں ہیں۔ وہ دونوں الگ الگ صوفوں پہ بیٹھتے ہیں اور انگوٹھی بھی ایک دوسرے کو خود نہیں پہناتے۔ دلہن کو انگوٹھی دولہے کی ماں پہناتی ہے اور دلہن کی ماں عموماً دولہے کو انگوٹھی کی بجائے گھڑی پہناتی ہے۔ شیراز نے اس وقت میری طرف سے تحفے میں دی ہوئی گھڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے وہ گھڑی اتار کے میرے ہاتھ میں تھمائی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

مجھے اس کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ مگر میں نے خاموشی سے گھڑی تھام لی۔

شیراز دلہن کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی وہاں مجھے بیٹھنا تھا۔ اسی لمحے میری نظر دلہن پر پڑی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر پر کسی نے بم پھاڑ دیا ہو۔ گھڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کا شیشہ میرے دل کی طرح چکنا چور ہو گیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ حمائلہ تھی۔ میری محبت جس کے ساتھ میں نے زندگی گزارنے کا سپنا دیکھا تھا۔ اس نے نظریں جھکائی ہوئی تھیں۔ اس نے پتا نہیں مجھے دیکھا تھا یا نہیں مگر مجھے اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی لگیں۔ میرا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اسی لمحے شیراز نے مجھے آواز دی۔ خیام آؤ ناں، بیٹھو۔ اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ میری حالت انجوائے کر رہا تھا اور کسی نے میری کیفیت کو نوٹ کیا تھا یا نہیں مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے قدم گھسیٹا۔ نیچے پڑی ہوئی گھڑی کو ٹھوکر لگی اور وہ شیراز کے قدموں میں چلی گئی۔ اس نے اسے اٹھا کے اس کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا اور میری طرف دیکھ کے طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میں بڑی مشکل سے تین قدم چل کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کی ساس نے آ کے اسے گھڑی پہنائی۔ انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ لڑکیاں لڑکے سیل فونز اور کیمرے اٹھائے تصویریں اور ویڈیوز بنا رہے تھے۔ مگر میرا ذہن سن ہو چکا تھا۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے میری کیفیت کی کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ شیراز کی امی نے حمائلہ کو انگوٹھی پہنائی تو میرے دل میں ٹھیس سی لگی۔ اس کے بعد باقی خواتین دولہا اور دلہن کے ساتھ بیٹھ کے تصاویر بنوانے لگیں۔ مجھے اب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر میں اٹھ جاتا تو لوگ باتیں بناتے اس لیے میں مجبوری کے عالم میں بیٹھا رہا۔ آخر کار بڑی مشکل سے فنکشن ختم ہوا اور سب اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

روانہ ہوتے وقت میں نے شیراز سے ہاتھ ملایا اور اسے مبارکباد دی۔ میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ بولا۔ "تم نے کہا تھا ناں کہ میں حمائلہ کو کبھی میلی نظر سے نہ دیکھوں، سو میں نے اسے کبھی میلی نظر سے نہیں

دیکھا۔اب اُمید ہے تم بھی اس سے رشتے کا پاس کرو گے۔اس کا انداز جتلانے والا تھا۔
''تم بے فکر رہو۔اب وہ میری بھابی ہے۔ویسے بھی میں نے ہمیشہ رشتوں کا پاس کیا ہے۔'' میرا دل یہ سب کہتے ہوئے خون کے آنسو رو رہا تھا۔مگر میں نے کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ سپاٹ رہے۔
میں گھر پہنچ کے اپنے کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔میں اپنی ناتمام آرزوؤں کا ماتم کرنا چاہتا تھا، مگر میرے اندر عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔مجھے حمائلہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ہمارے ہاں لڑکیوں کی شادی ماں باپ کی مرضی سے ہی ہوتی ہے، لڑکی کے گھر والوں کو اگر اس بات کی بھنک بھی پڑ جائے کہ ان کی لڑکی کسی کو پسند کرتی ہے تو اس کی شادی وہاں ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے وہ تو مجبور تھی۔مجھے دکھ شیراز پہ تھا اس نے سب کچھ جانتے ہوئے نہ صرف میری محبت پہ شب خوں مارا تھا بلکہ مجھے اپنا شہ بالا بھی بنا دیا تھا۔جانے اس نے مجھے کس جرم کی سزا دی تھی۔
اب ان کی منگنی ہو چکی تھی۔میں کچھ نہیں کر سکتا تھا میں نے اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا۔انٹرن شپ کے دوران ہی مجھے اسی بینک میں جاب مل گئی۔آج اس کی منگنی کو دو سے زیادہ ماہ ہو گئے تھے اور اس کے بعد آج پہلی بار میرا شیراز سے سامنا ہوا تھا۔اسے دیکھتے ہی نہ صرف میرے خوشگوار موڈ کا ستیاناس ہو گیا تھا بلکہ دوستوں کی دلچسپ گفتگو کو بھی بریک لگ گیا تھا۔پتا نہیں وہ کون سی میڈیکل پرابلم تھی جس کا حل ٹنڈ تھا؟
اس سوال کا جواب مجھے تو اسی دن مل گیا تھا مگر آپ کو وہ جواب آخر میں بتاؤں گا کیونکہ ابھی میری اور شیراز کی عجیب و غریب دوستی کی داستان نے ایک اور ٹویسٹ لینا ہے۔اور وہ آپ کو سنانا زیادہ ضروری ہے۔
☆......☆
یہ ان کی منگنی کے پانچ چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔
میں بینک کی ٹف روٹین والی جاب میں حمائلہ کی محبت اور شیراز سے نفرت کو کافی حد تک بھول چکا تھا۔ویسے بھی یہ میری نیچر میں ہے میں ہر مسئلے کے ساتھ اسی طرح سمجھوتا کر لیتا ہوں۔اس دن اتوار تھا۔مجھے ابو نے ایک شادی میں جانے کا کہا۔شادی ہزارے میں تھی، میں نے ''ٹنڈ'' والے کزن اویس کو ساتھ لیا اور ہم روانہ ہو گئے۔میں نے گاڑی میں فل آواز میں میوزک چلایا، اور دونوں سفر کے ساتھ ساتھ میوزک کو بھی انجوائے کرنے لگے۔آج کافی عرصے بعد میں اپنے اندر زندگی کو محسوس کر رہا تھا۔میں نے گاڑی گھوڑا گلی سے لورہ روڈ کی طرف موڑی ہی تھی کہ اویس بولا۔گاڑی روکو۔
میں نے گاڑی سائیڈ پہ لگائی ہی تھی کہ وہ گردن باہر نکال کے زور سے چلایا۔''شیراز، ادھر آؤ۔''
میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔شیراز سوزوکی کیری سے اتر کے ہماری طرف آ رہا تھا۔میرے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی، مجھے اویس پہ بے پناہ غصہ آیا۔اس کی وجہ سے میرے خوشگوار موڈ کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔خیر قصور اس کا بھی نہیں تھا، اسے تو میرے اور شیراز کے درمیان کسی تلخی کا پتا ہی نہیں تھا۔
شیراز جوں ہی گاڑی میں بیٹھا میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔اس نے رسمی انداز میں خیر خیریت دریافت کی۔میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔
وہ خود ہی بتانے لگا کہ وہ رات کو پنڈی تھا۔آج وہ ادھر سے ہی شادی اٹینڈ کرنے آ رہا تھا کہ اس کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی جس کی وجہ سے وہ گھوڑا گلی تک بس میں آیا تھا بس مری کی تھی اس لیے وہ یہاں اتر کے کیری میں بیٹھنے لگا تھا کہ اویس نے اسے بلا لیا۔
اویس اس سے باتیں کرنے لگا، جبکہ میری ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔روڈ بہت خطرناک تھا۔میں اپنی گاڑی لے کے اس روڈ پر پہلی دفعہ آیا تھا۔اچانک ایک کیری نے مجھے خطرناک انداز میں اوورٹیک کیا۔
یہ وہی کیری ڈبہ تھی جس پہ میں سوار ہونے لگا تھا۔کیری تھوڑا سا آگے ہی گیا تھا کہ اچانک اس کا پچھلا ٹائر ایک دھماکے سے پھٹا۔ڈرائیور نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کیری روڈ کے بالکل کنارے پہ تھا۔وہ روڈ سے نیچے اتر گیا۔سواریوں کی چیخیں انتہائی دلدوز تھیں۔میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔میں نے اپنی گاڑی سائیڈ پہ لگائی اور ہم نیچے اتر آئے۔
روڈ کے کنارے آ کے ہم نے نیچے جھانکا تو انتہائی ہیبت ناک منظر ہمارا منتظر تھا۔
کیری کسی کھلونے کی طرح کھائی میں لڑھکتا جا رہا تھا۔اس سے نکلنے والا کچھ سامان باہر بکھرا نظر آ رہا تھا۔اتنے دور جانے سے کسی بھی سواری کا زندہ بچنا محال تھا۔اتنے میں اور بھی کافی گاڑیاں رک چکی تھیں اور لوگ نیچے جھانک

رہے تھے۔ اب کیری نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے موبائل نکال کے ریسکیو والوں کو کال کی۔ کچھ لوگ نیچے کی طرف جانے لگے۔ ہم دکھے دل کے ساتھ واپس گاڑی میں آ کے بیٹھ گئے۔

اویس شیراز سے بولا۔ ”اگر میں تمہیں نہ دیکھ لیتا تو تم بھی اسی میں بیٹھے ہوتے۔“

”میں اگر اس میں ہوتا تو یہ حادثہ ہی نہ ہوتا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”کیوں تم حادثہ پروف ہو گیا کہ جس گاڑی میں تم ہو گے اسے حادثہ پیش ہی نہیں آ سکتا۔“ اویس نے اس پہ طنز کیا۔

”میں اگر اس میں ہوتا تو وہ نہ اس طرح اس گاڑی کو کراس کرتا نہ اس کا ٹائر اس پتھر سے ٹکرا کے پھنستا اور نہ وہ نیچے جاتا۔“ اس نے اپنی لاجک پیش کی۔

اویس جواب میں کندھے اچکا کے رہ گیا۔

ہم نے جہاں جانا تھا وہاں کیبل کار لگی تھی اسے مقامی زبان میں لفٹ کہتے ہیں۔ نیچے سے ”دریائے ہرو“ بہتا ہے۔ لفٹ پہ بہت رش تھا۔ لفٹ میں دس افراد سوار ہو سکتے ہیں۔ لفٹ آتی تو لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے کے سوار ہوتے۔ ہم پہلے تو کچھ دیر دیکھتے رہے پھر شیراز بولا۔ ”ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ ہمیں بھی ایسے ہی سوار ہونا ہوگا۔“

لفٹ آئی تو اویس سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا شیراز بھی لفٹ میں سوار ہو گیا مگر اسے سیٹ نہیں ملی۔ باقی لوگوں نے اسے کہا کہ اتر جاؤ اتنے میں لفٹ چل پڑی۔

لفٹ دوسری سائیڈ سے آپریٹ ہوتی تھی۔ ادھر جب لوگ سوار ہو جاتے تو کوئی شخص سیٹی مارتا یا وہ اندازے پہ ہی لفٹ چلا دیتے ہیں۔ اس وقت رش تھا وہ بھی جلدی میں تھے اس لیے لفٹ چلانے والے نے سیٹی کا انتظار ہی نہیں کیا اور لفٹ چلا دی۔ شیراز اتر ہی نہیں سکا۔ وہ ادھر ہی ڈالے پہ کھڑا ہونے لگا کہ اس کا سر چھت سے ٹکرایا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اتنے میں لفٹ آٹھ دس فٹ آگے جا چکی تھی۔ وہ سیدھا نیچے گیا۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ بلند ہوئی۔ کئی عورتوں کے منہ سے بھی چیخیں نکلیں۔ نیچے درخت تھے وہ ایک درخت کی چوٹی پہ ہی اٹک گیا اور ادھر ہی ساکت ہو گیا۔ لوگ شور مچانے لگے۔ میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے مشکل میں دیکھ کے پل بھر میں ہی اس کے لیے میرے دل میں جتنی نفرت تھی

جانے کہاں غائب ہو گئی۔ میں اس کی ساری زیادتیاں بھول گیا۔

درخت نیچے ڈھلوان میں تھے۔ اور ادھر کانٹے دار جھاڑیاں بھی تھیں۔ ادھر جانا ہی کافی مشکل تھا۔ لوگ اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے مگر کوئی بھی نیچے جانے کو تیار نہیں تھا۔ میں گاڑی سے ایک رسی نکال لایا۔ مجھے نیچے جاتے دیکھ کے دو نوجوان بھی میرے ساتھ چل پڑے۔ وہ جھاڑیوں سے احتیاط سے گزرنے لگے۔ مگر میں ان میں مردانہ وار گھس گیا۔ میرے ہاتھوں اور چہرے پہ خراشیں آئیں مگر میں نے پروا نہیں کی۔ میں رسی لے کے درخت پر چڑھ گیا۔ بچپن میں درختوں پر چڑھنے کا تجربہ آج کام آ رہا تھا۔ میں جب اوپر چڑھ رہا تھا تو اچانک مجھے ہاتھ پہ نمی محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا تو یہ خون کا قطرہ تھا جو اوپر سے گرا تھا۔ میں مزید تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کے دیکھا تو وہ شاخوں کے درمیان الٹا پھنسا نظر آیا۔ وہ بالکل حرکت نہیں کر رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ ایک نوکیلی شاخ اس کے گلے میں پھنسی ہوئی تھی خون اس کی گردن سے ہی ٹپک رہا تھا۔ میں نے اس کا سر پکڑ کے اوپر کی طرف زور لگایا۔ شاخ اس کی گردن سے نکل گئی۔ خون بھل بھل بہنے لگا۔ شاید اس کی گردن کی کوئی رگ بھی کٹ گئی تھی۔

اچانک اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکلی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ حیرت نظر آئی۔ میری کچھ امید بحال ہوئی میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنی کمر پہ سوار کیا اتنی دیر میں ایک اور لڑکا بھی درخت پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ رسی سے اسے میرے ساتھ باندھ دے۔ اس نے رسی کس کے باندھ دی تو میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں اسے روڈ تک لے جانے میں کامیاب ہوا۔ اویس بھی اسے گرتے دیکھ کے واپس آ گیا تھا۔ شیراز کی گردن سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

میں نے کاٹن کے کپڑے پہن رکھے تھے میں نے اپنا دامن پھاڑ کے اس کی گردن پہ باندھ دیا اور ہم اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسپتال میں اسے ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ قریب المرگ لگ رہا تھا۔ اتنے میں اس کے گھر والے بھی پہنچ چکے تھے۔ انہیں

اویس نے اطلاع دی تھی۔

گلے میں شاخ لگنے کے علاوہ اس کے سر میں بھی اندرونی چوٹ لگی تھی۔ جس کا پتا سی ٹی اسکین سے چلا تھا۔ اسے خون کی ضرورت تھی۔ میرے اور اس کے خون کا گروپ ایک ہی تھا۔ میں نے اسے دو بوتل خون کی دیں۔ وہ بہتر گھنٹے تک زندگی و موت کی کشمکش کے بعد آخر کار زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ مگر شاخ نے اس کے ووکل کارڈ کو متاثر کیا تھا۔ وہ صحیح طرح بول نہیں سکتا تھا۔ اس کے گلے سے خرخراتی ہوئی آواز نکلتی تھی۔ کچھ دن بعد اس کا آپریشن ہوا۔ وہ کسی حد تک ٹھیک ہوگیا، مگر اب بھی وہ نارمل انداز میں بات نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تھا۔

اس دوران میرا اس سے جب بھی سامنا ہوا وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں اس کی ڈھارس بندھاتا کہ انشا اللہ وہ جلد ٹھیک ہوجائے گا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے کچھ دن بعد وہ ہمارے گھر آیا۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا تھا وہ آتے ہی میرے پاؤں پڑ گیا اور زار و قطار رو رہا تھا، مجھ سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

میں نے اسے کندھے سے پکڑ کے صوفے پہ بٹھایا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی حالت سنبھلی تو وہ عجیب لہجے میں بولا۔ تم کیسے انسان ہو میں ساری زندگی تم سے زیادتیاں کرتا رہا مگر مجھے جب بھی تمہاری ضرورت پڑی تم میرے کام آئے۔ اس دن تو تم دو دفعہ میری زندگی بچانے کا سبب بنے۔ پہلی بار میں نے اسے بس اتفاق سمجھا شاید خدا نے اسی لیے مجھے پھر آزمائش میں ڈالا۔ اس وقت میں ادھر موجود ہر شخص سے اُمید رکھ سکتا تھا کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کرے گا، مگر تمہارے ساتھ جو کچھ میں نے کیا تھا اس کے بعد کم سے کم مجھے تم سے اس کی ہرگز اُمید نہیں تھی۔ مگر تم نے تو اپنی جان خطرے میں ڈال کے مجھے بچایا۔ تم انسان ہو یا فرشتہ؟ اس کی آواز میں جذبات کے ساتھ ساتھ حیرت کی آمیزش بھی تھی۔

میں مسکرایا۔ ''میں بس ''دوست'' ہوں۔''

''میں تو دوستی کے قابل ہی نہیں۔ مگر میں خود کو اس قابل بناؤں گا۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

میں نے تم سے جو زیادتیاں کیں اس میں سے کم سے کم ایک کی تلافی تو کرسکتا ہوں۔ میں نے ضد میں آکے حمائلہ سے رشتہ کیا تھا۔ اب میں اس سے منگنی توڑ دوں گا۔ تم اس سے شادی کر لینا۔ منگنی کے بعد سر توڑ کوشش کے باوجود اس نے آج تک مجھ سے بات تک نہیں کی وہ اب بھی تمہارے لیے تڑپتی ہے۔ اف کتنا ظالم تھا میں۔ میں نے تو آج تک کبھی کسی کے احساسات کی پرواہ تک نہیں کی۔ خدایا مجھے معاف کرنا۔'' وہ بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

میں نے کہا ''تم نے جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا وہ سب بھی میرے دل سے تمہاری محبت ختم نہیں کرسکا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تم منگنی توڑنے والی بات نہ کرو۔''

''منگنی تو میں توڑوں گا تمہیں مزید قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تمہیں اس سے ملانا اب میری زندگی کا مشن ہے۔ اس کے لیے مجھے جان بھی دینا پڑی تو میں پروا نہیں کروں گا۔'' وہ جذباتی مگر اٹل انداز میں بولا۔

قصہ مختصر اس نے منگنی توڑ دی کچھ دن بعد میرے گھر والے رشتہ لے کر گئے تو رشتہ قبول کرلیا گیا۔

میری منگنی بھی دھوم دھام سے ہوئی۔ شیراز میرا شہ بالا بنا۔

یوں تو لوگ ہمیشہ جب ان کے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے صرف اسی وقت کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی تھی۔ مگر مجھے حمائلہ ملی اور اس کے ساتھ ہی شیراز کی دوستی بھی واپس مل گئی۔ میں اس پہ کہتا ہوں کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ اللہ نے شاید اسی لیے شیراز کی جان ایک ہی دن دو دفعہ بچائی اور اس کا سبب مجھے بنایا۔ یہ اتفاق تو نہیں ہوسکتا تھا یہ اللہ کا منصوبہ تھا، جو شاید میرے صبر کے نتیجے میں اللہ نے میرے لیے بنایا تھا۔ یوں میری دوستی و محبت کی کہانی ہیپی اینڈنگ کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچی۔

کچھ قارئین کے ذہن میں اب وہ سوال آرہا ہوگا کہ آخر کون سا میڈیکل پرابلم ہے جس کا علاج ٹنڈ ہے؟ کافی لوگوں نے تو اندازہ لگالیا ہوگا بہرحال میں آپ کو بتا ہی دیتا ہوں۔

میں نے اس دن جب اویس سے یہ سوال پوچھا تو وہ معصومیت سے بولا تھا۔

''میرے بال گر رہے تھے ڈاکٹر نے ٹنڈ کردی۔'' سو اس کے بعد بال نہیں گرے۔ یہ واقعی گارنٹیڈ علاج تھا۔

اس کا جواب سن کے میرا منہ بن گیا۔ یعنی کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔

سکون

جناب معراج رسول
السلام علیکم
دسمبر کا مہینا آتے ہی سقوطِ مشرقی پاکستان کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر روداد بھی ایک ایسے دوست کی ہے جسے سقوط کے المیے نے نیم پاگل کردیا ہے۔

امجد انصاری
(نور الامین کالونی شیخوپورہ)

غلام محمد روز کی طرح اپنے دفتری کام کی انجام دہی میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے سامنے کچھ نوجوان نمودار ہوئے۔ اس نے حسبِ معمول بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ بنگالی زبان میں کہا۔ ”جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ بھی اس سے کوئی دفتری کام کروانے آئے ہیں۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ ڈھاکا میونسپل کارپوریشن کے میئر کا چیف اسسٹنٹ تھا۔ اپنی

بہترین کارکردگی کی وجہ سے بے حد ہردلعزیز تھا۔ بلاتفریق ایں و آں، سب کا کام انتہائی خوش اسلوبی سے کرنے کے لیے مشہور تھا۔

”اٹھو۔“ آنے والے نوجوانوں میں سے ایک سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”ہمارے ساتھ چلو۔“

”کیوں؟ کہاں؟“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”میر تو گھاٹ۔ سلاٹر ہاؤس۔“

غلام محمد کا سیاہ چہرہ اور سیاہ ہوگیا۔ نوجوانوں کی جیب سے ان کے پسٹل نکل کر ان کے ہاتھوں میں آگئے۔ ”ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ تم او بنگالی ہو۔ بہاری ہو، اردو اسپیکنگ ہو، بنگالی بن کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہو۔“

غلام محمد بے حد سلجھا ہوا اور سمجھ دار انسان تھا اس لیے ان درندوں سے الجھنے اور بحث کرنے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مکتی باہنی کے کارندوں کے ساتھ چل دیا۔

غلام محمد، اس بلند و بالا عہدے تک یونہی نہیں پہنچا تھا۔ اس کے پیچھے ایک طویل صبر آزما اور کٹھن جدوجہد شامل تھی۔ جب وہ کھلنا سے ڈھاکے آیا تھا تو بہت کمسن اور اسکول کا طالب علم تھا۔ اس کے والد کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ شاید کسی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا جس کے فوراً بعد ان کے لواحقین ڈھاکے آگئے تھے۔ اس کے بڑے بھائی شاہ محمد کو ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ ان کی اکیلے کی کمائی اور کھانے والے کئی تھے۔ والدہ تھیں، دو جوان بہنیں تھیں اور غلام محمد کے علاوہ دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔

میری اس سے ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ اس وقت وہ کالج کا طالب علم تھا اور ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ تاکہ بھائی کا بوجھ کچھ کم ہو۔

میری اس کی دوستی کی وجہ شاید ہمارے ادبی مشاغل تھے۔ وہ کہانیاں لکھا کرتا تھا اور میں شاعری کرتا تھا۔ اس کے افسانے میں دنیا جہان کے دکھ درد اور غم بھرے ہوتے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کا پورا خاندان کسمپرسی کے حالات سے دوچار تھا۔ ظاہر ہے ایسے حالات سے گزرنے والا نوجوان افسانہ نگار اور کیسی افسانہ نگاری کر سکتا تھا۔ مجھے جب وہ اپنے افسانے سناتا اور پھر اس کے بارے میں میری رائے طلب کرتا تو میں جی پر جبر کر کے اس کی تعریف کر دیتا مگر جب تنقیدی نشستوں میں اپنے افسانے سناتا تو سامعین ان پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں دوستوں نے پروگرام بنایا کہ آج اس کے افسانے کا اچھی طرح بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ کوئی رورعایت نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ سب نے ٹھیک ٹھاک طریقے پر اس کی کھنچائی کر دی۔ اس کا سیاہ چہرہ اور بھی سیاہ ہوگیا اور وہ جلدی جلدی سگریٹ کے کش پر کش لگاتا رہا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب بھی وہ جذباتی ہوتا بار بار سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا۔

تنقیدی نشست ختم ہوئی تو اس نے طیش میں آکر اپنے افسانے کا مسودہ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بڑے جذباتی انداز میں بولا۔ ”آج سے میں افسانہ نگاری نہیں کروں گا۔ کبھی کوئی کہانی نہیں لکھوں گا۔“

اور واقعی اس نے بہت دنوں تک کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ جب اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا تو اس کے لکھنے کے مزاج میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب اس کے حالات میں بھی بہتری آگئی تھی۔ اس نے بی اے پاس کر لیا تھا اور ایک جگہ چھوٹی سی ملازمت کرنے لگا تھا۔ اب اس نے اپنے سابقہ افسانے پڑھے تو خود اسے بھی بکواس اور بے ہودہ لگے۔ ایک دن کہنے لگا۔

”یار! میرے اس دور کے افسانے تو واقعی بڑے مضحکہ خیز تھے۔ اس روز تم لوگوں نے غلط تنقید نہیں کی تھی۔“

غلام محمد بہت اچھا، بہت پیارا شخص تھا۔ دھیمی طبیعت کا آدمی تھا۔ غصے کے عالم میں بھی زیادہ لاؤڈ نہیں ہوتا تھا۔ خوش ہوتا تب بھی دھیمے دھیمے مسکراتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی اثر لیتا تھا۔ طبیعت بہت حساس تھی۔ جب سگریٹ کے جلدی جلدی کش لیتا تو اندازہ ہو جاتا کہ اس کی طبیعت پر کسی کی کوئی بات گراں گزری ہے۔ اپنے دکھوں کو دوسروں پر بہت کم ظاہر کرتا تھا۔ بعض اوقات بہت معمولی باتوں سے بھی بہت خائف رہتا تھا۔ اکثر ایسی باتیں بھی جو چھپانے یا خفیہ رکھنے کی نہیں ہوتی تھیں انہیں بھی بڑے رازدارانہ انداز میں کہتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے اپنے اردگرد سے خائف ہو۔ ان باتوں کی وجہ سے وہ بڑا پُراسرار لگتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نفسیاتی کیس ہے۔ اس کے والد کے قتل کا اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا۔ اس نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ کھلنا میں اس کے والد کو کس نے قتل کیا تھا مگر جب بھی وہ اپنے والد کے قتل کا تذکرہ کرتا اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور

پر اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں سمجھتا تھا اور اپنے اردگرد سے اپنے نادیدہ دشمنوں کی آہٹ محسوس کرتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلام محمد میں تبدیلی آنے لگی۔ جن دنوں معروف شاعر محبوب خزاں ڈھاکے میں آڈیٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے ان کے دفتر میں اکثر ڈھاکے کے ادیبوں شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ محبوب خزاں نے غلام محمد کو مشورہ دیا کہ تم مقابلے کے امتحان میں بیٹھو۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسے گائیڈ بھی کیا اور مفید مشورے بھی دیئے اور غلام محمد نے اپنی ذہانت اور متانت سے یہ امتحان آسانی سے پاس کرلیا اور سیکشن آفیسر بن گیا۔ اس وقت تک اس کے چھوٹے بھائی بھی کسی قابل ہو گئے تھے۔ بڑی بہن پہلے ہی بیاہی جا چکی تھی۔ دوسری بہن کی عمر اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس کے بھائیوں نے صلاح مشورہ کے بعد افسانہ نگار واحد نظامی سے اس کی شادی کردی۔ غلام محمد نے اس سلسلے میں مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے کہا تھا۔ ”یہ تو تم لوگ معلوم ہی کر چکے ہو گے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”ہاں ہمیں معلوم ہے اور اپنی بیوی کے انتقال کے بعد انہی بچوں کی پرورش کے لیے وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔“

اور پھر چند دنوں کے بعد بڑی سادگی کے ساتھ ان لوگوں نے واحد نظامی کے ساتھ اپنی بہن کا نکاح پڑھوا دیا جس نے واحد نظامی کے بچوں کی سگی ماں بن کر پرورش کی۔ واحد نظامی کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی۔ اس کمال کے افسانہ نگار کو مکتی باہنی کے درندے گھر سے ایسے لے گئے کہ وہ لوٹ کر کبھی نہ آیا۔ اس کے بچوں کی پرورش غلام محمد کی بہن نے کی۔

سیکشن آفیسر بننے کے بعد غلام محمد نے اپنی ذمہ داریاں بڑی دیانت داری اور محنت سے نبھانی شروع کردی اور جلد ہی اپنے دفتری لوگوں میں بہت مقبول ہو گیا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا وہ شادی کر رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا یہ خبر درست ہے کہ تم شادی کر رہے ہو؟“

”ہاں، سو فیصد درست۔“

”کون ہے۔ کہاں رہتی ہے میری ہونے والی بھابی؟“

”میرے دفتر میں میرے ایک سینئر کولیگ ہیں، مجھے بہت چاہتے ہیں، میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی صاحبزادی ہیں۔“

میں نے اس کے کچھ دوستوں سے سنا تھا کہ ایک بنگالی لڑکی سے اس کا افیئر چل رہا ہے جس سے وہ شادی کرنے والا ہے مگر اس نے مجھے دوسری کہانی سنائی تھی۔ البتہ جن صاحب کا اس نے تذکرہ کیا تھا وہ بھی بنگالی تھے اور ایک دن ان کی اسی بیٹی سے غلام محمد کی شادی ہو گئی۔ لڑکی خاصی بڑی جائیداد لے کر آئی تھی اور اس نے اپنے شوہر کو بھی اپنی جائیداد اور ملکیت سمجھ کر اس پر مکمل قبضہ کرلیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں سے دور ہو گیا تھا۔ اس کے سسر جواب بڑے سرکاری عہدے دار تھے۔ انہوں نے شادی سے پہلے ہی اسے ایک آفیسر کوارٹر الاٹ کرادیا تھا جو عظیم پور کالونی کے قریب واقع تھا۔ اب غلام محمد اپنے ٹیپو سلطان روڈ کے گھر میں نہیں رہتا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس کی رہائش اپنی بیوی کے ساتھ اسی کوارٹر میں تھی۔

”ابھی بنگلہ دیش وجود میں نہیں آیا تھا لیکن وہاں کے حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔ غلام محمد طبیعتاً

رخمانوف، امام علی

تاجکستان کے سیاسی رہنما اور پہلے صدر۔ 20 فیصد ووٹ حاصل کرکے تاجکستان کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ 6 نومبر 1999ء کو پھر صدارتی انتخاب کا انعقاد عمل میں آیا تو وہ 92 فیصد ووٹ لے کر تیسری مرتبہ سات سال کے لیے صدر بن گئے۔ ان کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ملک میں چار سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ کردیا اور اس ضمن میں مسلمان گوریلا لیڈر سید عبداللہ نوری کے ساتھ 1997ء میں ماسکو میں معاہدہ طے کیا۔

انہوں نے 1999ء میں ریفرنڈم منعقد کرکے اسلام پسند سیاسی جماعتوں کو قانونی طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ پاکستان نے تاجکستان کا 13 ملین ڈالر کا قرضہ بھی ری شیڈول کرنے کا اعلان کیا۔

مرسلہ: شاہد علی ترمذی، ملتان

بہت محتاط آدمی تھا۔ اس نے حالات کو دیکھتے ہوئے بے حد محتاط قدم اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی دفتری کارکردگی تو اوّل روز ہی سے بہت اچھی اور صاف ستھری تھی۔ وہ دفتر کے چھوٹے بڑے لوگوں کے ساتھ بہت پیار و محبت اور خلوص کے ساتھ رہتا۔ سب کے کام آتا اور سب کو خوش رکھتا تھا۔ کیا بنگالی اور کیا غیر بنگالی، کیا دفتر کے لوگ اور کیا باہر کے لوگ، جو بھی اپنے کام سے اس کے پاس جاتا اس کی بھرپور طریقے سے مدد کرتا۔

اس کی بہترین کارکردگی کے باعث کچھ عرصہ کے بعد اسے ڈھاکا میونسپل کارپوریشن کے چیف ایگزیکٹو کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ مگر یہاں بھی اُس کی محبت اور خلوص کا وہی عالم تھا۔ وہ بلا امتیاز اپنے پاس آنے والے ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیا کرتا تھا۔ دفتر کے لوگ بھی اس سے بہت خوش تھے اور اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں اکثریت بنگالیوں ہی کی تھی اور شاید یہی اس کا مشن بھی تھا۔

پھر وہاں انقلاب آیا اور مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگلہ دیش بننے سے پہلے بھی بہت خون خرابہ ہوا تھا۔ بعد میں بھی ہوا۔ غلام محمد نے بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہی زیادہ محتاط قدم اٹھانا شروع کر دیا تھا اور اپنے بہت سے پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ اس سے ملنے یا اس کے گھر تک آنے کی کوشش نہ کریں۔ یہاں تک کہ اپنے بھائیوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ خبردار میری طرف آنے اور مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اس کے بھائیوں کو اس کی مدد اور رہنمائی کی سخت ضرورت تھی مگر اس نے انہیں اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ ایک بااثر بنگالی کا داماد تھا۔ ایک پاور فل بنگالی خاتون کا شوہر تھا۔ اس کے بچے بنگالی تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بنگالی نہیں تھا۔ اس کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اس نے اردو اسپیکنگ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے سے بھی گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔ بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہی اس نے حالات کا رخ دیکھ کر اردو میں خط و کتابت کے ساتھ ساتھ اردو میں لکھنا بھی بند کر دیا تھا۔ اس موقع پر اس نے افسانہ نگاری بند کی تو کوئی دس بارہ سال تک نہیں لکھا۔

جب بنگلہ دیش میں مکتی باہنی کا زور بڑھا تو انہوں نے اردو بولنے والوں کو پکڑ کر انتقاماً مارنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران انہیں بھنک مل گئی کہ غلام محمد بھی اردو اسپیکنگ ہے اس لیے ایک دن موقع ملتے ہی اسے پکڑ کر سلاٹر ہاؤس لے گئے۔ جہاں بہاریوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ ایسے کئی سلاٹر ہاؤس یا انسانی ذبیحہ خانے ڈھاکے میں موجود تھے جن میں بے شمار بہاریوں کو قتل کیا جا چکا تھا۔

غلام محمد سلاٹر ہاؤس میں پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ سلاٹر ہاؤس ایک ویران جگہ پر واقع تھا جہاں ایک بہت بڑا سا خندق کھودا گیا تھا جس کے سرے پر اغوا کیے گئے اردو بولنے والوں کو قربانی کے جانوروں کی طرح تیغ گران کے گلے پر چھری پھیر دی جاتی تھی۔ اس موقع پر وہاں موجود مکتی باہنی کے نوجوان ”جئے بنگلہ“ کا فلک شگاف نعرہ لگاتے تالیاں بجاتے اور اپنی خوشی کا والہانہ اظہار کرتے۔ ذبح کیا جانے والا بہاری تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا اور اس کا سارا خون گڑھے میں چلا جاتا تو وہ مرنے والے کو بھی لات مار کر خندق میں پھینک دیتے تھے۔ غلام محمد پتھر کی مورتی بنا یہ سارا خونی اور بھیانک تماشا دیکھ رہا تھا۔

ذرا سوچیے وہ غلام محمد جو باپ کے قتل کا سانحہ سوچ کر اس قدر خائف ہو جاتا تھا، اس وقت جب خود مقتل میں موجود تھا اور اس کی باری آنے والی تھی۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی؟ اس کی بیچارگی اور بے بسی کا تو یہ عالم تھا کہ اس وقت اس کے پاس سگریٹ کی ڈبی بھی نہیں تھی کہ وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا کر اپنے مشتعل اعصاب کو کچھ سکون پہنچا سکتا۔ میں جب بھی اس کے اس عالم کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر ایک لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔

ابھی میرے یار کی قربانی کی باری نہیں آئی تھی کہ اس کی بیوی آندھی اور طوفان کی طرح اپنی کار پر سلاٹر ہاؤس پہنچ گئی۔ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ غلام محمد کے دفتر میں سب ہی اس کے چاہنے والے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے غلام محمد کے اغوا کیے جانے کے فوراً بعد اس کی بیوی کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔ ”میڈم! غلام محمد صاحب کو مکتی باہنی کی فورس اغوا کر کے سلاٹر ہاؤس لے گئی ہے۔“

اس کی بیوی نے مکتی باہنی کے جوانوں سے کہا۔ ”ارے ارے! اسے کیوں مار رہے ہو۔“ اس کا اشارہ غلام محمد کی طرف تھا۔ ”یہ تو بڑا ’بھدر مانش‘ ہے۔“

”نہیں میڈم! یہ بھدر مانش نہیں ہے۔ یہ بہاری ہے اردو اسپیکنگ ہے۔ یہ بھلا شریف آدمی کیسے ہو سکتا ہے؟“

”پاگل ہوئے ہو۔ یہ میرا شوہر ہے۔“ اس کی بیوی نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ ”میں بنگالی ہوں یا اوبنگالی۔“

”آپ بنگالی ہیں۔“

”پھر میرا شوہر کیسے غیر بنگالی ہو سکتا ہے؟ تم لوگ مجھے پہچانتے نہیں میں کون ہوں؟“ مکتی باہنی کے لڑکوں میں شاید کسی نے اسے پہچان لیا تھا۔

”میڈم! آپ موکل ہیں۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔“

”اور تم سب سے کہیں بڑھ کر بنگلہ دیش تحریک کی علم بردار ہوں۔ تم سے زیادہ اس کی شادھن کے لیے جدوجہد کر چکی ہوں۔ پھر میں کسی اردو بولنے والے کو کیسے شریکِ حیات بنا سکتی ہوں؟“

مکتی باہنی کے کارندے مخمصے میں مبتلا ہو گئے۔ ”سوری میڈم!“ انہوں نے ذرا دیر بعد شرمسار ہو کر کہا۔ ”شاید ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ ہم کسی اور کے دھوکے میں انہیں لے آئے۔“

اس کی بیوی موکل نے بارعب لہجے میں کہا۔ ”یہاں لانے والوں کو لانے سے پہلے اچھی طرح معلوم کر لیا کرو کہ وہ اُوبنگالی ہے بھی یا نہیں۔ خدا جانے تم لوگ اب تک کتنے بنگالیوں کو مار چکے ہو گے۔ آیندہ تمہاری طرف سے ایسی کوئی غلطی ہوئی تو تم سب کی کورٹ مارشل کرا دوں گی۔“

ایک بار پھر سب نے ”سوری میڈم“ کہا اور بولے۔ ”اب ہم پورے احتیاط سے کام لیں گے۔ ہم سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہو گی۔“

موکل نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ غلام محمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی گاڑی پر بٹھایا اور جس طوفانی انداز میں گاڑی چلا کر آئی تھی۔ اسی طوفانی انداز میں سلاٹر ہاؤس سے اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

غلام محمد موت کے منہ سے بچ کے اپنے گھر آ گیا تھا۔ آتے ہی اس نے سگریٹ کی ڈبی سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اس کے باوجود اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس واقعے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ موت کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر اس شخص کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے جو باپ کے قتل کے سانحے کا سوچ کر ہی اپنے حواس کھو بیٹھتا تھا۔

”اگر موکل کو پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو اس وقت میں بھی ایک ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح خونی گڑھے میں ڈبکیاں لگا رہا ہوتا۔“

”اگر موکل اتنی دبنگ نہ ہوتی۔ مکتی باہنی کے درندوں کو قائل نہ کر پاتی، تو کیا اس صورت میں بھی میں زندہ بچ پاتا؟“

یہ اور اس قسم کے خیالات۔ اور سلاٹر ہاؤس میں گزرے ہوئے لمحات، ایک خوفناک سپنے کی طرح اس کے اعصاب پر سوار رہے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے مسلسل یہی بھیانک خواب دیکھا رہتا تھا۔ اس پر عجیب جنونی کیفیت طاری رہتی۔ ایسے میں اس کی سگریٹوں کا کوٹا بہت بڑھ گیا تھا۔

کئی دنوں تک تو موکل اور اس کے رشتے داروں نے اسے اس حال میں چھوڑ دیا کہ وہ خود ہی اس کیفیت سے آزاد ہو جائے مگر جب ایسا نہیں ہوا تو انہوں نے اسے سمجھایا اور تسلی دینا شروع کیا کہ اب ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ہم ہیں نا۔ اب معمول کی زندگی بسر کرنا شروع کرو۔ جاؤ اپنی ڈیوٹی شروع کرو۔ یہ کوئی معمولی نوکری نہیں ہے۔

”نہیں......سب دھوکا ہے......سب مایہ ہے...... مجھے اب کسی پر کوئی یقین نہیں رہا۔“

”پاگل ہوئے ہو؟ میونسپل کارپوریشن میں بھلا تمہارا کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کوئی شخص مجھے تمہارے اغوا کیے جانے کی اطلاع کیوں دیتا؟“

مگر غلام محمد نہ مانا۔ کئی مہینوں کے بعد بدقت تمام ایک پرائیویٹ ملازمت کر لی اس کے دل و دماغ میں بس یہی خیالات کسی آسیب کی طرح سوار رہتے۔

”میں ہزار برس اس سرزمین سے اپنا رشتہ استوار کر لوں، بنگالی لڑکی سے شادی کر کے اپنے سارے پرانے رشتے ناطے ختم کر دوں۔ اردو لکھنا پڑھنا، بولنا حتیٰ کہ اردو بولنے والے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دوں۔ اس کے باوجود میری اپنی شناخت نہیں بدلے گی۔ میں اردو بولنے والا ہی سمجھا جاؤں گا۔ بہاری ہی کہلاؤں گا۔“

اب وہ اپنے گھر میں بھی۔ اپنے بال بچوں میں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا تھا۔ اب ڈھاکے سے۔ بنگلہ دیش سے بھی اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ کبھی دبئی، کبھی لیبیا، کبھی امریکا۔ کہیں ملازمت، کہیں بزنس۔ نگری نگری پھرا مسافر......لیکن اس کے دل و دماغ کو کہیں سکون نہیں ملا۔

پھر سکون ملا تو کہاں، قبر کے اندھیرے کونے میں۔

حب ڈیم کے کیچمنٹ ایریا میں ایک قدرے اونچی جگہ پر میرا شکاری خیمہ نصب تھا۔ میں ڈبل نال کی بندوق لیے منہ اندھیرے کسی تیتر کی تلاش میں پیدل پھر رہا تھا۔ میرے ساتھی رات کو خرگوش اور تیتر کے گوشت کے کباب کھا کر نیند میں بدمست تھے۔ ویسے بھی یہ لوگ شہر میں بارہ بجے جاگنے کے عادی تھے۔ ہلکی سی روشنی شروع ہوئی۔ کہیں دور سے ایک انتہائی پرسوز اوردل سے نکلتی آواز کسی پرانے گانے کی سنائی دی۔ یا اللہ کیا جن بھوت بھی انڈیا کے پرانے گانوں کے عاشق ہیں۔ آواز جس جانب سے آرہی تھی ادھر ایک پرانا قبرستان تھا۔ یہ دنیا کا واحد قبرستان ہے جو سالہا سال پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ آٹھ دس سال بعد اگر حب ڈیم خشک ہوجائے تو یہ قبرستان نیلے پانیوں سے ابھرآتا ہے اور لوگ اپنے پیاروں کی قبریں پہچان کر ان کی مرمت اور سفیدی کردیتے ہیں۔ پانی آنے پر یہ قبریں پھر نیلے پانیوں میں محفوظ ہوجاتی ہیں۔ خشک سالی کے ان دنوں میں آجکل جاڑو کا قبرستان پھر آباد تھا۔ پورے بلوچستان سندھ اور ایران سے لوگ آکر قبروں کی زیارت مرمت اور فاتحہ خوانی کررہے تھے۔ تھوڑے وقفے کے بعد پھر آواز آئی۔ ''بہاریں چاردن کی پھر خزاں ہے محبت کی بس اتنی داستاں ہے۔''

اتنی درد بھری آواز کہ سننے والا لرز جائے۔ آواز میں گانے والے کی سانس کی کمزوری اور لرزہ بتا رہا تھا کہ کوئی بہت عمر رسیدہ شخص گا رہا ہے۔ میں شکار بھول کر اس آواز کی جانب چل دیا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک کوئی سو سال کا بوڑھا شخص

شنبے اور مومل

جناب مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک اور سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ روداد مجھ تک عرصہ قبل پہنچی تھی لیکن لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ سرگزشت کے قارئین نے میری تحریر استاد جی کو پذیرائی بخشی تو مجھے حوصلہ ملا ہے۔ شنبے اور مومل کی داستان کے ساتھ پھر حاضر ہو گیا ہوں۔
شمیم غوری
(کراچی)

دو قبروں کے درمیان آنکھیں بند کیے قبر سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے اور اونچے سروں میں یہ گانا گا رہا ہے۔ میں نے کچھ فاصلہ رکھ کر بندوق زمین پر رکھی اور بیٹھ گیا۔ اسے احساس نہ ہونے دیا۔ کبھی کبھی گانا روک کر بلوچی میں کہتا۔ ''ہائے میری موئل تو مجھے چھوڑ کر اپنی اماں کے پاس چلی گئی۔'' کبھی کہتا۔ ''رانو تو کیسی ہے۔ دیکھ میں نے تو دن رات سفر کیا لیکن موئل نہ جی سکی۔ رانو مجھے معاف کر دینا۔ دیکھ موئل کا خیال رکھنا وہ بہت چھوٹی ہے۔'' پھر کوئی اور غمزدہ گانا شروع کر دیتا اور آنسو جھڑنے لگتے۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے منہ سے ہائے نکل گئی اور وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ سلام دعا ہوئی۔

اس کی کیفیت کے سنبھلنے کے بعد تعارف ہوا۔ اس کا نام شنبے تھا۔ اس کے دادا کا نام بھی شنبے تھا۔ دو تین سو سال پہلے بھی اس کا کوئی جدِ امجد شنبے تھا جس کے نام پر یہ گوٹھ اتنے سال سے آباد ہے۔ ایک قبر اس کی بیوی رانی کی تھی اور دوسری قبر اس کی پانچ چھ سالہ بیٹی کی تھی جنھیں ستر اسّی سال قبل دفن کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ قبر پر گانا گا رہے تھے۔''

کہنے لگا۔ ''بہت یاد آ رہی تھی بس بے خودی میں دل سے آواز نکل گئی ورنہ میں کہاں اور یہ گانے کہاں۔''

میں اسے اپنے کیمپ لے آیا۔ ''چائے بنائی ناشتا کرایا۔ ہمارے ایک ساتھی کو واپس جانا تھا اس لیے جیپ اور دو آدمی واپس کراچی چلے گئے۔ اب میرے ساتھ دو افراد رہ گئے ایک سرفراز صاحب اور دوسرا ان کا بیٹا صلاح الدین۔ شنبے جانے والوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے اجازت چاہی، میں نے اسے شام کو دوبارہ آنے کو کہا۔

عجیب و غریب آدمی تھا۔ نہ اس نے کوئی لالچ دکھایا نہ بھوکوں کی طرح کھایا، نہ اور مانگا، نہ ہمارے ساتھ چپکنے کی کوشش کی۔ اکثر دیہاتی علاقوں کے لوگ ایسے نتھی ہوتے ہیں کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے میں نے کہا بھی کہ کچھ سالن ساتھ لے جاؤ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کی ضعیفی اور گفتگو اسے سو سالہ ظاہر کرتی تھیں۔ اسے خود معلوم نہیں کہ اس کی عمر کتنی ہے۔ اسے ایک جنگ یاد تھی جو پاکستان بننے سے پہلے ہوئی تھی۔

شام کو شنبے واپس آیا اپنے ساتھ کوئی بیس کلو کے قریب خربوزے لایا جو اس کی اپنی زمین کے تھے۔ رات ہو رہی تھی ہم تین آدمی تھے اور چوتھا شنبے تھا۔ میں تیتر پکانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''بابا جنگل کے لوگ ان کو کیسے پکاتے ہیں؟''

''لکڑیوں کا کوئلہ بناتے ہیں اور اس پر پکاتے ہیں۔''

''بابا تو پکا کر کھلاؤ نا، ہم تمہارے مہمان ہیں۔'' اس نے پکانا شروع کر دیا۔

''بابا صبح کیا ہوا تھا اتنے رو رہے تھے اور بیٹی کو کیا ہوا تھا اور کس کو اس کا خیال رکھنے کو کہہ رہے تھے؟''

''بیٹا، گھر کی باتیں ہیں۔ دل کی باتیں ہیں اندر کی باتیں ہیں۔ اندر اندر آہ میری موئل اندر اندر، ہائے، میری موئل کیا باتیں کرتی ہے تو اندر اندر اپنی ماں سے۔'' وہ بےخودی میں اندر اندر بول رہا تھا اور کبھی کبھی منہ سے ہائے نکل جاتی تھی۔

''بابا کون تھی یہ موئل۔''

''بیٹا زندگی گزر گئی، کبھی کسی نے نہیں پوچھا کہ مجھے کیا غم ہے۔ کسی کو بتایا بھی تو کسی نے پاگل، کسی نے مجنوں اور کسی نے کسی اور طرح مذاق اڑایا۔ چھوڑو بیٹا اس قصے کو لاؤ وہ موٹی لکڑیاں ادھر لگاؤ ان کے کوئلے پر ہی تو گوشت پکے گا۔''

اور وہ لکڑیاں پتھروں کے بنے چولہے میں لگانے میں لگ گیا۔

''بابا مجھے کچھ بتاؤ کہ یہ کیا معاملہ ہے آخر اتنا دکھ کیوں اکیلے اکیلے اٹھائے پھر رہے ہیں آپ۔''

''بیٹا یہ بہت پرانی بات ہے جب پاکستان بھی نہیں بنا تھا۔ رانو سے میری نسبت بچپن میں طے ہوئی تھی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ شادی ہو گئی۔ میں اپنے والد کی بڑھاپے کی اولاد تھا۔ میری شادی سے پہلے ہی میرے والدین اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ زمین کے بٹوارے کی وجہ سے گوٹھ میں سب کے ہوتے ہوئے ہم میاں بیوی کچھ تنہا سے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ میری بیٹی موئل پیدا ہوئی اس کی ماں رانو بس اس کی شکل دیکھ کر اسے پیار کر کے اسے سینے سے لگا کر اللہ میاں کے پاس چلی گئی۔ وہ اتنی چھوٹی عمر میں ماں بنی تھی کہ یہ بوجھ سنبھال نہ سکی۔ موئل کی خوبصورتی کی وجہ سے اسے سب لوگ موئل پری کہتے تھے۔ اب موئل کو گوٹھ کی دوسری خواتین نے اس طرح پالا کہ کوئی اسے چادر بکری کے دودھ میں بھگو کر منہ میں چسوا دیتی تو کوئی مٹی کے پیالے سے دودھ پلا دیتی۔ کوئی اسے بکری کے تھن سے لگا دیتی۔ چھوٹی بڑی لڑکیاں اسے دن بھر اٹھائے اٹھائے پھرتی تھیں۔ دھاتی برتن چمچے وغیرہ اس دور میں کسی نے گوٹھ میں نہیں دیکھے تھے۔''

''بابا کیا فیڈر نہیں لا سکتے تھے خرید کر۔'' صلاح الدین نے پوچھا۔

''بیٹا یہ بوتل شاید اس زمانے میں ولایت پائی جاتی ہوگی۔ مٹی کے برتنوں کا دور تھا۔ فیڈر یا بوتل کا نام کسی نے سنا ہی

نہیں تھا۔ پکانے کی ہانڈیاں مٹی کی اور لکڑی کی ڈوئیاں ہوتی تھیں۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ اب موتل ہر دم میرے ساتھ ساتھ بابا بابا کرتی پھرتی تھی۔ دن رات بس میرے ساتھ رہتی اور نا معلوم کتنے سوال کرتی۔'' شتے نے تیتر پلٹتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا وہ اپنی ماں کے بارے میں پوچھتی تھی کہ وہ کیسی تھی۔ اس مٹی سے باہر کیوں نہیں آتی۔ سب بچوں کی مائیں ان کو پیار کرتی ہیں، میری ماں میرے پاس کیوں نہیں آتی۔ میں جواب دیتے دیتے خود بھی رو پڑتا۔ ایک دن کہنے لگی کہ بابا مجھے بھی ادھر میری ماں کے پاس سلا دو۔ دونوں اندر اندر چپکے چپکے باتیں کریں گے۔ میں سوچتا کہ ماں کی محبت بھی کیا چیز ہے اس نے تو کبھی اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں۔ مجھے وہ اکثر قبرستان میں کھینچ لاتی۔ ایک دن کسی کے گھر سے ایک ہنڈیا میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لے آئی اور ان سے پیار کرنے لگی۔ کہتی تھی بابا مجھے تیرتی مچھلیاں بہت پسند ہیں۔ اکثر میرے ساتھ ندی پر جاتی اور تیرتی ہوئی مچھلیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔''

اتنے میں گیدڑوں کی آوازیں پہاڑیوں سے آنے لگیں۔ ہر طرف ان کی گونج تھی۔ ان آوازوں کو غور سے سن کر اس نے کہا۔ ''بیٹا اب یہ گیدڑ کھانے کے لیے نکل رہے ہیں۔ گیدڑوں کا معمول ہے کہ جب یہ کھانے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو سب اپنی کچھاروں سے باہر آ کر شور مچاتے ہیں اور اس کا جواب دور دور تک کے پہاڑوں سے دوسرے گیدڑ اسی انداز میں دیتے ہیں۔ خاموشی بتا رہی ہے کہ اب یہ شکار کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔''

''بابا آپ موتل کا بتا رہے تھے۔'' اسے کہانی کی جانب دوبارہ سے کھینچنے کے لیے میں نے کہا۔

''ہاں میں بتا رہا تھا کہ اس کے پیدا ہونے کے بعد سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ علاقے میں خشک سالی ایسی ہوئی کہ گھاس ختم، فصلیں تباہ اور زمینیں بنجر ہو گئیں۔ بھیڑ بکریاں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ ایک کوئی لڑائی یا جنگ بھی کہیں ہو رہی تھی۔ پہلے سردار کے آدمی کچھ جوانوں کو لے کر لشکر کے ساتھ پہاڑوں پر چلے گئے ان میں میرا اکلوتا بھائی بھی تھا جو پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ ان کے پیچھے کچھ فوجی آئے، وہ ہمارے مال مویشی لے گئے۔ گوٹھ میں پہلے ہی راشن نہیں تھا۔ لوگ سی پتوں کی جانب چلے گئے۔ وہاں کچھ پانی تھا۔ موتل نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ بس اپنی ماں کے پاس رہے گی۔ اب گوٹھ میں چند بوڑھے اور ہم دونوں رہ گئے۔ ایک دن موتل کو بخار ہوا۔ دیسی جڑی بوٹیوں اور ٹوٹکوں سے کام نہ بنا۔ شہر اس وقت یہاں سے چار دن کے فاصلے پر تھا۔ نہ کوئی سڑک تھی اور نہ کوئی گاڑی اس دور میں ہوتی تھی۔ پیدل سفر تھا یا اونٹ پر جاتے تھے۔ میرے پاس اونٹ تھا نہ پیسا۔ دو گائیں تھیں جن کو دانہ پانی بھی کئی ماہ سے پورا نہ ملا تھا۔ موتل اب شدید بخار میں تھی۔ مکئی کی چار روٹیاں ساتھ لیں، اسے کندھے پر ڈالا اور دونوں گایوں کو ہنکاتا ہوا شہر چل دیا کہ گائیں فروخت کر کے کسی ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔''

''بابا ٹیکسی کر لیتے۔'' صلاح الدین بولا۔

''بیٹا اس وقت تک کسی نے ٹیکسی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میری عمر بھی اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ میں نے تو اس وقت تک سائیکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں تو فوجیوں کی جیپیں دیکھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ موتل کو لے کر جنگل میں چھپ گیا اور اگلے دن واپس آیا۔ ایک دن کی مسافت کے بعد ایک گائے تو چل بسی۔ اسے راستے میں چھوڑا۔ بغیر رکے ایک رات اور دو دن چلتا رہا۔ اگلی آدھی رات کو کندھے پر موتل زور زور سے بابا بابا کہنے لگی اسے ہچکیاں لگیں، چھاگل سے پانی پلایا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ جنگل بیابان، اندھیرا آدم نہ آدم زاد، ایسے میں میری جان میری بیٹی موتل چل بسی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ اسی تگ و دو میں دوسری گائے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئی۔''

''ہیں بیٹی مر گئی جنگل میں اور آپ اکیلے تھے۔'' صلاح الدین نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا وہ مر گئی۔ اپنی پیاری کو پھر کندھے پر ڈالا اور واپسی شروع کی۔ اب اس کا بے جان جسم لیے چلتا جا رہا ہوں اور دعا کر رہا ہوں کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ چلتے چلتے صبح ہوئی۔ میرا ایک چچا زاد بھائی کسی سے میرا حال سن کر اونٹ لے کر میری تلاش میں آ رہا تھا۔ اس کے اونٹ پر باقی سفر طے کیا اور گوٹھ پہنچا۔ موتل کو اس کی معصوم آرزو کے تحت اس کی ماں رانو کے پہلو میں دفن کر دیا۔ اب وہ دونوں چپکے چپکے اندر اندر آپس میں باتیں کرتی ہوں گی۔ نا معلوم اس کا دل میرے بغیر وہاں کیسے لگتا ہوگا۔ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اس بات کو نا معلوم کتنے سال ہو گئے آج بھی اس کی آواز بابا بابا میرے کانوں میں تازہ معلوم ہوتی ہے۔ میری موتل دوا نہ ملنے کی وجہ سے مجھ سے جدا ہوئی تھی۔ میں نے طے کیا کہ اب اس گوٹھ کی کوئی موتل دوا نہ ملنے سے نہیں مرے گی۔''

''پھر کیا کیا آپ نے۔''

''بیٹا میں نے اپنی موتل کی قبر پر وعدہ کیا کہ اب کوئی موتل ایسے نہیں مرے گی۔ میں نے شہر جا کر فٹ پاتھ پر راتیں

گزار کر ایک کمپوڈر کی منتیں کر کے اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجھے کچھ دوائیں بتا دے جو بخار دست اور چھوٹی موٹی بیماریوں کی ہوں جو میں لے جا کر اپنی گوٹھ کے بچوں کو دے سکوں۔ وہ میرا جذبہ اور شوق دیکھ کر راضی ہو گیا اور مجھے ایک دفتر لے گیا۔ یہ کسی انجمن کا دفتر تھا۔ میری کہانی سن کر، میری مومل کی موت کا سن کر اس دفتر کے لوگوں کا دل بھر آیا۔ انہوں نے مجھے دو دن مہمان رکھا اس کے بعد ایک جیپ میں مجھے بٹھا کر دو ڈاکٹر ایک لیڈی ڈاکٹر اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ مجھے میری گوٹھ روانہ کیا۔ گوٹھ آ کر انہوں نے تمام افراد کو چیک کیا اور دوائیں دیں۔ مجھے کچھ دوائیں دے کر سمجھایا کہ بخار میں یہ دینا اور دستوں میں یہ گویا میں اپنی گوٹھ کے لوگوں کا ڈاکٹر بن گیا۔ ان لوگوں نے ہماری گوٹھ دیکھ لی اور ہماری مہمانداری بھی دیکھ لی۔ اب وہ مہینے میں دو مرتبہ گوٹھ کا چکر لگا لیتے اور مریضوں کو دیکھ لیتے۔ میں نے ایک سائیکل خرید لی کہ جس کی طبیعت خراب ہو اس کو اس پر بٹھا کر شہر لے جاؤں۔ جب کوئی بیمار ہوتا میں اسے سائیکل پر بٹھا کر شہر لے جاتا۔ یہ سائیکل اس دور کی ایمبولینس تھی اور اس نے کوئی بیس سال مریضوں کو شہر پہنچایا۔ میں نے کسی کو اپنی مومل کی طرح جنگل میں نہیں مرنے دیا۔ ویسے بھی ہم بلوچوں کی ساری بیماریاں بس قحط کے دنوں میں ہوتی ہیں جب غذا اور پانی نہ ہو۔ جب بارشیں ہوتی ہیں تو فصلیں مال مویشی دودھ گھاس چارا سب کچھ ہوتا ہے اور کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ اور قحط اس دور میں کچھ کم ہی آتا تھا۔"

"یہاں سے کراچی سائیکل پر جاتے تھے۔ اتنی دور؟"

"ہاں بیٹا لوگ پیدل بھی جاتے تھے اور اونٹوں پر بھی جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ حالات بدلے۔ علاقے میں کچھ نئے لوگ آنے شروع ہوئے۔ اس انجمن پر پابندی لگ گئی۔ ڈاکٹر آنے بند ہو گئے۔ ایک نئی بستی بستی نظر آئی۔ کچھ لوگوں کو وہاں روزگار ملا۔ گاڑیاں، مشینیں، مکانات موٹر سائیکلیں نظر آئیں۔ یہ سب ہم لوگوں کے لیے نیا اور عجیب تھا۔ ایک روز سردار نے جرگہ کیا اور حکم دیا کہ یہاں ایک ڈیم بن رہا ہے۔ آپ کی زمینیں پانی میں ڈوب جائیں گی۔ یہاں سے آپ لوگوں کو جانا ہے۔ اس کے بعد موجودہ شنبے گوٹھ میں ہمیں لا کر آباد کر دیا۔ اس سے پہلے بھی ہماری گوٹھ کا نام یہی تھا۔ وہ وہاں آباد تھی۔" اس نے ڈیم میں ایک پہاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ "جب ڈیم بننے لگا۔ وہاں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بن گئی اور ہماری گوٹھ کے مریضوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔ سڑک بننے اور گاڑیوں کے آنے جانے سے اب کوئی مومل بے یار و مددگار نہیں مرتی۔ میں بھی بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ زمینداری سے فارغ ہوتا تو مومل اور رانی کی قبر پر چلا جاتا تھا۔ جب ڈیم بن گیا۔ ایک روز طوفانی بارش ہوئی اور ڈیم بھر گیا۔ جاڑو کا قبرستان زیر آب آ گیا۔ میری مومل کو پانی میں تیرتی مچھلیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ اب قیامت تک کے لیے اس کی دونوں خواہشات پوری ہوتی رہیں گی۔ ماں سے اندر اندر چپکے چپکے باتیں کرنا اور تیرتی مچھلیاں دیکھ کر خوش ہونا۔ آج سے پندرہ سال پہلے یہ قبریں خشک سالی میں نظر آئی تھیں یا اب نظر آئی ہیں۔ لیکن میں ان کو بھولا نہیں۔ ان پر کچھ کیچڑ تو آ گئی لیکن شناخت ہو گئی۔ اب میری زندگی میں تو دوبارہ نظر آنا مشکل ہے۔" اس نے آنسو پونچھے پھر کہا۔ "خوشبو بتا رہی ہے کہ تیتر تیار ہو گئے ہیں۔"

"چلیں بابا کھانا کھا لیتے ہیں۔"

اس کے بعد ہم نے کوئی رات بارہ بجے کے بعد کوئلے کے پکے تیتر کھائے۔ شنبے نے بہت مزیدار پکائے تھے۔ رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سرفراز نے ان کی عمر پوچھی تو کہا "میں نہیں جانتا کہ میری عمر کیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ جرمن کی جنگ کے وقت میری شادی ہوئی تھی۔"

"آجکل آپ کیا کرتے ہیں۔"

"کچھ زمین ہے جسے بٹائی پر دیا ہوا ہے۔ اللہ اللہ کرتا ہوں۔ خدا نے زندگی میں ایک بار پھر اتنے سال بعد مومل اور رانی کی قبریں دکھا دیں۔ اپنے ہاتھ سے ان کی مرمت کر دی۔ اتنے قریب سے ان سے باتیں کر لیں۔ فاتحہ خوانی روز کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ میری مومل اور رانی اسی طرح باتیں کرتی رہیں اندر اندر چپکے چپکے اور جب پانی آ جائے تو میری مومل مچھلیوں کو تیرتا دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہے۔ ایک خواہش ہے کہ بارشوں سے پہلے اگر اللہ مجھے بھی اپنے پاس بلا لے تو میں بھی اپنی مومل اور رانی کے ساتھ اندر اندر چپکے چپکے باتیں کرتا رہوں۔"

تیتر کھلا کر شنبے اپنی مومل کی جانب چلا گیا۔ صبح صبح جیپ آ گئی اور ہم وہاں سے چل دیے۔

دس سال ان باتوں کو گزر گئے نامعلوم شنبے کی آرزو پوری ہوئی یا نہیں۔ لیکن اس کی محبت اپنی بیٹی سے لازوال ہے۔ مجھے یہ سوچ کر جھرجھری آ جاتی ہے کہ آدھی رات کو جنگل میں اکیلے اپنی بیٹی کو چھاگل سے پانی پلانا اور پھر اس کی لاش کو چھپا کے واپس آنا کیسا المیہ ہے۔ پھر اس کا ردِعمل کہ آئندہ ایسا نہ ہو کسی دوسری بیٹی کے ساتھ۔ واقعی شنبے سلام ہے تمہاری اس محبت کو۔

یہ کون بولا

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
میں ایک ایسا واقعہ بھیج رہا ہوں جس کی تشہیر ضروری ہے۔ لوگ نادانستگی اورکم علمی میں ان باتوں کو جنات کی کارستانی سمجھنے لگتے ہیں۔ سرگزشت میں معلومات کو اہمیت دی جاتی ہے اسی لیے یہ واقعہ سرگزشت کے لیے لکھا ہے۔

فرمان علی
(کراچی)

بہت خوب صورت بہت پیاری آواز تھی۔ ”کہاں جارہے ہو۔ کسی جگہ بیٹھ جاؤ۔“
میں نے یہ آواز راہ چلتے ہوئے سنی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کسی لڑکی کی اتنی خوب صورت اور میٹھی آواز نہیں سنی ہوگی۔ جیسی وہ آواز تھی۔
میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے اردگرد لوگ چل رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت میں ایک فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں لیکن کوئی بھی ایسی نہیں تھی جس نے خاص طور پر مجھے مخاطب کیا ہو اور وہ بھی میرے اتنے قریب آکر۔
وہ جو بھی تھی میرے قریب سے بولتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ”کہاں جارہے ہو؟ کسی جگہ بیٹھ جاؤ۔“
ہوسکتا تھا کہ یہ میرا واہمہ ہو۔ واہمے بھی تو ہزاروں طرح کے ہوتے ہیں۔ میں اپنے سر کو جھٹک کر آگے بڑھ گیا اور وہ

آواز پھر آئی۔ ”سامنے پارک ہے۔ وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔“

وہی میٹھی سریلی آواز۔ وہ آواز میرے ذہن میں گونج رہی تھی جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو۔ بہت ہی قریب سے بہت ہی پیار کے ساتھ۔ اس نے کہا تھا کہ میں سامنے والے پارک میں جاکر بیٹھ جاؤں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ آواز میرے قریب سے گزرتی ہوئی کسی عورت یا کسی لڑکی کی نہیں تھی بلکہ کچھ اور ہی تھا۔

خدا جانے کیا چکر تھا۔ یہ کیسی آواز تھی۔ کیا وہ کسی اور کو بھی سنائی دے رہی تھی یا صرف مجھے آرہی تھی۔ میں نے ارد گرد کے لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب لوگ اپنے نارمل انداز میں چلے جارہے تھے۔ کسی کے چہرے پر حیرت یا پریشانی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ورنہ وہ بھی میری طرح ٹھٹک کر رک جاتے۔

میں نے ایک بار پھر اپنے سر کو جھٹکا دیا اور لاحول پڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ میں ہرگز کوئی وہمی انسان نہیں ہوں لیکن میں جو کچھ سن رہا تھا وہ میرا وہم نہیں تھا۔

اتنی حقیقی آواز کسی وہم کی تو نہیں ہوسکتی۔ کچھ دور تک خاموشی رہی۔ جیسے سر کو جھٹکا دینے اور لاحول پڑھ کر آگے بڑھ جانے کے بعد آواز کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کچھ دیر کے بعد پھر وہی آواز آئی۔

”کیوں ضد کررہے ہو، جاؤ پارک میں جاکر بیٹھ جاؤ ورنہ بہت نقصان میں رہو گے۔“

یہ دھمکی تھی یا انتباہ تھا۔ کیا تھا؟ لیکن اس بار میں واقعی خوفزدہ ہوگیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں آگے بڑھتا جاؤں یا اس آواز کی ہدایت پر عمل کروں۔ جو مجھ سے یہ کہہ رہی تھی کہ میں پارک میں جاکر بیٹھ جاؤں۔ لیکن کیوں وہ آواز مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

اگر یہ کسی قسم کا شیطانی سلسلہ تھا تو مجھے اس آواز کی ہدایت پر عمل نہیں کرنا تھا۔ لہٰذا میں نے جلدی جلدی کچھ آیات وغیرہ پڑھیں اور اپنے قدم تیز کردیے اور ابھی میں چند قدم چلا ہوں گا کہ اچانک بھگدڑ شروع ہوگئی۔

کسی طرف سے فائرنگ کی زوردار آوازیں آنے لگیں۔ جیسے دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہو۔ اس قسم کے واقعات تو اس شہر کا معمول بنتے جارہے تھے۔

میں بہت بری طرح پھنس گیا۔ گاڑیاں جیسے ایک دوسرے کے اوپر سوار ہوئی جارہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ عورتیں مرد اور بچے، چیختے چلاتے ہوئے ایک ایسی افراتفری کا عالم تھا جو بیان نہیں ہوسکتا۔

میں نے بھی ایک طرف دوڑ لگادی۔ اس وقت ذہن میں یہ بات بالکل فراموش ہوگئی تھی کہ وہ آواز مجھے کیوں آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔

سامنے ایک گلی تھی۔ لوگ اس گلی میں بھی بھاگ رہے تھے لیکن کم از کم اتنا تھا کہ اس گلی میں گاڑیاں نہیں تھیں۔ البتہ موٹر سائیکل والے اِدھر اُدھر سے سمٹ کر اس گلی میں داخل ہورہے تھے۔

اس وقت انہیں جان بچانی مشکل ہورہی تھی۔ اس گلی میں مکانات تو تھے لیکن لوگوں نے دروازے بند کررکھے تھے۔ ظاہر ہے اب حالات ایسے ہوں تو پھر دروازہ کون کھولتا ہے۔

میں اس گلی میں اکیلا نہیں تھا اور بھی لوگ تھے۔ کیونکہ گولیاں چلنے کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوسکا تھا۔

اس گلی کے خاتمے کے بعد ایک سڑک تھی۔ اس سڑک تک آنے تک کچھ سکون ہوا تھا۔ لوگوں نے دوڑنے اور بھاگنے کی رفتار بھی کم کردی تھی۔

میں نے بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خود کو سنبھال لیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ ایک خالی رکشا مل گیا۔ حالانکہ اس نے پیسے زیادہ لیے تھے لیکن مجبوری ایسی تھی کہ رکشا کرنا ہی پڑا۔

اپنے فلیٹ پر پہنچ کر میں بہت دیر تک اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

پھر اچانک وہی آواز میرے ذہن میں گونجنے والی سریلی اور دلکش آواز۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ پارک میں بیٹھ جاؤ۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔ دیکھ لیا نا کیا ہوا۔ بچ کر آگئے ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔“

میرے خدا اب وہ آواز میرا وہم تو ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ میں بہت واضح طور پر سن رہا تھا۔ کون تھی یہ؟ میرے ہی دماغ میں کیوں گونج رہی تھی۔

بے شمار کہانیاں یاد آنے لگیں۔ ایسی کہانیاں جن میں اس قسم کی کوئی نادیدہ مخلوق کسی کے پیچھے پڑجاتی ہے۔

تو کیا میں بھی کسی نادیدہ مخلوق کے چکر میں پھنس گیا تھا لیکن کیوں؟ سنا ہے کہ ایسی چیزوں کے چکر میں وہی لوگ آتے ہیں جو ایسی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن میں تو ایسی باتوں کو مانتا ہی نہیں تھا۔ شاید یہ سب مجھے یہ باور کرانے کے لیے ہورہا ہے کہ تم چاہے مانو یا نہ مانو۔ ہم اپنے وجود کا احساس

ولا کر رہیں گے۔

کیا کروں میں؟ وہ آواز مجھ سے مخاطب ہوتی تھی۔ تو کیا میں اس کی باتوں کا جواب دینا شروع کردوں یا بالکل خاموش ہو جاؤں۔

کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار میں نہ کروں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ نظر انداز کیسے کیا جاسکتا تھا۔ کوئی اچانک آپ کے کان میں آکر سرگوشی کرنے لگے تو آپ اسے کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں۔

میں ساری رات بے چین رہا۔ ٹی وی کی خبریں یہ تھیں کہ دو گروہوں میں اچانک جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ دو آدمی ہلاک اور سترہ اٹھارہ کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔

شاید میں بھی ان مرنے والوں یا زخمیوں میں شامل ہو سکتا تھا لیکن عین وقت پر مجھے وہ گلی دکھائی دے گئی تھی جس سے گزرتا ہوا میں سڑک تک آیا تھا۔

اس رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے پھر وہ آواز نہیں سنی یہ اور بات ہے کہ میری ساری رات اسی بے چینی میں گزر گئی ہو۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

دوسرا دن بھی نارمل تھا۔ یعنی پورا دن خاموشی رہی تھی۔ کوئی آواز نہیں۔ کوئی سرگوشی نہیں۔

پھر دو دن اور گزر گئے۔ میں اب ذہنی طور پر نارمل ہو چلا تھا۔ شاید وہ میرا وہم ہی ہوگا۔ وہم تو اسی طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ پریشان کردینے والے۔ خوفزدہ کردینے والے۔

دو تین دنوں کے بعد اچانک پھر وہی آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ میں اس وقت اپنے فلیٹ ہی پر تھا اور ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا کہ اس آواز نے مجھے پھر خوف زدہ اور ڈسٹرب کردیا۔

وہ آواز کہہ رہی تھی۔ ”کیوں خوش ہوگئے نا کہ میری آواز نہیں سنائی دے رہی ہے لیکن اب تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہوں۔“

اور اس بار میں خوف زدہ تو ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی پھٹ بھی پڑا۔ ”کون ہو تم؟ کیوں مجھے پریشان کرکے رکھا ہوا ہے۔ کیا چاہتی ہو؟“

”اوہو، اتنا غصہ!“ وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بھی اس کی آواز کی طرح دلکش اور سریلی تھی۔ ”جب میں اتنی آہستگی سے بات کررہی ہوں تو تم بھی اسی طرح کرو تم چیخ کیوں رہے ہو۔“

”اس لیے چیخ رہا ہوں کہ میں پاگل ہوتا جارہا ہوں۔“

”اوں ہوں، میں تمہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی۔“ اس آواز نے کہا۔

”خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔“

”میں بھی تو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی۔“ اس آواز نے کہا۔ ”تمہارا ساتھ دے رہی ہوں۔ تمہاری تنہائی دور کررہی ہوں۔ تم سے ہمدردی کررہی ہوں تم بلاوجہ مجھے اپنا دشمن سمجھ رہے ہو۔“

”لیکن تم ہو کون!“ میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”اوہو! تم نے تو ایک بار میں کئی سوال کردیے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں خوشبو ہوں ہوا کا جھونکا ہوں۔ تمہاری دوست ہوں۔ ایک لڑکی ہوں اور وہ بھی اتنی خوب صورت کہ مجھ کو دیکھ کر تمہاری سانسیں رک جائیں گی۔“

”سانسیں تو اب بھی رکنے لگی ہیں۔“ میں زچ ہوکر بولا۔ ”تم تو مجھے پاگل کیے جارہی ہو۔“

”سنتے رہو تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہیں دکھائی دے سکتی ہوں۔ تمہارے قریب آسکتی ہوں تم مجھے دیکھ سکتے ہو بلکہ چھو بھی سکتے ہو۔ لیکن ابھی نہیں۔“

”تو پھر کب آؤگی میرے سامنے؟“

”میں تمہیں بتادوں گی۔ پہلے تمہیں احساس تو ہو کہ میں تمہارے لیے کتنی ضروری ہوں۔“

”احساس ہونے لگا ہے مجھے۔“

وہ ہنس پڑی۔ کیا خوب صورت ہنسی تھی۔ جیسے دور تک گھنٹیاں بجتی چلی گئی ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی کھنکتی ہوئی ہنسی نہیں سنی تھی۔

میں نے اس سے اس طرح باتیں کی تھیں جیسے کوئی سامنے بیٹھا ہوا ہو اور آپ اس سے باتیں کیے جارہے ہوں۔ مجھے تو بدک جانا چاہیے تھا۔ خوفزدہ ہوکر چیخنے لگنا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

بلکہ اس کے بعد جب دو دنوں تک وہ آواز سنائی نہیں دی تو میں واقعی بے چین ہوگیا تھا۔ ایسا لگا جیسے میں نے کوئی چیز گم کردی ہو۔ میرے اندر کوئی کمی ہوگئی ہو۔

ایک صبح میرا ایک دوست انور میرے فلیٹ پر آگیا۔ اس کی آمد غیر متوقع تھی کیونکہ وہ عام طور پر شام کے وقت آیا کرتا تھا لیکن اس صبح وہ سات آٹھ بجے کے درمیان نازل ہو

گیا تھا۔

اس کو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی ہوئی تھی۔ ''یار پہلے یہ بتاؤ سب خیریت ہے نا۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیونکہ تمہارا اس وقت آنا مجھے پریشان کر گیا ہے۔''

''ہاں ہاں سب خیریت ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تو پھر بیٹھ جاؤ میں چائے لے کر آتا ہوں۔''

''ویسے میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ابے جب سب خیریت ہے تو پھر کس بات کی جلدی ہے۔ چائے پینے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔''

میں نے کچن میں آکر چائے تیار کی۔ اس کو ایک پیالی دینے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ہاں اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟''

''یار یہ معاملہ میرا نہیں تمہارا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''پہلے تم یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے جسمانی اور ذہنی طور پر۔''

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ دو چار دن پہلے میں نے راستے میں تمہاری عجیب حرکتیں دیکھی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''مجھے حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کیسی حرکتیں۔''

''یار بولتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں یار، بتاؤ کیا دیکھا ہے تم نے۔''

''یار تم اپنے آپ سے اس طرح باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے۔ جیسے کوئی تم سے مخاطب ہو۔''

''اوہ......وہ۔'' میں ہنس پڑا۔ ''میں اس وقت ہینڈ فری موبائل پر باتیں کررہا تھا۔'' میں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''نہیں میرے دوست۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میں چونکہ بہت قریب سے تمہیں دیکھتا آرہا تھا۔ اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اس وقت موبائل پر بات نہیں کررہے تھے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا کروں۔ کیا چھپا جاؤں یا اسے بتادوں کہ میرے ساتھ کیا کہانی ہورہی ہے۔ پھر میں نے اسے بتادینا ہی مناسب سمجھا۔

وہ میرا دوست تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس کے پاس میری اس الجھن کا کوئی حل ہو۔ کسی نہ کسی کو تو اس راز میں شامل کرنا ہی تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرے پاس کوئی موبائل نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا ہوا تھا تمہیں؟ کیا دماغ چل گیا تھا۔''

''ہاں یار تم اسے دماغ چلنا ہی کہہ سکتے ہو۔'' میں نے اسے پھر ساری بات بتائی کہ کس طرح میرے دماغ میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ لڑکی مجھ سے کس طرح باتیں کیا کرتی ہے۔

''اوخدا۔'' وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ ''تم کسی آسیبی چکر میں پڑ گئے ہو۔ میں نے اس قسم کا ایک اور واقعہ بھی دیکھا ہے۔ میری ایک رشتے دار لڑکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہورہا تھا۔ پھر میرے بابا کے دوست نصیر صاحب نے اس کا علاج کیا۔''

''کیا اس علاج سے وہ لڑکی ٹھیک ہوگئی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''یار! وہ کچھ دنوں کے لیے ٹھیک ہوگئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ آوازیں آنی بند ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ شدید حملہ شروع ہوگیا۔ وہ بتاتی تھی کہ وہ آواز کہہ رہی ہے کہ تم سو جاؤ۔ مر جاؤ۔ مر جاؤ اور ایک دن اس نے چھت سے کود کر جان دے دی۔''

''بھائی۔ یہ تو بہت خطرناک صورت حال ہوئی۔'' میں خوف سے کانپ گیا تھا۔ ''اب بتاؤ کیا کروں۔''

''ظاہر ہے۔ یہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہورہا ہے۔ یہ کسی حکیم ڈاکٹر کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کے لیے تم کو کسی عامل سے رجوع کرنا ہوگا۔ تمہارے لیے پڑھائی وغیرہ ہوگی۔ تب جاکر ٹھیک ہوجاؤ گے۔''

''یار! میں تو کسی عامل کو جانتا نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے اس آواز نے مجھے ابھی تک کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے لیکن کیا بھروسا! تم بتارہے ہو کہ اس لڑکی کو اس آواز نے کہا تھا کہ وہ اپنی جان دے دے اور وہ چھت سے کود کر مر گئی۔''

''ہاں یار! اس بے چاری کے ساتھ تو ایسا ہی ہوا تھا۔ جوان لڑکی تھی اور کیسی موت ہوئی۔''

''جان! میں اس طرح نہیں مرنا چاہتا۔'' میں نے کہا۔

"وہ آواز لاکھ دلکش اور سریلی سہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کل میرا بھی وہی حشر ہو۔ اس سے پیچھا چھڑوادو لے چلو مجھے کسی بابا کے پاس۔"

"میری جان پہچان کے تو وہی نصیر صاحب ہیں جنہوں نے اس لڑکی پر دم کیا تھا۔"

"تو پھر ان ہی کے پاس لے چلو۔"

یہ طے پا گیا کہ وہ مجھے دوسرے دن اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اس آواز کی دو تین دنوں کی غیر حاضری ہوگئی تھی لیکن اس رات وہ پھر میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ اس بار اس کے تیور کچھ مختلف تھے۔ ویسے تو وہ بہت نرم اور دھیمے لہجے میں باتیں کیا کرتی تھی۔

"یہ تم میرے خلاف کیا کرتے پھر رہے ہو۔" وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ "اب میں تمہیں سزا دوں گی۔ سزا دوں گی۔ تم نے میرے لیے سازش کی ہے۔"

"نہیں۔" میں بول پڑا۔ "میں نے کوئی سازش نہیں کی۔ تم جاؤ یہاں سے تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔"

"اب تو ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔" وہ آواز ہنس رہی تھی۔ "اب تو تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔ میری ہر بات۔"

"نہیں کبھی نہیں۔" میں نے اپنے دونوں کان بند کرلیے لیکن اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا وہ آواز تو میرے دماغ میں گونجتی تھی۔ وہ باہر سے آنے والی آواز کہاں تھی جو کان بند کرلینے سے سنائی نہیں دیتی۔ وہ سنائی دے رہی تھی۔ پہلے کی طرح۔

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی ہمیشہ ہمیشہ۔ جب تم مر جاؤ گے تب میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہارا مرنا ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے۔"

"نہیں نہیں میں نہیں مروں گا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ نہیں مروں گا میں، نہیں مروں گا۔" میں اپنے دونوں کان بند کرتے ہوئے اپنے سر کو زور زور سے جھٹک کر پاگلوں کی طرح شور کیے جا رہا تھا۔

وہ رات بہت ہی بھیانک تھی جو اس طرح گزر گئی۔ صبح کے وقت وہ آواز خاموش ہوگئی تھی اور مجھے نیند بھی آگئی تھی۔

اس دن میں دفتر نہیں جاسکا تھا۔ دن بھر سویا ہی رہا تھا۔ شام ہوتے ہی میں اپنے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ اس کو جب میں نے رات کی صورتِ حال بتائی تو وہ بہت سنجیدہ اور پریشان ہوگیا تھا۔ "یار اب وہ بلا کھل کر تمہارے سامنے آگئی ہے۔ اس نے ظاہر کردیا ہے کہ وہ تمہاری دوست نہیں ہے۔ دشمن ہے۔"

"خدا کے لیے اس عذاب سے میری جان چھڑواؤ۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یا تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا اس کے آگے سرینڈر کرکے ہمیشہ کے لیے اس کا غلام بن جاؤں گا۔ وہ جو بھی کہتی رہے گی وہ مجھے کرنا ہوگا۔"

"پریشان نہ ہو۔" میرے دوست نے مجھے تسلی دی۔ "ہم ابھی نصیر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد ہم نصیر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ پچاس اور ساٹھ کے درمیان کے تھے۔ ایک چھوٹا سا آستانہ بھی تھا۔

اس کمرے میں دو تین لوگ پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ میرا دوست مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ نصیر صاحب نے میرے دوست اور اس کے والد کی خیریت معلوم کرنے کے بعد سوال کیا۔ "ہاں تو یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"انکل! یہ میرے دوست ہیں۔ فرمان علی ان کے ساتھ بھی وہی پرابلم ہے جو اس لڑکی کے ساتھ تھی۔"

"اوہو۔" نصیر صاحب اب میری طرف متوجہ ہوگئے۔ "تم بتاؤ کیا محسوس ہوتا ہے اور اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے۔"

میں نے ان کو ساری تفصیل بتا دی۔ یہ سب سن کر نصیر صاحب سوچ میں پڑ گئے تھے۔ "بہت عجیب سی بات ہے۔" وہ بڑبڑائے۔ "پچھلے چھ ہفتے سے اب تک چار آدمی آچکے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔"

"جناب کیا ہے... یہ سب۔" میں نے پوچھا۔ "وہ آواز کیا چاہتی ہے مجھ سے۔"

"یہ بہت سیدھا سا لیکن پیچیدہ سوال ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔" نصیر صاحب نے کہا۔ "جس وقت پہلی بار اس لڑکی کا کیس میرے سامنے آیا تو میرے ذہن میں یہی بات آئی کہ اس کے ذہن پر کسی بلا نے اپنا قبضہ کرلیا ہے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ایسا بہت ہوتا ہے۔ انجان طاقتیں انسان کے ذہن پر قابو کرکے اسے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ میں نے یہی سوچ کر وظیفوں وغیرہ کے ذریعے اس کا علاج شروع کردیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا یا تو وہ بلا بہت طاقت ور تھی یا معاملہ کچھ اور تھا۔ اس کے بعد اور کئی لوگ میرے سامنے آئے اور

اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کوئی بلا وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہ کہانی کچھ اور ہے۔"

"انکل یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میرے دوست نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہاں میاں کیونکہ میں ان میں سے تو نہیں ہوں جو لوگوں کو وہم میں ڈال کر تعویذ گنڈے کرتا رہوں۔" نصیر صاحب نے کہا۔ "میں اپنے علم اور اپنے تجربے کی حد تک دعاؤں وغیرہ سے کام لینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جب مرض کا علاج ہی دوا ہو تو بہتری اس میں ہوتی ہے کہ باقاعدہ علاج کیا جائے۔"

نصیر صاحب کی یہ صاف گوئی بہت اچھی لگی تھی، ورنہ وہ بھی وظیفے وغیرہ کے چکر میں الجھا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک راستہ دکھا دیا تھا جو راستہ باقاعدہ علاج کا تھا۔

ہم دونوں ان کا شکریہ ادا کرکے واپس آگئے۔

"اب تمہارا کیا خیال ہے۔" میرے دوست نے پوچھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے نصیر صاحب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک کھرے انسان ہیں۔ انہوں نے جنوں اور آسیبوں کا چکر نہیں چلایا۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اس پرابلم کا حل باقاعدہ علاج سے ہو۔"

"تو پھر کس سے علاج کراؤ گے؟"

"میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کوئی بھی اچھا سایئکاٹرسٹ مل جائے تو اس کے پاس چلا جاؤں گا۔"

پھر وہ رات میرے لیے بہت عذاب کی تھی۔

ساری رات وہ آواز مجھ سے جھگڑا کرتی رہی تھی وہ کہہ رہی تھی۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح کسی عامل یا ڈاکٹر کے پاس جاکر مجھ سے پیچھا چھڑالوگے۔"

"ہاں، چھڑالوں گا پیچھا۔" میں بھی اس کا جواب دیے جارہا تھا۔ "تم چاہے کوئی بھی ہو۔ میں تم کو اپنے دماغ سے جھٹک کر رہوں گا۔"

"میں ماردوں گی تمہیں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" میں باقاعدہ جیسے لڑائی کررہا تھا۔ "میں بھی دیکھ لوں گا تمہیں۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ شاید اس پُراسرار آواز نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ میں اس سے نجات کی جدوجہد کررہا ہوں۔

خاموشی لیکن میں جاگتا رہا۔ سو ہی نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے کس وقت ذہن میں دھماکے ہونے لگیں۔

وہ آواز کس وقت پلٹ آئے۔

دوسرے دن میں نے دفتر سے آف کیا اور ایک سایئکاٹرسٹ کے پاس پہنچ گیا۔ میں چونکہ ایک اکیلا انسان تھا اس لیے یہ سب کچھ خود مجھ ہی کو کرنا تھا۔

سایئکاٹرسٹ کو میں نے اپنی ساری کیفیت بتاتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب مجھے اس بلا سے نجات دلوادیں۔"

"بلا!" ڈاکٹر مسکرادیا۔ "مسٹر یہ کوئی باہر کی بلا نہیں ہے بلکہ آپ خود ہی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ بہت عام سی بات ہے۔" اس نے بتایا۔ "دماغ میں کچھ کیمیکل غیر متوازن ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ آپ پہلی بار جب یہ غیبی آواز سنتے ہو تو اس کا جواب دیتے ہیں پھر اس جواب کا جواب خود اپنے ذہن میں تیار کرلیتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔"

"لیکن یہ ہے کیا؟"

"اسے ہم شیزوفرینیا کہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "ہم آپ کو کچھ دوائی دیں گے۔ آپ وہ استعمال کریں دماغ کا غیر معمولی کیمیکل ایکشن ختم ہوجائے گا۔"

"کمال ہے۔ میں تو اسے آسیب یا بلا سمجھ رہا تھا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو دوائی لکھ کر دے رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے دوائی لکھ کر دے دیں۔

اس ڈاکٹر کے پاس مجھے صرف دو بار جانا پڑا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک میں بالکل صحت مند ہوں۔ وہ آوازیں غائب ہوچکی ہیں۔

اور اس کہانی کو تحریر کرنے کا موقع ہی یہی ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ اگر وہ خود یا آس پاس کوئی شخص اس قسم کی کسی کیفیت سے دوچار ہو تو اسے کسی پری یا آسیب وغیرہ کی کارستانی نہ سمجھیں بلکہ کسی ماہر سایئکاٹرسٹ سے رجوع کرلیں۔

اس مشینی عہد نے جہاں ہمیں بہت سی نعمتیں دی ہیں۔ وہیں اس نے بے شمار ذہنی امراض میں بھی مبتلا کر رکھا ہے۔ "شیزوفرینیا" ان میں سے ایک ہے۔

آتش گزیدہ

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ سرگزشت کے لیے میری پہلی کاوش ہے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑے حادثے کو جنم دیتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد نے کیا خواب دیکھا اور اسے کیسی تعبیر ملی۔

سید شکیل حسنین کاظمی
(اسلام آباد)
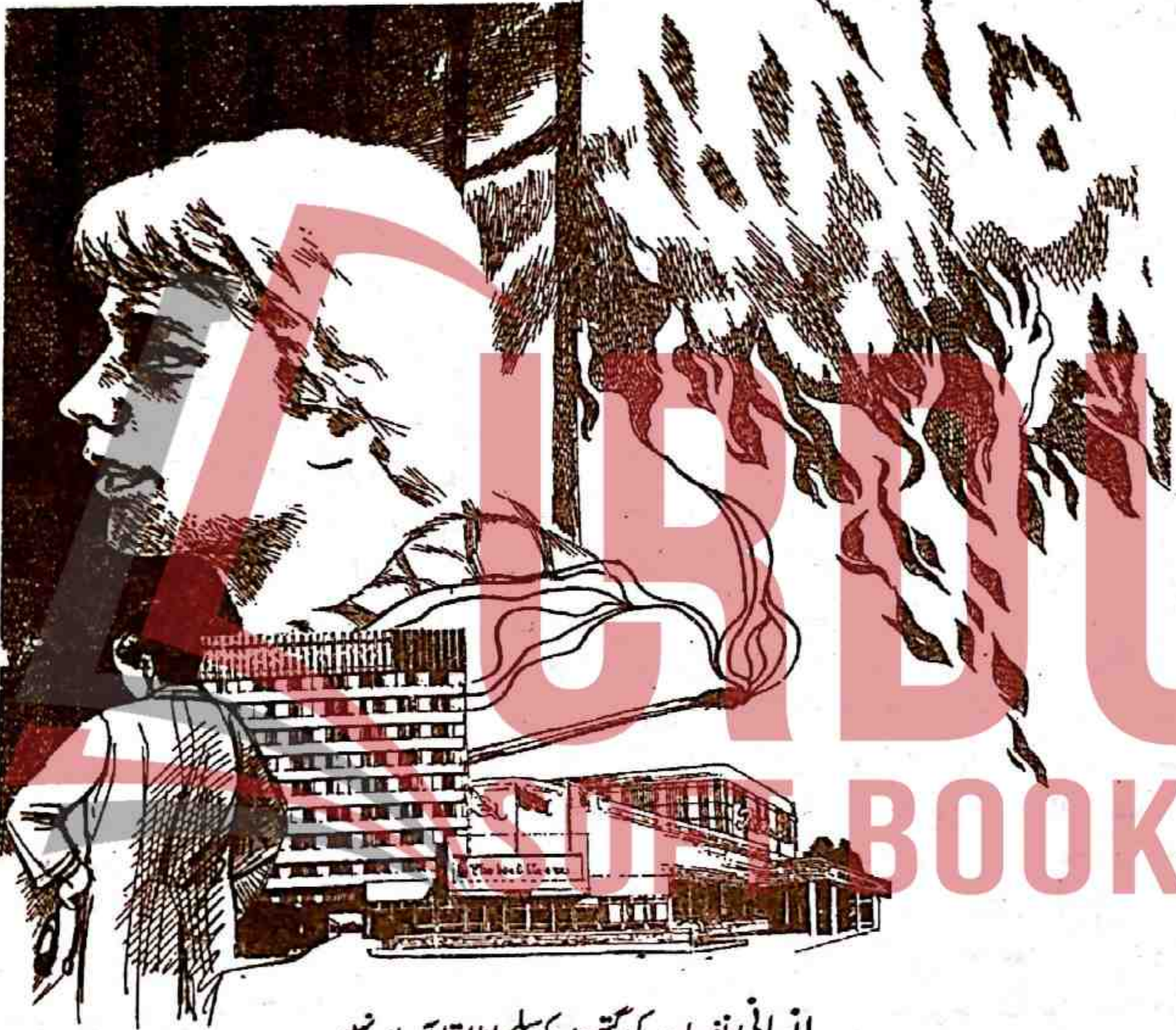
انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانا اتنا آسان نہیں، میں.... لکھنے لکھانے کے شوق میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملا ہوں جو ایک پہیلی کی طرح گنجلک ثابت ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک شخص صغیر احمد بھل تھا، میرے علم میں اس کی کہانی نفسیاتی اسپتال سے آئی۔

اسپتال کی بہت زور و شور سے صفائی ہو رہی تھی۔ ہر کمرا اور اسپتال کا سنگی ٹائلوں سے مزین فرش تیزاب ملے پانی سے دھویا جا رہا تھا جس کی وجہ سے فضا میں ڈیٹول اور

تیزاب کی تیز بو رچ گئی تھی۔ یہ شہر کا سب سے مشہور نفسیاتی اور جسمانی امراض کا اسپتال تھا۔ یہاں سینکڑوں مریض علاج کی غرض سے داخل تھے اور کچھ لوگ تو سالوں سے یہاں رہ رہے تھے۔ یہ وہ افراد تھے جن کی ذہنی و جسمانی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ عام اور صحت مند معاشرے کا حصہ بن سکیں۔

اس مقصد کے لیے کچھ خصوصی بیرک تہ خانے میں بنائے گئے تھے جہاں طویل مدت رہنے والے مریضوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کا مقصد ان کو باقی نارمل مریضوں اور ان کے ساتھ آنے والے لوگوں سے دور رکھنا تھا۔ وہاں کی سیکیورٹی اور ڈاکٹر بھی خصوصی طور پر تربیت یافتہ تھے۔ اس سیکشن میں کام کرنے والے تمام افراد باقی اسپتال سے زیادہ تربیت یافتہ اور کوالیفائیڈ تھے۔ یہاں ہر روز تین وقت صفائی ہوتی تھی اور جگہ جگہ وارننگ سائن اور بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ایمرجنسی صورتِ حال سے ابتدائی طور پر نمٹنے کے لیے تمام لوازمات موجود تھے۔ پورے فرش پر جابجا فلور مارکنگ ہوئی تھی۔ حفاظتی آلات کی جگہ جگہ تنصیب نے اسے صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی طرز کا اسپتال بنا دیا تھا۔

لیکن آج کی صفائی کا مقصد یہاں آنے والی ایک مشہور سیاسی شخصیت کی آمد تھی۔ عام طور پر باقی تمام اسپتال میں صفائی دن میں ایک بار ہوتی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر...... ورنہ اس بات کی کوئی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ دفاتر اور ریسپشن ایریا ہی سب سے زیادہ صاف ستھرا ہوتا تھا کہ آنے والے مریضوں اور ان کے لواحقین پر اچھا اثر پڑ سکے...... کیونکہ کاروبار کی چمک دمک اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

تمام عملہ صاف ستھرے لباس میں نظر آرہا تھا۔ اسپتال کے مالک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر خالد اقبال کو اُمید تھی کہ معزز مہمان ضرور کوئی اچھی گرانٹ دے کر جائیں گے۔ مشہور سماجی شخصیت ملک شاداب اختر کے یہاں آنے کا وقت تو صبح دس بجے تھا مگر حسبِ معمول وہ تین بجے کے قریب جلوہ افروز ہوئے اس کی وجہ انہوں نے ایک انتہائی اہم میٹنگ بتائی جو کہ ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کے لیے تھی اور کچھ سیکیورٹی معاملات...... انتظار کرتے کرتے اکتا جانے والا عملہ ایک دفعہ پھر جوش و جذبے کا مظاہرہ کرنے لگا اور ساتھ آنے والے سیاسی کارکن زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ اسپتال کے نیچے درجے کے ملازمین بھی ازراہ مزاح کا حصہ بن گئے۔ پھر کانفرنس ہال میں تمام عملے کے سامنے ملک شاداب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اسپتال کے عملے کی تعریف اور ڈاکٹر خالد کے جذبے کو سراہا کہ وہ ایسا معیاری اسپتال بنا کر ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ وفاقی حکومت سے اس رفاہی (لوگوں کے مطابق یہ رفاہی اسپتال ہی تھا) ادارے کے لیے جتنا ہو سکا مدد کی درخواست کریں گے۔

لیکن فی الحال اپنے طور پر وہ ذاتی حیثیت (جو کہ ذاتی ہرگز نہ تھی) میں دس لاکھ کی خطیر رقم کا چیک ادارے کی بھلائی اور ترقی کے لیے ابھی دے کر جا رہے ہیں۔ کانفرنس ہال ایک دفعہ پھر زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا اور ڈاکٹر خالد کا چہرہ بھی روشن ہو گیا۔ حالانکہ یہ کچھ زیادہ رقم نہیں تھی مگر وفاقی حکومت سے گرانٹ کی توقع روشن ہو گئی تھی۔ ملک شاداب کا بھی اصل مقصد یہاں ڈاکٹر خالد کو پارٹی جوائن کرنے کی دعوت دینی تھی اور خود ڈاکٹر خالد نے بھی در پردہ یہی منصوبہ بنایا تھا اسی لیے ملک شاداب اختر کو یہاں آنے کی دعوت دے دی تھی۔

تقریر کے خاتمے کے بعد ڈاکٹر خالد بذاتِ خود ملک شاداب اختر کو لے کر اسپتال کے باقی حصوں کا دورہ کروانے لگا اور ساتھ ساتھ ہی وہ اپنے مطلب کی باتیں بھی کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے ملک شاداب اختر، اس کے پرسنل سیکریٹری عابد اور ڈاکٹر خالد کے سوا باقی سب لوگ کانفرنس ہال میں ہی ریفریشمنٹ میں مصروف تھے۔ جبکہ ان تینوں کے لیے الگ سے ٹیبل سج رہی تھی جہاں وہ مزید پچیس تیس منٹ تک وقت گزارتے۔ ملک شاداب اختر نے مسکراتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب، اسپتال تو آپ نے اچھا خاصا بنا لیا ہے، اور آپ کی اس علاقے میں اچھی جان پہچان ہو گئی ہے۔ آپ الیکشن کیوں نہیں لڑ لیتے؟“

”ارے ملک صاحب یہ سیاست ہمارے بس کی بات کہاں...... فکر معاش اور یہ ذمّے داری جان چھوڑے تو بندہ کچھ اور سوچے۔“ ڈاکٹر خالد نے اپنی خوشی دباتے ہوئے کہا۔

”لو جی ڈاکٹر صاحب آپ کو فکر معاش کیوں ہونے لگی بھلا؟ اتنا اچھا اسپتال چل تو رہا ہے اور مجھے پوری اُمید ہے وفاقی حکومت آپ کی کارکردگی اور لگن کو دیکھ کر آپ کے ساتھ مزید تعاون کرے گی...... آپ ہمت تو کریں......“

ملک شاداب نے تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ڈاکٹر

خالد کی طرف دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر خالد نے اس دفعہ صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کیونکہ وہ اب شفاخانے کے اس حصے میں آچکے تھے جہاں خصوصی مریض رکھے جاتے تھے۔ وہاں جابجا وارننگ بورڈ اور حفاظتی اقدامات دیکھ کر ملک شاداب بھی حیرت زدہ ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب...... ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم کسی خفیہ بیس یا کسی ایجنسی کے دفتر آگئے ہیں۔ اتنی سیکیورٹی اور جگہ جگہ وارننگ بورڈز...... کہیں یہ کوئی خفیہ فوجی بیس تو نہیں۔'' ملک شاداب ہنستے ہوئے بولا۔

کچھ ایسا ہی سمجھ لیں ملک صاحب، یہاں اسپیشل قسم کے مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ یہاں کا عملہ اور سیکیورٹی اسٹاف بھی خصوصی تربیت یافتہ ہے...... یہ ایسے مریض ہیں جن کو ہم عام مریضوں کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ ڈاکٹر خالد نے کہا۔

''بڑی عجیب بات ہے ڈاکٹر صاحب...... یہ مریض اتنے خاص کیوں ہیں کہ دوسرے مریضوں کے ساتھ ان کو نہیں رکھا جا سکتا؟'' ملک شاداب اختر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا ہے ملک صاحب! یہاں کا ہر مریض ایک الگ کہانی ہے اور اس کا الگ مرض یا پریشانی ہے۔ ہر بندے کے حالات کے مطابق ہی ہم نے اس کمرے کا ماحول بنا کر رکھا ہے تاکہ جتنا بھی ہو سکے وہ یہاں سکون محسوس کرے...... اس لیے یہاں کوئی زائد یا غیر ضروری عملہ اور چیز نہیں...... پھر تمام تر احتیاط بھی برتی جاتی ہے۔'' ڈاکٹر خالد نے وضاحت کی تو ملک شاداب...... سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی دوران ایک سفید براق لباس میں ملبوس دلکش نرس سیڑھیاں اترتی دکھائی دی۔ اس کی آستینوں کے آخر اور کالر کے گرد سرخ ربن اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ یہ اسی سیکشن سے متعلقہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ وہ سیدھی ڈاکٹر خالد کی طرف آئی۔ ''سر پلیز یہ دیکھ لیجیے گا...... ان کاغذات پر آپ کے دستخط ضروری تھے۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی کا تاثر تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے بہت کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا......

بہر حال اب وہ آچکی تھی اس لیے ان سے کاغذات لے کر ان پر نظر ڈالنا ضروری سمجھا لیکن وہ معزز مہمان کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اس لیے ڈاکٹر خالد نے اجازت طلب نظروں سے ملک شاداب اختر کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب دیکھ مار لیں ایک نظر آپ ظاہر ہے کوئی ضروری کاغذات ہی ہوں گے اس لیے تو یہ خاتون یہاں تک آئی ہیں۔'' ملک شاداب اختر نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اب وہ شفاخانے کے آخری حصے سے گزر رہے تھے...... زیادہ تر مریض یا تو سوئے ہوئے تھے یا پھر آرام کر رہے تھے۔ اور بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ بالکل آخری کمرے سے پہلے پھر ایک وارننگ بورڈ انگلش اور اردو میں لکھا ہوا تھا۔ ''شعلہ مت جلائیں۔ خطرناک ہو سکتا ہے۔'' پھر سائٹ والی دیوار پر بھی لکھا تھا'' آگ مت جلائیں...... ملک شاداب نے بے پروائی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں یہاں ایٹم بم تو نہیں رکھا ہوا ڈاکٹر صاحب نے یا کوئی پیٹرول کا ذخیرہ ہے۔'' اس کمرے کا مریض نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر خالد کی توجہ کاغذات کی طرف تھی اس لیے اس نے ملک شاداب کی خود کلامی کا تفصیلی جواب دینے کی بجائے ''نہیں ملک صاحب'' کہنے پر ہی اکتفا کیا...... کمرے کی سامنے کی دیوار جیل کی طرح سلاخ دار تھی لیکن اوپر اور نیچے سے دو دو فٹ دیوار کے درمیان پٹی کی طرح ہر کمرے کے ساتھ الگ واش روم تھے۔ شاید یہاں مریض تھا ہی نہیں یا تھا بھی تو واش روم میں گیا ہوا تھا۔ ملک شاداب چھت کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کوئی فائر الارم یا کیمرا تو موجود نہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اسے سیکیورٹی کیمرا میں دیکھیں کہ کس طرح پبلک مقامات خصوصاً اسپتال میں وہ تمباکو نوشی کر رہا ہے۔ حالانکہ دو عدد کیمرے اور ایک عدد الارم اس کے عقب میں لگے ہوئے تھے...... تسلی ہونے کے بعد اس نے سگار نکال کر منہ میں دبایا اور پھر لائٹر نکال کر سگار کو شعلہ دکھایا۔ اس دوران وہ کمرے کی دیوار کے کافی قریب آچکا تھا۔ اچانک اس نے ایک چنگھاڑ سنی اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنی گردن پر دو مضبوط ہاتھ محسوس ہوئے۔ پھر اس کے بعد تو اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ مسلسل چیخنے چلانے کی آوازیں اور بار بار سلاخوں سے سر ٹکرانے کی وجہ سے اس کے حواس جواب دے رہے تھے۔ وہاں جیسے قیامت برپا ہو گئی تھی۔ ایمرجنسی کا سائرن ایسے چیخ رہا تھا جیسے کسی نے طبل جنگ بجا دیا ہو۔ یہ فائر الارم کی وجہ سے تھا یا غالباً سیکیورٹی والوں کی طرف سے بجایا گیا تھا کیونکہ وہ کیمروں سے مانیٹرنگ کر

رہے تھے۔ اس دوران عابد اور ڈاکٹر خالد نے..... پہلے خود ہی ملک شاداب کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ان کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ ایک جناتی پکڑ تھی۔ ساتھ ہی اس مریض کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''تو نے آگ لگائی ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... تجھ کو بھی ساتھ ہی جلا دوں گا......'' نرس بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کے پاس بنے ہوئے سیکیورٹی کیبن میں موجود سیکیورٹی گارڈز کو بلانے کے لیے بھاگی تو اسے راستے میں ہی دو گارڈ مل گئے جو بھاگتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے...... ان کے ہاتھ میں کچھ جدید قسم کے آلات تھے......

یہاں ملک شاداب بے ہوش ہو چکا تھا اور مزید دو تین منٹ میں موت کے قریب پہنچنے والا تھا مگر سیکیورٹی گارڈ نے آتے ہی ایک شاٹ گن طرز کا کوئی آلہ نکالا اور مریض کے پیٹ میں دے مارا۔ مریض تڑپ کے پیچھے گر پڑا لیکن بدستور چیخ رہا تھا۔ پھر ڈارٹ گن جیسے کسی آلے سے بے ہوشی کا انجکشن فائر کیا تو وہ اس کی گردن کے پاس لگا۔ اگلے دس سیکنڈوں میں وہ مریض بے ہوش ہو گیا۔ ملک شاداب اختر کو فوراً وہاں سے نکال لیا گیا۔ اب اس کو ابتدائی طبی امداد دی جا رہی تھی اگر بروقت سیکیورٹی گارڈز نہ آتے تو آج ملک شاداب کا یوم وفات ہوتا۔ اب وہ صرف بے ہوش تھا۔ یہ ایک اچھی خبر تھی مگر اتنی اچھی بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر خالد اقبال سکون کا سانس لیتا۔ اسے اپنا اور اسپتال دونوں کا مستقبل تاریک ہوتا نظر آرہا تھا۔

☆......☆

ڈاکٹر خالد اقبال اس وقت ایک تحقیقاتی ٹیم کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کمرے کے انتہائی کم درجہ حرارت کے باوجود پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''تو ڈاکٹر صاحب آپ بتانا پسند کریں گے کہ یہ واقعہ کیسے اور کیونکر پیش آیا۔'' ایک سرکاری اہلکار نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ وہ ایک گھنٹے سے ڈاکٹر خالد کے ساتھ تھے اور کافی سوالات پوچھ چکے تھے کہ ان کو کیوں بلایا گیا تھا یہاں اور آپ کی موجودگی میں یہ حادثہ کیسے ہوا؟ اگر وہ مریض اتنا ہی خطرناک تھا تو آپ ملک صاحب کو لے کر وہاں کیوں گئے وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر خالد نے تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے تھے۔ ویسے بھی سی سی ٹی وی کیمروں سے بنی ہوئی ویڈیو بھی کافی مددگار ثابت ہوئی تھی کہ اس میں سراسر غلطی ملک شاداب اختر کی تھی۔ ایک تو اس نے وارننگ کے باوجود وہاں آگ جلائی اور دوسرا وہ بے خیالی میں سلاخوں کے نزدیک چلا گیا تھا۔

اب اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر خالد نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے سامنے بیٹھے تینوں سرکاری اہلکاروں سے کہا۔ ''اس بات کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو شروع سے صغیر احمد یعنی حملہ کرنے والے مریض کا بیک گراؤنڈ معلوم ہو...... وہ یہاں کیسے اور کن حالات میں پہنچا......''

''آپ شروع کریں ہم سن رہے ہیں......'' ان میں سے ایک اہلکار نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر خالد خلا میں تکتے ہوئے اپنے الفاظ اور خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، تاکہ مناسب الفاظ میں صغیر احمد کی کہانی سنا سکے۔ اس نے جو کہانی سنائی، وہ کچھ یوں تھی۔

صغیر احمد لاہور کے قریب شہر مرید کے کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے دو بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ مرید کے میں ایک نیم پختہ مکان میں رہتا تھا جس کی دیواریں تو پختہ تھیں لیکن ان میں سیمنٹ کی بجائے گارے سے چنائی ہوئی تھی۔ چھت میں سرکنڈوں اور لکڑی کے بالے استعمال ہوئے تھے۔ وہ تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹا نصیر پندرہ سال کا اور شائلہ صرف دس سال کی تھی۔ جبکہ صغیر احمد خود نصیر سے تین سال بڑا تھا یعنی اس وقت اس کی عمر لگ بھگ اٹھارہ کے قریب تھی۔ وہ ایک کم گو اور شرمیلا نوجوان تھا۔ اس کے دونوں چھوٹے بہن بھائی تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن وہ گھر کی مجبوریوں کی وجہ سے میٹرک تک پڑھنے کے بعد اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ روز صبح لاہور جاتا اور وہاں ایک دواساز فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتا تھا جبکہ اس کے والد خوشی محمد مرید کے میں ہی ایک بازار میں سبزی اور پھل کی ریڑھی لگاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی محنت اور لگن کو دیکھ کر اس کے سپروائزر نے اسے منشی بنا دیا یعنی وہ پیکنگ کا آنے جانے والا حساب لکھنے لگا۔ میٹرک کرنے کی وجہ سے وہ باقی لڑکوں سے ذرا زیادہ پڑھا لکھا بھی تھا اور ایک دو لڑکے جو پیکنگ میں میٹرک پاس تھے، وہ بالکل ہی نالائق تھے اور کسی طور بھی نہیں لگتا تھا کہ انہوں نے میٹرک پاس کیا ہوا ہے۔ یہ دور صغیر احمد کے لیے یادگار تھا۔ کیونکہ اس کی ترقی ہوئی تھی اور ساتھ ہی تنخواہ میں بھی چار ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

محلے میں صرف اس کے دو دوست تھے، ایک رضوان عرف جانا اور نوید...... وہ دونوں انتہا درجے کے شراتی تھے جبکہ صغیر ان دونوں کا الٹ تھا۔ کبھی کبھی محلے کے لوگ حیران ہو جاتے کہ آخر ان دونوں کی دوستی صغیر سے کیونکر ہو گئی لیکن کوئی بھی جواب نہیں ملتا تھا۔ خود صغیر کو بھی کبھی کبھی وہ دونوں بہت برے لگتے تھے مگر پھر بھی وہ ان دونوں سے دوستی ختم نہیں کرسکا تھا۔ وہ آئے روز نت نئی شرارتیں کرتے اور کبھی کبھار انتہائی گھٹیا حرکتیں بھی کرجاتے تھے...... جیسے کسی بزرگ کے ہاتھ سے خریدا ہوا سامان چھین کر بھاگ جانا، کھڑی موٹر سائیکل سے پیٹرول نکال لینا اور کسی جاتی ہوئی لڑکی کو زبانی کلامی چھیڑنا اور فحش اشارے کرنا ان کا معمول تھا اور وہ روز رات کو گھروں کے سامنے تھڑوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنے دن کی ''مصروفیات'' بتاتے تھے اور خوب قہقہے لگاتے تھے...... جبکہ صغیر ان کے درمیان ایسے بیٹھا ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کا باشندہ ہو...... رضوان عرف جانا اسے اکثر یہ کہہ کر چڑاتا تھا۔ ''میرا دھیاں بھیناں ورگا یار (میرا بیٹیوں، بہنوں کی طرح کا دوست)'' یہ سن کر صغیر احمد کی کنپٹیوں میں خون ٹکریں مارنے لگ جاتا اور اس کا چہرہ تذلیل کے احساس سے سرخ ہو جاتا مگر وہ ہمیشہ کی طرح ضبط کرتا تھا اور یہی کہتا تھا۔

''میں ایسا ہی ٹھیک ہوں تم لوگوں کی طرح روز لوگوں کی گالیاں تو سننے کو نہیں ملتی ناں......'' اپنے طور پر وہ ان دونوں کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ ڈھیٹ یا شرمندہ ہونے کی بجائے ہنستے تھے۔

اسی طرح دن کٹ رہے تھے اور روزمرہ کی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں تھی سوائے جانے اور نوید کے کارناموں کے یہاں تک کہ رمضان کا مہینا آ گیا اور اس مقدس مہینے میں ان دونوں کے کرتوت ویسے کے ویسے رہے...... ایک دو دفعہ صغیر نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی خدا کا خوف کرو اور اس مہینے کا تو احترام کرو لیکن وہ کہتے ''لالے تو کیا جانتا ہے افطاری کے بعد سرکاری کالونی کے ساتھ والے پارک میں کیسا کیسا پیس آتا ہے۔'' اسی طرح پھر ستائیسویں کی بابرکت رات آئی جب تمام عالم اسلام اللہ کے حضور تمام رات عبادت کرتا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ یہ شب بیداری کا موقع ہوتا ہے۔ لوگ سحری تک جاگ کر عبادات اور تسبیحات کرتے ہیں پھر سحری کرنے کے بعد نماز کی ادائیگی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگ تمام رات کی نیند پوری کرنے کی غرض سے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ خوشی محمد اور صغیر احمد بھی نزدیکی مسجد میں عبادت کی غرض سے گئے اور سحری تک وہاں رہے۔ سحری کا انتظام مسجد میں ہی تھا اس لیے وہ سحری کرنے کے بعد گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو صغیر نے دیکھا کہ رضوان اور نوید نے سر پر ٹوپی پہنی ہوئی ہے اور بڑی مسکین صورت لیے گلی میں کھڑے ہیں۔ خوشی محمد نے ناگواری سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ باپ ہونے کے ناتے سمجھتا تھا کہ یہ کسی دن اس کے بیٹے کو غلط راہ پر نہ ڈال دیں کیونکہ اس نے ان دونوں کو ایک دو دفعہ چھپ کر سگریٹ پیتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور وہ بھی عام نہیں چرس سے بھرا ہوا سگریٹ۔ اسی لیے وہ اب صغیر کو دبے دبے لفظوں میں ان سے دور ہونے کا کہتا تھا۔ کھل کر اس لیے نہیں کہتا تھا کہ صغیر ان دونوں کے سوا نہ کسی کے پاس آتا جاتا تھا نہ ہی اسے اور کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وہ اپنے جوان بیٹے کو پُراعتماد اور کامیاب دیکھنا چاہتا تھا اور ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے پروں کے نیچے پناہ لیتا رہے۔ خیر خوشی محمد کو دیکھ کر وہ دونوں آگے آئے اور کہا۔ ''سلام چاچا...... کیسی طبیعت ہے؟''

خوشی محمد نہ چاہتے ہوئے بھی بولا ''بس کرم ہے سوہنے رب کا...... جتنا بھی شکر کریں کم ہے...... اچھا بھئی جوانو...... اب میں ذرا لک (کمر) سیدھا کرلوں، یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب صغیر کچھ دیر ان دونوں کے ساتھ ضرور گپ شپ لگائے گا۔''

صغیر ان دونوں کو دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہوا کہ یہ کہاں عبادت کرتے رہے ہیں جو ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ جلد ہی اسے پتا لگ گیا کہ یہ بھی ایک منصوبے کا حصہ ہیں اور اس دفعہ صغیر کو بھی وہ ساتھ لے کر جانے پر بضد تھے مگر صغیر ہمیشہ کی طرح انکار کر رہا تھا۔ آخر نوید بولا۔ ''تو نے کچھ نہیں کرنا یار...... ابھی سحری کی اذان ہوئی ہے اس کے بعد ایک گھنٹے کے لیے لائٹ جاتی ہے۔ ہم ذرا ساتھ والے محلے ہی تو جا رہے ہیں تو محلے سے باہر ہی رہنا ہم اندر سے ہو کر صرف دس منٹ میں آجائیں گے اگر نہ آئے تو بے شک تو واپس آجانا۔''

صغیر احمد اتنی ہمت اور حوصلے والا نہیں تھا لیکن پانچ دس منٹ کا سن کر وہ مائل نظر آنے لگا اور سوچنے لگا کہ شاید یہ

آج سے مذاق کرنا اور طعنے دینا چھوڑ ہی دیں...... بالآخر وہ اپنی بہت ساری شرائط سامنے رکھ کر بولا۔ ”اگر یہ منظور ہے تو میں چلوں گا۔“

رضوان، جس نے ٹھیک سے وہ سب سنا بھی نہیں تھا، ایک دم بولا۔

”سب شرطیں منظور ہیں تو بس ساتھ چل......“

اگلے پندرہ منٹوں میں وہ ہانپتے ہوئے واپس اسی جگہ پر موجود تھے جہاں یہ سارا پروگرام بنا تھا۔ اب وہ دونوں بے تحاشا جبکہ صغیر دبی دبی مسکراہٹ سے ہنس رہا تھا۔ ”بس یار اتنا سا کام تھا تو دیکھ کسی نے ہم کو دیکھا یا کسی کو پتا لگا؟ لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ نماز پڑھ کر واپس آرہے ہیں اگر کسی نے دیکھا بھی ہو تو......“ نوید نے گویا صغیر کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس محلے میں موجود بجلی کے تمام میٹر کی تاریں پلاس سے کاٹ آئے تھے...... چونکہ لائٹ گئی ہوئی تھی اس لیے کسی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن جب ایک گھنٹے بعد لائٹ آتی تو سب کو معلوم ہو جاتا...... پھر صبح تک وہ شور وغل اٹھتا اور نامعلوم بندوں کو گالیاں دی جاتیں کہ خدا کی پناہ...... وہ ایسی حرکت اپنے محلے میں کر چکے تھے اس لیے دوبارہ کرتے تو پکڑے جاتے کیونکہ سب ان کو یہاں جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے دوسرے محلے کا انتخاب کیا تھا۔

ان کی توقع کے عین مطابق صبح دوسرے محلے والوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا اور پورا محلہ گھروں سے باہر نکل کر تاریں کاٹنے والوں کو کوس رہا تھا اور کچھ لوگ روزے کے باوجود گالیاں دینے سے بھی احتراز نہیں کر رہے تھے۔ آج کی رات جب وہ ایک ساتھ جمع ہوئے تو ان کی زبان پر سحری والے واقعے کی باتیں تھیں یا ان لوگوں کا جو ردِعمل تھا اس پر قہقہے......اب صغیر احمد بھی تھوڑی ہمت پکڑ ہی گیا تھا اور ان دونوں کے درمیان اپنا ”قد“ ذرا اونچا محسوس کرنے لگ گیا تھا۔

پھر رمضان کے آخری روزے والے دن بھی صغیر احمد فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ کیونکہ آج شام کو جاتے ہوئے اسے تنخواہ ملنی تھی...... چھٹی کے وقت مالک نے سب اسٹاف کو نہ صرف تنخواہ دی بلکہ ہر ایک کو اس کی تنخواہ کے مطابق عیدی بھی تھمادی...... صغیر احمد کو اپنی تنخواہ سے تین ہزار روپے زیادہ ملے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا...... وہ فوراً بازار گیا اور ان تین ہزار روپوں سے گھر والوں کے لیے خریداری کرنے لگ گیا۔ اپنے ماں باپ کے لیے اس نے دو سوٹ لیے جبکہ نصیر کو پینٹ شرٹ کا بہت شوق تھا...... اس کے لیے اس نے جینز اور ٹی شرٹ لی پھر اپنی گڑیا جیسی بہن کے لیے اس نے ایک گلابی رنگ کا فراک لیا اور تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ جب شمائلہ پہنے گی تو بالکل کسی گڑیا کی مانند لگے گی۔ اس کے علاوہ اس نے اس کے لیے چوڑیاں اور مہندی بھی لی تھی۔ وہ اپنی بہن سے حد سے زیادہ پیار کرتا اور اس کے لاڈ دیکھتا تھا۔ گوکہ وہ نصیر سے بھی کم محبت نہیں کرتا تھا مگر شمائلہ کی محبت کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اسی لیے آج بھی وہ اس کے لیے زیادہ خریداری کر رہا تھا۔ آخر شام کو جب چاند نظر آنے کی خبریں آنا شروع ہوئیں اور مساجد میں زوروں سے تکبیروں کا سلسلہ بلند ہوا وہ بس میں بیٹھا گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ رش اور عید کی وجہ سے وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اپنی گلی میں داخل ہوا۔ گلی میں پٹاخے اور پھلجڑیاں لیے بچے ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے۔ اس کے...... دونوں ہاتھوں میں شاپر موجود تھے جس میں اس نے بڑے ارمانوں سے اپنے گھر والوں کے لیے خریداری کی ہوئی تھی۔ وہ ابھی گھر کی طرف مڑا ہی تھا کہ نوید اور رضوان دونوں اس کے پاس آگئے۔ ”اوئے لالے یہ کیا ہے؟ لگتا ہے پورا لاہور ہی اٹھا لایا ہے......“ نوید نے حیران ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں موجود شاپر دیکھے۔

”بس یار کچھ گھر والوں کے لیے دو چار چیزیں لی تھیں اور کچھ خاص نہیں۔“ اس نے محتاط لہجے میں کہا...... وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والوں سے پہلے کوئی اور یہ چیزیں دیکھے......

”اچھا یار جلدی سے یہ سامان رکھ کر واپس آ...... تجھے ایک چھوٹا سا شغل دکھاتے ہیں“ اس دفعہ رضوان نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو صرف اس کی اماں موجود تھی۔ نصیر بھی باہر نکلا ہوا تھا اور خوشی محمد شمائلہ کو مہندی اور چوڑیاں دلوانے لے کر گیا تھا۔ اس لیے صغیر نے سارا سامان چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور اماں سے کہا ”اماں میں ابھی آتا ہوں۔ یہ میرے مالکوں کا سامان ہے میرے واپس آنے تک کوئی نہ چھیڑے۔“ وہ سب کو سرپرائز دینا چاہتا تھا...... اس کی ماں نے ”اچھا پتر ٹھیک ہے“ کہہ کر گھر کے چھوٹے

نے صحن کی صفائی شروع کر دی۔
باہر نکلتے ہی نوید اور رضوان نے اس کا بازو پکڑا اور ایک طرف گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ کچھ دور جا کر رکنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ آج صبح سے وہ دو بار یہ کام کر چکے ہیں، بہت مزہ آ رہا ہے۔ اس دفعہ کسی اور کال سینٹر کی طرف چلتے ہیں۔ ان کے پاس موبائل موجود تھا مگر وہ موبائل سے کال کرنے کے حق میں نہیں تھے اس لیے وہ مین مارکیٹ میں ایک پبلک کال سینٹر آئے اور وہاں فون بوتھ میں گھس گئے۔ اس دفعہ انہوں نے صغیر کو کہا کہ وہ کال کرے صغیر تھوڑا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن وہ کسی طور بھی جان چھوڑنے کو آمادہ نہیں تھے۔ بظاہر صغیر احمد کے لیے بھی یہ کوئی خطرناک یا ایڈونچر والی بات نہیں تھی مگر اسے یہ غیر اخلاقی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ریسکیو والوں کو فون کر کے کہے کہ فلاں جگہ آگ لگی ہوئی ہے آپ جلدی پہنچو اور وہ بیچارے وہاں آ کر دیکھتے تو کچھ نہ ہوتا لیکن یہ ضرور تھا کہ ان تینوں کی تفریح ہو جاتی ویسے بھی صبح سے دو دفعہ وہ دونوں یہ کر چکے تھے اب صغیر کی باری تھی۔
بہت پس و پیش کے بعد صغیر نے دل بڑا کر کے ریسکیو کا ایمرجنسی نمبر ملایا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا کہ مرید کے مین جی ٹی روڈ میں ایک مارکیٹ میں آگ لگ گئی ہے...... وہ نروس تھا اس لیے قدرتی طور پر اس کا لہجہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا...... آپریٹر نے دوبارہ مارکیٹ کا نام کنفرم کیا اور کہا کہ ہم جلد از جلد فائر فائٹرز کو بھیج رہے ہیں...... آپ اس دوران آگ سے دور رہیں اور جہاں تک ہو سکے آگ پر قابو پانے کی کوشش کریں۔
اتنے رش کے باوجود ریسکیو والوں کی گاڑی بیس منٹ میں پہنچ چکی تھی مگر وہاں ایسی کوئی آگ نہیں تھی جس کو وہ بجھاتے۔ یہ تینوں گاڑی کے قریب ہی تھے اور وہاں کھڑے ریسکیو اہلکاروں کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے پھر ان میں بظاہر سپروائزر نظر آنے والے اہلکار نے شاید اپنے آفس کال کر کے بتایا کہ کسی نے مذاق کیا ہے یہاں کوئی آگ نہیں لگی۔ آگے سے اسے پھر کوئی ہدایت ملی تھی۔ اس اہلکار نے کہا۔ ”یار مجھے تو لگتا ہے یہ بھی مذاق ہی ہو گا صبح سے یہ تیسری چوتھی کال ہے جو فیک ثابت ہوئی ہے۔ کیا پتا یہ بھی کوئی ایسی ہی کال ہو...... لوگوں کو تو جیسے کھلونا ملا ہوا ہے کھیلنے کے لیے......“ اس کو چاند رات والے دن بھی فیلڈ میں کام کرنے اور اوپر سے بے وقوف بننے کا نہایت دکھ اور غصہ تھا اس لیے وہ نئی جگہ پر جانے پر رضامند نہیں نظر آ رہا تھا لیکن ڈیوٹی سے فرار ممکن نہیں تھا۔ با دل ناخواستہ اس نے آپریٹر سے پتا پوچھا۔ اسے بتایا گیا کہ دربار بابا احمد شاہ سے پچھلی طرف کوئی کالونی ہے وہاں جائے۔ اس نے جب یہ پتا دہرایا تو صغیر احمد سمیت نوید اور رضوان نے حیرت سے دیکھا کیونکہ یہ لوگ اسی کالونی کے رہنے والے تھے۔ یہاں مین بازار سے راستہ جاتا تھا اس کالونی کی طرف۔ وہ بھاگتے ہوئے اس جانب روانہ ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ریسکیو والوں کی گاڑی تھی...... مین بازار اور چاند رات ہونے کی وجہ سے وہاں انتہا کا رش تھا...... ریسکیو گاڑی کو وہاں پہنچتے پہنچتے تیس چالیس منٹ لگ گئے حالانکہ عام حالات میں وہ صرف دس منٹ کا راستہ تھا۔ اگر وہ اپنے دفتر سے اس طرف جاتے تو پھر بھی وہ دس سے پندرہ منٹ تک پہنچ سکتے تھے لیکن وہ فیک کال پر مین جی ٹی روڈ کی طرف آ نکلے تھے۔ اسی سبب وہ کافی سے زیادہ تاخیر سے پہنچے۔
لیکن وہاں پہنچ کر ریسکیو والوں نے جو منظر دیکھا وہ بھولنے والا نہیں تھا۔ ایک نوجوان جس کے تمام کپڑے دھواں دھواں ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے وہ بار بار آگ میں کودنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ باقی سب لوگ اسے پکڑ رہے تھے...... یہ صغیر احمد تھا اور اسے پکڑنے والوں میں نوید اور رضوان سمیت محلے کے باقی لوگ بھی تھے۔ یہ آگ صغیر احمد کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ جس میں کچھ دیر پہلے داخل ہونے والا خوشی محمد اپنی بیوی اور بچی سمیت جل کر مکان کے ساتھ خاکستر ہو گیا تھا...... کچھ لوگوں کے مطابق یہ شارٹ سرکٹ سے آگ لگی تھی اور کچھ لوگ کوئی اور کہانی سنا رہے تھے لیکن اصل بات کا نہ کسی کو پتا تھا نہ ہی وہ اس خاکستر ہونے والے مکان میں جا کر دیکھ سکتے تھے۔
صغیر احمد کا چھوٹا بھائی ایک طرف صدمے سے نڈھال پڑا ہوا تھا۔ لوگ اسے تسلیاں دینے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ یہاں صغیر احمد صدمے اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ کسی طور پر لوگوں کے قابو نہیں آ رہا تھا۔ آخر اس کی نظر ریسکیو والوں پر پڑی تو وہ تیر کی طرح ان کی طرف آیا اور ان کو گالیاں دینے لگ گیا۔ ”تم کہاں مر گئے تھے جو اتنی دیر بعد آئے ہو۔ صرف حرام کھانا جانتے ہو...... حرام خور ہو تم...... میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا...... تم نے ہی یہ آگ لگائی ہے......“ وہ گاڑی پر ٹھڈے مارتا ہوا بول

رہا تھا...... جبکہ رضوان اور نوید اسے مسلسل دور لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ریسکیو والوں نے باقی رہ جانے والی آگ کو بجھا دیا تھا مگر وہ اس گھر کے مکینوں کو نہیں بچا سکے تھے۔ سارا کام ختم کر کے انہوں نے محلے اور اردگرد اکٹھے ہونے والے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس دوران صغیر احمد نیم بے ہوشی کے عالم میں چلا گیا تھا۔ ریسکیو ٹیم کا سپروائزر بولا۔

''میرے بزرگو اور دوستو۔ یہ بہت افسوس ناک واقعہ ہوا ہے۔ یہاں ہر بندہ مجھے اس واقعے پر دلی طور پر دکھی نظر آ رہا ہے کیونکہ یہاں رہنے والے لوگ سیدھے سادے، معصوم اور بے ضرر لوگ تھے لیکن اسی معاشرے میں کچھ ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو اس طرح کے واقعات کا باعث ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آگ انہوں نے لگائی لیکن مگر یہ آگ ہمیں بجھانے سے روکنے والے وہی ہیں۔'' لوگوں کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات ابھرے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم صبح سے پانچ، چھ دفعہ لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنے یعنی لوگوں نے فیک کال کر کے ہم کو ایمرجنسی کے لیے بلایا، کبھی کوئی ایکسیڈنٹ کبھی آگ اور کبھی کوئی اور بات...... اس واقعے کی بھی جب ہمیں اطلاع ملی تھی تو اس وقت بھی ہم مین جی ٹی روڈ پر موجود تھے اور ایسی ہی ایک کال کے نتیجے میں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی کسی نے مذاق ہی کیا ہے...... اس دوران جب ہم کو یہاں آنے کے لیے کہا گیا تو ہم کو ایک دفعہ پھر یہی محسوس ہوا کہ یہ بھی کوئی مذاق ہی ہوگا مگر اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہم پھر بھی یہاں آ گئے...... لیکن مین روڈ کے رش کی وجہ سے یہاں آنے میں بہت وقت ضائع ہو گیا اگر ہم اپنے دفتر ہوتے تو یہاں دس منٹ کے اندر پہنچ سکتے تھے اور کسی نہ کسی طور پر شاید ہم آگ پر تابو بھی پا لیتے لیکن شاید اللہ پاک کو یہی منظور تھا، میری بس آپ لوگوں سے یہی درخواست ہے کہ ایسا مذاق مت کریں جو کسی کے لیے اتنا سنگین ہو جائے اور گھروں کے گھر اجاڑ دے۔'' یہ کہہ کر وہ اُمید طلب نظروں سے وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگوں کے چہرے پر ندامت اور تاسف کی جھلک تھی۔ حالانکہ انہوں نے یہ حرکت نہیں کی تھی مگر جنہوں نے کی تھی وہ اسی معاشرے کا حصہ تھے۔ اس دوران صغیر احمد کو بھی ہوش آ چکا تھا اور کچھ باتیں اس کے پلے بھی پڑ چکی تھیں۔ اس کے قریب ہی رضوان اور نوید شرمسار سے بیٹھے تھے۔ نوید نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جیب سے سگریٹ نکالی...... ابھی اس نے لائٹر نکال کر سگریٹ کو شعلہ دکھایا ہی تھا کہ صغیر احمد چنگھاڑتا ہوا اس پر جا پڑا...... گلی میں موجود ایک پتھر اٹھا کر اس نے بے دریغ نوید کے سر کو نشانہ بنایا اور ساتھ ساتھ ہی چلاتا جا رہا تھا۔ ''تو نے یہ لگائی ہے...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' لوگوں کے بیچ بچاؤ کرانے کے باوجود وہ نوید کو مہلک ضربیں لگا چکا تھا۔ اسی ریسکیو کی گاڑی پر نوید کو اسپتال لے جایا گیا جبکہ نصیر اپنے بڑے بھائی کو سنبھالتے سنبھالتے دوسری طرف لے گیا۔

☆......☆

نوید احمد کی اسپتال میں موت واقعہ ہو گئی تھی جبکہ صغیر احمد کو اس کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ ایک پیشی کے دوران جب اس نے عدالت کے سامنے ایک اور شخص کو سگریٹ جلاتے دیکھا تو وہ اپنی ہتھکڑی اور زنجیروں کے باوجود اس کی طرف دوڑ پڑا اور اس کے منہ سے بار بار وہی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ''تو نے یہ آگ لگائی ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا......'' مگر پولیس اہلکاروں نے اسے جلد ہی روک لیا۔ کمرۂ عدالت میں جج نے اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے نفسیاتی علاج والے کسی اسپتال داخل کرانے کا حکم دے دیا اور کہا جب تک اس کی حالت نہیں سدھرتی اس مقدمے کی سماعت ملتوی کی جاتی ہے۔ اس دن کے عدالتی حکم کے بعد سے آج تین سال ہونے کو آئے ہیں، صغیر احمد ہمارے ساتھ ہے...... وہ بالکل پُرسکون اور تعاون کرنے والا شخص ہے...... مگر ابھی تک وہ اسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہے کہ جب بھی کہیں آگ یا شعلہ جلتے ہوئے دیکھتا ہے، اسے ایک دم سے دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ بے قابو ہو جاتا ہے...... اسی وجہ سے ہم نے وہاں آگ نہ جلانے کے کافی وارننگ بورڈ لگائے تھے مگر ملک شاداب اختر صاحب نے احتیاط نہیں کی...... اس وجہ سے یہاں ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔''

ڈاکٹر خالد نے اپنے سامنے بیٹھی تفتیشی ٹیم کو کہانی مکمل کرتے ہوئے بتایا۔ اس کے بعد معمول کی کارروائی کی گئی اور اس واقعے کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر خالد کے اسپتال کو انتظامی اور حفاظتی امور میں کوتاہی برتنے پر بارہ لاکھ کا جرمانہ کیا گیا، حالانکہ قصور سراسر ملک شاداب اختر کا ہی تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

انوکھی جیت

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام تہنیت
کبھی کبھی انسان شکست کھا کر بھی فتح یاب کہلاتا ہے۔ سیف جان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس نے کسی انوکھے انداز میں اپنے مقابل آنے والے کو شکست دی۔ اگر وہ چاہتا تو بیوی کو چھین لینے کا انتقام اس کی بیوی کو چھین کر لے سکتا تھا لیکن اس نے بالکل الگ انداز سے بدلہ لیا۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

جیپ فراٹے بھرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ چھ ہزاری سی جیپ تھی جس کا طاقتور انجن پہاڑی راستوں پہ بآسانی اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ ہماری منزل وادی کیلاش تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ قیصر براجمان تھا۔ اس کے برابر میں، میں بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ شہزاد پچھلی سیٹ پر اونگھ رہا تھا۔ ہمارا چار پانچ ماہ پہلے پروگرام بن گیا تھا کہ اس بار اپریل کے آخر میں وادی کیلاش جائیں گے۔ میں نے اس وادی کے بارے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہاں کے لوگ، ان کا رہن سہن، رسم و رواج

اور ثقافت مجھے اپنی جانب کھینچتی تھیں اسی لیے اشتیاق ہوا کہ ایسی جگہ زندگی میں ایک بار تو ضرور دیکھنی چاہیے۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے ہم راولپنڈی سے چترال کے لیے نکلے تھے۔ ہم تینوں کالج دور کے دوست تھے اور اب بھی ہماری دوستی قائم تھی۔ وہ دونوں بھی کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے۔ اپنا اپنا بزنس تھا۔ میں نے بی اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ جاب کے حصول کے لیے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بقول ابو
"کسی کی نوکری کرنے سے بہتر ہے بندہ اپنا کاروبار کرلے۔" اس لیے میں نے کاروبار میں دل لگالیا تھا۔ لیکن انسان ہوں ناں۔ یکسانیت سے اکتانا ضروری ہے یہی وجہ تھی کہ میرا دل جب بھی کاروباری زندگی سے اکتا جاتا، یا اپنے اردگرد کے ماحول سے گھبرا جاتا تو اپنے دوستوں کے ساتھ سیاحت کے لیے نکل پڑتا تھا۔ ہم تینوں کو ہی سیاحت کا شوق تھا۔ ابو بھی منع نہیں کرتے تھے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ابو کے ساتھ گارمنٹس کے کاروبار میں لگا ہوا تھا۔

میں اکثر پہاڑوں کی طرف سفر کرتا تھا۔ پہاڑ جن کے دامن بہت کشادہ ہوتے ہیں۔ ان پر بچھی برف کی سفید ردا ان کی سیاہ ہولناکی کو ڈھانپے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا زندگی ان ہی پہاڑوں میں بتا دوں۔ نہ کوئی شور شرابا نہ پولیشن ایک ابدی سکون سا ماحول بس چہار سو پہاڑ اور برف سے ڈھکی فلک بوس چوٹیاں، عطر بیز فضائیں اور نباتات کی مخصوص مہک، جہاں میں آزادی سے سانسیں لے سکتا تھا۔ مجھے پہاڑوں کی وادیوں میں ڈھلتی شامیں اور افق پہ بکھرے خوبصورت رنگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس وقت راولپنڈی سے نکلے کم وبیش پانچ گھنٹے ہوچکے تھے۔ چترال، راولپنڈی سے گیارہ بارہ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ گویا چھ، سات گھنٹوں کا سفر ابھی باقی تھا۔ میں نے کلائی پہ بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پانچ چھ بجے تک ہمارا سفر اختتام پذیر ہونا تھا۔ جیپ طوفانی انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ہم اردگرد کے ماحول کا نظارہ کرتے جارہے تھے۔ ہر طرف خوبصورت و دلفریب مناظر تھے۔ دور تک پھیلے بلند وبالا پہاڑوں کے سلسلے اور اونچی چوٹیاں ہمیں بہ زبان خاموشی خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ہم مردان پہنچنے والے تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ پہ پڑا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا، سگریٹ نکال کر سلگالی۔ قیصر نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظروں کا مفہوم جان گیا تھا۔ اسے بھی سگریٹ کی طلب ہورہی تھی۔

"ڈرائیونگ کے دوران سگریٹ نوشی ممنوع ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس ایک سگریٹ ظفر بھائی۔" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ تاہم میں جان گیا تھا کہ یہ اس کا خاص انداز ہے، جب کسی سے کوئی کام نکالنا ہو تو وہ لہجے میں عاجزی سمو لیتا تھا۔

"اچھا یہ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا؟"

میں نے ہنستے ہوئے سگریٹ اور لائٹر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا، پھر بولا۔

"شہنشاہ معظم آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔"

اس کے اس انداز پہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ ہمارا خوشگوار سفر جاری تھا۔ دس منٹ بعد ہم مردان پہنچ گئے۔ قیصر نے جیپ سڑک کنارے موجود ایک پیٹرول پمپ کی طرف موڑ دی۔ ہم وہاں کچھ دیر رکے۔ میں جیپ سے اترا اور پیٹرول پمپ کے نزدیک جنرل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے بسکٹ، نمکو اور ٹھنڈی بوتل لے کر واپس آگیا۔ قیصر نے اتنی دیر میں پیٹرول ڈلوالیا تھا۔ شہزاد بھی جاگ گیا تھا۔ ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا تھا۔ ہم بسکٹ اور نمکو کھانے کے بعد بوتل سے دل بہلاتے رہے۔ مردان سے تخت بھائی، جلالہ اور سخاکوٹ سے ہوتے ہوتے دوپہر تک ہم درگئی پہنچ گئے۔ یہ سارا علاقہ پہاڑی اور نیم زرعی سا تھا۔ جہاں گندم کے کھیت اور پھلدار باغات بھی تھے۔ دو گھنٹے مسلسل سفر کرنے کے بعد آخر ہم دیر پہنچ گئے۔ قیصر نے ایک ہوٹل کے سامنے جیپ روکی تو شہزاد واش روم چلا گیا۔ ہمارا ارادہ تھا کھانا کھا کر آگے جائیں گے۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی شخص بھی تھا۔ وہی شخص ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ پھر اس نے ویٹر کو اشارے سے بلایا اور کھانا لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گوشت سے بھری پلیٹیں اور تندوری روٹیاں لے آیا۔ ہم نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی۔ اس نے شکریہ کہہ کر قبول کی اور دو لقمے لے کر ہاتھ روک لیا۔ کھانے کے دوران ہمیں شہزاد نے بتایا کہ یہ اس ہوٹل کا مالک رحمت خان ہے۔ انہیں میں نے اپنے سفر کے بارے میں بتا دیا ہے۔ بقول ان کے آگے کا راستہ بہت دشوار ہے۔ یہاں سے کسی ڈرائیور کو ساتھ لے جائیں۔ یہ سب جان کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی کہ اس مہربان اجنبی شخص نے جان پہچان نہ ہونے کے باوجود ہماری راہنمائی کی۔

"خان بھائی۔ ہم پہلی بار اس علاقے میں آئے

ہیں۔ آپ ہی کوئی ڈرائیور ڈھونڈ دیں۔“ میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

”تم آرام سے کانا کاؤ۔ بکر مت کرو۔ ڈریئوار بی مل جائے گا۔“

وہ خلوص بھرے لہجے میں گلابی اردو میں بولا۔

ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو ویٹر چائے لے آیا۔ رحمت خان بھی ہمارے ساتھ چائے پینے لگا۔

”سیف جان!“ وہ کاؤنٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پکارا۔ میری نظریں اس جانب بے اختیار اٹھ گئی تھیں۔ کاؤنٹر کے قریب کھڑا شخص جو کہ نوجوان تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہماری جانب چل پڑا۔ اسے آتا دیکھ کر رحمت خان پشتو میں اونچی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ سیف جان نامی شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ سیف جان۔“ رحمت خان نے اسے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ پشتو میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا۔

تاہم ایک بات جو میں نے محسوس کی، وہ رحمت خان کا احترام کرتا تھا۔ جب ان کی گفتگو طول پکڑ گئی تو میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”رحمت بھائی۔ اگر بات معاوضے کی ہے، تو جو یہ مانگ رہا ہے۔ ہم دینے کو تیار ہیں۔“

میری یہ بات سن کر رحمت خان کی بجائے سیف جان جلدی سے بولا۔ ”نہیں صیب۔ معاوضے کی بات نہیں ہے۔ اصل میں، میں وہاں جانا نہیں چاہتا ہوں۔“ اس نے اردو میں جواب دیا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جونہی بات ختم کی تو رحمت خان نے کہا۔ ”سیف جان یہ امارے (ہمارے) مہمان ہیں۔ ام پختون اپنے مہمانوں کو جان سے عزیز سمجھتے ہیں۔ تم ضرور جاؤ گے۔“ آخر کافی بحث و تکرار کے بعد وہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گیا۔ ہم نے رحمت خان کا شکریہ ادا کیا۔ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے بعد ہم جیپ میں آ کر بیٹھ گئے۔

☆......☆

ہمارا سفر جاری تھا۔ اب جیپ سیف جان چلا رہا تھا۔ ارد گرد کے خوبصورت مناظر نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ ہم آنکھیں جھپکے بغیر قدرت کی حسین منظر کشی دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر آنکھ جھپکی تو کسی دلفریب منظر کو دیکھنے سے محروم رہ جاؤں گا۔ شاید یہی حال باقی لوگوں کا بھی تھا۔

”ظفر صیب بیس منٹ بعد ہم لواری ٹاپ پہنچ جائیں گے۔“ سیف جان نے سکوت توڑا۔

”لواری ٹاپ کا سفر بہت خوبصورت اور ایڈونچر سے بھرپور ہے مگر اس میں خطرہ بھی بہت ہے۔ ذرا سی غفلت انسان کو موت کی وادی میں دھکیل دیتی ہے۔“ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔

”سیف جان کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہم لوگ اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر وہاں جا رہے ہیں۔ باقی اللہ مالک ہے۔ زندگی و موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کچھ لوگ سب کچھ کھونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ پانا یا کسی کو پالینا ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔“ وہ اداس لہجے میں بولا۔

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی باتیں بہت عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ جب بھی کوئی بات کرتا، اس کا لہجہ یاسیت بھرا ہی ہوتا تھا۔ پھر میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جیپ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ راستہ بھی دشوار گزار تھا۔ باتوں باتوں میں ہم لواری ٹاپ پہنچ گئے۔ راولپنڈی سے نکلنے سے قبل قیصر نے کہا تھا کہ لواری ٹاپ سے جائیں گے اور اونچائی کا مزہ لیں گے۔ جیپ سبک روی سے ٹاپ کی طرف رواں دواں تھی۔ تاحد نگاہ پہاڑوں کی چوٹیوں پہ کہیں کہیں پڑی چمکتی برف عجب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ پہاڑوں پر گہرا سبزہ کہیں کہیں سیاہ نظر آتا تھا اور نیلا آسمان بہت بھلا لگ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ برفیلے پہاڑوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لینا شروع کر دیا اور سڑک ناہموار ہونے لگی۔ لواری پوسٹ ابھی کافی اوپر تھی۔ ہم سے آگے اور پیچھے گاڑیوں اور ٹرکوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور یہی حال کچھ ہمارے ساتھ بھی تھا۔ آخر ہم ٹاپ پہ پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک طرف دیکھا تو دیر کا خوبصورت شہر نظر آ رہا تھا، جبکہ دوسری جانب چترال کی وادیاں تھیں۔ اچانک میں نے نیچے دیکھا۔ سڑک کسی ناگن کی طرح بل کھاتی معلوم ہو رہی تھی۔ ہاں یہ راستہ بھی کسی زہریلی ناگن جیسا ہی تھا۔ جو پل میں انسان کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ سڑک پر ٹرک قطار در قطار چل رہے تھے۔ جیپ چیونٹی کی رفتار سے منزل کی جانب رینگ رہی تھی۔ لواری پوسٹ پر

انٹری کے لیے جگہ جگہ چیک پوسٹیں تھیں۔ وہاں سے گزرنے والوں کی چیکنگ اور شناخت ہو رہی تھی۔ انٹری کروانے کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔ آخر ایک طویل اور جاں گسل سفر کے بعد جیپ کیلاش والے راستے پر جا رہی تھی۔ راستے میں ایک بہت خوبصورت گاؤں آیا۔ سیف جان نے جیپ روک دی اور بتانے لگا۔ ”یہ آیون گاؤں ہے، جو کہ چترال شہر کے جنوب میں بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے بمبوریت کے سنگم پر واقع ہے۔“

ہم نیچے اتر آئے اور گھومنے پھرنے لگے۔ فلک بوس پہاڑوں میں گھرے اس گاؤں کو دیکھ کر ہم سحر زدہ رہ گئے تھے۔ کچھ وقت اس گاؤں میں گزارا۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے اور ہنستے مسکراتے چہروں والے تھے۔ گاؤں کے تقریباً سبھی گھروں میں پھلدار درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے جب کیلاش کی طرف مڑے تو دریا پر ایک لکڑی کا پل نظر آیا۔ سیف جان نے بتایا۔ ”یہ دریائے کابل ہے اور ہم یہ پل عبور کرنے کے بعد وادی میں جائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیپ پل پہ چڑھا دی۔ جیپ ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔

نیچے دریا کا بپھرا ہوا پانی موت کی طرح لگ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم نے پل عبور کیا۔ آیون سے مسلسل کوئی دو گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد آخر ہم ”بمبوریت“ پہنچ گئے۔ سیف جان نے جیپ ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔ ہم گاڑی سے اترے ہی تھے کہ ایک ویٹر دوڑا دوڑا آیا۔ اس نے پشتو میں کچھ کہا تو سیف جان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ پھر ہوٹل کے باہر مخصوص جگہ پر کھڑی کر کے واپس آ گیا۔ اچانک میری نظر کچھ عورتوں پہ پڑی جو کہ بہت موٹے اونی کپڑے کے بنے فراک نما لباس میں ملبوس تھیں۔ ان کے سروں پر موتیوں سے بنی ٹوپیاں تھیں۔ اور کپڑوں پر جگہ جگہ رنگ برنگے موتی جڑے ہوئے تھے۔ مجھے اس خوبصورت ماحول میں بہت کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ شام کے چار بج چکے تھے۔ یہاں ابھی سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے دیوؤں جیسے پہاڑوں میں گھری وادی بہت پُراسرار لگ رہی تھی۔ سیف جان نے ہوٹل والوں سے معاملات طے کر لیے تھے۔ ہم اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلے گئے۔ میں فریش ہونے کے بعد لیٹا تو سو گیا تھا۔ میں کافی دیر سوتا رہا۔ پھر شہزاد نے جگایا تو آنکھ کھلی تھی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ”آؤ ظفر صیب کھانا کھا لیں۔“ سیف جان بولا۔

”اچھا دو منٹ رکو۔ میں منہ ہاتھ دھو لوں۔“ یہ کہہ کر میں واش روم میں لگے بیسن کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہونے کے بعد ہم سیف جان کی راہنمائی میں ہوٹل کے بڑے ڈائننگ روم میں آ گئے۔ وہاں چبوترے پہ بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ جلد ہی ویٹر نے کھانا سرو کر دیا۔ کھانے میں بکرے کا گوشت، مختلف سبزیاں اور چپاتیاں تھیں۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ویٹر قہوہ لے آیا۔ ابھی ہم قہوہ پی رہے تھے کہ میرے کانوں میں میوزک کی مترنم آوازیں سنائی دیں۔

سیف جان نے شاید میری دلچسپی بھانپ لی تھی۔ اس نے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک جانب چل پڑا۔ ہم تینوں ایک بار پھر اس کی راہنمائی میں چلتے ہوئے ہوٹل کے لان میں آ گئے۔ بہت سے لوگ ہوٹل کے لان میں دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس بیٹھ گئے۔ راگ کی محفل عروج پہ تھی۔ کچھ لوگ ستار اور بانسری بجا رہے تھے۔ ان کے مدھر سروں نے ماحول سحر زدہ کر دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر سیف جان نے بتایا کہ یہ کیلاش کی مخصوص موسیقی ہے۔ جسے مقامی زبان میں "اسٹوک" کہا جاتا ہے۔

سازندوں نے کوئی نئی دھن چھیڑی تو سیف جان اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ پشتو میں کوئی گانا گانے لگا۔ اس کی آواز میں عجب درد تھا۔ کسی ڈار سے بچھڑی کونج کی پکار تھی۔ اک نوحہ تھا۔ یہ محفل رات گئے تک جاری رہی۔ پھر ہم اپنے کمرے میں آ کر سو گئے۔

☆......☆

رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ بستر سے اتر کر میں کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں نے چاند کو ڈھانپ لیا تھا۔ تاہم کبھی کبھی بادل کی اوٹ سے اپنا چہرہ دکھا دیتا تھا۔ پورے چاند کی رات میں، بہتی ہوا کا شور اور چاند کی آنکھ مچولی دل کو عجب طمانیت بخش رہی تھی۔ یہ پہاڑوں پہ اتری چاندنی رات تھی، جس نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

اچانک مجھے ہوا کے دوش پر آتی کسی کی سسکی سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، دبی دبی آواز میں رو رہا تھا۔ اس کی آواز میں تڑپ تھی۔ دکھ تھا۔ اک درد تھا۔ اس کی آہوں میں سوز تھا۔ میرا دل بے قرار ہونے لگا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف کھلے آسمان کے نیچے کھڑا تھا۔ اب چاند بھی

بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تھا۔ میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگالیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میں ادھر بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچنے پر میں نے پہچان لیا۔ وہ سیف تھا جو کھلے آسمان کے نیچے لیٹا نظر آیا۔ وہ اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپائے رو رہا تھا۔ اس کے سینے پہ ایک سیاہ ہیولا تھا جسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میرے قدم بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئے پھر میں قریب جا کر رک گیا۔ بادلوں کی اوٹ سے پورا چاند نکل آیا تھا۔

ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کے اوپر موجود سیاہ ہیولے کو بغور دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کا لباس تھا۔ ایسا لباس یہاں کی بھی خواتین پہنتی ہیں۔ موتیوں سے سجا سیاہ لباس...... میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''سیف جان۔'' میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ظفر صیب۔''

''پھر رو کیوں رہے ہو؟ اور یہ لباس کس کا ہے؟'' میں نے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

''ظفر صیب ام ادر نا ئیں آنا چاہتا تھا مگر آپ کے کہنے پر آیا اے۔ ام جانتا تھا کہ ادر آ کر دکھ ادگا۔'' وہ صاف اردو میں گفتگو کرتا تھا مگر پتا نہیں کیوں اس وقت گلابی اردو میں بات کر رہا تھا۔

''کیسا دکھ کچھ بتاؤ نا یارا؟'' میرے سوال پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ میرے بار بار پوچھنے پر وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ بہت درد بھری کہانی ہے۔ میں کسی کو نہیں سنا سکتا۔ کوئی سن بھی لے گا تو کیا کرے گا؟''

''سیف جان تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ اپنی کہانی سنا دو شاید میں اس کا کوئی حل نکال لوں۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ سسکا، پھر بولا۔

''اس کا حل اب کسی کے پاس نہیں ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد بولا۔ ''میں کل سنا دوں گا۔ اب مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔''

''اچھا جیسے آپ کی مرضی۔ اب اٹھو کمرے میں چلتے ہیں۔''

پھر میں اسے لے کر واپس کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں جاگتا رہا۔ پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔

☆......☆

صبح کی روشنی نے وادی کو سنہرے رنگ میں نہلا دیا تھا۔ میں کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر کھڑا قدرت کی خوبصورت منظر کشی دیکھتا رہا۔ ہر سو فطرت کے حسین مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں دیکھا۔ وہ تینوں بھی جاگ چکے تھے۔ ان کے فریش ہونے تک میں کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر ہم نے ہوٹل میں ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد وادی کی سیر کے لیے نکل پڑے۔ ہر طرف قدرت کی صناعی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ کافی دیر وادی کے خوبصورت بازاروں میں گھومتے رہے۔ دن چڑھ گیا تھا۔ بازاروں میں مردوں اور خواتین کی آمد و رفت جاری تھی۔ مرد ہمیں دلآویز مسکراہٹ سے نوازتے اور گزر جاتے۔ گھروں کے دروازوں کے سامنے کھیلتے بچے ہمیں دیکھتے اور مسکرا دیتے تھے۔ یہاں بھی محبت کرنے والے اور شفیق لوگ تھے۔ مقامی لوگوں کی طرح یہاں کے مکانات بھی منفرد تھے، جو کہ مہنگی دیار لکڑی اور گارے سے بنے ہوئے تھے۔ یہاں حسن گویا آسمان سے اترتا ہے۔ نیچے زمین میں کشش ہے، محبت کرنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہم نے یہاں کافی ہوٹل اور مدرسے دیکھے۔ ہم چلتے چلتے باہر نکل آئے۔ ہر طرف سبزہ تھا۔ گندم کی فصلیں تھیں۔ یہاں ہمیں اخروٹ، خوبانی اور توت کے قد آور درخت کافی تعداد میں نظر آئے۔ ہم دوپہر تک گھومتے رہے۔ پھر سیف جان ایک گھر کے سامنے

رک گیا۔ بتانے لگا کہ یہ ہمارا گھر ہے۔ پھر اس نے دروازہ کھولا تو ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ اجڑا ہوا گھر، جس کے در و دیوار بھی اداس اداس نظر آرہے تھے۔ ہم چاروں ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ خواہ مخواہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتا اس کا مقام بدلتا پھر آ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اٹھتا اور ایسی ہی کوئی حرکت۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مضطرب ہے۔ اندر کے ہیجان کو قابو میں کرنے کے لیے وہ ایسا کر رہا ہے۔ میں بغور اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''ظفر صیب اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' اور کھڑا ہو گیا۔

ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے ہوٹل واپس آئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔ سیف جان کے بارے سوچتا سوچتا میں سو گیا۔ پانچ بجے کے لگ بھگ اس نے مجھے جگایا، اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ قیصر اور شہزاد ابھی تک سو رہے تھے۔ میں کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم دونوں چلتے چلتے ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر ایک پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے کہا۔ ''سیف جان کل آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی داستان سناؤ گے۔''

وہ میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''اچھا سنو۔'' سورج آخری کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ڈوبتی کرنوں نے پانی میں گویا سونا گھول دیا تھا۔ سرسبز پہاڑیاں بھی سورج کی روشنی کے باعث سنہری ہو رہی تھیں۔ دور افق پر پہاڑوں کے اوپر بادلوں کی کالی چادر تنی ہوئی تھی جو ہوا کے دوش پہ آہستہ رو تیر رہی تھی۔

''ظفر علی! محبت کا درد بہت انوکھا ہوتا ہے۔ انسان جی جی کر مرتا ہے۔ مر مر کے جیتا ہے۔''

وہ دور کہیں خلاؤں میں نادیدہ نقطے پہ نظریں مرکوز کیے بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ وادی میری آرزوؤں کا مسکن ہے۔ اس سے میری سانسیں وابستہ ہیں۔ میں بچپن سے جوانی تک اس کی سہانی صبحوں میں کھویا رہا۔ فلک بوس چوٹیوں پر اتری شاموں کا مزہ لیا۔ جھیلوں کا شفاف پانی پیا۔ اس کی فضاؤں میں سانسیں لیں۔ یہ میرے خوابوں کی سرزمین ہے۔ یہاں مجھے بے انتہا محبت ملی ہے اور نفرت بھی جھیلی ہے۔ میں تڑپا ہوں، اس پُرکشش وادی کے رسم و رواج کے مسموم کانٹوں نے میرے پاؤں لہولہان کر دیے تھے۔'' بولتے بولتے وہ رکا جیسے دور افق کے پار کوئی منظر دیکھ رہا ہے اور وہی کچھ بول رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر سلسلہ کلام جوڑا۔ ''میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو مجھے بے انت محبتیں ملیں۔ امی ابو دونوں مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ بمبوریت میں کوئی عورت ایسی نہ تھی، جس نے مجھے گود میں نہ اٹھایا ہو۔ میں جب ذرا بڑا ہوا تو وادی کے بچوں کے ساتھ سارا سارا دن کھیلتا تھا۔ شام گئے گھر واپس آتا تھا۔ پھر میری دوستی سالم جان، متا گل اور زویا سے ہو گئی۔ وہ بھی اسی وادی کے باسی تھے۔ سالم جان اور متا گل کے باپ گہرے دوست تھے۔ سالم جان کی ایک بہن شمسیہ تھی۔ متا گل کا ایک بھائی اور بہن ثرغونہ تھی۔ جبکہ زویا مذہبی پیشوا کی بیٹی اور پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ہم وادی کے دوسرے بچوں کے ساتھ اکثر ندی پہ نہانے جایا کرتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ پھر گھر والوں نے ہمیں وادی کی درس گاہ میں داخل کروا دیا۔ ہم چار سال اکٹھے پڑھتے رہے۔ مجھے متا گل اچھی لگنے لگی تھی۔ بچپن کا ساتھ کیسے محبت میں بدلا کہ احساس تک نہ ہوا۔ جب ہم بڑے ہوئے تو ملنا جلنا بھی کم ہو گیا۔ میں کبھی کبھار ہی متا گل کے گھر جاتا تھا۔ وہ جب بھی مجھے دیکھتی اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ جاتی تھی۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔ شاید پرت در پرت اپنے ماضی کو کھول رہا تھا۔ میں انہماک سے اس کی روداد سن رہا تھا۔ لمحاتی توقف کے بعد بولا۔

''ایک دن میں ان کے گھر گیا تو متا گل اکیلی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اس سے گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ دوسری وادی میں گئے ہوئے ہیں۔ اس دن مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ میں نے دل کا حال اسے بتا دیا۔ اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس وقت ہم دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ہمیں کوئی اور بھی دیکھ رہا ہے۔ میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا پھر اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔''

یہ اک اداس شام تھی۔ ماحول بھی سوگوار تھا۔ سیف جان یادوں کی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ اس کی روداد بہت انوکھی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ شاید وہ درختوں کی باس کو اپنے پھیپھڑوں میں سمونا چاہتا تھا۔ اس کا آنسوؤں سے دھلا معصوم چہرہ میری آنکھوں کے

سامنے تھا۔ شام کے سائے بھی گہرے ہونے لگے تھے۔ آسمان بھی بجھ گیا تھا۔ مٹیلا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں مٹی کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں مجھے عجب سی اداسی نظر آئی۔

اگلے دن میں کہیں جارہا تھا۔ سالم جان نے مجھے بازار میں روک لیا اور کہا کہ متا گل سے یہ چوری چوری ملنا چھوڑ دو۔ وہ بس میری ہے۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا...... دیکھو سالم جان ہم بچپن کے دوست ہیں، متا گل اور ہمارا بچپن کا ساتھ ہے۔ آج تم بھی سن لو کہ متا گل صرف میری ہے۔ میری رہے گی۔ جاؤ جو کچھ تم نے کرنا ہے کرلو۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر اول فول بکتا ہوا چلا گیا۔ گو کہ وہ اٹھارہ سال کا تھا اور مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ مگر میں قد کاٹھ میں اس سے زیادہ تھا۔ اگر وہ ہاتھا پائی پر اتر آتا تو میرا پلڑا بھاری رہتا۔ شاید اسی وجہ سے وہ چلا گیا تھا۔

میں وہیں سے واپس گھر آ گیا۔ دو دن بعد متا گل سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے تمام واقعہ سنایا۔ یہ سب سن کر وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ سالم جان اور تم دونوں کہتے ہو کہ متا گل میری ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ میں صرف تمہاری ہوں، اگلے سال سالم جان کو بھی پتا چل جائے گا کہ میں اس کی نہیں ہوں۔"

اس کی بات سن کر میرا دل خوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر اپنے گھر آ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ متا گل اور میری محبت پروان چڑھتی گئی۔ سالم جان اور میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ہماری اکثر بحث و تکرار ہوتی رہتی تھی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جس کا ہم دونوں کو انتظار تھا۔ ہاں سالم جان کو شکست دینے کا وقت آ پہنچا تھا اور متا گل میرے ساتھ تھی۔ مئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ وادی پھولوں میں چھپ گئی تھی، فضاؤں میں خوشبوؤں کا سفر جاری تھا۔ وادی کے قریب بہنے والی ندی میں ابال آ چکا تھا کیونکہ پہاڑوں پر جمی برف پگھل کر شفاف پانی بن کر اس میں موج زن تھا۔ ہر طرف ہریالی نظر آتی تھی۔ یہ خوشیوں کے دن تھے۔ وادی میں مذہبی تہوار "چلم جوش" کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ متا گل اور میں ان دنوں بہت خوش تھے۔

وقت کا پہیا گردش کرتا رہا آخر وہ دن آ گیا۔ وہ تقریب کا آخری دن تھا۔ اظہارِ محبت کا دن...... اس دن رقص کے بعد وادی کی سب لڑکیاں اور لڑکے سب کے سامنے اپنا جیون ساتھی چنتے ہیں۔ میں نے متا گل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ پھر میں اسے اپنے گھر لے آیا۔"

سیف جان یہ سب بتا کر چپ ہوا تو میں نے کہا۔

"سیف بھائی آپ کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ اندھیرا بھی چھا چکا ہے۔ قیصر اور شہزاد ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اب آگے بھی سنا دیں، پھر واپس چلیں گے۔"

اس نے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "متا گل اور میں یک جان دو قالب تھے۔ ہر دن خوشیوں کے پنگھوڑے میں جھولتے گزرتا تھا۔ چھ ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بدل گئی ہے۔ میں نے بارہا پوچھا مگر وہ ٹالتی رہی۔ عورت ایک پہیلی ہوتی ہے جسے بوجھنا آسان نہیں۔ میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اسے نہ سمجھ سکا۔ ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا تھا۔ مذہبی تہوار کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ہم دونوں بھی تقریب میں شامل ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ تہوار شروع ہوا تو سب بستی والے مخصوص میدان میں آ گئے۔ تہوار کے آخری دن ساتھی کے انتخاب کا ہوتا ہے اس دن متا گل اور میرا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ سالم جان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔ میں ہار گیا۔ وہ فاتحانہ انداز میں... متا گل کا ہاتھ پکڑے میرے سامنے گزرا تھا۔ وادی میں یہ عام رواج ہے۔ اگر کوئی بھی شادی شدہ عورت اپنی مرضی سے مذہبی تہوار کے دن کسی اور مرد کے ساتھ چلی جائے تو پہلے شوہر کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں دوسرے شوہر پر واجب ہے کہ وہ اس کے پہلے شوہر کو اس کی شادی پر ہونے والے خرچ سے دو گنا رقم ادا کرے۔ میں نے وہ رقم نہیں لی تھی۔ محبت پیسوں کے بدلے تو نہیں بیچی جاتی نا۔" میں حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے گہرا سانس لیا، پھر بولا۔

"وہ بمبوریت میں میرا آخری دن تھا۔ میں اسی شام ایک سیاح کے ساتھ دیر چلا گیا۔ وہاں رحمت خان سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہاں اب مجھے رہتے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں۔ اس نے مجھے گاڑی چلانا سکھائی۔ اردو بھی وہاں رہ کر سیکھی۔ چار سال پہلے میری ماں اور باپ فوت ہوئے تو اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ میں سالم جان کی طنزیہ مسکراہٹ کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔"

"اچھا اب متاگل کہاں ہے؟" میں نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔
وہ دل فگار لہجے میں بولا۔ "وہ تین سال پہلے مرگئی۔ سالم جان نے پچھلے تہوار پر ماریہ سے شادی کرلی۔" پھر وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ پھر بولا۔
"میں سالم جان سے اپنی شکست کا بدلہ ایک دن ضرور لوں گا۔"
"سیف بھائی! یہ بتاؤ کہ اب مذہبی تہوار کب ہے؟"
"چودہ دن بعد۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ہم واپس چل پڑے۔ راستے میں اس نے بتایا کہ رات آپ نے جس لباس کے بارے پوچھا تھا، وہ متاگل کا تھا۔ جو میں اپنے گھر سے اٹھا کر لایا تھا۔
ہم سات بجے کے لگ بھگ ہوٹل پہنچے۔ قیصر اور شہزاد بہت غصے میں تھے۔ انہیں مشکل سے منایا۔ پھر ہم کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانا کھا کر جلد ہی واپس آگئے۔ میں بستر پر لیٹا سیف جان کے بارے میں سوچتے سوچتے سوگیا تھا۔

☆......☆

اگلی صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ قیصر اور شہزاد بھی جاگ رہے تھے۔ سیف جان کمرے میں نہیں تھا۔ دونوں کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ میں نے انھیں اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہ مشکل اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے پاس آگئے۔
"یار۔ دوستوں سے اتنی ناراضی اچھی نہیں ہوتی۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔
"ظفر بھائی...... آپ نے اچھا نہیں کیا۔ خود تو سیر سپاٹے پر نکل گئے اور ہمیں یہاں چھوڑ گئے۔" قیصر جلدی سے بولا۔
"یار کیسی سیر؟ میں تو کہیں نہیں گیا۔ بس ندی کے کنارے سیف جان کے ساتھ بیٹھا رہا ہوں اور اس کی کہانی سنی ہے۔"
"کیسی کہانی؟" شہزاد کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ پھر میں نے انہیں ساری روداد سنادی۔
"ظفر بھائی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔" دونوں نے بہ یک زبان کہا۔
"دوستو میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔ اس کے لیے وقت اور رقم درکار ہے۔" میں نے انہیں اپنا پلان بتا دیا۔ دونوں نے ہامی بھرلی۔ "آؤ پہلے ناشتا کرتے ہیں۔ پھر سیف جان سے بات کریں گے۔"
اس کے بعد ہم باری باری سے فریش ہوئے لباس تبدیل کیا۔ اتنی دیر میں سیف جان بھی آگیا تھا۔ پھر ہم چاروں ناشتا کرنے چلے گئے۔ ناشتے سے فارغ ہوکر وادی میں گھومنے پھرنے نکل پڑے۔ چلتے چلتے ہم ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ ہم وہیں ایک دوسرے کے قریب پتھروں پہ بیٹھ گئے۔
"ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے سیف جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ چونکا، پھر بولا۔ "کیسی مدد؟ اور کس کام کی؟"
میں نے اسے بتادیا کہ تمہاری کہانی اپنے دوستوں کو سنا دی ہے۔ پھر اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ بہ مشکل راضی ہوا۔
"اب جو کام میں نے تمہارے ذمے لگایا ہے۔ وہ آج سے شروع کردو۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"اچھا بھائی۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے۔ دوپہر کے قریب ہوٹل واپس آکر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آگئے۔ سیف جان کھانا کھا کر ہوٹل سے باہر چلا گیا تھا۔

☆......☆

ہمیں وادی کیلاش میں آئے تیرہ دن ہو چکے تھے۔ ہم خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وادی میں خوب گہما گہمی تھی۔ کافی تعداد میں سیاح آئے تھے۔ سیف جان کے ذمے میں نے جو کام لگایا تھا، اس نے کرلیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا چلا گیا پھر وادی میں مذہبی تہوار شروع ہوگیا۔ سیف جان مقامی لوگوں کے ساتھ رسموں میں شامل ہوتا رہا تھا۔ وہ تہوار کا آخری دن تھا۔ ہم چاروں بھی بستی کے مرد و زن کے ساتھ چلتے ہوئے مخصوص میدان میں آگئے۔ یہاں آکر مرد الگ ہوگئے تھے، جبکہ عورتیں میدان میں ڈھول کی تھاپ پہ ناچنے، گانے لگیں۔ یہ ایک دلفریب منظر تھا۔ مگر میرے دل کی عجب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ ایک بار وقت پھر خود کو دہرا رہا تھا۔ متاگل سیف جان کی موجودگی میں سالم جان کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ کچھ نہیں کرپایا تھا۔ مگر اب وقت بدل چکا تھا۔ آج یہاں کچھ انوکھا ہونے والا تھا۔ سیف جان کو میں نے جو سمجھایا تھا۔ وہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ ڈھول کی تھاپ ذرا تیز ہوئی تو رقص کرتی عورتوں اور

لڑکیوں کے جسم بھی تیزی سے تھرکنے لگے۔ وہ دائرے میں ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر گھوم رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سیاہ لباس میں ملبوس عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ ان سب کے سر پہ مخصوص ٹوپیاں تھیں اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کے ہار تھے۔ ان کا رقص گانا جاری تھا۔ یہ عمل شام ڈھلے تک جاری رہا۔

پھر دریون بابا مذہبی پیشواؤں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میدان میں آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں سبز شاخیں تھیں۔ ڈھول بجنا بند ہوگیا تھا۔ وہ میدان کے وسط میں آکر رک گئے تھے۔ سب عورتوں نے انہیں سلامی پیش کی۔ اب وہ مرحلہ آنے والا تھا۔ جس کا مجھے انتظار تھا۔

''سیف جان تیار ہو جاؤ۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ہاں اب وہ آخری مرحلہ آگیا تھا۔ جو بہت انوکھا تھا۔ یہ موقع محبت کے سر عام اظہار کا تھا۔ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے قریب آتے تھے، ہاتھ تھام کر شادی کا اعلان کرتے تھے۔ اگلے ہی لمحے میدان شادی کے خواہش مند نوجوان جوڑوں سے بھر چکا تھا۔ ان میں سیف جان بھی شامل تھا۔ پھر سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے۔ سیف جان نے بھی ایک لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ لڑکی ماریہ تھی۔ سالم جان کی بیوی۔ میں نے ہی اسے ماریہ کے پیچھے لگایا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر کے اسے اپنی طرف مائل کیا تھا۔ لوگ خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ سب ہنس رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ سیف جان اور ماریہ کے ساتھ قیصر بھی چلا گیا تھا۔ اسے میں نے کہا تھا کہ ان دونوں کو گھر چھوڑ کر ہوٹل سے کھانا لے آنا۔ اچانک میری نظر سالم جان پہ پڑی۔ اس کا چہرہ غم واندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس نے ایسا سوچا بھی نہ ہوگا جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ تمام جوڑوں کے میدان سے نکلنے کے بعد وادی کے لوگ باری باری ان کے گھروں میں جا کر مبارک باد دیتے تھے۔ میں اور شہزاد بھی سیف جان کے گھر کی طرف چل پڑے۔ سیف جان نے سچ کہا تھا۔ کیلاشوں میں شادی محبت اور ہم خیالی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ سیف جان ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور میرے سینے سے لگ گیا۔ میں محبت بھرے انداز میں اس کی پشت تھپکنے لگا۔ پھر شہزاد اور میں نے ماریہ کے سر پہ باری باری شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ہم

وہیں صحن میں بڑی سی چارپائی پہ بیٹھ گئے۔ اتنے میں قیصر بھی آگیا۔ وہ ہوٹل سے لایا ہوا کھانا نکالنے لگا۔ ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر ہم تینوں واپس ہوٹل آگئے۔

☆......☆

اگلے دن ہم صبح سویرے اٹھے، ناشتا کیا، اور سیف جان کے گھر چلے گئے۔ ان دونوں کے لیے ناشتا بھی لیتے گئے۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ پوری وادی سنہری دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ ہم شہتوت کے قریب رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سیف جان اور ماریہ کمرے میں ناشتا کر رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ہمارے پاس آیا ہی تھا کہ بیرونی دروازے پہ دستک ہوئی۔ وہ دروازہ کھولنے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہمراہ سالم جان مذہبی پیشوا دریون بابا اور وادی کے چار پانچ بزرگ بھی تھے۔ ہم نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ پھر سیف جان نے انہیں لکڑی کے بنے تخت پوش پر بٹھا دیا۔ سالم جان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ مجھے یوں لگا وہ ساری رات روتا رہا ہے۔ سیف جان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ماریہ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ ہم سب آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دریون بابا نے پشتو میں سیف جان سے کوئی بات کی تو وہ بولا۔ ”دریون بابا! میں چاہتا ہوں آپ اردو میں بات کریں۔ تاکہ ہمارے مہمان بھی سمجھ سکیں۔“

یہ سن کر وہ ہنسنے لگے، پھر بولے۔ ”اچھا... اب تو م سالم جان کو پیسے دو۔“

”بابا کتنے پیسے دوں؟“

”پچاس ہزار روپے۔ کیونکہ اس نے اپنی شادی پہ پچیس ہزار خرچا کیا تھا۔“ سیف جان یہ سن کر اٹھا اور کمرے میں چلا گیا۔ سالم جان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے کمرے میں گئے دس منٹ ہو چکے تھے۔

سب کی نظریں کمرے کے دروازے کی پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد سیف جان ماریہ کا ہاتھ پکڑے باہر نکلا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی تھی۔ (جو اسے ہم نے دی تھی) وہ ماریہ کو لے کر سیدھا دریون بابا کے پاس آیا اور دل فگار لہجے میں بولا۔

”بابا محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ انمول ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سالم جان ماریہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ آج میں چاہوں تو اس کی محبت خرید سکتا ہوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ محبت کرنے والے جدائی کا درد نہیں سہہ سکتے۔ ہاں بابا یہ درد لا دوا ہوتا ہے۔ میں کئی سال سے اس کرب میں مبتلا ہوں۔“

دریون بابا کے ساتھ ساتھ ہم تینوں بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ پل خاموش ہوا پھر بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بابا میں جانتا ہوں۔ ہاں میں جانتا ہوں...... جدائی کا زہر پینا بہت مشکل ہے۔ یہ بہت اذیت دیتا ہے۔ دل کی جگہ درد ڈیرا ڈال لیتا ہے۔ میں یہ درد جھیلتا رہا ہوں، جھیل رہا ہوں۔ مجھے سالم جان کی حالت سے اندازہ ہو رہا ہے۔ اس نے ساری رات انگاروں پر گزاری ہے۔ بابا جو محبت کرتے ہیں۔ وہ محبت کرنے والوں کا درد سمجھتے ہیں، اور جو درد سمجھتے ہوں وہ کسی کو درد نہیں دیتے۔“ آخر میں اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ماریہ کا ہاتھ پکڑے سالم جان کے قریب چلا گیا اور اس کا ہاتھ سالم جان کے ہاتھ میں دے کر پشتو میں کچھ کہا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے۔ اگلے لمحے وہ اٹھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر وہ ماریہ کو لے کر چلا گیا۔

دریون بابا نے اب اپنے ساتھ آئے لوگوں کو پشتو میں کچھ بتایا۔ وہ سب اٹھے اور سیف جان کو باری باری سینے سے لگانے لگے۔ پھر وہ سب چلے گئے۔ اس دن بہت کچھ انوکھا ہوا تھا۔ تین بجے کے لگ بھگ ہم واپسی کے لیے نکل رہے تھے۔ وادی کے کافی لوگ جیپ کے اردگرد کھڑے تھے۔ جن میں دریون بابا اور ان کے بیٹے بھی تھے۔ دریون بابا جو بہت مخلص انسان تھے۔ بعد ازاں میری ان کے ساتھ کافی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ اب ہمارے ساتھ بستی کا ایک اور باسی بھی جا رہا تھا۔ وہ دریون بابا کی بیٹی زویا تھی۔ انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی سیف جان سے کردی تھی اور اب وہ دونوں ہمارے ساتھ راولپنڈی جا رہے تھے۔ وادی کے لوگوں کے بہت زیادہ اصرار کے باوجود سیف جان یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ہم الوداعی نظروں سے وادی کے پیار کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ دریون بابا کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ سیف جان نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد جیپ وادی سے باہر جانے والی سڑک پر جا رہی تھی۔ وہ اپنے برابر بیٹھی زویا کو محبت پاش نظروں سے دیکھ کر مسکرایا اور پشتو میں کوئی گیت گنگنانے لگا۔ وہ ہار کر بھی جیت گیا تھا۔
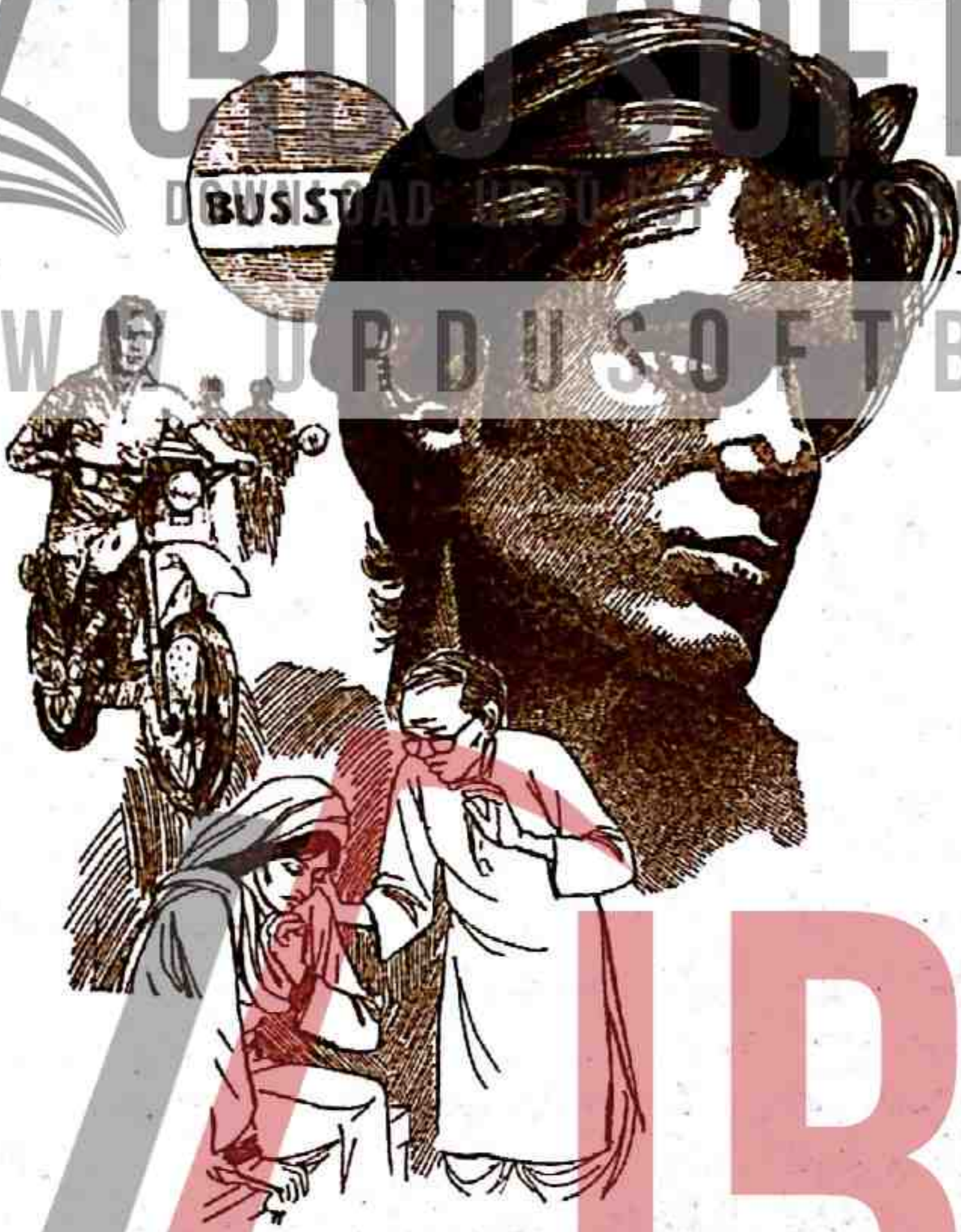
برائی کا فیشن

جناب مدیر اعلیٰ:
سلام مسنون

یہ سچ بیانی عام ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی ہے یعنی فرسٹ پرسن کی بجائے سیکنڈ پرسن میں بیان کی گئی ہے لیکن دلچسپ ہے۔ اس میں ایک مثبت پیغام ہے اس لیے شامل کرنا ضروری ہے۔

واصف حسن
(کراچی)

واصف واش روم میں تھا کہ اس کے موبائل پر ایس ایم ایس آنے کی ٹون بجی۔ وہ کچھ دیر بعد تولیا سے سر رگڑتا باہر آیا تو میمونہ اس کے موبائل پر کچھ دیکھ رہی تھی، اس نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔ ”مونا جان! کیا بات ہے آج جاسوسی ہو رہی ہے۔“

مونا نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”مغی مجھے لگ رہا ہے۔ یہ لڑکی کچھ سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔“

واصف چونکا۔ ”کون لڑکی... روبینہ؟“

مونا نے سر ہلایا۔ ”ہاں، دیکھیں آج اس نے کیسا ایس ایم ایس کیا ہے؟“

واصف نے ایس ایم ایس دیکھا۔ واقعی، یہ بڑا رومانی شاعری لیے ہوئے ایس ایم ایس تھا۔ اسے بھی عجیب سا لگا لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا اور بے پروائی سے بولا۔ ”کوئی خاص نہیں ہے، آج کل تو ایسے ایس ایم ایس عام ہیں۔“

”مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس نے خاص طور سے آپ کو کیا ہے اور شاعری دیکھی ہے آپ نے اس میں نارسائی کا رونا ہے۔“

”کم آن یار، وہ صرف ایک فین ہے۔“ واصف نے موبائل بستر پر ڈال دیا۔ مونا اس کے پاس آ گئی۔

”میں کوئی اعتراض نہیں کر رہی ہوں اور نہ مجھے آپ پر شک ہے۔“

واصف مسکرایا۔ ”اگر تم کہو تو اس کے ایس ایم ایس کا جواب دینا بند کر دوں؟“

”نہیں، بے چاری نے اتنی مشکل سے نہ جانے کتنے جتن کر کے آپ کا نمبر لیا ہے۔“

”تب تم ان باتوں پر توجہ مت دیا کرو اور اسے نارمل لو۔“

کوئی چھ مہینے پہلے اس کے موبائل پر روبینہ نامی لڑکی کے ایس ایم ایس آنا شروع ہوئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی فین ہے اور اس کے سارے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہے۔ واصف اپنا نمبر کسی کو دیتا نہیں تھا اور یہ نمبر تو بہت خاص لوگوں کے پاس تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس لڑکی نے یہ نمبر کہاں سے حاصل کیا ہے۔ اسے شک ہوا کہ کوئی اسے بے وقوف بنا رہا ہے، اس لیے اس نے نمبر کی انکوائری کروائی تو پتا چلا کہ سچ مچ روبینہ نامی لڑکی کا نمبر ہے۔ ایک دن اسے ایس ایم ایس آیا۔ روبینہ نے لکھا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتی ہے اور اسے پرستش کی حد تک چاہتی ہے۔

واصف نے اسے کال کر لی۔ ”میں واصف بات کر رہا ہوں۔“

روبینہ کی کچھ دیر تو آواز ہی نہیں نکلی تھی۔ پھر اس نے بمشکل کہا۔ ”وہ آپ... مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”میں واصف ہی ہوں کیونکہ اپنے نمبر سے کال کر رہا ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ اس قسم کے ایس ایم ایس کیوں کرتی ہیں؟“

”کس قسم کے ایس ایم ایس سر؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

واصف کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس طرح بتائے اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ ”تم میری اداکاری پسند کرتی ہو؟“

”جی سر، بہت زیادہ۔“ وہ کھل اٹھی تھی۔ ”آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آپ کو کتنا پسند کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ واصف نے کہا اور فون بند کر دیا۔

روبینہ کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی تھی۔ شاید کالج گرل تھی۔ واصف نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اس کے ایس ایم ایس آتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اس سے کوئی سوال کرتی تو وہ اسے جواب دے دیتا۔ پھر روبینہ اسے کچھ ایسے ایس ایم ایس کرنے لگی جو اس کے خیال میں مناسب نہیں تھے، یہ سب ہی شاعری پر مشتمل ہوتے تھے اور شاعری بھی خاصی رومانی ہوتی تھی۔ مونا اس کا موبائل دیکھ لیا کرتی تھی کیونکہ ان میں آپس میں کچھ چھپا نہیں تھا اس لیے مونا، روبینہ کے ایس ایم ایس بھی دیکھ سکتی تھی۔

واصف کو خود اس قسم کے ایس ایم ایس اچھے نہیں لگتے تھے۔ تعریف اور کسی کا فین ہونا اپنی جگہ لیکن ایک کم عمر اور بہ ظاہر نادان لڑکی کسی آدمی کو جو کسی کا شوہر بھی ہو، اس قسم کی شاعری ایس ایم ایس کرے، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا وہ ایسے ایس ایم ایس دیکھتے ہی ڈیلیٹ کر دیتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مونا ان ایس ایم ایس کو دیکھے اور اس کے دل میں کوئی غلط خیال آئے۔ پھر روبینہ نے مونا کا نمبر بھی مانگ لیا۔ واصف نے مونا سے پوچھ کر دے دیا۔ اب وہ مونا کو بھی ایس ایم ایس کرنے لگی۔ واصف نے سکون محسوس کیا تھا۔ روبینہ کے ایس ایم ایس ڈیلیٹ کر کے اسے احساسِ جرم سا ہوتا تھا حالانکہ اس کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ اب روبینہ نے وہی ایس ایم ایس مونا کو بھی کرنا شروع کیے تو اس کے سر سے بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔

واصف ایک اسٹریٹ فارورڈ قسم کا شخص تھا، اس سے پہلے اس سے جتنی لڑکیوں یا عورتوں نے فین ہونے کے ناتے بات کرنے کی کوشش کی، اس نے ان سے... دو ٹوک انداز رکھا اور ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس سے کوئی غلط بات کہہ سکیں یا ایک حد سے زیادہ فری ہوتیں۔ واصف ان کی فطرت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے انسانوں کو پرکھنا آتا تھا لیکن روبینہ کی فطرت اسے ان سب سے الگ لگی

تھی۔ اس کے انداز میں ایک پُرخلوص معصومیت کے ساتھ ساتھ ایک ناسمجھی بھی ہوتی تھی اور وہ جو کسی کی پروا نہیں کرتا تھا اس لڑکی کی پروا کرنے لگا تھا۔ البتہ اس کے بعض خاص پیغامات سے الجھن برقرار رہتی تھی۔

واصف دیکھتا تھا کہ چاروں طرف یہی ہو رہا تھا۔ کمسن لڑکیاں اور لڑکے عشق کا کھیل کھیلتے تھے اور موبائل نے ان کو آسانی مہیا کردی تھی۔ بہ ظاہر یہ سیدھا سادہ جمع دو برابر چار والا معاملہ تھا لیکن جب وہ روبینہ کے بارے میں سوچتا تو اس کے اندر سے کوئی کہتا کہ وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اس کی فین ہے اور بس۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ اور نہیں سوچا۔

اگرچہ مونا اور روبینہ کی آپس میں بات چیت تھی لیکن کچھ عرصے سے وہ اس سے مطمئن نہیں تھی۔ ایک دن اس نے واصف سے کہا۔ ”یہ روبینہ ہماری لائف میں کچھ زیادہ ہی دخل نہیں دینے لگی ہے۔“

واصف جو ایک ٹی وی شو دیکھ رہا تھا اس کی بات پر چونک گیا۔ ”کیا مطلب، کیا کہا ہے اس نے؟“

”کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا؟“

”نہیں، مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔“

”وہ مجھ سے ہماری پرسنل زندگی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتی ہے۔“

”تو تم جواب مت دیا کرو۔“ واصف دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مونا جھنجلا گئی۔

”افوہ آپ جانتے نہیں ہیں کیا اسے.... اگر کسی سوال کا جواب نہ دو تو وہ کس طرح دکھی ہو جاتی ہے اور پھر اس کی دکھی شاعری سے بھرپور میسیجز آنے لگتے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے مجھے بھی آتے ہیں لیکن ان کو اتنا زیادہ سر پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھ لو بچی ہے اور بچوں کی باتوں کو زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔“

مونا نے گہری سانس لی۔ ”مگر وہ مجھے بچی نہیں لگتی۔“

واصف نے جان بوجھ کر اس کی بات نظر انداز کر دی۔ پھر اس روز مونا نے اس کے موبائل پر روبینہ کا ایس ایم ایس دیکھ لیا اور اس نے محسوس کرلیا کہ معاملہ بگڑ رہا تھا۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ مونا اس پر کبھی شک نہیں کرے گی لیکن اس کی وجہ سے مونا کو کوئی دکھ یا معمولی سی تکلیف ہو یہ اسے بالکل گوارا نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔

واصف ملک ایک ٹی وی آرٹسٹ تھا۔ وہ گزشتہ پندرہ برس سے ٹی وی ڈراموں اور بعض دوسرے پروگراموں میں کام کرتا آیا تھا۔ شروع میں اداکاری اس کا پیشہ نہیں تھا۔ اس نے ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ کیریئر کا آغاز اس نے نوکری سے کیا تھا اور آج کل اپنی ایک چھوٹی سی فرم چلا رہا تھا۔ نوکری کرتے ہوئے ٹی وی میں کام کرنا مشکل تھا۔ اسے چھٹی مشکل سے ملتی تھی اور آئے دن باس کی بنی ہوئی صورت دیکھنا پڑتی تھی۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے، ایک اداکاری ترک کردے لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ یہ کام بھی مشکل تھا لیکن وہ کرسکتا تھا اس لیے اس نے یہی کیا۔

جب واصف نے اداکاری شروع کی تو ملک میں دو چینل تھے اور کام محدود تھا۔ بلکہ کام زیادہ تر سفارش اور تعلقات کی بنیاد پر ملتا تھا۔ کسی نئے اداکار کی جگہ مشکل سے بنتی تھی۔ واصف خوش شکل تھا اور اس میں اداکاری کی صلاحیت بھی تھی لیکن کوئی غیر محسوس سی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ ہیرو نظر نہیں آتا تھا۔ اسے خود بھی اس کا احساس تھا اس لیے اس نے ہیرو بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے ہر وہ کردار قبول کیا جو اسے آفر کیا جاتا۔

بات صرف شکل صورت کی نہیں تھی کیونکہ اس سے کہیں معمولی صورت رکھنے والے ہیرو آرہے تھے۔ لیکن اس پر ایک چھاپ بھی لگ گئی کہ وہ بہت اچھا کریکٹر ایکٹر تھا۔ اس لیے جب کسی ڈرامے کی کاسٹنگ کے وقت واصف کے بارے میں غور کیا جاتا تو اس کے حصے میں ہمیشہ کوئی سائڈ رول آتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ اسے بنا کسی کوشش کے ڈرامے کا اہم ترین رول دے دیا گیا لیکن کوشش کے باوجود اسے ہیرو کا رول نہیں مل سکا۔ واصف دو تین بار ہیرو کے رول میں بھی آیا تھا لیکن وہ جچا نہیں۔ اس لیے وہ دوسرے اہم کردار ادا کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی ایک شناخت بنالی تھی۔ وہ کہیں باہر جاتا تو کہیں نہ کہیں اسے پہچان کر لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ مگر یہ پسند والہانہ حد تک نہیں تھی۔ لوگ اس سے مناسب انداز میں ملتے اور اسے سراہتے تھے۔ اسے اچھا لگتا تھا اس لیے وہ معروف اداکاروں کی طرح بھیس بدل کر باہر نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی اسے عجیب سا لگتا تھا کہ اس سے جونیئر فن کاروں سے لوگ کتنی والہانہ محبت کرتے تھے۔ وہ کہیں نظر آجاتے تو ان کے پیچھے دیوانہ وار لپکتے تھے لیکن جب وہ ان فن کاروں کو بے

زار اور ان کی پبلک لائف کا خاتمہ دیکھتا تو خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

سات آٹھ سال پہلے جب نجی تفریحی چینلو شروع ہوئے تو ڈراموں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔اس وقت تک واصف ایک وقت میں ایک ہی ڈرامے میں کام کرتا تھا کیونکہ اسے وقت کم ملتا تھا۔پھر نجی پروڈکشن کی وجہ سے ڈرامے زیادہ بننے لگے اور اداکاروں کے معاوضے میں بھی معقول اضافہ ہوا تو واصف نے بھی پہلے سے زیادہ کام شروع کر دیا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ سارا دن اور پھر رات میں بھی شوٹنگ میں حصہ لیتا تو ملازمت کب کرتا۔اس کی فرم کے مالکان کچھ عرصے تو یہ صورتِ حال برداشت کرتے رہے پھر انہوں نے اسے نوٹس دے دیا کہ وہ ملازمت کرے یا اداکاری۔واصف فرم میں بہت اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا اور اسے اچھی تنخواہ ملتی تھی۔

مگر جب کام بڑھا اور اس حساب سے معاوضے بھی بڑھے تو واصف کو اچھی آمدنی ہونے لگی تھی۔اب وہ سوچ رہا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر فل ٹائم اداکاری شروع کر دے۔ایک ایسے وقت جب سب فنکار کما رہے تھے تو وہ کیوں پیچھے رہتا۔پھر جب اس کے فرم مالکان نے اسے وارننگ دے دی تو اس نے سوچا کہ اب فیصلے کا وقت آ گیا ہے اور اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔اسے نقصان نہیں ہوا تھا بلکہ فائدہ ہی ہوا تھا کیونکہ اس کی ملازمت کی وجہ سے پروڈیوسرز اسے بڑے پروجیکٹس میں لینے سے ہچکچاتے تھے کہ اس کی طرف سے ڈیٹس کا مسئلہ نہ ہو۔بڑے پروجیکٹ ان دنوں سارے بیرونِ ملک شوٹ ہو رہے تھے لیکن جیسے ہی اس نے نوکری چھوڑی وہ پروڈیوسرز کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔اس کی ساکھ اچھی تھی، وہ ڈیٹ کے معاملے میں تنگ نہیں کرتا تھا کام پوری محنت اور ذمے داری سے کرتا تھا، اسے سیٹ پر اسکرپٹ پڑھنے کی عادت نہیں تھی۔وہ اپنا کردار خوب سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اسے بلا جھجک سیریلز اور بیرونِ ملک شوٹ ہونے والے ڈراموں میں کاسٹ کیا جانے لگا۔

چند سالوں میں اس نے اتنا کما لیا کہ اپنی ایک چھوٹی سی فرم قائم کر لی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے لگا۔ ایک تو اس کام میں اسے مسلسل دفتر میں نہیں بیٹھنا پڑتا تھا، جن دنوں کوئی کنسائنمنٹ آ رہی یا جا رہی ہوتی تب ہی وہ دفتر میں بیٹھتا تھا ورنہ اس کا عملہ کام دیکھتا تھا۔اپنے تعلقات اور مقبولیت کی وجہ سے اس کے کاروباری مسائل اور خاص طور سے سرکاری دفاتر والے مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔

ملازمت کے دوران اس نے بڑی مشکل سے دو بیڈروم کا ایک فلیٹ بنایا تھا۔لیکن جب اس نے ملازمت چھوڑی اور اپنا کام شروع کیا تو چند سال میں اس نے ایک چھوٹا بنگلا خرید کر اسے اپنی اور مونا کی مرضی کے مطابق آراستہ کیا تھا۔پہلے اس کے پاس سوزوکی مہران تھی اور اب اس نے وٹز لے لی تھی۔

واصف اور مونا کی شادی کو پندرہ برس گزر چکے تھے یعنی تقریباً اتنا ہی عرصہ جتنا اسے اداکاری میں آئے ہوئے ہو چکا تھا اور اس کی زندگی بھی اداکاری اور مونا کی محبت سے عبارت تھی۔ان کی لو میرج تھی۔واصف کو کالج کے زمانے سے اداکاری کا شوق تھا۔جن دنوں وہ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔اسی دوران گرلز کالج میں ہونے والے ڈرامے میں بہ طور گیسٹ کام کر رہا تھا اور وہیں اس کا پہلی بار مونا سے سامنا ہوا تھا۔مونا اس کالج میں بی اے فائنل میں تھی۔اسٹیج پر اداکاری کے دوران واصف نے اسے دیکھا، وہ پہلی قطار میں بیٹھی تھی اور دونوں پہلی ہی نظر میں دل ہار بیٹھے تھے۔

ڈرامے کے بعد مونا نے آٹوگراف کے بہانے واصف سے اس کا نمبر لے لیا۔اس نے آٹوگراف بک سامنے کی تو واصف نے پوچھا۔”اس پر کیا لکھوں؟“

مونا نے ایک ادا سے کہا۔”اپنا فون نمبر لکھ دیں۔“

واصف نے لکھ دیا اور آہستہ سے بولا۔”میں نے تو لکھ دیا لیکن مجھے کال کرنا پڑے تو کس نمبر پر کروں گا؟“

”نمبر بھی مل جائے گا اگر کوئی تلاش کرے گا تو۔“

مونا نے کہا اور اس کے سامنے سے ہٹ گئی کیونکہ اور لڑکیاں بھی آ گئی تھیں۔واصف نے بے چین ہو کر اسے دیکھا لیکن وہ پھر نظر نہیں آئی۔اس تقریب سے آنے کے بعد بھی واصف کو اسی کا خیال آتا رہا۔وہ تعلیم کے سلسلے میں کراچی میں اکیلا مقیم تھا اور اس کا تعلق ملتان کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا مالی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔جب وہ ایم بی اے کرنے کراچی آیا تو اس کے باپ نے اسے یہ چھوٹا سا فلیٹ خرید کر دے دیا تھا تاکہ اسے کرائے پر دھکے نہ کھانے پڑیں۔رابطے کے لیے فون لگوا لیا تھا۔کالج میں ہونے والے ڈرامے کے دو دن بعد وہ اپنے فلیٹ میں آنے والے

ایک ٹیسٹ کی تیاری کررہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو کون بات کررہا ہے؟"
"بھول گئے۔" کسی قدر شوخ نسوانی آواز نے کہا۔
وہ چونکا۔ "میں نے پہچانا نہیں۔"
"آپ واقعی بھول گئے کسی کو اپنا نمبر دیا تھا۔"
"آپ......!" اس نے بے ساختہ کہا۔ "آپ..... کیسے یاد کرلیا؟"
"آپ بھولے کب تھے۔" وہ بولی۔
"پھر فون کیوں نہیں کیا؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے شوقیہ نمبر لے لیا ہے۔"
"ہمت کررہی تھی۔" مونا نے آہستہ سے کہا۔
"اتنے دن سے ہمت کررہی تھیں؟"
"ہاں، سچ کہوں تو میں نے بہت ہمت کرکے آپ کو کال کی ہے۔"
"ایک دفعہ ہمت کرلی ہے تو اب کال کرتی رہوگی؟"
"ہاں کرتی رہوں گی۔" مونا شرما گئی۔ "اچھا اللہ حافظ۔"
"اللہ حافظ!" واصف نے کہا اور فون بند ہوگیا۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ مونا سے بات کرکے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ لیکن اس کی محبت میں شدت کا پتا اسے آنے والے دنوں میں چلا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے فون پر بات کرتی تھی۔ معاملہ ڈھکے چھپے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا لیکن ابھی دونوں میں سے کسی نے کھل کر اقرار محبت نہیں کیا تھا۔
پھر ایک بار ایسا ہوا کہ پورے ایک ہفتے تک مونا کی کال نہیں آئی۔ اس ایک ہفتے میں واصف کو اندازہ ہوا کہ وہ اسے کس قدر چاہنے لگا تھا۔ کتنی بار اس نے موبائل کا نمبر ملانا چاہا کئی بار ایسا بھی ہوا کہ نمبر ملا بھی دیا لیکن بیل جانے سے پہلے اس نے کاٹ دیا۔ جب ایک ہفتہ ہوگیا تو اس کا صبر جواب دے گیا اور اس نے مونا کے نمبر پر کال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ فون اٹھانے جا ہی رہا تھا کہ اس کی بیل بجی اور سی ایل آئی پر مونا کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ "مونا کہاں تھیں تم؟ تم ٹھیک تو ہو؟ فون کیوں نہیں کررہی تھیں؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔
وہ ہنسی۔ "آپ کو میری کال کا انتظار تھا۔"
"دل و جان سے۔" اس نے کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ اس ایک ہفتے میں میری حالت کیا ہوگئی ہے؟"
"میں بیمار تھی، فلو ہوگیا تھا۔ بستر سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ امی نے فون کرنے پر بھی پابندی لگادی تھی۔"
"اب کیسی ہو؟"
"ٹھیک ہوں، آج پہلی بار چلنے پھرنے کی اجازت ملی ہے تو سب سے پہلے آپ کو کال کی ہے۔"
"میں نے کتنی بار تمہیں کال کرنے کا سوچا لیکن پھر رک گیا کہ کہیں تمہیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"
"مجھے بھی یہی خوف تھا کہ کہیں آپ کال نہ کرلیں۔ ویسے میرا نمبر ہے آپ کے پاس؟"
"ہاں اسی دن سے ہے جب تم نے پہلی بار کال کی تھی۔ میرے سیٹ میں سی ایل آئی ہے اور اس وقت میں تمہیں کال کرنے ہی جارہا تھا۔"
"آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ میرا نمبر آپ کے پاس ہے؟"
"میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن آج میں بس صبر چھوڑ بیٹھا تھا اور تم کو کال کرنے جارہا تھا کہ تمہاری کال آگئی۔"
"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" مونا ہنسی۔
"مونا میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" واصف نے اچانک کہا تو مونا چپ ہوگئی۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر بولا۔ "کیا میری بات بری لگی؟"
"نن.... نہیں۔" مونا نے جواب دیا۔
"تو پھر بولونا؟"
"میں.... میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" مونا نے بہ مشکل کہا اور فون بند کردیا۔ اس بار واصف نے خود فون کرلیا۔ اقرار محبت کے بعد کی منزل آسان بھی ہوتی ہے اور مشکل بھی۔ ان کے لیے بھی یہ مرحلہ آگیا تھا۔ دونوں اپنا حال دل بیان کرکے مطمئن تھے لیکن اب مستقبل کے اندیشے انہیں ڈرا رہے تھے۔ واصف کو خوف تھا کہ مونا کے گھر والے مانیں گے یا نہیں اور یہی خوف مونا کو تھا۔ مونا کا گھرانا ذرا بہتر متوسط طبقے کا تھا اس کے والد ایک انشورنس کمپنی میں منیجر تھے۔ دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ مونا سب سے چھوٹی اور بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ چھ مہینے بعد اس کے پیپرز تھے۔
"میرا ایم بی اے کا آخری سمسٹر ہے۔" واصف نے کہا۔ "مالی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن میں کوئی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور جیسے ہی مجھے کوئی

ملازمت ملی میں گھر والوں کو تمہارے گھر لے آؤں گا۔“
”کیا وہ مان جائیں گے؟“ مونا کو خدشہ ہوا۔
”ہاں مان جائیں گے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اور میری ہر بات مانی جاتی ہے۔“ واصف نے یقین سے کہا۔
آخری امتحان دیتے ہی واصف نے ملازمت کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے ملتان جاکر ماں باپ سے بات کرنے کی تیاری کی اور ایک دن روانہ ہوگیا۔ اس نے باپ کے بجائے ماں سے بات کی اور وہ مان گئی اس نے واصف سے کہا۔ ”پتر تو فکر نہ کر جا تیرے باپ کو بھی میں منا لوں گی۔“
ماں نے باپ سے بات کی اور وہ بھی مان گیا۔ واصف خوش ہوگیا تھا کہ ایک حد تک مشکل نظر آنے والا معاملہ آسانی سے طے ہوگیا تھا، اب اسے مونا کے گھر والوں کی فکر تھی۔ لیکن قسمت اس پر مہربان تھی۔ وہ واپس کراچی آیا تو ایک فرم کا انٹرویو لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس نے جاکر انٹرویو دیا اور اسے ملازمت کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ تقدیر خود اس کی راہیں ہموار کر رہی تھی۔ پھر اس نے مونا کے والد احمد کرمانی سے بات کی اور مونا کے رشتے کے لیے اپنے ماں باپ کو لانے کے لیے کہا۔ احمد کرمانی مان گیا تھا۔
”کیوں نہیں بیٹا.... بیٹیاں گھر بٹھانے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔“
واصف خوش ہوگیا تھا۔ ”تو میں اپنی امی ابو کو لا سکتا ہوں۔“
”کیوں نہیں لیکن پہلے ان سے کہو مجھ سے فون پر رابطہ کرلیں۔“
احمد کرمانی سمجھ دار آدمی تھے، انہوں نے واصف سے کوئی سوال نہیں کیا کہ مونا سے اس کا رابطہ کیسے ہوا۔ وہ سمجھ گئے کہ اس رشتے میں ان کی بیٹی کی مرضی بھی شامل ہے۔ واصف نے اپنے ماں باپ کو بتایا اور وہ کراچی آگئے۔ وہ مونا کے گھر گئے اور سادہ سے انداز میں رشتہ ڈال دیا۔ مونا کے گھر والوں کو بھی رشتہ پسند آگیا تھا۔ ایک ہفتے بعد دونوں کی رسم کر دی گئی اور طے ہوا کہ شادی چھ مہینے بعد ہو گی۔
یہ مراحل بھی گزر گئے اور ان دونوں کو بہت دن تک یقین نہیں آیا کہ وہ ایک ہو چکے ہیں۔ ولیمے کے بعد وہ گھومنے کے لیے شمالی علاقے کی طرف گئے تھے اور ایک ہفتہ وہاں گزار کر سیدھے واپس کراچی آگئے تھے کیونکہ واصف کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ وہ آکر دفتر میں مصروف ہوگیا۔ ان ہی دنوں اسے ایک ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی تھی۔ کاسٹ میں اس کا ایک دوست شامل تھا۔ اس نے ایک چھوٹے سے کردار کے لیے واصف کو بھی شامل کرا دیا۔ کردار غیر اہم سا تھا لیکن اس کی اداکاری ہدایت کار کو اتنی اچھی لگی کہ اس نے واصف کا کردار بڑھا دیا اور پہلے ہی ڈرامے سے اسے اچھا ردعمل دیکھنے کو ملا۔ اس کے بعد اس کے لیے منزل آسان ہو گئی تھی۔
مونا کو نہیں معلوم تھا کہ واصف ٹی وی پر بھی کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے زمانہ طالب علمی میں اسٹیج کی حد تک شوق تھا۔ شادی کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ کسی قدر پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن واصف نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کرلیا تھا۔
”کیا بات ہے، تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ تم ایک ٹی وی آرٹسٹ کی بیوی ہو؟“
مونا ہچکچائی۔ ”نہیں، خوشی تو ہوئی ہے لیکن آج کل ٹی وی آرٹسٹ لڑکیوں میں بہت مشہور ہیں۔“
واصف ہنسا۔ ”وہ تو ہمیشہ سے مقبول رہے ہیں۔ تم میری اور اپنی بات کرو۔“
مونا نے صاف کہہ دیا۔ ”مجھ سے برداشت نہیں ہوگا کہ لڑکیاں آپ کو کال کریں اور آپ کے پیچھے بھاگیں۔“
”ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اوّل تو مجھے ابھی کوئی جانتا نہیں ہے اور دوسرے میں خود بھی اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔“
”میں آپ کو جانتی ہوں لیکن آج کل کی لڑکیاں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ میرے ساتھ کالج میں کچھ لڑکیاں تھیں جو آرٹسٹوں سے دوستی کے قصے سناتی تھیں۔“
”ہاں آج کل کی لڑکیاں واقعی بہت تیز ہوگئی ہیں۔“ واصف نے معنی خیز شوخی سے اسے دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔
”جی نہیں، میں نے آپ سے محبت کی تھی اور یہ آپ کی فن کاری کا تو شادی کے بعد پتا چلا تھا۔“
”میں جانتا ہوں۔“ واصف سنجیدہ ہوگیا۔ ”اور تم بھی مجھے جانتی ہو اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“
بعد میں واصف نے ثابت بھی کیا کہ وہ کردار کا مضبوط آدمی ہے۔ جب وہ مشہور ہوا اور اس کو گھر پر پرستاروں کی کالز آنا شروع ہوئیں تو اس نے اپنا فون تبدیل

کروالیا۔ موبائل سروس کا آغاز ہوگیا تھا لیکن ابھی اس کی کوریج زیادہ نہیں تھی اور لوگ رابطے کے لیے زیادہ تر لینڈ لائن ہی استعمال کرتے تھے۔

اس کا نیا نمبر ڈائریکٹری میں نہیں تھا۔ اس لیے کوئی اس کا نمبر حاصل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہیرو نہیں تھا اس لیے نوجوان نسل میں اتنا مقبول بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس سے دوستی کی خواہش مند خواتین یا لڑکیوں کی کوئی کمی تھی جن کے دماغ میں شوبزنس کا کریز ہوتا ہے وہ تو کسی سے تعلقات بڑھانے میں نہیں چوکتیں ہیں۔ خود واصف نے دیکھا تھا، پی ٹی وی کے ایک مشہور زمانہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر جو شکل صورت میں بالکل گئے گزرے تھے ان کے گرد بھی حسین صورتیں منڈلاتی رہا کرتی تھیں جبکہ اس زمانے میں اتنی آزادی نہیں تھی۔

پھر زمانہ بدلا اور روشن خیال حکومت نے باقاعدہ منصوبے کے تحت مادر پدر آزادی کی تحریک شروع کردی اور نئی نسل قابو سے باہر ہوگئی۔ جو خرابیاں پہلے ایلیٹ کلاس میں تھیں وہی اب موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے متوسط طبقے میں گھس آئیں۔ واصف حیران رہ جاتا جب اسے ایسی لڑکیاں دوستی کی پیش کش کرتی تھیں یا شوبزنس میں متعارف کرانے کے عوض ہر حد پار کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ مڈل کلاس یہ وہ لڑکیاں تھیں جو گھر سے برقع کے بغیر باہر نہیں جاتی تھیں اور وہ کلاس بھی تھی جو بی ایم ڈبلیو سے کم کار میں بیٹھنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ زمانے کی بے راہ روی میں سب ایک ہوگئے تھے۔

واصف کے گرد بھی حسین چہرے جمع ہوئے لیکن اس کے قدم نہیں ڈگمگائے اور وہ ان سے پہلو بچا کر نکل گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت پاکباز شخص تھا یا اسے حسین چہرے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن اسے ایک بات معلوم تھی کہ آوارگی کا کوئی انجام نہیں ہوتا۔ یہ انسان کو اس کی آخری سانس تک لے جاتی ہے۔ اس لیے...... اس نے پہلا قدم ہی نہیں اٹھایا تھا۔ پھر اسے مونا سے بے انتہا محبت تھی اور وہ اپنی ساری محبت اور توجہ کا حقدار مونا کو تصور کرتا تھا۔

ان کی زندگی میں اولاد کی کمی تھی۔ شروع میں تو انہوں نے بہت جتن کیے اور ڈاکٹروں کے پاس بھاگے۔ کسی حکیم کا پتا چلا تو اس کے پاس بھی دوڑے گئے اور جب سب نے کہہ دیا کہ بس قدرت کی طرف سے دیر ہے تو پھر صبر کرکے بیٹھ گئے۔ شادی کے پندرہ سال بعد ان کو توقع بھی اتنی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ ابھی دونوں جوان ہی تھے۔ واصف چالیس کا ہونے والا تھا جبکہ مونا ابھی پینتیس کی نہیں ہوئی تھی اور دیکھنے میں وہ اتنے کے بھی نہیں لگتے تھے۔ انہوں نے زندگی کو بہت سنبھال کر گزارا تھا۔ انہوں نے گھر میں ایک چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا اور واصف ہفتے میں ایک بار سوئمنگ بھی کرتا تھا جس سے وہ فٹ رہتا تھا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں تو مونا کو بور ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ وہ فلیٹ میں سارا کام خود کرتی تھی۔ پھر وہ اس بنگلے میں آئے اور واصف کی آمدنی بڑھی تو مونا نے ایک ملازمہ رکھ لی جو صبح سے شام تک گھر کے مختلف کام کرتی تھی۔ مونا صرف کھانا بناتی تھی اس کے کچن میں کام کے لحاظ سے ہر سہولت تھی اس لیے دو افراد کا کھانا بننے میں دیر نہیں لگتی تھی۔

بوریت سے بچنے کے لیے مونا نے ایک مونٹیسوری اسکول جوائن کرلیا تھا۔ اسکول اصل میں واصف کے ایک دوست کی بیوی نے کھولا تھا اور اس سے مونا کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے مونا کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ساتھ اسکول میں آجائے، جب تک قدرت کی طرف سے اسے کوئی مصروفیت نہیں مل جاتی۔ مونا کو یہ آفر اچھی لگی کیونکہ واصف صبح کا جاتا تو رات تک شوٹنگ میں مصروف ہوتا تھا اور اس دوران میں وہ اپنی فرم بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب مصروفیات زیادہ ہوتی تھیں تو اس کا چھٹی کا دن بھی شوٹنگ میں گزرتا تھا لیکن چھٹی کا دن مونا کو یوں بور نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاتی تھی۔ ماں باپ گزر چکے تھے مگر بھائی تھے۔ واصف کی مصروفیات پر وہ یوں اعتراض نہیں کرتی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ جب تک کوئی اداکار اپنی ساری توجہ کام کو دیتا ہے تبھی وہ کامیاب ہوتا ہے ورنہ شوبزنس کے لوگ اسے بھلانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔

واصف نے ٹی وی سے متعلق تمام مشہور ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھا اور اس کی سب سے دوستی یا اچھے تعلقات تھے لیکن ایک حد تک وہ اس سے زیادہ کا قائل نہیں تھا۔ اسے کسی کے ساتھ کبھی گھومتے پھرتے یا تفریح کرتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ واصف کو جاننے والے شوبزنس کے ایک صحافی دوست نے اس سے شکوہ کیا کہ وہ اسکینڈل کے معاملے میں کنجوس ہے۔ واصف مسکرا دیا۔ ”کوئی ایک تو شریف آدمی رہنے دو تم لوگ تو ان کے بھی اسکینڈل بنا دیتے ہو جو اس لفظ کے معنی بھی نہیں جانتے۔“

واصف اداکاروں کی ایسوسی ایشن کا سرگرم رکن تھا لیکن خالص شوبزنس کی تقریبات میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔

☆......☆

جب موبائل فون نیا نیا آیا تھا تب واصف نے پہلا موبائل لیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک جدید قسم کا موبائل تھا جس میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ اس میں انٹرنیٹ بھی استعمال کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اس جدید موبائل کے فیچرز کو استعمال کرکے نہیں دیکھا۔ دس برس گزرنے کے بعد اور ایک درجن سے زیادہ موبائل سیٹس بدلنے کے بعد بھی موبائل میں اس کا وہی استعمال تھا یعنی کال سننا اور کال کرنا۔ ہاں اتنی تبدیلی آئی تھی کہ ضرورت کے تحت وہ ایس ایم ایس کا استعمال بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے کبھی شوقیہ ایس ایم ایس نہیں کیے تھے۔

روبینہ سے پہلے واصف نے کسی فین سے اتنا تعلق نہیں رکھا تھا کہ وہ اس کے بارے میں سب جانے اور اس سے دن رات رابطہ رکھے لیکن واصف محسوس کرتا تھا کہ روبینہ اس کے معمولات میں شامل ہوتی جارہی تھی۔ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اگر وہ اسے رومانی قسم کے ایس ایم ایس نہ کرتی۔ اگر بات صرف اس کی ذات کی ہوتی تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن مونا تو ان کو نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس روز کے بعد بھی اس نے واصف سے کئی بار یہ سوال کیا تھا کہ جب وہ صرف اس کی فین ہے تو اس قسم کے ایس ایم ایس کیوں کرتی ہے۔ واصف کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مونا نے اس سے کہا۔

”میں آپ یا روبینہ پر شک نہیں کرتی ممکن ہے وہ آپ کو پسند کرتی ہو۔ لیکن وہ اگر آپ کو پسند کرتی ہے تو یہ بات اس طرح اشاروں کنائیوں میں کیوں کہتی ہے۔“

”میرا خیال ہے تم اس بارے میں زیادہ دور کی سوچنے لگی ہو۔ ممکن ہے اس کے نزدیک یہ عام سی بات ہو۔“

مونا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ کوئی لڑکی کسی آدمی سے پسند کے شدید جذبے کا اظہار کرتی ہو اور پھر اسے اتنے رومانی ایس ایم ایس بھی کرتی ہو تو یہ عام سی بات ہے۔“

واصف پریشان ہوگیا۔ ”مونا تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ دیکھو اب دور بدل گیا ہے۔“

”دور اتنا نہیں بدلا ہے۔“ مونا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج کل کی نسل ہم سے زیادہ ذہین ہے اور اسے پتا ہوتا ہے کہ وہ کیا کررہی ہے۔“

واصف کو مونا سے اختلاف تھا لیکن وہ اختلاف کرنا نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ نئی نسل کے بارے میں اس کا تجربہ کچھ اور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی نسل زیادہ ذہین تھی اور عام مسائل کو وہ اپنے بڑوں سے بہتر سمجھتی تھی لیکن جہاں تک لوگوں سے رویوں کا تعلق تھا تو اس نسل کو اتنا شعور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نسل اپنے بڑوں کی پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ جب آپ اپنے بچے کو تربیت کے لیے ٹی وی اور خاص طور سے کیبل کے سپرد کردو گے۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے انٹرنیٹ اور موبائل جیسی خطرناک چیزیں تھما دو گے تو ایسے بچوں سے آپ یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ رکھ رکھاؤ کے معاملے میں آپ جیسے ہوں گے۔

واصف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ روبینہ کو کس طرح سے یہ احساس دلائے کہ وہ ناسمجھی میں اس کو پریشان کررہی تھی۔ اسے کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے کوئی حل بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

واصف مکالمے بولنے میں ماہر تھا اور اس کے کہے ہوئے فقرے اور اسٹائل لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا تھا لیکن ذاتی زندگی میں زبان سے کسی کو قائل کرنے میں اسے بہت دشواری پیش آتی تھی۔ اس لیے وہ کسی سے بحث کرنے یا کسی کو قائل کرنے کی کوشش کم ہی کرتا تھا۔

لیکن روبینہ کے معاملے میں اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا گھر متاثر ہوتا اسے اس مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ کئی دن غور کرنے کے بعد اس نے پہلے مونا سے بات کی۔ ”میرا خیال ہے اب وقت آگیا ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔“

”میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔ آپ اس سے بات کریں کہ اس کے ذہن میں کیا ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو اسے سمجھائیں۔“

واصف ہچکچایا۔ ”ایک حل تو یہ ہوسکتا ہے کہ اسے نظرانداز کردیں۔“

مونا اس کا مسئلہ سمجھ رہی تھی۔ اس نے واصف کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اسے میری طرف سے کوئی پریشر مت سمجھیں۔ اگر ہماری زندگی میں کوئی مسئلہ آتا ہے تو کیا ہم اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اسے بھی ایک مسئلہ ہی سمجھیں۔“

''میں اس سے بات تو کرلوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ انجانے میں مجھ سے کسی کی دل آزاری نہ ہو جائے۔''

''آپ کو اس سے بات کرنا ہوگی۔ آپ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے کیونکہ آپ کو اس کی فکر ہے اور آپ کے ناتے مجھے بھی اس کی فکر ہے۔ اگر آپ کو فکر نہ ہوتی تو آپ ایک کال یا ایس ایم ایس کے ذریعے کہہ سکتے تھے کہ اب وہ آپ سے کوئی رابطہ نہ رکھے لیکن مجھے معلوم ہے آپ اسے ایسا نہیں کہہ سکتے اور نہ میں آپ سے ایسا مطالبہ کروں گی۔''

''جب تمہیں معلوم ہے تو تم کیوں چاہتی ہو کہ میں اس سے بات کروں؟''

مونا ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''کیونکہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اس سے بات کلیئر کرلیں تو اس کے لیے بھی بہتر ہوگا اور ہمارے لیے بھی۔''

واصف بدستور ہچکچا رہا تھا اتنے دنوں میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ روبینہ بہت حساس لڑکی تھی۔ وہ اس سے بات کرتا اور اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جس سے اس کی دل آزاری ہوتی تو واصف کو بہت دکھ ہوتا۔ اس نے مونا سے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں موقع دیکھ کر اس سے بات کرلوں گا لیکن اب تم اس بارے میں مجھ سے بار بار پوچھنا مت۔''

''اوکے میں نے آپ پر چھوڑ دیا ہے۔'' مونا مسکرائی تھی۔

واصف سمجھ رہا تھا کہ مونا اس کی ذات کے آس پاس بھی کسی کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ واصف پر اپنا مکمل حق سمجھتی تھی اور کوئی واصف کے بارے میں سوچے یا اس سے جذباتی وابستگی رکھے مونا کو یہ برداشت نہیں تھا۔

دوسری طرف کبھی کبھی واصف کو بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ لڑکی اسے پسند کرنے لگی ہے مگر اپنی پسند چھپا رہی ہے۔ وہ فین بن کر اس کے قریب ہونے کی کوشش کررہی ہے لیکن جب اسے یہ خیال آتا تو وہ اسے ذہن سے جھٹک دیا کرتا تھا۔ جب وہ روبینہ کے ایس ایم ایس دیکھتا تو اس کا یقین ڈانواں ڈول ہو جاتا تھا کہ یہ لڑکی ایسی کوئی حماقت کر بیٹھی تو اس کے لیے ساری عمر کا روگ بن جائے گا۔ اس کے بعض ایس ایم ایس دیوانگی کی حد تک چاہت لیے ہوتے تھے۔

واصف نے مونا سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ روبینہ سے بات کرے گا۔ مگر ابھی تک اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ مونا نے حسبِ وعدہ اس سے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی

تھی لیکن کبھی کبھی اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ اس کی طرف سے کسی اقدام کی منتظر ہے۔

ان دنوں مونا کے بڑے بھائی کی سب سے بڑی بیٹی کی شادی تھی جو ابھی صرف اٹھارہ سال کی تھی لیکن رشتہ اچھا تھا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا اس لیے مونا کے بھائی نے ہاں کر دی۔ واصف کو حیرت ہوئی تھی۔ اس نے مونا کے بھائی احد الدین سے کہا۔ ”بھائی جان اتنی جلدی کیوں، ابھی بچی کی عمر ہی کیا ہے؟“

”ہاں ہے تو چھوٹی لیکن یار، آج کل لڑکی کی شادی جتنی جلدی کر دی جائے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا ہے جب لڑکیاں تیس سال کی بھی ہو کر صبر سے ماں باپ کے گھر بیٹھی رہتی تھیں۔ دور بہت بدل گیا ہے اور افسوس ہے کہ بہت سارے لوگ اس کا ادراک ہی نہیں کر رہے ہیں۔“

واصف کی نظر میں رخسانہ ابھی بچی ہی تھی۔ اس نے تو اسے گود میں کھلایا تھا۔ بے شک وہ بڑی ہو گئی تھی لیکن واصف ابھی تک اسے بچہ ہی سمجھتا تھا۔ ان کی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ رخسانہ اور دوسرے بچوں سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خاص طور سے رخسانہ سے مونا اور واصف دونوں کو بہت پیار تھا۔ وہ ان سے ابھی تک بچوں کی طرح لاڈ کرتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے باپ سے موبائل کی ضد کی تھی اور جب انہوں نے نہیں دلایا تو اس نے رو رو کر آنکھیں سجا لی تھیں۔ مونا نے سنا تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے رخسانہ کو موبائل دلا دیا۔ مونا کے بھائی نے غصہ کیا تھا کیونکہ وہ لڑکیوں کو موبائل دلانے کے قائل نہیں تھے لیکن مونا نے بھائی کو قائل کر لیا تھا اور رخسانہ کو موبائل رکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔

رخسانہ کی خواہش تھی کہ وہ مونا کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کرے اس لیے مونا آج کل بھائی کے گھر کے چکر لگا رہی تھی۔ اس دن بھی وہ گئی ہوئی تھی۔ اس نے واصف سے کہا تھا کہ وہ دیر سے آئے گی۔ وہ اس کے لیے کھانا بنا کر رکھ گئی تھی لیکن نو بجے اس کا فون آیا۔

”صفی، میں آج نہیں آ سکوں گی۔ ابھی تو ہم بازار جا رہے ہیں وہاں سے واپسی پر اتنی دیر ہو جائے گی اور رات کو اکیلے آتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم رک جاؤ۔“ واصف نے کہا۔ ”بلکہ چاہو تو کل بھی رک جاؤ میں کل شام کو وہیں آ جاؤں گا پھر ایک ساتھ گھر واپس آ جائیں گے۔“

مونا خوش ہو گئی تھی۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

واصف کھانا کھا کر بیڈ روم میں آیا۔ اس نے ٹی وی لگایا اور خبریں دیکھنے لگا۔ پھر بور ہو کر ایک تفریحی چینل لگا لیا۔ مزید بور ہو کر اسے بھی بند کر دیا۔ وہ سونے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ موبائل کی میسج ٹون بجی۔ وہ دیکھے بغیر جان گیا کہ روبینہ کا ایس ایم ایس ہوگا۔ اس نے میسج کھولا۔ حسب معمول شاعری تھی۔

میں کاتب تقدیر سے اس کو مانگتی ہوں
جو میرے اندر ہے پر میرا نہیں ہے

واصف کو غصہ آ گیا تھا۔ یہ لڑکی اس کے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی تھی، ایک طرف خود کو اس کا فین ظاہر کرتی تھی اور دوسری طرف اس قسم کے رومانی اشعار بھیجتی تھی۔ ان اشعار میں بے تابی ہوتی تھی اور دوری کا دکھ ہوتا تھا۔ وہ ان سے کیا ظاہر کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے جوابی ایس ایم ایس کیا۔

”روبینہ تم آج بتا دو تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟“

کچھ دیر بعد اس کا جواب آیا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

واصف نے لکھا۔ ”سمجھا تو میں بھی نہیں ہوں حالانکہ تم رومانی شاعری کی آڑ میں مجھے سمجھانے کی پوری کوشش کر رہی ہو۔“

روبینہ کا حیرت زدہ جواب آیا۔ ”رومانی شاعری..... یہ کیسی بات کر رہے ہیں سر..... میں سمجھی نہیں۔“

واصف کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ ”تم مجھے بے وقوف مت بناؤ.... کون لڑکی کسی غیر مرد کو اس قسم کی شاعری بھیجتی ہے۔“

روبینہ کا جواب آیا۔ ”سر، اول تو آپ میرے لیے غیر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ تو عام سی شاعری ہے۔“

”تم ابھی بچی ہو اور میں نے دنیا دیکھی ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لڑکیاں اس قسم کی شاعری کب کس کو بھیجتی ہیں۔ مہربانی کر کے یہ سلسلہ بند کر دو اور تمہارے دماغ میں کوئی خیال ہے تو اسے نکال دو۔“

”کس قسم کا خیال سر..... میں بالکل نہیں سمجھ رہی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرنے کی حماقت کر بیٹھی ہو تو اسے یہیں روک دو۔“

یہ ایس ایم ایس کرنے کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا تھا اور پھر اسے پچھتاوا ہونے لگا کہ اس نے کچھ زیادہ....

ہی سخت الفاظ استعمال کر دیے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ جب روبینہ سے اس موضوع پر بات کرے گا تو اسے نرمی سے سمجھائے گا لیکن نہ جانے کیوں وہ اس طرح ابل پڑا اور اسے اتنی زیادہ سنا دی تھیں۔ اس کے بعد روبینہ کا میسج نہیں آیا۔ واصف کا پچھتاوا بڑھ رہا تھا۔ اس نے کال کرنے کا سوچا لیکن پھر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بیل بجی۔ روبینہ کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو...''

جواب میں دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ واصف بے چین ہو گیا۔'' روبینہ ...رو رہی ہو...پلیز.....''

''سر....آپ ....نے مجھے...ایسا سمجھا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

واصف کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔''

''یہی بات ہے۔'' روبینہ تیز لہجے میں بولی۔ اس کا رونا جاری تھا۔'' آپ مجھے ایسا سمجھیں گے....میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''روبینہ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو.....آخر تم اس قسم کے ایس ایم ایس کیوں کرتی ہو؟''

''کس قسم کے؟'' اس نے ناک سے سوں سوں کرتے ہوئے پوچھا۔

واصف نے ایک بار پھر خود کو بے بس محسوس کیا۔ وہ اس لڑکی کو کن الفاظ میں سمجھائے جو کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ بہرحال اس نے کوشش کی۔'' بھئی اس قسم کے جو کسی لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔''

''لیکن میں تو سب کو یہ میسج کرتی ہوں۔ صرف آپ کو تو نہیں کرتی۔''

''دیکھو ہر کام اگلے آدمی کو دیکھ کر کرنا چاہیے۔'' واصف نے اسے سمجھایا۔'' اب میں ایک بڑی عمر کا پختہ کار آدمی ہوں، مجھے اس قسم کے میسج اچھے نہیں لگتے۔''

''تو آپ کہہ دیتے، مجھ پر ایسا الزام تو نہ لگاتے...''

اس نے پھر زور وشور سے رونا شروع کر دیا۔ واصف نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔

''اچھا بھائی غلطی ہو گئی مجھ سے۔''

''نہیں سر غلطی مجھ سے ہوئی ہے میں انجانے میں آپ کو پتا نہیں کیا کیا میسج کر جاتی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا آپ میرے بارے میں اتنا غلط سوچ لیں گے۔ مجھے معاف کر دیں اب میں آپ کو دوبارہ میسج نہیں کروں گی۔''

واصف نے کہنا چاہا لیکن روبینہ نے لائن کاٹ دی تھی۔ واصف نے ملایا تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ جو ہوا اچھا نہیں ہوا تھا۔ اسے اس لڑکی سے ایک انجانا سا لگاؤ ہو گیا تھا اور اب وہ اس کے دکھ پر دکھی تھا۔ لیکن ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ اس لڑکی کو پتا چل گیا کہ اسے کس آدمی کو کس قسم کے ایس ایم ایس کرنے چاہئیں۔ اگرچہ وہ ابھی نہیں جان پایا تھا کہ روبینہ کو کیوں سینس نہیں تھا کہ وہ اسے کیسے ایس ایم ایس بھیج رہی ہے۔ اتنے عرصے میں واصف کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کم عقل نہیں ہے۔ گریجویشن کے آخری سال میں ہے اور دوسری باتوں میں بھی بہت ذہین ہے۔ ایک بار مونا نے روبینہ کا ایسا ہی ایک ایس ایم ایس دیکھ کر کہا۔

''صفی میں آپ سے پہلی نظر میں محبت کرنے لگی تھی لیکن یقین کریں اگر اس وقت میرے پاس موبائل ہوتا تب بھی میں آپ کو اس قسم کے رومانی میسج نہیں کر سکتی تھی۔''

واصف کے خیال میں اس دور میں محبت اتنی کھل کر نہیں ہوتی تھی اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو شاید وہ بھی مونا کو اس قسم کے میسج نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس کا دل اداس تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس نے ایک لڑکی کا دل توڑ دیا تھا بلکہ یہ سوچ کر کہ آج کی نئی نسل کس طرف جا رہی ہے۔ کیسی معمولی سی باتیں اس کی نظر میں کتنی اہم ہو گئی تھیں۔ اس نے سونے سے پہلے روبینہ کو میسج کیا۔

''میں تمہیں غلط سمجھنے پر شرمندہ ہوں لیکن اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ تم جو میسجز مجھے کرتی ہو وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔''

اگلے دن اس نے موبائل دیکھا تو کئی مہینے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ روبینہ نے اسے صبح بخیر کا ایس ایم ایس نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کا میسج روبینہ کو چلا گیا تھا۔ واصف ناشتا کر کے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ آج بہت سارے اہم کام تھے۔ دو ڈراموں کی فائنل شوٹنگ تھی پھر شام کو اسے مونا کو بھی لینے کے لیے جانا تھا۔ شام تک وہ بہ مشکل فارغ ہوا تو اس نے مونا کے بھائی کے گھر کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ مونا کو لے کر نکلنے کا تھا لیکن سب نے اصرار کر کے کھانے پر روک لیا۔ رخسانہ اسے اپنی شاپنگ دکھانے لگی۔ اس نے کام والے سوٹ اور اس کی

مناسبت سے چیولری لی تھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل میسج بھی کررہی تھی۔ اس کی زبان اور ہاتھ یکساں رفتار سے چل رہے تھے۔ واصف نے اسے ٹوک دیا۔

''بیٹے آپ ایک کام کریں یہ میسج بعد میں کرلیجیے گا۔''

''انکل مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، میں تو کام کرتے ہوئے بھی میسج کرلیتی ہوں۔'' رخسانہ نے جواب دیا۔

''اچھا یعنی تمہیں ایس ایم ایس کرنے کا اتنا کریز ہے۔''

''بہت زیادہ انکل.... اب تو میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ ایک دن میں تین چار سو ایس ایم ایس کرلیتی ہوں۔''

واصف حیران ہوا تھا۔ ''تین چار سو میسجز.... لیکن مجھے تو تم نے کبھی نہیں کیا۔''

''میں تو کرنا چاہتی تھی لیکن پھپو نے منع کردیا کہ آپ مصروف ہوتے ہیں تو میسجز پسند نہیں کرتے۔''

واصف نے مسکرا کر مونا کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری پھپو کا بس چلے تو ہمارا حقہ پانی بھی بند کردیں۔''

''جی نہیں میری پھپو ایسی نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔ ''اور اب میں آپ کو اتنے ایس ایم ایس کروں گی کہ آپ تنگ آجائیں گے۔ میں ابھی آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

رخسانہ کے جاتے ہی مونا نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آپ کا موڈ کچھ چینج ہے؟''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' واصف نے جواب دیا اور اسے کل رات کی بات بتائی۔ ''اب مجھے افسوس ہورہا ہے۔''

''ممکن ہے وہ ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پھر بھی اسے ایسے ایس ایم ایس آپ کو نہیں کرنے چاہیے تھے۔''

''یہ بات میں نے بھی اس سے کہی ہے، ممکن ہے اس کی سمجھ میں آجائے اور اب وہ رومانی ایس ایم ایس نہ بھیجے۔''

مونا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے متفق نہیں تھی۔ اچانک واصف کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ رخسانہ کا ایس ایم ایس تھا۔ یہ شعر ہی تھا۔

تیرے عشق میں یوں بے خود سے ہوگئے
کہ اپنے تن بدن کا ہوش ہی کھو بیٹھے ہم

واصف چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل ہورہا تھا یہ شعر اسے ایس ایم ایس کی صورت میں اس بچی نے بھیجا تھا جسے اس نے گود میں کھلایا تھا اور اب بھی وہ اس سے بیٹی جیسا پیار کرتا تھا۔ اسے یوں چپ دیکھ کر مونا نے کہا۔ ''کیا بات ہے کیا روبینہ کا کوئی میسج آیا ہے؟''

واصف نے بنا کچھ کہے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ مونا نے میسج دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''یہ رخسانہ کا دماغ درست ہے۔ اس نے کس قسم کا ایس ایم ایس کیا ہے آپ کو، میں اس سے ابھی پوچھتی ہوں۔''

اسی لمحے رخسانہ چائے لے کر آگئی۔ واصف نے مونا کو روکنے کا سوچا مگر اس سے پہلے ہی مونا نے اس سے پوچھ لیا۔ ''یہ تم نے اپنے انکل کو کس قسم کا میسج کیا ہے؟''

وہ چائے سامنے رکھ کر چینی ملانے لگی اور سادگی سے پوچھا۔ ''کیسا میسج پھپو؟ میں نے تو کئی بھیجے ہیں۔''

''یہ والا۔'' مونا نے موبائل اس کے سامنے کر دیا۔ ''تمہیں عقل نہیں ہے کہ کس کو کیسا میسج کرنا چاہیے۔''

رخسانہ نے میسج دیکھا اور ہنسی۔ ''لو اس میں کون سی خاص بات ہے۔ یہ تو میں سب کو بھیج چکی ہوں، انکل کو بھی بھیجا ہے۔''

اس لمحے واصف کی سمجھ میں سب آ گیا تھا۔ مونا رخسانہ کی بیخ سے کلاس لینے جارہی تھی کہ واصف نے اسے روک دیا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، آپ چائے دیں بیٹے۔''

رخسانہ خوش ہوگئی۔ ''دیکھا انکل بھی میری سائڈ لے رہے ہیں۔'' اس نے واصف کو چائے دی۔ اس کی امی نے آواز دی تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ مونا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ واصف نے کپ نیچے رکھ دیا۔

''آپ نے اسے ڈانٹا کیوں نہیں؟''

''کیونکہ اس میں واقعی اس کی غلطی نہیں ہے۔''

''اس نے اتنا واہیات شعر آپ کو بھیج دیا۔''

''مونا، یہ زمانے کا عذاب ہے۔ دور بدل گیا ہے، جو برائی ہمارے باپ دادا کے زمانے میں برائی ہوتی تھی وہ ہمارے زمانے کا فیشن بن گئی ہے اور ہم نے اسے بڑے فخر سے اپنا لیا۔ جن باتوں کو ہم برائی سمجھ کر اس سے دور رہتے تھے، اسے آج کی نسل نے عام سی بات سمجھ کر سینے سے لگا لیا ہے۔''